

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

نومبر 2014

میں
میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

طاہر جاوید مغل

سے قصہ ہے نئی داستان ستاروں کی کہ کند
اندرونی صفحات پر ہا۔ حلقہ نوائیس



پبلشر پروپرائٹر: ذیشان رسول، سقاۃ اشاعت، گراؤنڈ فلور-63 فیضان ایکس نیشن، ڈیفنس سیمینار کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی



جلد 44 • شمارہ 07 جولائی 2014 • زبیر سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتہ: وسٹیکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 • ایکس (021) 35802551 E-mail: jdpgrp@hotmai.com

اسم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
مٹنے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

حکمت عملی

انشائیہ
جون ایلیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

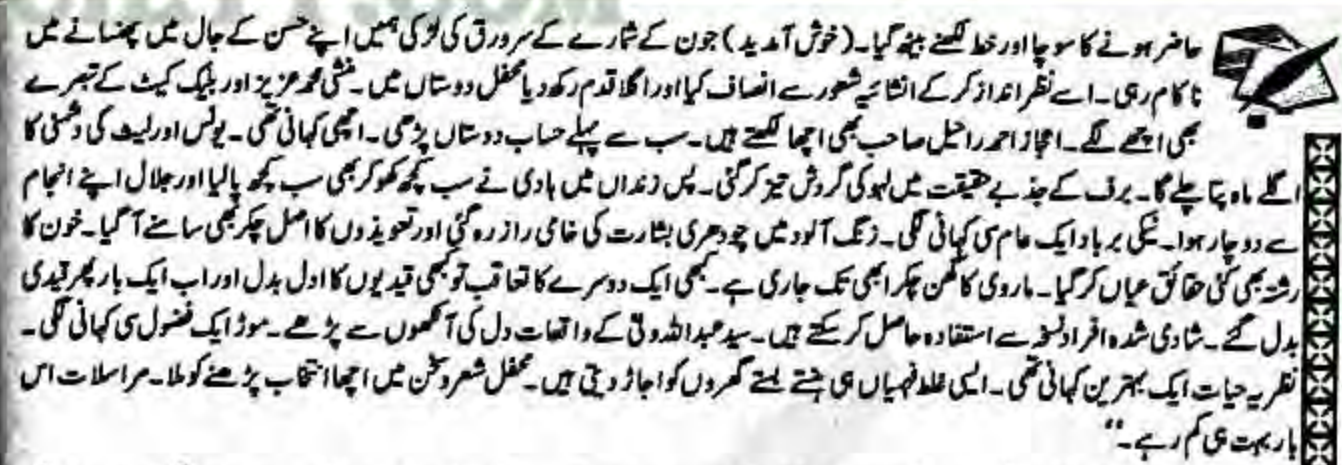
شام ہے اور ایک حالت استغہام ہے۔ میں اور میرا ہنرا بیٹے سوچ رہے ہیں اور بول رہے ہیں۔ یہ عمل وقفے وقفے سے جاری ہے۔ جو لفظ ہماری زبان پر بار بار آ رہا ہے وہ "سیاست" ہے۔ ہے یوں کہ جہاں سماج ہے وہاں سیاست اور جہاں سیاست ہے وہاں سماج۔ دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک ایسے سماج کے خواب دیکھتا ہے جہاں کوئی سیاسی نظام یعنی حکومت یا ریاست نہ پائی جاتی ہو۔ اس گروہ کو اردو میں نراجی اور عربی میں فوضوی (Anarchist) کہتے ہیں۔ ایسا ہی سماج میرا اور میرے ہنرا کا خواب رہا ہے۔ یہ خواب کب اور کتنی نسلیں گزرنے کے بعد پورا ہوگا؟ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن گمان یہ ہے کہ یہ خواب ضرور پورا ہوگا۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جسے ہمیشہ معتمد خیر سمجھا گیا ہے۔ اس پرانیسویں صدی میں بھی بری طرح ہنسایا گیا اور اس صدی میں بھی اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی ذہن کے سب سے خوب صورت خوابوں کا مذاق کیوں اڑایا جاتا ہے؟ جو خیالات انسانی ذہن کا سرمایہ ہیں، بیش قیمت ترین سرمایہ انہیں دیوانگی کی پیداوار کیوں سمجھا جاتا ہے؟ جو خیالات دیوانگی کی پیداوار سمجھے گئے انہی نے تاریخ میں انقلابی کردار ادا کیا۔ وہ فکر و خیال کے دیوانے ہی تھے جنہوں نے فرزانگی کی پرورش اور پرداخت کی۔ تہذیب کی تاریخ دراصل دیوانوں ہی کی کارگزاری کی سرگزشت ہے۔ ذکر تھا، سیاست کا۔ سیاست کو ایک ایسا عمل سمجھا جاتا ہے جو چالاک، عیاری، سازش، فریب دہی اور دروغ گوئی سے تعلق رکھتا ہو۔ ایسا سمجھنا "سیاست" کے ساتھ بے حد نفوس ناک نا انصافی ہے۔ یہاں میں جس امر کو واضح کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں وہ یہ ہے کہ سیاست یا ملک داری (حکومت) حکمت سے تعلق رکھتی ہے اور حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکمت نظری اور دوسری حکمت عملی۔ حکمت نظری، منطق، ریاضت، طب، علم ویت (Astronomy)، طبیعیات اور دوسرے علوم سے تعلق رکھتی ہے۔ اب رہی حکمت عملی، حکمت عملی کی تین قسمیں ہیں اور وہ ہیں تہذیب اخلاق، تدبیر منزل یعنی امور خانہ داری کی تنظیم اور سیاست (یعنی حکومت یا ملک داری) اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست حکمت عملی کی سب سے برتر قسم ہے۔ اگر میری یہ بات صحیح ہے اور ظاہر ہے کہ صحیح ہے اس لیے کہ یہ بات میرے ذہن کی ایجاد نہیں ہے بلکہ مہذب معاشروں کی تسلیم شدہ بات ہے تو مجھے بتایا جائے کہ سیاست دانوں یا حکمرانوں کی اکثریت جس طرز سیاست پر عمل پیرا ہے کیا اس کا حکمت سے دور کا بھی کوئی واسطہ ہے؟ میری اس بات کے پیش نظر سیاست یا ملک داری کا کام چلانے والے لوگوں کا معاشرے کے حکیم ترین یا دانش مند ترین لوگوں کے حلقے سے تعلق ہونا چاہیے۔ ہونا چاہیے یا نہیں..... اگر ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ہونا چاہیے تو کیا ہم بہت رعایت دینے کے بعد بھی سیاست دانوں یا حکمرانوں کو حکیم ترین اور دانش مند ترین نہ سمجھیں، بہت ادنیٰ مفہوم کے اعتبار سے حکیم یا دانش مند قرار دے سکتے ہیں؟ یہاں چند لکھوں کے لیے رک کر ذرا پس لیجئے..... سیاست داں یا حکمران اور حکیم..... سیاست داں یا حکمران اور دانش مند! تو بہ تو بہ..... یہ تو ہم حکیم بھی نہیں ہیں..... ہاں خطرہ جاں ضرور ہیں۔

میں دنیا کے سیاست دانوں یا ملک داروں کی ایک بڑی تعداد سے سوال کرنا چاہتا ہوں اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا تمہارے عوام نے قومی معاملوں میں بھی قوم کو مایوس کیا.....؟ ان میں سے کس کی مجال ہے جو یہ کہے کہ مایوس کیا۔ ہرگز مایوس نہیں کیا۔ پھر تم کسی بد بلا ہو جو اپنی قوم کو لگا تار مایوس کرتے چلے آ رہے ہو، تمہارے عوام نے ہمیشہ تم پر اعتبار کیا، پر تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمہارے پیش رو اور تم ہمیشہ ناقابل اعتبار ٹھہرے۔ انہوں نے ہمیشہ تم سے اپنی عزیز ترین امیدیں وابستہ کیں پر تم نے انہیں بڑے بڑے اور بینڈے انداز کے ساتھ نا امید کیا۔ تمہارا ٹولا تو بس بڑوں کے بن کا ہنر مند اور آنکھوں میں دھول جھونکنے پر کار بند رہا ہے۔

آخر تم لوگ کس غرے میں ہو۔ کیا تم روشنی کے جنے ہو۔ کیا تم رنگ و خوشبو کے بیٹے ہو، کیا تم سلیقے اور شائستگی کے لے پا لک ہو.....؟ نہیں جانا جاتا کہ آخر تم کون ہو؟ جنہوں نے تم سے شروع شروع میں آس لگائی، ان کی بجائیں بھی سفید ہو چکی ہیں اور جو ان کے بعد آئے وہ..... اور جو ان کے بعد آئے وہ اس عذاب میں مبتلا ہیں جسے ہونے کے احساس کی جان کنی کہتے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ انسانوں کے حقیقی مسئلوں کو نہ تو سائنس دان حل کر سکتے ہیں۔ نہ فلسفی، نہ شاعر اور نہ ادیب۔ یہ فرض تو صرف سیاست داں اور حکمران ہی ادا کر سکتے ہیں اس لیے کہ عوام ان ہی کی بات سنتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اپنی بات منوانے کی طاقت صرف سیاست دانوں یا حکمرانوں ہی کو حاصل ہے۔ آج انسانوں کے مسئلے پہلے سے نہیں زیادہ اچھے ہوئے ہیں اور یہ اچھے ہوئے مسئلے کسی ایک ملک یا ایک علاقے کے عوام کو متاثر نہیں کر رہے بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ کیا دنیا کے سیاست دانوں اور حکمرانوں کا گروہ اس صورت حال کو حکمت پسندی، دانش مندی اور انسان دوستی کے ساتھ پیش نظر رکھے گا یا نہیں؟





قصیر اقبال گچہ، بکول، ضلع بکھرے جہرہ کر رہے ہیں "زندگی اک سفر ہے اس سفر میں کئی لوگ ہم سفر بنتے ہیں۔ کچھ زندگی کی بھیڑ میں کم ہو جاتے ہیں تو کچھ راستے میں ہی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ بہر حال اپنی توفیقی دعا ہے کہ "رت بدلے چاہے موسم بدلا رہے، سسپنس سے ہمارے حیار کا دیا یوں ہی چلتا رہے۔" (اس محبت کا شکر ہے) گرمیوں کی نوید سنا تا جون کا سسپنس 16 مئی کو ملا۔ سرورق کی حسینہ کو ملک کے ساتھ اس کے حال پر چھوڑا اور اتنا یہ شعور سے استفادہ حاصل کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم بے فکر وقت کا ایک غمغسول پن اور تاریخ کی ہڑ بونگ ہیں۔ کہانیوں کی ابتدا میں زنداں سے کی۔ گو کہ حجاب ہادی کو اپنی جدائی دے گئی مگر حجاب ہادی کے دل میں اور کہانی قارئین کے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ نواب صاحب نے ماروی کو ایک چکر بلکہ گھن چکر بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایسے اتفاقات نواب صاحب کی کہانیوں میں ہی ہوتے ہیں۔ جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ نظریہ حیات میں فطور ہادی نے ایک معمولی سی غلط فہمی کو اتنی بڑی کہانی کا روپ دے دیا۔ اگر عادل پوری کوشش کرتا تو فہمی کو اصل بات بنا سکتا تھا۔ پہلی کہانی حساب دوستانہ لیٹ، پولس، خندا اور حنا کے گرد گھومتی تاریخی کہانی جس میں دوست دشمن کا اصل فیصلہ اگلے ماہ ہوگا۔ فیاض نسیم بکراہی کی سید عبداللہ ولی کے واقعات اور بچپن سے اللہ کے راستے میں سفر اور کرامات دل پر اثر کر گئے۔ رنگ آلود میں ملک صفحہ حیات نے تعویذوں کا بھانڈا چھوڑا اور اپنی حکمت عملی سے مسمن شاہ اور خالدہ کو قاپو کر کے چودھری بشارت کی رنگ آلودی کو چھپایا۔ کاشف زہیر کی برف کے جذبے میں ڈاکٹر مین کا منصوبہ تو فہمیک ہی تھا مگر جیف اور شیریں کے سامنے ناکام ہو گیا۔ شرماس کی خون کا رشتہ میں آخر کار اسٹیغور، جیکسن اسٹیغور سوم کے چھگل سے نکلنے میں کامیاب ہوئی گیا۔ مہر امام کی لٹری میں رضوان کی بدولت نوید نے ایک نیا تجربہ سکھا۔ نیکی برباد میں نفسی کے انجام سے ایرس کے بے چین دل کو سکون ملا۔ سلیم انور کی دلچسپی میں بیڑی اور دی اس کے گلے کی ہڈی بن گئی۔ محفل شعرو سخن میں اعجاز احمد راحیل اور قدرت اللہ ناز کا انتخاب بہترین رہا۔ مجموعی طور پر جون کا سسپنس گرمیوں کا بہترین مجموعہ رہا۔" (بہت شکریہ)

ناہید شہید، ڈیرہ غازی خان سے تشریف لائی ہیں۔ سائنس عمر 2 سال سے میرے مطالعے میں ہے۔ خدا کلمے کی ہمت پہلی بار بکھر ہے (خوش آمدید) مٹی کی ہلکی پھلکی گرمی میں جون کا سائنس ملا۔ سرورق کی حسینہ اچھی لگی۔ لہجہ است کو ایک نظر دیکھ کر انتہائی شعور پڑھا۔ مغل میں رضوانہ کو اکل آنے پر مہارک پاد۔ محمد جاوید کلمے منہ اور بند آکھوں سے ہوائی جہاز دیکھتے نظر آئے۔ پس زعمال ختم ہوئی اور ختم ہونے والی یادیں ختم گئی۔ ماروی کا ہم کیا کہیں۔ بس نواب انکل کہانی کو کھمٹے جارہے ہیں۔ حساب دوستوں میں دوستوں کا حساب کتاب ابھی باقی ہے۔ رنگ آلود میں صاحب نے اندر ہی اندر سارا مسئلہ حل کر لیا، برف کے جذبے میں ڈاکٹر میں کا ہیرے چرائے کا منصوبہ بنا کام رہا۔ نظریہ حیات ایک اچھی کہانی رہی

✽ عمران علی، تحصیل شورکوٹ، ضلع جمگ سے محفل میں تشریف لائے ہیں۔ ”ہاں جی آگئے ہیں، ہم بھی اس رنگ برنگی اور پھولوں سے اور قہقروں سے سبھی محفل میں، امید ہے میری طویل فیر حاضری کو معاف کیا جائے گا۔ بہت کوشش کی محفل میں آنے کی بس ہر بار کوئی نہ کوئی مصروفیات بین جاتی۔ اس دفعہ

طاہر جاوید مغل جی!

شاعر اعجاز احمد راحل سما ہوا



شمارہ 19 تاریخ کو طوا اور ساتھ یہ بھی خبر ملی کہ زینت کی آخری قسط ہے بالکل ختم نہ آیا۔ بس پھر نہ پوچھو جو حال ہوا..... ہاشم صاحب سا کہ اک اداس اور مغموم سی لڑکی۔ پہلے تیر پر رضوان خونی اور دوسرے تیر پر توصیف صاحب بیٹھے تھے جو میری طرح کافی غیر حاضری کر کے حاضری لگوانے آئے تھے۔ گل مروت اللہ آپ کو صحت دے آمین۔ مہرین ناز ہماری دعا ہے اللہ آپ کو اپنے گھر کی بار بار حاضری نصیب فرمائے۔ آمین۔ ہمیں بھی اپنی خاص دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے بہت بے صبر رہے ہیں سے پس زنداں پڑھی، آخری قسط دیکھ کر اعتبار نہ آیا کہ اتنی جلدی ختم ہو جائے گی۔ طاہر صاحب سے امید تھی کہ کوئی لمبی استوری لائیں گے۔ نشور ہادی کی کہانی نظریہ حیات بھی استوری تھی، واقعی ہر انسان اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق رکھتا ہے۔ ماروی بھی بڑی تیزی سے جاری ہے، اس بار تو ساری کہانی مرینہ اور مراد کے ارد گرد گھومتی رہی۔ ملک مفسر حیات صاحب کی کہانی رنگ آلود اچھی سبق آموز کہانی ثابت ہوئی۔ تاریخ اور ماضی کے آنکھوں سے جھانکتی ہوئی الیاس بیٹا پوری کی کہانی حساب دوستان اگر ایک سادہ لوح انسان کے ساتھ چالاک انسان نہ ہو تو سادہ لوح بھی خود میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ سید عبداللہ دینی کی حیات کا مطالعہ کر کے دل کو بہت سکون ملا۔ کتر نہیں بہت اچھی تھیں۔ اشعار تقریباً سب اچھے اور معیاری تھے۔

افروز یہ تبسم، خانیوال سے جلوہ افروز ہیں۔ جون کا سسٹن 19 مئی کو ہمارے خوب صورت ہاتھوں میں آیا۔ شعور کو چکا تا انتائی شعور سے ہو کر محفل میں حاضری دی تو محفل کے ہر رکن پر قیصر اقبال کی کمی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے پس زنداں پڑھی۔ حجاب کا انجام بہت دگنی کر گیا۔ ماروی میں پھر مراد اور محبوب ایک دوسرے کی جگہ لے رہے ہیں۔ رنگ آلود میں ملک مفسر حیات کی کوششیں رنگ لائیں اور محسن شاہ اور ملک صاحب کا فیصلہ پسند آیا۔ حساب دوستان میں یونس اور لیٹ کا کل کر آسانا سامنا اگلے حصے میں ہوگا۔ آخری کہانی نظریہ حیات کچھ خاص نہیں تھی۔ سید عبداللہ دینی کا اللہ کے راستے میں سفر اور واقعات بہت پسند آئے۔ نسخہ یوں پر ہنسی کھینچی۔ کاشف زہیر کی برف کے جذبے ایک بہترین تحریر تھی۔ دھچکا اور خون کا رشتہ بھی پسند آگیا۔ اس دفعہ کتر نہیں بہت کم تھیں جبکہ محفل شعرو سخن میں راجہ بھاری کا انتخاب پسند آیا۔

اشوک کمار، میر پور خاص سے تہرہ کر رہے ہیں۔ ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ہاشم گرل بھی اپنے محبوب کے بارے میں سوچ سوچ کر خوش گھبراہٹ میں جھلا ہو رہی ہے، جون صاحب کا سبق آمیز انتائی پڑھ کر ہماری روح تک لرز اٹھی۔ ادارہ یہ ہمیشہ کی طرح لا جواب رہا، ایڈیٹر صاحب کے خیالات قابل غور و غمل ہیں۔ ماہ ایمان کہاں غائب تھیں اسنے دن؟ بہت دنوں بعد روشن کروایا آپ نے۔ اس دفعہ سسٹن میں بڑی دلگداز کہانیاں ہیں جو دلوں کو گرما گئیں سب سے پہلے طاہر جاوید محفل صاحب کی پس زنداں پڑھی۔ یہ بھی ان کی مخصوص طرز تحریر ہے جو کبھی بھی قاری کو یوں نہیں ہونے دیتی۔ حجاب کی موت اور ہادی کی محبت بہت رنجیدہ کر گئے۔ تاریخی کہانی حساب دوستان بھی بہت معلوماتی رہی۔ الیاس بیٹا پوری صاحب نے دوست نما دشمن کی پہچان کروائی، لیٹ بھی یونس کی چال بازیوں سے بہت کچھ سیکھ گیا۔ نظریہ حیات نشور ہادی صاحب کی بہترین کاوش ثابت ہوئی۔ تنگ نظری ہمارے معاشرے کا خاصہ بن چکی ہے۔ محی الدین نواب کی ماروی اوسط درجہ پر رہی۔ ملک مفسر حیات کی ڈائری سے رنگ آلود، معاشرے کی خرابی کی تصویر ہے جہاں عورت کی حیثیت کچھ نہیں اس میں عورت، عورت پر ظلم ڈھالی ہے اور دوسرے کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ سسٹن کی نیم کے لیے نیک خواہشات اور مزید کامیابیوں کی دعا۔ (بہت شکریہ)

یعنی راجپوت، پکوال سے تشریف لاری ہیں۔ سسٹن سے ملاقات محفل اتفاق ہی ہے۔ تاریخ میں اپنی ایک کزن کے پاس راولپنڈی جانا ہوا تو وہاں سسٹن سے جان پہچان ہوئی۔ میں نے سرسری طور پر ایک استوری پڑھنا شروع کی تو مجھ پر لفظوں کے جادو نے ایسا اثر کیا کہ میں کھوی گئی۔ طاہر جاوید محفل نے اس ماہ کہانی کا ایڈ بھی کر دیا۔ محفل صاحب مبارک باد کے ساتھ ہیں حجاب اور ہادی صاحب کی محبت کی داستان دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی مگر حجاب کی موت نے ہمیں رلا دیا، برف کے جذبے میں ایک باہت عورت کی جدوجہد نے کافی متاثر کیا۔ نیکی بر باد میں پڑھ کر یقین ہوا کہ عورت، عورت سے بہت جنمیں ہوتی ہے۔ دھچکا میں ایک ذہین عورت سے سامنا ہوا، رنگ آلود بھی اچھی لگی۔ خون کا رشتہ نے کافی متاثر کیا کہ دولت بہت ظالم شے ہے، رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہے۔ نواب صاحب گھما روئی گزارے لائق ہے۔ مہر ام کی کہانی نسخہ پڑھ کر ہم بہت دیر تک الجھائے کرتے رہے۔ نظریہ حیات میں نشور ہادی نے واضح بتا دیا کہ فلفلیہ نمایاں ہماری زندگی کو تباہ کرتی ہیں۔ نیا نسیم بگڑی نے سید عبداللہ دینی جیسے اللہ کے نیک بندے کی زندگی کے بارے میں کافی معلومات دی ہیں۔ سرورق کی حینہ کا شاداب چہرہ بہت بھلا لگا۔ آپ کے خط پڑھنے کا مزہ ہی کچھ الگ ہے۔ بشری افضل کا تہرہ بہت اچھا لگا۔ محفل شعرو سخن کے سب اشعار بہت اچھے لگے ہیں۔ (شکریہ) مگر آپ کا خط پڑھ کر ایسا نہیں لگا کہ آپ نے ہماری بار سسٹن کو پڑھا ہے۔ گویا..... خیر بہت اچھی بات ہے)

ملک سعید، پکوال سے چلے آ رہے ہیں۔ 19 مئی کو اپنا پہلا پیپر دے کر واپس آ رہا تھا جب سسٹن کو ایک بک اسٹال پر اپنے انتظار میں بے چین و بے قرار پایا۔ ہاشم عظیم صاحب نے یہ فقرہ اس دفعہ کی ہاشم گرل کے لیے ہی کہا تھا کہ "ایسا نہیں ہے کہ میں حسن سے آشنا نہیں ہوں لیکن کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو حسن کو بالکل غنی تشریف دے دیتے ہیں۔ پس زنداں کے اچھے جلدی اختتام کی توقع تو ہرگز نہیں تھی لیکن کچھ کام خلاف توقع بھی ہو جاتے ہیں۔ گل دوسرا پیپر ہے لیکن پھر بھی خطا لکھنے کے لیے وقت نکال لیا ہے تو پلیز اب بیک لسٹ کی ضرورت سمجھیے گا۔ تمام دوستوں کو خصوصاً تفسیر مہاس باہر بھائی کو سلام رضوان خونی کو بھی دلی..... مبارک باد۔" (شکریہ)

محمد قدرت اللہ نیازی، سکیم ہاؤس، خانیوال سے پھر پور تہرے کے ساتھ شرکت کر رہے ہیں۔ 15 مئی کو اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا تو



معلوم ہوا کہ پارلوگوں نے جون کے شمارے کا ہاشم گرل اپ لوڈ کر دیا ہے یعنی سسٹن مارکیٹ میں آچکا ہے۔ سرورق کی حینہ بھی عوام کی طرح سوچوں میں گم نظر آئی کہ بجٹ آنے والا ہے کیا بنے گا۔ جون ایلیا انسانی شعور کو موضوع بنائے کر رہے تھے۔ ادارہ یہ حکومتی وعدوں اور وعظوں کی جتنی کھونٹا نظر آیا۔ نیکی کی فراہمی کا وعدہ موجودہ حکومت نے انتخاب میں فخر کے طور پر استعمال کیا لیکن اب اس وعدہ کو پورا کرنا اپنے بس سے باہر کی چیز بتا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں کی حکومتی اداروں کی نیکی نادمندگی کی وجہ سے کاٹ دی گئی، حکومتی اداروں کا یہ حال ہے تو عوام کیا کرے گی؟ مبارک قبول ہو۔ توصیف احمد! سسٹن کی محبت واقعی کمال کی ہے کہیں جانے نہیں دیتی۔ عبدالنضر خان! آپ شاید غلطوں کی تعداد بتاتے ہی آتے تھے؟ بھئی کوئی کہانیوں پر تہرہ کوئی دوستوں سے پچھڑ چھاڑ بھی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ اپنے خط کو دیکھا تو پتا چلا بہت کچھ ایڈٹ کر کے شائع کیا گیا۔ بہر حال پھر بھی قبول ہے۔ (شکریہ) احمد خان توحیدی! آپ بے فکر رہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں آلو ہائے ہائے، آلو ہائے ہائے! پس زنداں کا اختتام حسب توقع ہوا۔ ہادی کے پُر غلوس جذبات حجاب کی رہائی کا سبب بنے تاہم کسی طرح فیصل اور اس کے والد نے بھی اس میں بڑا حصہ ڈالا یہ اور بات کہ "بہت دیر کی مہریاں آتے آتے۔" پس زنداں کے اختتام کے ساتھ ہی ستاروں پر کند کی خوش خبری دی گئی اچھے سلسلے کی امید رکھتے ہوئے انتظار رہے گا۔ ملک مفسر حیات کی رنگ آلود میں گھر لے چیتلش کا فرما نظر آئی۔ سلیم انور کی دھچکا حقیقت کیرو لین کا پیڑ کے لیے دھچکا ثابت ہوئی یہ تو وہی بات ہوگئی "چوروں کو پڑ گئے مور"۔ خوبر ریاض کی نیکی بر باد میں تنہی کا رویہ ایس کے لیے تازیانہ ثابت ہوا اور وہ تنہی کی جان تک لینے پر خود کو حق بجانب سمجھنے لگی۔ شرعاً اس کی خون کا رشتہ مغربی معاشرے کی تلخ حقیقتوں سے آگاہی دیتی شمارے کی زینت بنی۔ مہر ام کا نسخہ حقیقتاً عجیب محسوس ہوا۔ سید عبداللہ دینی کے حالات زندگی پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ محفل شعرو سخن میں قیصر امون مرگودھا کا انتخاب بہترین لگا، کتر نہیں کی تعداد کافی کم تھی۔

مہر اختر عباس، خانیوال سے تشریف لائے ہیں۔ ایک سال کی طویل غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر اپنی محفل میں حاضر ہیں مگر ہم نے سسٹن سے علیحدگی بالکل نہیں کی تھی۔ (شکریہ) اصل میں والد محترم کی ڈیوٹی کے بعد عظم کانا بہت مشکل ہو گیا تھا مگر اب پس زنداں کا ایڈ پڑھ کر بے اختیار رجم کا سہارا لیا۔ محفل صاحب کو اتنی خوب صورت تحریر لکھنے پر دی مبارک باد۔ ماروی بھی بہت خوب جارہی ہے۔ ابتدائی صفحات پر الیاس بیٹا پوری ایک عمدہ تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ آخری صفحات پر بھی نشور ہادی نے ایک اعلیٰ تحریر پیش کی۔ زندگی میں جلد بازی میں اتنے بڑے فیصلے کرنے والے ہمیشہ بچتاؤں کی آگ میں چلے رہے ہیں۔ رنگ آلود بھی اچھی تحریر تھی۔ محفل میں سب کے تہرے اچھے تھے۔ توصیف احمد کا تہرہ زبردست تھا۔ بشری افضل کے خوب صورت الفاظ پسند آئے۔ شعی محمد مزمل نے، اعجاز احمد رحیل بہت اچھے انسان ہیں اور شاعر بھی ہیں۔ رمضان پاشا اگلے حوصلہ رکھو ادارے والے ہمارے ساتھ زیادتی نہیں کرتے بس جگہ کی کمی آڑے آ جاتی ہے۔ مہرین ناز باجی مجھے آپ کی عمر پر جانے والی بات پر بہت خوشی ہوئی۔ محفل میں بھائی تفسیر مہاس، عادل خان اور حکیم رضا شاہ کی کمی محسوس ہوئی۔ (آپ کے والد کے انتقال پر افسوس ہوا)

عاطف شاہین، اڈاروتی سے شریک محفل ہیں۔ سسٹن اس بار ایک عجوبے کی طرح 19 تاریخ کو مل گیا، ورنہ ہمیں تو ایک مدت تک انتظار رہتا ہے۔ ایک نگاہ ہاشم گرل پر ڈالی اور یوں لگا کہ ڈاکٹر انکل نے خود کبھی سوچوں میں گن ہو کر اسے بنایا ہے۔ لگتا ہے کسی کے جگر میں تڑپ رہے ہیں جو ہر بار اداسی چھاتی ہوئی ہوتی ہے۔ جون ایلیا کا شعور پڑھا۔ جون ایلیا سارا دل تو آپ کے انتائی پرفراہ ہو جاتا ہے۔ شعور خدا کی ایک لازوال نعمت ہے۔ پھر ادارہ میں قدم رکھا تو یہاں لوڈ شیڈنگ کا وہ دن تازہ رہے ہیں جو شاید ہماری ساری زندگی وقت نزع تک ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آج کل آپ کا موڈ آف ہے خیر تو ہے؟ مہرین ناز واقعی آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ بلی کیشن کے رکن جناب انکمہ صدیقی کو اللہ تعالیٰ جنت میں اعلیٰ درجے عطا فرمائے۔ آمین۔ کہانیوں کی طرف آتے ہیں، سب سے پہلے طاہر جاوید صاحب کی پس زنداں پڑھی جس کے لیے انتظار کی گھڑیاں بہت مشکل سے گزاری تھیں، کیا کہنے ہیں طاہر صاحب! اس انداز سے کہانی پانے نیکی کو پہنچی، برسوں یاد رہے گی۔ ہادی تیری محبت کو سلام! ماروی کی طرف بڑھنے لگے تو پس زنداں نے دل کو ایسے جکڑا کہ پھر آزاد ہونا ہی نہیں چاہا پھر دھواں دار قسط بھی ماروی کی بھی۔

حور یہ علی ایڈیٹر مقدس، نورنگ سے چلی آ رہی ہیں۔ امتحانات کے باوجود ہم جون کا سسٹن لینا نہیں بولے اور ساتھ ساتھ خط لکھنا بھی یاد رہا۔ انتائی شعور کے حقائق سے اتفاق کرتے ہوئے محفل میں آئے۔ رضوان خونی کا تہرہ جامع تھا۔ مبارک باد قبول کریں۔ پس زنداں ختم ہوئی اور حجاب کی موت ہادی کے دل پر یادوں کے ظہور رقم کر گئی۔ ماروی میں قیدیوں کے ایک دوسرے کی جگہ لینے کا سلسلہ بھی جاری ہے اور شاید آگے بھی رہے گا۔ حساب دوستان میں اگلے حصے میں سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ رنگ آلود میں گھروں میں پیدا ہونے والے مسائل اور توحیدوں کی حقیقت بیان کی گئی۔ معمولی غلطی سے رشتے کیسے ٹوٹ جاتے ہیں، یہ بات آخری کہانی نظریہ حیات پڑھ کر پتا چلی۔ سید عبداللہ دینی بچپن سے ہی ولی اللہ ثابت ہوئے۔ خون کا رشتہ بھی خوب رہی۔ نسخہ بستی مسکراتی تحریر ثابت ہوئی۔ برف کے جذبے میں ڈاکٹر مین کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ دھچکا میں پیڑ کو خوب دھچکا لگا۔ محفل شعرو سخن بھی خوب رہی۔ ساتھ میں کتر نہیں بھی مزہ کر گئیں۔

ابراہیم وارث، سندیلانوالی سے تشریف لائے ہیں۔ سسٹن کا شمارہ جون اپنی آب و تاب کے ساتھ 18 تاریخ کو مل گیا۔ ہاشم گرل بہت پیارا تھا۔ جون ایلیا کی کو پڑھا جو کبھی دوسرے ہوئے مرد خیر کو سمجھو ڈر اور شعور پیدا کرنے کی پوری تک و دو میں مصروف تھے۔ اے کاش کہ انسان اپنے انسان ہونے کا ثبوت بھی دے۔ شعور سے بات لگتی ہے تو ایک عرض کرتا ہوں ہاتھ جوڑ کے کہ خدا ارا اپنی پہچان، اپنی آن بان، اپنی شان و شوکت کو نہ مٹائے۔ میں آپ سب قارئین سے خود بانہ گزارش کرتا ہوں کہ ہاشم گرل کو جھوک تو پچھتی رہتی ہے لیکن خدا کے واسطے شعر کے خستہ نہ

چلاؤ ایک دوسرے پر۔ سسٹن کی محفل میں ایک دوسرے سے محبت کی راہیں ہموار کرو۔ ہمارا ملک پہلے ہی بیرونی و اندرونی سازشوں میں گھرا ہوا ہے تم لوگ کیوں ڈائجسٹ کے توسط سے ایک دوسرے کے خلاف فلو پد و پیکٹر اچھلا رہے ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پس زنداں پڑھی۔ بہت افسردہ اور ٹھنکن کر گیا حجاب کا بچھڑنا۔ شاید سچ حقیقت ایسی ہی ہوتی ہے جسے قبول کرنا پڑتا ہے ہمارے تو وہم میں بھی نہیں تھا کہ حجاب مرجائے گی وہ بھی یوں 3 دن کے اندر اندر۔۔۔۔۔۔ میں بہت رویا شاید ہادی سے بھی زیادہ پس ایک بات کا سکون ہے کہ ہادی کو اس کی محبت مل تو گئی چاہے مختصر عرصے کے لیے ہی سہی۔ حجاب نے شرتی بیوی ہونے کا بھرپور ثبوت دیا۔ پلیز طاہر جاوید جی ستاروں پر کندہ میں ہیر و کن شادی شدہ نہیں ہونی چاہیے۔ پس زنداں کا اختتام بہت جلدی میں ہو گیا ہے یہ افسوس رہے گا۔ ستاروں پر کندہ کی پرودہ و پیکٹر پلیز ٹائٹل بھی جولائی کا ستاروں پر کندہ والا دیں۔ جو سسٹن میں پس زنداں کے آخر میں شائع ہوا تھا۔ ماروی بھی زبردست رہی۔ خود کو بچاتے بچاتے ماروی کو ماس پلٹی گئی، عاشق ہمارے اپنی اپنی جگہ ہاتھ پاؤں مار تو رہے ہیں لیکن ہاتھ کچھ نہیں آ رہا۔ مرید کے ساتھ بہت اچھا ہوا۔ نشور ہادی کی نظریہ حیات بالکل نکھاس گئی Sorry نشور ہادی جی یہ کیا بات ہے کہ بہن بھائی بھی سمجھتے ہیں خود کو اور صرف زیر جامہ میں حیران کی نکھائی جا رہی ہے۔ کہیں بھی شراب کی تباہ کاری نہیں دکھائی گئی حالانکہ جی نے تنہی بار لی۔

✽ صوبہ اقبال، راولپنڈی سے تھرہ کر رہی ہیں "جون کا سسٹن مقررہ وقت پر ہی مل گیا۔ سرورق کی حسینہ کو دیکھ کر ڈاکٹر اکل کے شہکاری تعریف کی۔ انٹرایٹ شعور کا لفظ لفظ حقیقت آشکار کرتا نظر آیا۔ مخطوط کی محفل کا جوش و جذبہ ڈراما تھا لگا۔ پس زنداں کا ایک خوب صورت اختتام ہوا۔ حجاب کا انجام ہمیں بھی رلا گیا۔ ماروی بھی بس صفحات پورا کرنے کی ذمہ داری نبھا رہی ہے۔ نظریہ حیات عادل اور جی کی فلفلی کے گرد گھومتی تحریر پسند آئی۔ سید عبداللہ و ق کے واقعات نے ایمان کی پتلی میں اضافہ کیا۔ حساب دوستان میں پولس اور لیٹ کے درمیان رسائی ابھی جاری ہے۔ رنگ آلود میں معاشرے کی ایک تلخ حقیقت سامنے آئی کہ تھوڑے گنڈے ہمیشہ بادی لاتے ہیں۔ خون کا رشتہ میں اسٹینورڈ کی کوششیں رنگ لائیں۔ برف کے جذبے میں آخر کا ہیرو کی کشش کا راز کھل ہی گیا۔ دھچکا میں کیرولین نے چور کے ساتھ خوب ہاتھ کھیلے۔ نیکی برباد، موڑ اور نیو بھی ٹھیک رہیں۔ اشعار کی محفل میں سب انتہا بات اچھے لگے۔ مگر مٹی محرز کا انتخاب بہت اچھا لگا۔"

✽ محمد صفدر محاورہ، خانیوال سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں "بہت ہی خوب صورت اور اسٹائش ماڈل کے ساتھ ایک جگہ باا سرورق کو خوب صورت بناتے نظر آئے، چپ لگا کر انٹرایٹ میں آئے تو جون ایلیا شور سکھاتے نظر آئے بہت ہی جیتی باتیں تھیں لیکن ہمارے محل و ہم سے کہیں بڑھ کر۔ مانو کچھ سمجھ آئی تو کچھ نہ آئی۔ آپ کا ادارہ پڑھا آپ حکمرانوں کی کارکردگی جو کہ مفر ہے بتاتے نظر آئے ایک ہی جملہ جی جی جی عوام دیے حکمران۔ دسم احمد خانیوال سے ویکم گھبرانائش میرا یہ گیارہواں خط ہے دو شائع 8 ایک لٹ ہوئے پھر بھی ہمت مردان مدد خدا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پس زنداں پڑھی، بہت ہی دھکی کر گئی۔ طاہر جاوید مخطوط کا کیا جاتا اگر ان دونوں کو ملایا تھا تو حجاب کے ساتھ ہادی کو کچھ سال رہنے دیے۔ ستاروں پر کندہ طاہر جاوید صاحب کی اگلی کہانی بھی امید کرتے ہیں، جیٹ ہوگی۔ پھر ماروی پڑھی ہر قسط دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی جا رہی ہے۔ حساب دوستان ایسا سیتا پوری بہت ہی زبردست کہانی ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ برف کے جذبے شیری آخر کار بھرم تک پہنچ ہی گئی۔ رنگ آلود میں ملک صاحب نے مجرم تک پہنچ کر بھی کسی کی پردہ پوشی کا معاہدہ کر لیا، گریٹ ملک صاحب۔ محفل شعرو سخن میں سارے اشعار ہی جیٹ تھے۔ سید عبداللہ و ق کے بارے میں پڑھنے کو ملا اللہ کے نیک لوگوں کے بارے میں جان کر اور پڑھ کر دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ نظریہ حیات، نشور ہادی کے قلم سے لکھی گئی ایک منفرد تحریر تھی۔ جی کوک کا زہر کھائے۔ اپنی خوب صورت زندگی کو خود ہی ٹھوکر مار دی۔ نیکی برباد، دھچکا، خون کا رشتہ اور باقی کہانیاں ابھی تھیں نتیجہ کہ جون کا شمار جیٹ رہا۔" (بہت شکریہ)

✽ ناو رسپال، سینٹرل جیل میانوالی سے محفل کی زینت بنے ہیں "چار سسٹن ڈائجسٹ مجھے 17 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے مخطوط پر نظر ماری لیکن افسوس کا منہ دیکھنے کو ملا۔ اس بار پھر میرا خط روٹی کی ٹوکری میں پیچیک دیا گیا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور پھر قلم اٹھالیا (اچھا کیا) کہانی ماروی ابھی جا رہی ہے۔ مرید کو ماروی مل گئی وہ اب اسے جام تھارو میں قید رکھے گی۔ ادھر محبوب صاحب جیل میں سڑ رہا ہے بالکل میری طرح جی الدین نواب صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ ہمیں اتنی خوب صورت کہانی پڑھنے کو دے رہے ہو۔ پس زنداں یہ کہانی میں جب بھی پڑھا ہوں پتا نہیں میں اس کیوں ہو جاتا ہوں۔ اس کہانی میں کچھ اپنا سا لگتا ہے۔ بہر حال بہت اچھی جا رہی ہے۔ اشوک کمار کا تبصرہ پڑھا بہت ہی اچھا لگتا لیکن بھائی جان پڑھائی پر بھی دھیان دینا۔ ایلیا جی آپ بھی بہت اچھا لگتی ہو۔ زویا اعجاز جی آپ نے ٹھیک فرمایا حیران پکارنے والی ہمارا دل دکھایا۔ حیران اعلیٰ معراج رسول صاحب جی آپ تو کم از کم ہمارا خیال کیا کریں، ہم سسٹن کے ذریعے تو جیل میں جی رہے ہیں۔ دوستوں کے پیٹھے پیٹے الفاظ پڑھ کر۔ (اب تو آپ کا خط شائع ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ خوش) محفل شعرو سخن میں، مس زریں نواز، مہرین ناز، ایلیا، کرانہ، شیش اور زہد چوہدری کے اشعار اچھے لگے۔"

✽ زاہد احمد خان داد، ناگن چورنگی، کراچی سے تشریف لائے ہیں "ایک بہت ہی طویل رفاقت ہے میری سسٹن سے محفل کے تمام دوستوں، ہاں سے بننے والے دوستوں کو آداب۔ ٹائٹل پر نظر گئی تو ہائے اک پرانا نظم گہرا ہو گیا وہ ایسی ہی تھی۔ خیر چھوڑیں میں بھی کیا قصے لے بیٹھا۔ ٹائٹل سے فوراً نظریں ہٹا کر اپنے پیارے محبوب سلسلے پس زنداں میں داخل ہوئے جس میں محفل صاحب محبت کرنے والوں کے دل کی دھڑکنوں کو زبردست کرتے

اور لاتے ہوئے نظر آئے، ہم تو بڑے طرم خان اور پتھر دل سمجھتے تھے اپنے آپ کو، محفل صاحب نے تو سب کچھ جس جس کر دیا۔ ہادی از دی مگر سب کچھ لیا کر اور قدم قدم پر قربانیاں دے کر اس نے کوئی صلہ نہ چاہا۔ سید عبداللہ و ق رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے ایمان افروز واقعات پڑھے، جس سے روح کو تازگی ملی۔ بے شک اولیا کرام نے اپنی زندگیوں عام عوام اور رشد و ہدایات کے لیے وقف کی ہوئی تھیں۔ حساب دوستان کرنے کے لیے پیٹھے بے شک لیٹ ذاتی اور گناہ گار رہے لیکن حنان کے سلسلے میں وہ حق پر ہے۔ ماروی میں بھی محبوب صاحب نے حد کر دی اس قدر دیوانے ہو رہے ہیں ماروی کے عشق میں۔ رنگ آلود میں ملک صاحب نے بہت قلم و دہر سے کام لیا۔ اگر کوئی عام قاری تھو تو بے چارے شاکر کو جو کہ کچھ نفسیاتی مریض بھی تھا کو قلم کی بجلی میں جیس دیتا۔ برف کے جذبے کچھ ایسے تھے، ڈاکٹر مین نے ہیروں کے لالچ میں کئی قتل کرادیے۔ دھچکا میں بیٹری جیسے چوروں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے۔ نیکی برباد میں ایس کی واقعی ساری نیکیاں برباد ہو گئیں۔ خون کا رشتہ میں اسٹینورڈ جیکسن اسٹینورڈ کا بیٹا نہیں تھا لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ماں کا بھی بیٹا نہ ہو۔ مگر امام صاحب خوب لٹولائے، لگتا ہے کلینک میں بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ موڑ کا نام دراصل بھوک ہونا چاہیے تھا کیونکہ دامور پاڑے جیسے لوگوں کا پیدا ہونے کے بعد مرنے تک ایک ہی فضل شوق اور ضرورت کھانا اور صرف کھانا ہوتا ہے۔ نظریہ حیات بھی مناسب ہی تھی جی سے ایسی غیر معاد جی اور غیر تدریجی کی توقع نہیں تھی ہم تو ان کو مظلوم سمجھ رہے تھے کہ ان کی ازدواجی زندگی ان کے شوہر اور ان کی بہن نے تباہ کر دی وہ تو پوری کہانی پڑھ کے پتا چلا کہ بے چارے عادل اور مصوم نجم کو بہن بھائی بننے کی سزا ملی ہے۔ کٹر نہیں اس بار کم ہیں۔ پولٹری فارم کے چوروں کا لطفہ پسند آیا۔ اشعار بھی مناسب اور معیاری تھے۔ اس کے بعد جون ایلیا مرحوم انتائیہ میں اپنی قوم کا شعور بیدار کرتے ہوئے نظر آئے۔ مرحوم کے دل میں قوم کا بہت درد تھا اور محبت تھی، بہر حال آپ کے انتائیہ اب بھی ہر ماہ اپنی قوم کی اصلاح کرتے رہیں گے۔ ادارہ بھی کافی جائداد اور اچھا تھا۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے۔"

✽ ایم افضل کھرل، گاؤں عظیم والا سے تشریف لائے ہیں "اس بار سرورق بہت دلکش تھا۔ کم مرماؤں کی گہری سوچ میں مگن تھی۔ انتائیہ جون ایلیا کی تحریر نے دل موہ لیا۔ مخطوط کی محفل میں داخل ہوا۔ روشنی رشید بڑی مدت بعد نظر آئی ہے، ویکم۔ اپنا شہر دیکھ کر مر جھپٹا ہوا، قلب خوشیوں کی تاب نہ لا سکا۔ ہمارا تبصرہ نہ تین میں تھا نہ تیرہ میں۔ آغاز پس زنداں سے کیا۔ ہادی کی بے لوث محبت کو سلیوٹ کرتا ہوں، حجاب کی موت کا بیان پڑھ کر اٹھ آنکھوں سے رواں ہو گئے، آخری صفحات پر نشور ہادی کی کہانی نظریہ حیات نے بہت متاثر کیا۔ شک کی بنیاد بھی انسان کس کس چور ہے پلا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ عادل نیمر کو اپنی بہن سمجھتا رہا اور جی کی اور نظر سے دیکھتی رہی۔ محفل شعرو سخن میں محمد صفدر محاورہ، طالب حسین، طلحہ، جبران احمد اور بابا ایمان کا انتخاب اچھا لگا۔ سعد بن یحییٰ آپ کی بہت زیادہ کی محسوس ہو رہی ہے۔"

✽ نا صر و میو، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہیں "اپنے پیارے سسٹن کو پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں۔ قندادل نہ توڑے گا۔ میں ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا میں تقریباً 8 ماہ سے بے گناہ قید و بند کی سختیاں بھگت رہا ہوں۔ جیل میں قید کے دوران ہی سسٹن ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا، ہر بار سسٹن کو منفرد پایا کبھی یکسانیت کا فکا نہیں ہوئے۔ مخطوط کی محفل میں خاص طور پر بلیک کیٹ کو میرا سلام دینا۔ جون کا سسٹن 17 تاریخ کو اپنے احاطہ کے حوالدار (ہیڈ وارڈر) سے وصول کیا۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مخطوط کے قلم سے لکھی پس زنداں کی آخری قسط پڑھی۔ پڑھ کر افسوس ہوا کہ ہادی کو حجاب ملی بھی تو بستر مرگ پر۔ دوسری طرف جلال کا ادم سے ٹھکرا ہوا۔ واقعی خدا کی لاشی بے آواز ہے۔ ماروی کہانی پڑھی، ماروی کا مراد کے ہاتھ لگتا۔ ماروی کا اسپتال پہنچنا۔ جیل میں محبوب چائو کو ماروی کی اسپتال میں موجودگی کا پتا چلتا۔ دوسری طرف مراد کا جیل واپس جانا اور چائو یو کی رہائی۔ جیل پیر شینڈل کی آنکھوں میں دھول جھونک دینا اچھا لگا۔"

✽ زویا اعجاز، لاہور سے جلی آرہی ہیں "سال رواں کا چھٹا شمارہ 17 مئی کی شام اس وقت موصول ہوا جب مئی کے شمارے کا مطالعہ سے ہم ابھی فارغ ہوئے ہی تھے۔ حسینہ سسٹن کی خاموش و متورم آنکھیں اور ساکت لب کسی ایسے سمندر کا پتا دے رہے تھے جس کی گہرائی میں ان گنت طوفان موجزن ہوں۔ جون ایلیا اس مرتبہ انسانیت و آدمیت سے نالاں نظر آئے۔ ادارہ بہترین تھا۔ بابا ایمان جی ادیکم بلیک اور فکرائٹ ڈیٹر۔ اب ذکر ہو جائے پس زنداں کا جس کا اختتام ہماری توقعات کے متن مطابق ہوا۔ ذہنی آزادی کے باوجود حجاب کی موت نے بے حد ملول کیا اس کے آخری لمحات نے آنکھیں بے اختیار نم کر دیں۔ محفل اعظم! آپ کا جواب نہیں۔ نظریہ حیات اوسط سے بھی ٹھپے در بے کی تحریر ثابت ہوئی۔ پلاٹ موضوع کردار نگاری کسی نے بھی متاثر نہیں کیا۔ ملک صفدر حیات اس بار کافی نازک و صحت کے کیس سے نبرد آزما نظر آئے۔ ویسے قسمت کہیں یا سلسل اتفاق ان کی ہر پوسٹنگ میں انہیں ایک فرض شناس ماتحت ضرور میسر آتا ہے۔ نواب صاحب جس قسم کے حسن و عشق کی داستان بیان فرما رہے ہیں اسے ایکسپاز ہوئے کئی دہائیاں بیت چکی ہیں۔ کاشت زہر نے چھلپائی گریوں میں برف زاروں کی خوب سیر کروائی۔ شاعر ارکائی رہی۔ مگر امام نے ازدواجیات کی اصلاح کے لیے بہت زبردست نسخہ بیان کیا۔ نیکی برباد اور دھچکا بھی خوب تھیں۔ سید عبداللہ و ق کے بعد اب شاہ ولی اللہ کے حالات پڑھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ حساب دوستان سے اگلے ماہ حساب کتاب کرنے کا ارادہ ہے۔ محفل شعرو سخن میں راجہ اختر علی اور حافظ گل محمد کا انتخاب بہت خوب صورت تھا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔ محمد جاوید علی پور۔ محمد اسحاق انجم، بنگن پور، قصور۔ عبدالغفور خان ساغری، عجب، محبوب خلیف، تھیرہاس بابر، اوکاڑہ۔ رانا محمد فہیم، ملتان۔ ایلیا، کراچی۔ خزانہ وقار، ملتان۔ ہارون رشید، مردان۔ اللہ نواز افغانی، کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ صاحبہ کوثر شادیہ کوکر، میانوالی۔ ماریہ قادی، جمن۔ اشفاق شاہین، کراچی۔ مظہر سلیم، رحیم یار خان۔

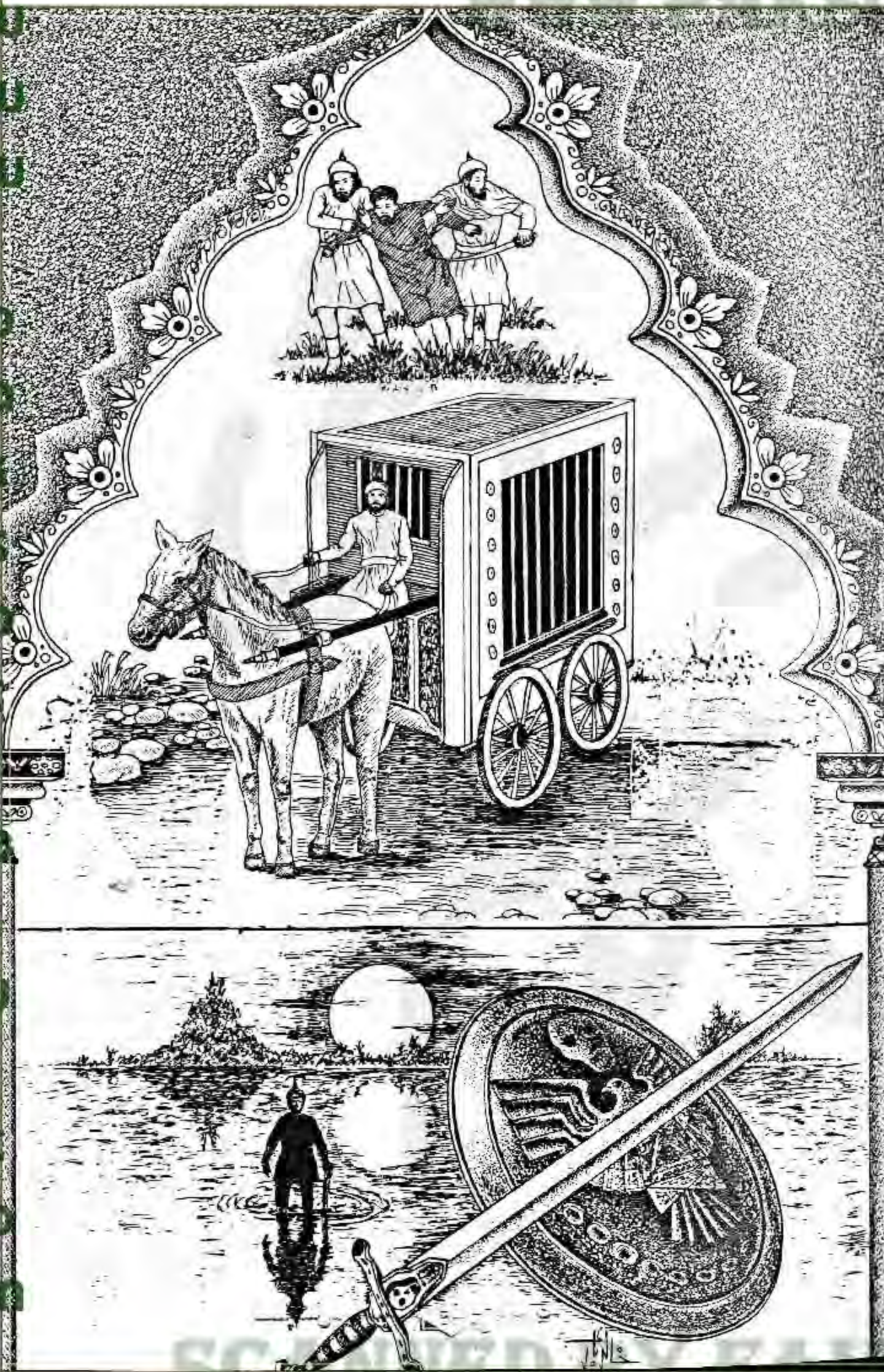
ایسا سیتا پوری دوسرا اور آخری حصہ

حساب دوستوں کا ہوا دشمنوں کا... میزان کھری ہو تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتے دیر نہیں لگتی... اور اگر یہ حساب کتاب وقت کے ہاتھوں میں آجائے تو لمحوں کا شمار جذبات و احساسات اور حیرت انگیز واقعات کے حصار میں قید کر کے ہر پل کی پڑتال ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ یہی جانچ پڑتال تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ ہر دور کی حقیقت ہے کہ جب تک یہ وقوف زندہ ہیں عقلمندوں کا کاروبار چمکتا رہے گا... اس کی سادہ لوحی اور یہ شمار دولت بھی اس کے لیے وبال بن گئی تھی۔ ایسے میں اگر کوئی ہمدم، کوئی غمگسار بھی ساتھ نہ ہو تو شعور کے تمام دروازوں پر قفل لگ جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس کسی سلطنت کی بادشاہت نہ تھی... نہ دربار میں دریادلی کی مثالیں تھیں... اس کے باوجود ایک دنیا اس کے پیچھے تھی اور وہ محو سفر تھا... مگر اسے شاید یہ انداز ہی نہ تھا کہ سفر میں اگر زاد سفر ساتھ نہ ہو تو ہوائیں بھی مخالف ہو جاتی ہیں۔ جنگ کوئی بھی ہو تدبیروں سے لڑی جاتی ہے، طاقت اور دولت کے بل پر تو حکمرانی کی جاتی ہے... لیکن اس کی سادہ لوحی اسے ہر موڑ پر زندگی کا ایک الگ ہی رخ دکھاتی رہی اور وہ سمجھوتوں کے ہجوم میں خود کو ڈھونڈتا رہا... اس بار تاریخ ایک اور ہی انداز میں اوراق پلٹ رہی تھی۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

قاضی نے پھر منہ بنایا۔ "میرا بیٹا یوں؟ کون میرا بیٹا؟" یوں ان دونوں کو ٹھس ٹھس کرتے دیکھ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ قاضی نے کن انہیوں سے یوں کو دیکھا اور لیٹ سے پوچھا۔ "جشن طرب کے آغاز میں کیا دیر ہے؟" لیٹ نے جواب دیا۔ "جناب! اس محفل کا پہلے میں نہیں، یوں ہے۔ وہی اس کا جواب دے سکتا ہے۔" قاضی نے لائق سے کہا۔ "بہر حال میں گانا تو سن لوں گا لیکن کھانے پینے میں نہیں شریک ہوں گا۔" محفل کے دوسرے شرکاء قاضی کے احترام میں بے تکلف نہیں ہو سکتے تھے اس لیے انہیں قاضی کی موجودگی گراں گزر رہی تھی۔ خود یوں اس لیے پریشان تھا کہ وہ اپنے معزز باپ کی موجودگی میں میزبانی کے فرائض شاندار طریقے سے انجام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ خود بھی گانا چاہتا تھا محض اس لیے کہ وہ اس سے عنان کا دل جیت لے مگر باپ کی موجودگی میں وہ گانا بھی نہیں سکتا تھا۔

لیٹ نے قاضی لبیب بخدی کا شاندار استقبال کیا اور اس کے ساتھ ساتھ چل کر سب سے بہتر جگہ پر بٹھا کر خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔ محفل کے دوسرے مہمان بھی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ قاضی نے محفل کا طائرانہ جائزہ لیا اور شراب اور آلات شراب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "لیٹ! میں یہاں آ تو گیا ہوں لیکن یہ سب کیا ہے؟ جشن طرب یا جشن ناؤ نوش؟" لیٹ نے جواب دیا۔ "دونوں ہی، جشن طرب بھی اور جشن ناؤ نوش بھی۔" قاضی نے منہ بنا کر کہا۔ "استغفر اللہ... تجھے اپنی ماں کی صحت یابی کے شکرانے میں خدا کو یاد کرنا چاہیے تھا۔ میں یہاں آ تو گیا ہوں لیکن جلدی ہی واپس چلا جاؤں گا۔" لیٹ نے آہستہ سے عرض کیا۔ "جناب! میں نے آپ کو جس لیے زحمت دی ہے، آپ واقف ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس جشن کا پہلے میں نہیں آپ کا بیٹا یوں ہے۔"



یونس کچھ دیر تک تو ان کے پاس کھڑا رہا، اس کے بعد وہ عتبان کی ماں کے پاس چلا گیا اور بڑی مایوسی سے کہا: ”ماں! میرے خلاف زبردست سازش کی گئی ہے۔“

عتبان کی ماں قاضی سے بہت متاثر اور مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے کہا: ”یونس! تو خوش قسمت ہے جو تیرا باپ بھی اس جشن میں شریک ہے جس میں تیرے اور عتبان کے رشتے کا اعلان ہونے والا ہے۔ میرا خیال ہے، تیرا باپ اس اعلان سے بہت خوش ہوگا اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ اپنا عاق نامہ واپس لے لے اور تجھے پھر سے اپنا بیٹا بنالے۔“

دوسری طرف لیف قاضی کی خوشامد کر رہا تھا کہ وہ اس جشن میں شروع سے آخر تک موجود رہے لیکن قاضی زیادہ وقت دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ لوگوں کے بے مبرے اور نذیدے پن پر حیران تھا۔ ہر شخص بلا لوشی میں لگا ہوا تھا۔ کافی دیر بعد جب جوش و خروش کم ہوا تو جشن طرب کے آغاز کا اعلان کر دیا گیا۔ پہلی گانے والی ایک نو عمر لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی آواز میں رس ضرور تھا لیکن کلام کمزور تھا۔ قاضی نے تبصرہ کیا: ”ذرا سی رہنمائی اسے بام عروج تک لے جاسکتی ہے۔“ محفل وجد میں آئی ہوئی تھی۔ لیف، قاضی کے قدموں میں بیٹھا ادب و احترام اور فرماں برداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ قاضی اس سے خوش ہو گیا تھا۔ قاضی کے مصاحبین، قاضی کے آس پاس کھڑے تھے۔

قاضی نے لیف سے پوچھا: ”کیا اس خاتون سے تو واقف ہے؟“

لیف نے جواب دیا: ”بدقسمتی سے یہی میری سوتیلی ماں ہے۔“

دوسری طرف عتبان کی ماں اعلان کر رہی تھی۔ ”حضرات! اس خوشی کے موقع پر میں یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہی ہوں کہ قاضی لیبب بخدی کا بیٹا یونس عنقریب میری فرزندگی میں آنے والا ہے اور میں نے اپنی بیٹی عتبان کو اس سے منسوب کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا: ”یونس کا باپ قاضی لیبب بخدی اسی محفل میں موجود ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ اس اعلان سے خوشی محسوس کر رہا ہوگا۔“

قاضی فوراً اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اعلان کیا۔ ”حضرات! جیسا کہ تاجر حمدون مغیث کی بیوہ نے اعلان کیا کہ قاضی لیبب بخدی اس محفل میں موجود ہے، یہ درست ہے لیکن یہ غلط ہے کہ یونس میرا بیٹا ہے اور میں اس اعلان سے خوش ہو رہا ہوں گا۔“

یونس کے پورے جسم میں آتش سیال دوڑنے لگی۔ وہ دور ہی سے چیخا: ”باوا جان! اپنی بکواس بند کرو۔“

قاضی نے مزید کہا: ”میں یونس کو عاق کر چکا ہوں اور میں اس کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ یہ اپنے مکرو فریب میں اپنے ساتھ میرا نام لیتا پھرے۔ کبھی میں اس کا باپ تھا لیکن اب نہیں ہوں کیونکہ میں نے اسے عاق کر دیا ہے۔“

یونس غصے میں باپ کی طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ لیف اور قاضی اس کا ارادہ بھانپ چکے تھے۔ قاضی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

”اس مردود کو سنبھالنا۔“

قاضی کے آدمیوں نے یونس کو راستے ہی میں روک لیا۔ یونس نے ان پر بھی وار کیا۔ وہ خنجر چلا رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ ”میں اس جھگڑے ہی کو ختم کر دوں گا۔ میں قاضی، اپنے باپ اور لیف دونوں ہی کو مار دوں گا۔“

لیکن قاضی کے طاقت ور آدمیوں نے بڑی ہوشیاری سے یونس کو اپنے قابو میں کر لیا۔ یونس بدستور چیخ رہا تھا۔ ”مجھے چھوڑ دو، میں ہر اس شخص کو مار دوں گا جو میری راہ میں حائل ہوگا۔“

محفل درہم برہم ہو گئی۔ لوگ یونس کی طرف دوڑے لیکن قاضی نے ان سب کو دور رہنے کا حکم دے دیا۔

”حضرات! آپ لوگ دور رہیں کیونکہ یہ معاملہ آپ سے تعلق نہیں رکھتا۔ آپ لوگ یونس کو نہیں جانتے لیکن میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ بدطینت، ناخلف، تالائق، گستاخ اپنی انہی حرکتوں کی وجہ سے عاق کیا گیا تھا۔ میں آج اس جشن میں ہرگز نہ آتا اگر مجھے یہ نہ بتایا گیا ہوتا کہ یونس میرے نام کو اپنے مفاد کے لیے اب بھی استعمال کر رہا ہے۔ مجھے حیرت تو تاجر حمدون مغیث کی بیوہ پر ہے کہ جب اس کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ میں، یونس کا باپ بغداد ہی میں موجود ہوں تو اپنی بیٹی کے رشتے کی منظوری یا اطلاع مجھ سے کیوں.....“

یونس برابر اچھل کود رہا تھا۔ اس کا ایک ہی نعرہ تھا: ”مجھے چھوڑ دو، میں ان دونوں کو قتل کر دوں گا۔“

قاضی نے لیف سے کہا: ”تو کس بات کا شکر ہے، محفل برخاست کیوں نہیں کرتا؟“

لیف نے اعلان کر دیا: ”حضرات! اب محفل طرب اپنے اختتام کو پہنچی اس لیے شب بخیر کہتا ہوں۔“

محفل بہت بری طرح، بڑی بدعز کی سے درہم برہم ہو گئی۔ قاضی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا: ”یونس کو اپنے

ساتھ لے جاؤ۔ گو کہ اس نے کسی کو زخمی یا قتل نہیں کیا لیکن اس کی نیت بھی تھی۔ اس پر مقدمہ چلے گا اور یہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔“

یونس پھر چیخا: ”میں نہیں جاؤں گا، مجھ پر مقدمہ نہیں چلے گا۔“

لیکن قاضی کے آدمیوں نے اسے باندھ دیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ قاضی نے لیف سے کہا: ”نو جوان! ذرا اپنی سوتیلی ماں سے میری بات تو کرواؤ۔ میں بھی تو اس سے پوچھوں کہ وہ یہ کیسی فاش غلطی کر رہی تھی۔“

لیف اپنی سوتیلی ماں کے پاس گیا اور اسے مطلع کیا: ”قاضی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

ماں نے افسردگی سے جواب دیا: ”بلا، دیکھتی ہوں وہ کیا بات کرتا ہے۔“

لیف، قاضی کو ماں کے قریب لے گیا۔ قاضی نے ایک بار پھر بیوہ کو بڑے غور سے دیکھا۔ قاضی نے کہا: ”حمدون کی بیوہ! کیا میں تجھ سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تجھ کو یہ ناکارہ اور آوارہ نو جوان کیوں پسند آیا؟“

ماں نے جواب دیا: ”میں نے اس کو اس کے شجرۂ نسب سے پہچانا تھا۔“

قاضی نے کہا: ”خاتون! یہ میں پورے وثوق اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تو یونس کو اپنا داماد بنالے گی تو تیری جائیداد اور مال و زر کا حساب کتاب بہت جلد برابر ہو جائے گا۔ میں تیری ہمدردی میں آ گیا۔“

لیکن عتبان کی ماں یونس کو برا سمجھنے پر بالکل تیار نہیں تھی، بولی: ”اس نے میری بیماری میں بڑی حیران داری کی تھی اور عضد الدولہ کے طبیب خاص سے میرا علاج کروایا تھا۔ کیا خلوص اور محبت کی کوئی قیمت نہیں؟“

قاضی نے جواب دیا: ”خاتون! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ خلوص اور محبت اس کے پاس تھی ہی کب؟ آپ اس کو مجھ سے زیادہ تو نہیں جانتیں؟“

اب ماں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ قاضی سے کہا: ”اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔“

قاضی نے جواب دیا: ”بے شک، میں آپ کے پاس واپس جانے ہی کے لیے آیا تھا۔ اللہ نے چاہا تو پھر کسی وقت آپ سے ملوں گا اور اس آوارہ اور لپے لپٹے کی بابت بہت ساری باتیں کروں گا۔“ چلتے چلتے لیف سے کہا: ”نو جوان! میرے پاس آنا ضرور، ایک کام ہے تجھ سے۔“

اب قاضی بھی چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی عتبان، خنسا اور لیف نے ماں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان میں ہر کوئی خوش تھا لیکن خود ماں بہت اداس تھی۔

خنسائے کہا: ”برے کام کا برا انجام۔“

ماں نے ڈانٹا: ”چپ رہ، اپنی زبان بند رکھ۔“

لیف نے عتبان کی خاطر خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

یونس قید خانے میں جذباتی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ وہ اپنے ہی بالوں کو نوچنے لگا۔ وہ اپنے باپ قاضی اور لیف کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ پھرے داروں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے جذباتی طوفان کا مقابلہ کرتے۔ انہوں نے قاضی کو اس کی خطرناک صورت حال سے مطلع کیا۔ قاضی نے حکم دیا کہ اسے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ حکم پر فوری عمل ہوا اور یونس کو زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ کئی دن بعد اس کا مقدمہ قاضی کے روبرو پیش ہوا۔ باپ نے بیٹے کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھا، دل پر کچھ اثر ہوا مگر اسے فوراً ہی اپنے باوقار منصب کا احساس ہوا اور اس نے سختی سے سوال کیا: ”اے بدترین انسان! اگر اس رات تیرا بس چل جاتا تو تو کیا کرتا؟“

یونس کا چہرہ سو جا ہوا تھا۔ اس نے بے باکی سے جواب دیا: ”میں تیرے ساتھ لیف کو بھی ہلاک کر دیتا۔“

قاضی نے کہا: ”لیف کے ساتھ ہی مجھے بھی..... کیا میں حیرا باپ نہیں ہوں؟ کیا تو نے اپنی زندگی کے بدترین گناہ کا ارادہ نہیں کیا تھا؟ کیا اپنے باپ کو ہلاک کر کے تو جہنم میں اپنا ٹھکانا نہ بنا لیتا؟“

یونس نے جواب دیا: ”تو نے مجھے عاق کر کے اس مقدس رشتے کو پہلے ہی ختم کر دیا ہے۔ اب میں جب بھی تجھے قتل کروں گا تو اپنے باپ کو نہیں بلکہ قاضی لیبب بخدی نامی ایک شخص کو قتل کروں گا۔“

قاضی نے حکم دیا کہ لیف کو بھی حاضر کیا جائے۔

لیف پہلے ہی سے آیا بیٹھا تھا وہ فوراً ہی حاضر کر دیا گیا۔ یونس اور لیف کی نظریں جو ملیں تو دونوں پر اس کا متضاد اثر ہوا۔ یونس کو اشتعال کا دورہ پڑا اور اس نے لیف کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا لیکن لیف کو اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ یونس کا زخمی سر، سو جا ہوا چہرہ، متورم آنکھیں، خفقانی حالت، ان تمام کیفیات نے لیف کے دل کو مسمول ڈالا۔

قاضی نے لیف سے کہا: ”نو جوان! یونس اپنے ارادے کا اقرار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر اس رات میرا بس چلتا تو میں تم

دونوں کو ہلاک کر دیتا، تو اس اقرار پر مجرم کو مزادینے کے حق میں ہے یا کچھ لے دے کر معاف کر دینے کے حق میں؟“

لیفٹ نے جواب دیا۔ ”جناب محترم! میں قاضی نہیں ہوں اور نہیں جانتا کہ فقہ کسی ایسے شخص کو مجرم مانتی بھی ہے یا نہیں، جس نے جرم کا ارادہ تو کیا ہو لیکن اس کا کب نہ کیا ہو۔“

قاضی اس خلاف توقع جواب پر چونک گیا، بولا۔ ”میں تجھ سے جو سوال کر رہا ہوں تو بس اس کا جواب دے دے۔“

فقہ کیا کہتی ہے اور کیا نہیں کہتی، یہ میرا دوسرا ہے۔ تو تو مجھے یہ بتا کہ اسے سزا دینا پسند کرے گا، معاف کر دے گا؟“

لیفٹ نے جواب دیا۔ ”مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے۔ میں فوراً ہی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

قاضی نے کچھ سوچ کر یونس کو دوبارہ قید خانے بھیج دیا اور بعد میں لیفٹ کی بڑی دلجوئی کی اور کہا کہ ”تیرا باپ میرا دوست تھا۔ اگر درمیان میں یونس نہ آ جاتا تو میں تجھ سے ملنے آتا یا تجھے اپنے پاس بلوا لیتا۔“

قاضی کی طرف سے یہ انکشاف بڑا حیرانہ تھا، پھر بھی قاضی... کی دل جوئی سے بڑی ڈھارس بندھی، بولا۔ ”اگر آپ واقعی میرے والد مرحوم کے دوستوں میں سے ہیں تو آپ اب بھی میری مدد کر سکتے ہیں۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

لیفٹ نے جواب دیا۔ ”وہ اس طرح کہ آپ میرے بزرگ کا کردار ادا کریں اور میری سوتیلی ماں سے دوبارہ ملیں اور اس پر یہ دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنی بیٹی عتآن کی شادی مجھ سے کر دیں۔“

قاضی نے خوشی کو چھپانے کی کوشش کی، بولا۔ ”یہ کون سا مشکل کام ہے۔ تیرا یہ کام میں ضرور کروں گا اور آج کے تیسرے دن تیری حویلی پر آ رہا ہوں، بس اسی دن تیری یہ بات ہو جائے گی تو فکر نہ کر۔“

اس دن قاضی نے کھانا لیفٹ ہی کے ساتھ کھایا۔

لیفٹ واپسی میں سیدھا یونس کے پاس قید خانے پہنچا اور پہرے داروں سے کہا۔ ”میں یونس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

پہرے داروں نے منع کیا مگر جب ان کی پھٹی پر دینار آئے تو انہوں نے لیفٹ کی ملاقات یونس سے کرا دی۔ یونس اسے دیکھتے ہی اس پر جھپٹ پڑا مگر لیفٹ کے نرم رویے اور مہرے لنگھنے سے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور وہ بہت دل گرفتہ انداز میں بولا۔ جتنا ابھرنے اور نکلنے کی کوشش کرتا ہوں، دھنسا چلا جا رہا ہوں۔“

لیفٹ نے کہا۔ ”تجھے خوش حالی اور عزت کی زندگی

اب بھی مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے تجھے مجھ سے ایک معاہدہ کرنا پڑے گا۔“

یونس نے حسرت سے پوچھا۔ ”اگر یہ دونوں چیزیں مجھے مل جائیں تو بتاؤ معاہدہ کیا ہے۔“

لیفٹ نے رک رک کر کہا۔ ”میں تیرے باپ سے کہہ کر تجھے رہا کر دوں گا۔ میں تجھے اپنے مال سے بھی کچھ دے دوں گا اور اتنا کچھ دے دوں گا کہ تو باعزت زندگی بسر کر سکے گا اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ میں تجھے اپنے کاروبار میں بھی شریک کر لوں لیکن یہ ساری باتیں اسی وقت ممکن ہوں گی جب تو میرے حق میں عتآن سے دست بردار ہو جائے گا۔“

یونس اس طرح چونکا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ کر جاگ پڑا ہو، بولا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟“

لیفٹ نے کہا۔ ”نہی وہ بات ہے جس نے ہم دونوں کو الگ کر دیا ہے۔ اگر تو چالاکی سے عتآن پر قبضہ جمانے کی کوشش نہ کرتا تو میں بھی تیرے خلاف نہ ہوتا اور یہ عین ممکن تھا کہ میں اپنے مال و زر سے تیرا حصہ تیرے حوالے کر دیتا۔“

ایسا محسوس ہوا جیسے یونس کی سوچ میں پڑ گیا تھا، کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”اچھا اب یہ بات کس طرح بن سکتی ہے؟“

لیفٹ مفید نتیجہ نکلتے دیکھ کر بہت خوش ہوا، بولا۔ ”بس تجھے میری سوتیلی ماں سے یہ کہنا پڑے گا کہ میں عتآن سے شادی نہیں کروں گا کیونکہ اس پر لیفٹ کا حق زیادہ ہے۔“

یونس فس دیا، بولا۔ ”لیفٹ! تو کیسی بے وقوفی کی بات مجھ سے کہلوانا چاہتا ہے۔ اب تو میں درمیان سے نکل ہی گیا ہوں، تو با آسانی عتآن سے شادی کر سکتا ہے۔“

لیفٹ نے جواب دیا۔ ”وہ تو توچ کہہ رہا ہے لیکن اگر میں نے ایسا کیا تو میرا ضمیر مجھے زندگی بھر کچھ کے لگائے گا۔ میں یہ کام بالآخر بالآخر اپنے طور پر نہیں کرنا چاہتا۔ تیری اجازت اور منظوری سے کرنا چاہتا ہوں۔“

یونس ایک بار پھر لیفٹ کی سدھائی، شرافت اور بھولے پن کا قائل ہو گیا حالانکہ لیفٹ کی تجویز میں کئی ایسی باتیں شامل تھیں جن کا وہ اظہار یا اقرار نہیں کر سکتا تھا۔ لیفٹ جانتا تھا کہ اس کی سوتیلی ماں اب بھی یونس ہی کا دم بھرتی ہے اور یہ تاثر یونس ہی ختم کر سکتا ہے۔

یونس نے مجبوری سے کہا۔ ”اچھا اگر میں تیری خاطر عتآن کی ماں سے یہ سب کہہ دوں گا تو اس کے عوض قطعی طور پر تجھے کیا ملے گا؟“

لیفٹ نے چالاک تاجر کی طرح جواب دیا۔ ”وہ سب

کچھ، جس کا ابھی ابھی میں نے وعدہ کیا تھا۔“

یونس نے کہا۔ ”اب جبکہ تو اپنے باپ کی طرح کاروبار ہی پر تل گیا ہے تو میں بھی تھوڑی بہت کاروباری باتیں کر لوں، اجازت ہے؟“

لیفٹ نے کہا۔ ”اول تو یہی غلط ہے کہ میں تجھ سے کاروبار کر رہا ہوں، میں کاروبار نہیں کر رہا، اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے یہ باتیں کر رہا ہوں۔“

یونس نے کہا۔ ”چل بھی سکتی، میں تیری ہی بات ماننے لیتا ہوں لیکن میں عتآن کو دے کر خنسا کو لے لوں گا۔“

لیفٹ مسکرایا۔ ”واہ، یہ کیسے ممکن ہے، اگر خنسا خود تیرے ساتھ نہ جانا چاہے تو؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”میں اسے راضی کر لوں گا۔“

لیفٹ نے کہا۔ ”اگر تو اسے راضی کر لے گا تو میں بھی کوئی اعتراض نہیں کروں گا لیکن خنسا کی واپسی میں ایک بد اخلاقی کا پہلو باقی رہتا ہے، اس کا خیال ضرور رکھنا۔“

یونس نے پوچھا۔ ”کون سی بد اخلاقی؟“

لیفٹ نے جواب دیا۔ ”خنسا تیرا نذرانہ ہے، اب اگر تو خنسا کو مجھ سے لے لے گا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تو نے اپنا نذرانہ دے کر واپس لے لیا۔“

یونس پر جذباتی دباؤ بڑھنے لگا، بولا۔ ”خدا یا! یہ کیا ہے کہ میں کاروبار حیات میں ہر جگہ خسارہ اٹھا رہا ہوں، معرکہ زیت میں ہر جگہ شکست کا منہ دیکھ رہا ہوں۔“

لیفٹ نے تسلی دی۔ خسارہ نہیں، نفع ہی نفع، شکست نہیں ہر جگہ فتح ہی فتح۔ تو اپنے باپ سے کیا لایا تھا؟ تو نے جب مجھ سے دوستی کی ہے اس وقت تیرے پاس کتنی رقم تھی؟ شاید کچھ بھی نہیں لیکن اب جب تو مجھ سے ملے ہوگا یا میرے کاروبار میں شرکت کرے گا تو تیرے پاس مال ہی مال ہوگا، دولت ہی دولت ہوگی۔ اب تو ہی بتا کہ یہ فتح نہیں ہے؟ کیا یہ نفع نہیں ہے؟“

لیفٹ نے یونس کو ایک بار پھر قائل کر لیا تھا۔

یونس نے کہا۔ ”لیفٹ! میں تیری شرافت اور رحم دلی کا قائل ہو گیا لیکن خنسا کے عوض میں عتآن سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔ اگر تو خنسا کو میرا پیش کیا ہوا نذرانہ سمجھتا ہے تو افسوس کہ میں وہ نذرانہ واپس مانگ رہا ہوں۔“

لیفٹ نے بے تامل جواب دیا۔ ”اگر خنسا اپنی مرضی سے تیرے پاس جانے پر آمادہ ہو جائے گی تو میں اسے نہیں روکوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔“

یونس نے پوچھا۔ ”چل، یہ باتیں تو طے ہو گئیں، اب

کرے گی اور یہ ناممکن ہے کہ عنان جو چاہے وہ نہ ہو۔“
لیف نے سوچا۔ ”چلو اس طرح خنسا کا دل کیوں نہ ٹٹول لیا جائے۔“ پوچھا۔ ”تیری کیا خواہش ہے ذرا پھر تو بتا؟“
خنسا نے جواب دیا۔ ”یہ کہ میں لونڈی کے بجائے آزاد بیوی کہلو اؤں۔“

لیف نے پوچھا۔ ”کس کی بیوی، میری یا کسی کی بھی؟“
خنسا نے ناگواری سے لیف کو دیکھا، بولی۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ میری یا کسی کی بھی سے تیرا کیا مطلب ہے؟“
لیف نے جواب دیا۔ ”خنسا! تو فرض کر لے کہ میں تجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور تجھے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تیری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر دیتا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے اگر میں اپنے دل پر پتھر... رکھ کر تجھے آزاد کر دوں اور کسی اور سے تیری شادی کر دوں تو کیسا رہے گا؟“

خنسا نے بے زاری سے کہا۔ ”معلوم نہیں، تو اس وقت اپنے ہوش و حواس میں بھی ہے یا نہیں۔ یہ کیسی بہکی باتیں کر رہا ہے تو۔ میں محبت تو کروں تجھ سے اور شادی کسی اور سے کر لوں؟ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

لیف نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن میں ابھی طرح چاہتا ہوں کہ تو یونس میں بھی بڑی دلچسپی لے چکی ہے۔ اگر میں تجھے آزاد کر کے یونس سے تیری شادی کر دوں تو کیسا رہے گا؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”لیف! وہ دل کا چھوٹا ہے، چالاک ہے، عیار ہے، لالچی بھی ہے اور اس سے بھی بڑی اور بڑی بات یہ کہ وہ مصاحب ہے، تن تنہا کچھ بھی نہیں۔ جب تک کوئی بڑا آدمی اس کے بس میں نہ ہو وہ کچھ بھی نہیں رہتا۔“

لیف دنگ رہ گیا کیونکہ اس نے یونس کا مرض واقعی پکڑ لیا تھا پھر بھی لیف نے کہا۔ ”خنسا! میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ایک دن زندان میں یونس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ عنان سے میرے حق میں دست بردار ہو سکتا ہے اگر میں اس کے عوض تجھے اس کے حوالے کر دوں۔“

خنسا نے تیور یوں پر بل ڈال لیے، بولی۔ ”پھر تو نے کیا جواب دیا؟“

لیف نے کہا۔ ”میں نے یہ جواب دیا کہ اگر خنسا کو کوئی اعتراض نہ ہو اور وہ اپنی مرضی سے اس پر آمادہ ہوگئی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

خنسا کچھ دیر کے لیے اداس ہوگئی، اس کے گلاب جیسے رخساروں پر موتیوں جیسے آنسوؤں کے قطرات جھلکانے لگے۔ لیف اسے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ لیف کی بے

جسی پر خنسا کو غصہ بھی آ رہا تھا اور روتا بھی۔ خنسا کی مایوسی اور ملال سے کچھ دیر لطف اندوز ہونے کے بعد لیف نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بولا۔ ”واللہ! تو روتی ہے تو اور زیادہ حسین ہو جاتی ہے۔“

خنسا نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ اپنے حسن کی تعریف میں وہ مسکور ہو چکی تھی۔

یونس قید خانے میں لیف کا انتظار کرتا رہا لیکن یہ نہیں پہنچا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر جذباتی دباؤ کم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کیے پر شرمندگی محسوس... کرنے لگا۔ تنگ و تاریک کوشٹری میں اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دن کیا ہوتا ہے اور رات کسے کہتے ہیں۔

لیف قصداً تاخیر برت رہا تھا۔ آخر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اب یونس کا کیا حال ہے، وہ قید خانے پہنچ گیا۔

اب یونس کی صحت زیادہ خراب ہو چکی تھی اور بچھتاوا اس کے چہرے سے جھلکنے لگا تھا۔ لیف کا خیال تھا کہ یونس اس کی شکل دیکھتے ہی شکوہ و شکایت شروع کر دے گا لیکن وہ خاموش رہا۔ بس چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ جھلکی اور دونوں ہونٹ ذرا سا ہلے، بولا۔ ”بہت دن بعد آیا تو؟“

لیف نے جواب دیا۔ ”ہاں لیکن اس دوران میں برابر اسی کوشش میں رہا کہ کسی طرح تجھے رہا کر دوں۔ اللہ کر کے اب کام بنتا نظر آ رہا ہے۔ شاید تیرا باپ تیری رہائی پر آمادہ ہو جائے گا۔“

یونس کے ہونٹوں پر ہلکا سا ہنسنے کی ملی جلی مسکراہٹ زیادہ گہری ہوگئی، بولا۔ ”اب میں قید خانے کی زندگی کا عادی ہو چلا ہوں اور خود کو یہاں تک تو آمادہ کر لیا ہے کہ اگر مجھے نہ بھی چھوڑا گیا اور کسی قسم کی سزا دے دی گئی تب بھی مجھے دکھ یا افسوس نہیں ہوگا۔“

لیف نے جواب دیا۔ ”یونس! ہم دونوں میں جو ایک زبانی معاہدہ ہوا تھا، وہ یاد بھی ہے یا نہیں؟“

یونس نے کہا۔ ”یاد ہے۔“

لیف نے پوچھا۔ ”ہم میں کیا معاہدہ ہوا تھا؟“
یونس نے جواب دیا۔ ”یہ کہ اگر عنان کی ماں کے سامنے تیرے حق میں عنان سے دست برداری کا اعلان کر دوں تو، تو اس کے عوض اپنے مال و زر میں سے میرا حصہ دے دے گا اور خنسا بھی میرے حوالے کر دی جائے گی اور یہ بھی کہا تھا کہ شاید کاروبار میں بھی کسی طرح شامل کر لیا جاؤں گا۔“

لیف نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ ”خوب، خوب لیکن اس میں اب بھی ذرا سی غلطی پائی جاتی ہے۔ خنسا کی بابت

ہم دونوں میں یہ طے پایا تھا کہ اگر وہ اپنی مرضی سے تیرے پاس جانے پر آمادہ ہوگئی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“
یونس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ”ہاں یہی طے پایا تھا۔“

لیف نے کہا۔ ”تب پھر اب اس معاہدے پر عمل درآمد کا وقت آ گیا ہے۔ میں عنان کی ماں کو یہیں تیرے پاس بھیج دوں گا۔ تجھے جو کچھ کہنا ہے، یہیں کہہ سن لے کیونکہ معاہدے کے اس حصے پر رہائی سے پہلے ہی عمل درآمد ہو جانا چاہیے۔“
یونس نے بے یقینی سے لیف کو دیکھا۔ ”لیکن مجھے رہائی کب ملے گی؟“

لیف نے جواب دیا۔ ”اس کے فوراً بعد، کیونکہ تیرے باپ نے مجھ سے یہ کہہ رکھا ہے کہ اگر میں چاہوں تو یونس پر مقدمہ چلے گا اور اگر میں مقدمہ نہیں چلانا چاہتا تو وہ تجھے رہا کر دے گا۔“

یونس نے کہا۔ ”تب پھر جلد ہی عنان کی ماں کو میرے پاس بھیج دے، جلد از جلد رہا ہونا چاہتا ہوں۔“
لیف کافی دیر رکنے کے بعد یونس کی ہمت اور حوصلے کا معترف ہو گیا کیونکہ اس تنگ و تاریک کوشٹری میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور یہ فرض کر کے بہت پریشان ہوا کہ اگر خدا نخواستہ اسے یہاں رہنا پڑے تو اس کا کیا حال ہوگا۔

لیف نے واپس جا کر ماں کو یونس سے ملاقات پر آمادہ کیا جس کے دل میں اب بھی یونس کی محبت باقی تھی۔ لیف ماں سے مختصر باتیں کر کے قاضی سے ملنے کے بارے میں سوچنے لگا کہ یونس کی رہائی کے بارے میں قاضی سے ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ قاضی کے گھر پہنچا تو اسی وقت قاضی لیف کی حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ قاضی نے لیف کی ماں کو مطلع کیا۔ ”قاضی لبیب بخدی تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“

عنان کی ماں کو شبہ گزرا کہ شاید قاضی کے دل میں شفقت پوری بیدار ہوگئی ہے اور وہ اپنے بیٹے یونس کے رشتے کی بات کرنے آ گیا ہے وہ قاضی سے بات کرنے پر رضامند ہوگئی۔ قاضی نے آس پاس کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ ”تیری بیٹی عنان کہاں ہے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”وہ اندر کہیں ہوگی، کیا میں اسے بلواؤں؟“

قاضی نے کہا۔ ”نہیں، میں عنان ہی کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ماں نے جواب دیا۔ ”عنان یہاں نہیں ہے اور جب تک میں نہیں بلاؤں

گی، نہیں آئے گی۔ تجھے جو بات بھی کرنا ہو، بلا پس و پیش کر ڈال۔“

قاضی نے پھر پوچھا۔ ”یہاں کوئی اور بھی ہے یا مکمل تحلیلہ ہے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”مکمل تحلیلہ ہے۔ تو پریشان نہ ہو اور میں اس بات کا وعدہ کرتی ہوں کہ تو مجھ سے جو باتیں کرے گا، میں اسے راز میں رکھوں گی۔“

قاضی نے ایک ایک کر خورشاد نہ کہا۔ ”خاتون! پہلی بات تو میں عنان اور لیف کی کروں گا۔ میں حیران ہوں کہ تو نے میرے لفتکے بیٹے یونس کو لیف پر کیوں ترجیح دی حالانکہ لیف تیرے شوہر کا شریف ترین بیٹا ہے۔“

ماں کو سخت غصہ آیا کہ یہ کیسا احمق قاضی ہے جو اپنے بیٹے پر لیف کو ترجیح دے رہا تھا۔ بولی۔ ”یہی بات کرنا ہے یا کچھ اور بھی؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”خاتون! تو یقین کر، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پہلے میری پہلی بات کا جواب دے دے۔ اس کے بعد میں دوسری بات کروں گا۔“

ماں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں جانتی کہ... تو کس طرح معزز اور سمجھ دار قاضی سمجھا جانے لگا۔ چاہے تو یہ تھا کہ عنان کے سلسلے میں تو یونس کی سفارش کرتا کیونکہ یونس تیرا بیٹا بھی ہے لیکن تو بات کر رہا ہے لیف کی۔ مجھے تیری یہ بات ماننے میں پس و پیش ہے۔“

”معزز خاتون! پہلے میری بات تو سن لیجیے اس کے بعد میں کوئی اور بات کروں گا۔ اگر یونس تیرا داماد بن گیا تو میں ابھی اسی وقت یہ پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ وہ تجھے اور تیرے کاروبار کو تباہ کر دے گا۔ اس لیے یونس کا تو اپنے ساتھ رکھنے کا دل میں خیال ہی نہ لا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”تو خواخواہ الجھ رہا ہے۔ میں تجھ سے ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ میں تیرے بیٹے یونس کو زبان دے چکی ہوں اور اب اس فیصلے میں اسی وقت کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے جب یونس خود انکار کر دے۔“

قاضی نے حویلی کے دروازے کو لپٹا کی نظروں سے دیکھا اور گلا صاف کر کے بولا۔ ”نیک بخت! میری باتیں ذرا غور سے سن اور جب تک بات پوری نہ ہو جائے، درمیان میں دخل مت دیتا۔“

عنان کی ماں نے بے مروتی سے کہا۔ ”کہہ، میرا وعدہ ہے میں بیچ میں دخل نہیں دوں گی۔“

قاضی نے کہا۔ ”خاتون! جیسا کہ میں نے تجھے بتایا

کہ میں ایک معزز شخص ہوں۔ آل بویہ کا سلطان عضد الدولہ مجھ پر سب سے زیادہ اعتماد کرتا ہے اور اس کے اس اعتماد کے پیچھے میری نیک نامی، عدل و انصاف اور دیانت داری کام کر رہی ہے۔ جب میں تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ تو عنان کا ہاتھ اپنے سوتیلے بیٹے لیث کے ہاتھ میں دے دے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں لیث کو نیک و جوان سمجھتا ہوں اور بغرض محال اگر یہ اندیشہ ہو کہ لیث تجھے خوش نہیں رکھے گا اور شادی کے بعد تجھے پریشان کرے گا تو میرے پاس اس اندیشے اور اس پریشانی کا حل بھی ہے۔

اس کے بعد قاضی نے سکوت اختیار کیا اور عنان کی ماں کے چہرے سے اس کے اندر کی حالت کا اندازہ لگانے لگا۔ اسی وقت خنسا آگئی اور ماں سے پوچھا۔ ”کیا آپ جانتی ہیں کہ لیث کہاں چلا گیا؟“

لیکن ماں کے جواب سے پہلے ہی قاضی نے خنسا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی! شاید تو وہی ہے جسے میں پہلی بار اہواز میں لیث کی حویلی میں دیکھ چکا ہوں؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں وہی ہوں اور شاید تو قاضی لبیب بخدی ہے، یونس کا سخت دل باپ؟“

قاضی نے کہا۔ ”ہاں بے شک میں وہی ہوں لیکن تیرا یہ خیال غلط ہے کہ میں کوئی سخت دل انسان ہوں۔“

عنان کی ماں ان فضول باتوں سے الجھ رہی تھی، خنسا سے کہا۔ ”ہاں لیث کہیں گیا ہوا ہے، اس سے کوئی کام؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”اہواز سے لیث کا غلام آگیا ہے اس کو میں کالا شیطان کہتی ہوں.....“

ماں نے بات کاٹ دی۔ ”اگر غلام آگیا ہے تو حویلی کے خدام سے کہہ دے کہ اسے اپنے ساتھ ٹھہرا لیں، لیث بھی آجائے گا۔ آخر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

خنسا چلی گئی لیکن قاضی اور عنان کی ماں کے بیٹھنے کے انداز سے وہ سمجھ گئی کہ اس وقت ان دونوں میں کچھ اہم باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کے جاتے ہی عنان کی ماں نے کہا۔ ”یہ لڑکی لیث کی لونڈی ہے، اسی لیث کی جس کی تو سفارش کر رہا ہے اور جس کی نیکی اور شرافت کا تیرے دل پر رعب بیٹھ گیا ہے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اگر یہ لڑکی لیث کی لونڈی ہے تو اس سے اس کی نیکی، شرافت پر کون سا حرف آیا جاتا ہے۔ لونڈیاں تو خوش حال گھرانوں کا جزو ہیں اور ان سے کسی شخص یا خاندان کی عزت بڑھتی ہے۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”میں تجھ سے بحث نہیں کرنا

چاہتی، اب اپنی بات مکمل کر۔“

قاضی نے پرشوق نظروں سے بیوہ کے سراپے کا جائزہ لیا، بولا۔ ”خاتون! بات غیر متعلق سہی لیکن کیا تو اپنی عمر بتانا پسند کرے گی؟“

عنان کی ماں نے ترش لہجے میں کہا۔ ”قاضی! یہ تو بہک کیوں رہا ہے؟ کہیں تو پی کر تو نہیں آیا؟“

قاضی نے اس کی بات کو ہنسی میں ٹال دیا، بولا۔ ”میرا خیال ہے تیری عمر بمشکل پینتیس چالیس کی ہوگی، اس عمر میں بیوی اچھی نہیں لگتی۔“

عنان کی ماں اٹھنے لگی، بولی۔ ”اگر اب اصل باتیں باقی نہیں رہیں اور یہی فضول باتیں رہ گئی ہیں تو مجھے چلے جانا چاہیے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”خاتون! اگر تو میری پوری بات سنے بغیر ہی چلی گئی تو زندگی بھر پچھتائے گی۔ میں تیرے بالوں میں سیاہی اور تیری جلد میں شباب کا تناؤ اور چمک محسوس کر رہا ہوں۔ اگر لیث کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہ ہو تو میں تجھ سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔ اس طرح تجھ کو ایک مضبوط سہارا مل جائے گا اور لیث تو لیث کوئی بھی شخص تجھے اپنے دغا و فریب اور ظلم و ستم کا نشانہ نہیں بنائے گا۔“

عنان کی ماں خلاف توقع مزید برہم نہیں ہوئی۔ قاضی کو غور سے دیکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، بولی۔ ”کچھ اور یا بس؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اور کچھ یہ کہ مجھ سے شادی کر کے تو اس معاشرے کی معزز خاتون میں شمار کی جانے لگے گی۔“

عنان کی ماں نے کچھ سوچے ہوئے بے خیالی میں پوچھا۔ ”تو تو مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بے شک کیونکہ مجھ سے شادی کر کے تو احساس تحفظ حاصل کر لے گی۔“

عنان کی ماں ایک دم جوش و خروش سے کھڑی ہو گئی اور ڈانٹتی ہوئی بولی۔ ”او ذلیل انسان! اب تو یہاں سے چلا جاو نہ میں اپنے انجام کی پروا کیے بغیر تجھے دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔“

قاضی حیران رہ گیا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا، بولا۔ ”میری پیشکش پر ٹھنڈے دل سے غور تو کر، مجھے جلدی نہیں ہے۔“

عنان کی ماں نے کسی غلام کو آواز دی۔ ”ارے کوئی ہے جو اس دیوانے کو نکال باہر کرے۔“

قاضی خود ہی کھڑا ہو گیا، کہا۔ ”خاتون! تو میری وجہ

سے پریشان نہ ہو اور میں تیری سچ کلامی سے نہیں ٹھہرا رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میری یہ پیشکش اس وقت کتنی ہی شاندار کیوں نہ نظر آئے لیکن اس کی افادیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوگا جب خاتون تجھ پر کوئی خطرناک وقت آ پڑے گا اور تجھے سرکار دربار سے واسطہ پڑے گا۔ تب میں تجھ سے پوچھوں گا کہ خاتون! اب تو کیسی ہے؟ تو اس وقت تیرے پاس رونے کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا اور میں بہت یاد آؤں گا۔“

اسنے میں حویلی کا غلام بھی آگیا، اس نے پوچھا۔ ”مجھ سے کوئی کام؟“

عنان کی ماں نے کہا۔ ”اسے باہر جانے کا راستہ بتا دے۔“ یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔ قاضی حیران اور پریشان اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

غلام کو اچانک یاد آگیا کہ کیا وہ شخص ہے جس نے جشن طرب میں یونس کو گرفتار کر کے قید خانے بھیج دیا تھا، ڈر گیا بولا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں۔ اگر آپ واقعی باہر جانے کا راستہ نہیں جانتے تو میں اسی وقت آپ کو باہر تک لے جاسکتا ہوں۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں راستے کسی سے پوچھ کر نہیں ملے کرتا بلکہ میں اپنے راستے خود ہی نکال لیا کرتا ہوں۔ تیری مہربانی جو تو اسی وقت ذرا سی دیر کے لیے اپنی آقا کو بلوالے۔“

اندر جب عنان کی ماں کو یہ معلوم ہوا کہ قاضی اس سے چند باتیں اور کرنا چاہتا ہے اور اپنی بات پوری کیے بغیر وہ یہاں سے نہیں ملے گا تو وہ مجبوراً واپس آگئی، بولی۔ ”میں نے سنا ہے کہ تو کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے؟“

قاضی نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”ہاں واقعی ایک ضروری بات تو رہی گئی تھی۔ اگر اجازت دے تو عرض کر دوں؟“

عنان کی ماں نے جواب دیا۔ ”جب اندر سے بلوایا لیا ہے تو جو کچھ مزید کہنا چاہتا ہے، کہہ سن کر میرا پیچھا چھوڑ۔“

قاضی نے اپنے پاس کھڑے ہوئے غلام کی طرف دیکھا اور ڈانٹ کر کہا۔ ”یہ تو میرے سر پر کیوں کھڑا ہے؟ جا، بھاگ جاو نہ ایک ایسا ہاتھ رسید کروں گا کہ وجود تک کا پتہ نہ چلے گا۔“

غلام ڈر کر چلا گیا۔ قاضی نے عنان کی ماں سے کہا۔ ”ابھی ہم دونوں میں جو باتیں ہوئی ہیں انہیں اپنے سینے میں چھپی اور خطرناک راز کی طرح محفوظ رکھنا۔ کسی اور پر ہرگز نہ ظاہر کرنا۔ ورنہ ہم دونوں رسوا ہو جائیں گے اور اس

رسوائی سے تجھ ہی کو نقصان پہنچے گا۔“

عنان کی ماں نے پوچھا۔ ”بس کچھ اور؟ اب تو میں جاسکتی ہوں اور جاتے جاتے یہ کہتی جاؤں گی کہ تیری یہ عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے، رنگینیوں اور عیاشیوں کے لیے نہیں ہے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اب تو میں واپس جاؤں گا اور ایک ہفتہ بعد پھر آؤں گا۔ امید ہے کہ اس وقت تک تو کسی نہ کسی نتیجے پر ضرور پہنچ جائے گی۔“

عنان کی ماں قید خانے میں یونس سے ملنے گئی تو معلوم ہوا کہ قاضی کی اجازت کے بغیر یہ ملاقات نہیں ہو سکتی لیکن عنان کی ماں، قاضی کے نام تک سے بیزار تھی۔ لیث نے کہا۔ ”یہ اجازت میں حاصل کر لوں گا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا نام نہ آئے۔“

لیث نے کہا۔ ”نام تو لینا ہی پڑے گا کیونکہ اس کے بغیر قید خانے کا نگران آپ کو اندر نہیں جانے دے گا۔“

لیث بھاگا بھاگا قاضی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”میری ماں قید خانے میں یونس سے ملنا چاہتی ہے، کیا ملنے کی اجازت دے دی جائے گی؟“

قاضی نے مسکرا کر پوچھا۔ ”یہ یونس نے تیری ماں پر کون سا جادو کر دیا ہے جو وہ قید خانے تک پہنچ گئی؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں لیکن وہ یونس کو بہت پسند کرتی ہے۔“

قاضی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”تیری کیا رائے ہے؟ کیا اسے ملنے کی اجازت دے دی جائے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے، دے دی جائے۔“

”اس کا یونس سے ملنا تیرے خلاف تو نہیں جائے گا؟“

”نہیں شاید نہیں، میرا خیال ہے اس کی یہ ملاقات میرے حق میں رہے گی۔“

قاضی کو یہ اندیشہ پریشان کر رہا تھا کہ کہیں اس کی ماں نے قاضی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ذکر لیث سے کر تو نہیں دیا، پوچھا۔ ”ایک دن شاید پرسوں میں تیری ماں سے ملا تھا اور اس سے تیری اور عنان کی شادی کا ذکر کیا تھا، کیا اس نے تجھے کچھ بتایا؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

قاضی نے لیث سے بے ساختہ جواب اور تجسس چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ سچ سچ لاعلم ہے۔ ”میں ملنے کی اجازت تو دے دیتا ہوں لیکن تیری ماں سے میں خود بھی

ایک بار اور ملوں گا۔“

لیف ملاقات کا اجازت نامہ لے کر چلا گیا۔ اس نے ماں کو یونس کے روبرو لے جا کر کھڑا کر دیا۔ یونس ان دونوں کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ذرا سی دیر کے لیے ہلکا سا گھبراہٹ میں رہا۔ لیف نے ماں سے پوچھا۔ ”کیا میں باہر چلا جاؤں؟“ یونس نے جواب دیا۔ ”نہیں، باہر جانے کی ضرورت نہیں، یہیں موجود رہو۔“ لیکن ماں نے کہا۔ ”اگر تجھے برا نہ لگے تو ذرا سی دیر کے لیے باہر چلا جا۔“

لیف بے چوں چراپا ہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک دم خاموشی طاری ہوئی۔ گویا دونوں کے پاس بات کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ ماں دیر تک یونس کا مدقوق چہرہ دیکھتی رہی، بولی۔ ”یہاں یہ تیرا کیا حال ہو گیا؟“ کوٹھری میں ایک صبح روشن تھی۔ یونس نے اس صبح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”خوش قسمتی سے آج تو یہ صبح بھی روشن ہے ورنہ شب و روز کا بیشتر وقت اندھیرے میں ہی گزرتا ہے۔ میں یہاں دھوپ، ہوا اور روشنی سے بیکسر محروم ہوں۔ ہاضمہ بھی بگڑ گیا ہے، کھانا بھی صحیح نہیں ملتا پھر صحت کس طرح برقرار رہے گی۔“

ماں نے افسوس سے کہا۔ ”میں تیری ماں نہیں ہوں لیکن تیری مصیبتوں پر ماں جیسی اذیت محسوس کر رہی ہوں جبکہ تجھے قید میں ڈالنے والا تیرا باپ ہے اور اس پر اس کا کوئی اثر نہیں۔“

یونس نے کہا۔ ”اب چھوڑیے ان باتوں کو اور یہ بتائیے، آپ کا آنا کیونکر ہوا؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”میں نے تو یہ سنا تھا کہ تو مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“

یونس بے بسی سے مسکرا دیا۔ ”ہاں، میں نے ہی آپ سے ملنے کی خواہش کی تھی اور اب خود ہی آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ کیوں زحمت فرمائی۔“

ماں نے کہا۔ ”یونس! میں نے بیوگی کے دوران عجیب عجیب تجربے کیے۔ انسانوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھا اور اس سے اتنی مایوس ہوئی کہ بعض اوقات مر جانے یا تارک الدنیا ہو جانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔“

یونس نے سر آدھ بھری بولا۔ ”آپ نے تو خاص عمر گزار لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا، میں تو ہوش سنبھالنے کے بعد سے مسلسل ان ہی تجربوں سے گزر رہا ہوں۔“

ماں نے پوچھا۔ ”کیا تیرا باپ بھی تجھ سے ملنے آیا؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”ایک بار بھی نہیں۔“

ماں نے پوچھا۔ ”تجھے کبھی بلوایا؟“

”نہیں بلوایا، ابھی تک تو مجھ پر مقدمہ بھی نہیں چلا۔“

ماں نے ہول کر پوچھا۔ ”تو اب ہوگا کیا؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں، میں نے تو یہ سوچنا ہی ترک کر دیا ہے کہ اب کیا ہوگا۔“

ماں نے کہا۔ ”میری مستقل مزاجی دیکھ کہ مجھے حیرے خلاف بہت زیادہ ورغلا یا گیا اور ان ورغلانے والوں میں تیرا باپ بھی شامل ہے لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور میں اب بھی تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ میں ہر ایک سے یہی کہتی ہوں کہ عنان یونس کی ہے اور یونس ہی کو دی جائے گی۔“

یونس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں آپ کا شکر گزار ہوں اور شاید آپ کی ذات میری زندگی کی پہلی وہ ذات ہے جس نے مجھے محبت اور خلوص دیا ورنہ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ ہر کوئی مطلبی ہے، خود غرض ہے، اپنا کام نکال کر بھول جاتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے۔ انہی باتوں نے میرے دل سے انسان کا اعتبار اٹھا دیا ہے۔“

ماں نے پوچھا۔ ”پھر اب کیا ہوگا؟ اب کیا کیا جائے معاملے کو کس طرح سلجھایا جائے؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”ماں! میں نے اس لیے آپ سے ملنے کی خواہش کی تھی، میں بڑے دکھ اور اذیت سے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ مجھے بھلا دیں اور وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ عنان کو لیف سے واپس کر دیا جائے۔“

ماں نے گہرا کر یونس کی طرف دیکھا، اس نے جو کچھ سنا تھا، اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، بولی۔ ”یہ تو کیا کہہ گیا ہے؟ کیا تو اس حد تک مایوس ہو گیا ہے کہ خدا کی رحمتوں کا بھی خیال نہیں رہا؟“

یونس نے اسی طرح مایوسی سے کہا۔ ”بات یہ نہیں ہے بلکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں جیسی قسمت لے کر آیا ہوں اس کے زیر اثر عنان بھی ہمیشہ پریشان اور مصیبت زدہ رہ سکتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ عنان میری وجہ سے مصیبتیں جھیلے۔“

ماں نے ہمت بندھائی، کہا۔ ”ہمت نہ ہار، حوصلہ رکھ کبھی تو قسمت پلٹا کھائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تیری قسمت عنان پر اثر انداز ہونے کے بجائے عنان کی قسمت تجھ پر اثر انداز ہو اور تیری قسمت ہی بدل جائے۔“

یونس کھوکھلا قبچھہ لگا کر بولا۔ ”شاید عنان کی قسمت میری قسمت سے مختلف نہیں ہے۔ اس کے اپنے باپ کی

موت پھر سوتیلے باپ حمدون مغیث کا انتقال اور شادی سے پہلے یہ ہنگامہ آرائیاں۔ کیا اس کی بد قسمتی کی غماز نہیں ہیں؟“

ماں بھی کسی حد تک یونس کی دلیلوں کی قائل ہو گئی لیکن اس کا دل عنان کو بد قسمت سمجھنے پر آمادہ نہیں تھا پھر وہی سوال کیا۔ ”اب میں کیا کروں؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”میرا کہنا ماننے اور عنان کی شادی لیف سے کر دیجیے۔“

ماں نے پوچھا۔ ”کیا تو یہ فیصلہ غلوں دل سے کر رہا ہے؟“

”ہاں کیونکہ میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ عنان کی خوشیوں کی پروا کیے بغیر اپنی فضول خواہش پر اڑا رہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کی رفاقت ایک دوسرے کو راس نہیں آئے گی۔ اس لیے ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کا خیال اپنے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیں۔“

ماں نے کسی حد تک یونس کی بات مان لی لیکن اب بھی پورے دل سے وہ اس پر تیار نہیں تھی کہ عنان کو لیف سے واپس کر دیا جائے۔

آخر رخصت ہوتے ہوئے ماں نے کہا۔ ”یونس! میں تیری مایوسی پر افسوس کر رہی ہوں۔ میں تیرا انتظار کروں گی۔ زیادہ نہیں کم از کم چھ ماہ ضرور کروں گی، اس کے بعد عنان کا مسئلہ حل کروں گی۔“

ماں باہر نکلی اور لیف کو ساتھ لے کر اپنے قصر کی طرف چل پڑی۔ واپسی میں وہ بہت چپ چپ تھی۔ لیف اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ماں اور یونس میں کیا طے پایا لیکن ماں نے کوئی بات نہیں کی لیکن چند دنوں میں یہ فرق ظاہر ہوا کہ

ماں لیف سے خوش دلی سے باتیں کرنے لگی تھی اور عنان بھی لیف کے گرد چکر لگانے لگی تھی۔ لیف نے عنان سے پوچھا۔

”عنان! کیا بات ہے آج کل تو بہت خوش نظر آ رہی ہے اور مجھ پر بھی توجہ دینے لگی ہے؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”میں نے تجھ پر کب توجہ نہیں دی؟ کیا تو اس سے انکار کر سکتا ہے کہ میں نے تجھ سے محبت نہیں کی؟“

لیف نے کہا۔ ”لیکن چند دنوں پہلے تک تو مجھ سے ذرا دور دور رہتی تھی مگر اب تو مجھ سے زیادہ قریب رہنے لگی ہے۔“

”ہاں، تو نے بالکل صحیح محسوس کیا۔ پہلے ماں یہ کہا کرتی تھی کہ میں تجھ سے زیادہ ربط و ضبط نہ رکھوں کیونکہ اس طرح یونس کو غلط فہمی ہو سکتی تھی لیکن اب ماں نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں تجھ سے مل جل سکتی ہوں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

لیف نے کہا۔ ”لیف نے عنان کو سمجھایا۔“ عنان! تجھے خنسا سے اتنی تلخ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ کسی انسان کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ میرا خیال ہے اگر تو خنسا سے اپنی بات پر معذرت کر لے تو اس کی دلجوئی ہو جائے گی۔“

عنان نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”اب میں اتنی کئی گزری بھی نہیں کہ ایک کنیز سے معافی مانگوں۔ معذرت یا معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

خنسا نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”عنان! برے وقت سے ڈر، عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے

لیف کو عنان کی باتیں اچھی نہیں لگیں کیونکہ عنان معاملات عشق و محبت میں بھی ماں کی اجازت کی قائل اور پابند تھی۔ لیف نے سوچا اگر کاروبار اور مال و زر کو عنان اور اس کی ماں کے ذکر سے حذف کر دیا جائے تو عنان میں حسن کے علاوہ کوئی بات ایسی نہیں ملے گی جو لیف کی دلچسپی کا باعث بنتی۔ اس نے عنان سے پوچھا۔

”عنان! عشق و محبت میں تو انسان باغی اور سرکش ہو جاتا ہے لیکن تو اس میں بھی کم ہمتی کا مظاہرہ کر رہی ہے، آخر کیوں؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”لیف! میں بزدل یا کم ہمت نہیں ہوں لیکن ماں کا احترام اور محبت کرتی ہوں اور یہ نہیں چاہتی کہ اپنی محبت اور شوق سے اپنی ماں کو دکھ پہنچاؤں۔“

ان دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ خنسا بھی ان دونوں کے پاس پہنچ گئی اور یونس کر پوچھا۔ ”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“

لیف نے جواب دیا۔ ”خنسا! تو بھی شریک گفتگو ہو جا، بڑی کام کی باتیں ہو رہی ہیں۔“

خنسا نے کہا۔ ”تم دونوں میں کام کی کوئی بات ہوئی نہیں سکتی کیونکہ عنان میری طرح آزادی سے بات نہیں کر سکتی۔ یہ تو اپنی ماں کی مرضی اور خواہش کی پابند ہے۔“

عنان نے جل کر جواب دیا۔ ”ہم دونوں کی حیثیتوں میں بڑا فرق ہے۔ تو لونڈی ہے، غلام۔ اس لیے تو ہر معاملے میں لیف کی مرضی اور خواہش کی پابند ہے لیکن میں آزاد ہوں اور اپنی ماں کی مرضی اور خواہش کی پابند نہیں، اس کا احترام ضرور کرتی ہوں۔“

خنسا نے بڑے کرب سے عنان کی طرف دیکھا پھر لیف سے مخاطب ہوئی۔ ”لیف! تو میری اس بات کی تائید کرے گا کہ میں پیدا تو آزاد ہوئی تھی لیکن انسانوں نے مجھے کنیز بنا دیا، اب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کا میں شکوہ کس سے کروں؟“

لیف نے عنان کو سمجھایا۔ ”عنان! تجھے خنسا سے اتنی تلخ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ کسی انسان کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ میرا خیال ہے اگر تو خنسا سے اپنی بات پر معذرت کر لے تو اس کی دلجوئی ہو جائے گی۔“

عنان نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”اب میں اتنی کئی گزری بھی نہیں کہ ایک کنیز سے معافی مانگوں۔ معذرت یا معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

خنسا نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”عنان! برے وقت سے ڈر، عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے

لیف نے عنان کو سمجھایا۔ ”عنان! تجھے خنسا سے اتنی تلخ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ کسی انسان کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ میرا خیال ہے اگر تو خنسا سے اپنی بات پر معذرت کر لے تو اس کی دلجوئی ہو جائے گی۔“

عنان نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”اب میں اتنی کئی گزری بھی نہیں کہ ایک کنیز سے معافی مانگوں۔ معذرت یا معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

خنسا نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”عنان! برے وقت سے ڈر، عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے

لیف نے عنان کو سمجھایا۔ ”عنان! تجھے خنسا سے اتنی تلخ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ کسی انسان کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ میرا خیال ہے اگر تو خنسا سے اپنی بات پر معذرت کر لے تو اس کی دلجوئی ہو جائے گی۔“

عنان نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”اب میں اتنی کئی گزری بھی نہیں کہ ایک کنیز سے معافی مانگوں۔ معذرت یا معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

خنسا نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”عنان! برے وقت سے ڈر، عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے

لیف نے عنان کو سمجھایا۔ ”عنان! تجھے خنسا سے اتنی تلخ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ کسی انسان کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ میرا خیال ہے اگر تو خنسا سے اپنی بات پر معذرت کر لے تو اس کی دلجوئی ہو جائے گی۔“

عزت دے اور بس لو چاہے ذلت دے۔ اس میں انسان کی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تو نے میری دل آزاری کی ہے اس لیے میں اپنے خدا سے مبرا اور برداشت کی ہمت چاہوں گی۔ وہی مجھے ملے گا اور تجھے اس کا بدلہ دے گا۔

عنان، خنسا سے چپتی تھی۔ لیٹ سے بولی۔ "لیٹ! اس زر خرید کو سمجھالے، یہ مجھے بددعا دے رہی ہے۔ میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر یہ درمیان میں نہ ہوتی تو میں کب کا وہ فیصلہ کر چکی ہوتی جس کا تو منتظر ہے۔"

لیٹ نے خنسا کو سمجھایا۔ "خنسا! تو احتیاط سے کام لے۔ اس حویلی کی فضا بڑی سوگوار ہے۔ یہاں کا ہر شخص دنگی ہے۔" پھر عنان سے کہا۔ "اور عنان! میں تجھ سے بھی یہی کہوں گا کہ تو خنسا کے معاملے میں فراخ دلی سے کام لے۔"

عنان جواب دے بغیر روتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی لیٹ نے خنسا کو آغوش میں لے لیا اور اس کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ "نہرو میری جان۔ عنان نادان ہے۔ ماں پر تازہ کرتی ہے لیکن اس غریب کو نہیں معلوم کہ عنقریب اسے مجھ سے وابستہ کر دیا جائے گا کیونکہ یونس نے اپنی بارمان لی ہے۔"

خنسا نے آغوش سے نکلنے کی کوشش کی، بولی۔ "اگر بات یہاں تک پہنچ چکی ہے تو میں تجھ سے صاف صاف کہوں گی کہ اب تامل اور انتظار کا وقت نہیں رہا۔ تو مجھے فوراً آزاد کر کے اپنی بیوی بنا لے کیونکہ اگر عنان مجھ سے پہلے تیری بیوی بن گئی تو وہ میری راہ میں کانٹے بچھانے سے باز نہیں رہے گی۔"

لیٹ نے یونس کی بوجھاڑ کردی، بولا۔ "خنسا! اگر میں عنان سے پہلے تجھے اپنی دہن بنا لوں گا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا اس لیے جہاں تو نے اتنا صبر کیا ہے کچھ اور کر لے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں نے تجھ سے جو عہد کیا ہے اس سے پھروں گا نہیں۔"

خنسا نے مایوسی سے کہا۔ "میں کس طرح یقین کر لوں کہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے درست ہے۔ اگر عنان سے شادی کرنے کے بعد تو نے اپنا یہ عہد پورا بھی کر دیا تو مجھے زندگی بھر یہ ملال رہے گا کہ میں نے تجھ سے ایک خواہش کی تھی اور تو نے اس کی پروا کیے بغیر وہی کیا جس پر تو عمل کرنا چاہتا تھا یعنی عنان کو مجھ پر ترجیح دی۔"

لیٹ نے جواب دیا۔ "تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ عنان بہر حال میری سوتیلی ماں کی بیٹی ہے اور میں اسے اہمیت دینے پر مجبور ہوں پھر بھی جہاں تک تیری

ذات کا تعلق ہے، میرے لیے تو بھی بہت اہم ہے۔ تو قدر مند نہ ہو اور یہ سمجھ لے کہ زندگی میں اس قسم کے سانحے آتے ہی رہتے ہیں۔"

خنسا نے جواب دیا۔ "میں تو تیری طفل تیلیوں پر یقین کرنے پر مجبور ہوں ورنہ میرا دل اندر سے یہی کہتا رہتا ہے کہ کوئی بھی انسان اعتبار کے لائق نہیں ہے۔ میں نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے ایک مثل سنی تھی آج اس کی صداقت پر غور کرتی ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔"

لیٹ نے اشتیاق سے پوچھا۔ "کون سی مثل؟ میں بھی تو سنوں۔"

خنسا نے جواب دیا۔ "ہسپانیہ کی مثل ہے کہ اعتبار کرنا بڑی اچھی بات ہے لیکن نہ اعتبار کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔ کیسے کسی مزے کی بات اس مثل میں کہی گئی ہے۔"

لیٹ نے کہا۔ "بات تو بڑی اچھی کہی گئی ہے اس مثل میں، میں بھی اس پر عمل کروں گا۔" خنسا خاموش رہی۔

عنان نے ساری باتیں ماں سے جا کر کہہ دیں جس سے پورے قصر میں بڑی بد مزگی اور کشیدگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ ماں کے رویے میں پھر فرق آ گیا۔ وہ لیٹ سے پھر گئیں۔ ایک دن رات کو نصف شب کے بعد اس نے اپنی ماں کو سجدے میں پڑا دیکھا۔ وہ گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھی۔

"اے اللہ! تو یونس کو رہا کر وادے تاکہ میں اپنی عنان کو اس سے وابستہ کر دوں۔ لیٹ مجھے پسند نہیں گو کہ یہ میرے شوہر اور میری سوت کا بیٹا ہے۔ اگر لیٹ ہی سے میری عنان کا رشتہ مقدر ہو چکا ہے تو اس کا خنسا سے بچھا چھڑا دے۔ اگر میری دعا قبول ہو گئی، تو نے میری سن لی تو شکر اے میں، میں پہلے حج بیت اللہ کو جاؤں گی۔ اس کے بعد واپس آ کر عنان کی شادی کروں گی۔" جب یہ دعا لیٹ کے کانوں تک پہنچی تو لیٹ لرز گیا کیونکہ اس دعا کی قبولیابی میں اس کا نقصان تھا۔ اگر یونس رہا ہوتا تھا تو وہ عنان سے محروم ہو جاتا اور اگر یونس رہا نہیں ہوتا اور عنان، لیٹ ہی کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی تو وہ خنسا سے محروم ہو جاتا اور خنسا سے جدائی اس کے لیے سوہان روح بن سکتی تھی لیکن اسے یونس کے سلسلے میں پورا پورا یقین تھا کہ اس کی رہائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اس رات کے بعد صبح ہی صبح ماں نے بڑی قوت ارادی سے لیٹ پر یہ واضح کر دیا کہ اگر عنان سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خنسا سے بچھا چھڑا لے کیونکہ وہ خنسا کی موجودگی میں عنان کی شادی لیٹ

سے نہیں کر سکتی۔ لیٹ نے دل شکستگی سے جواب دیا۔ "ماں! میں نے یہ بات عنان سے بھی کہی تھی اور اب آپ سے بھی کہہ رہا ہوں کہ دل آزاری بدترین گناہ ہے، انسان کو اس سے بچنا چاہیے۔ خنسا مجھ سے محبت کرتی ہے پھر میں کس طرح اسے الگ کر سکتا ہوں۔ قصر کے کسی گوشے میں اگر خنسا بھی پڑی رہے تو اس میں آپ کا یا عنان کا کیا نقصان ہے؟"

ماں نے کہا۔ "یہ بات صرف میں ہی نہیں عنان بھی کہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ خنسا کی موجودگی میں وہ تجھ سے شادی نہیں کرے گی۔ رہی یہ بات کہ خنسا تجھ سے محبت کرتی ہے تو تجھے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ عنان بھی تجھ سے محبت کرتی ہے۔ دل آزاری اگر بدترین گناہ ہے تو تو لا علمی میں اس گناہ کا برابر کا ارتکاب کر رہا ہے۔ خنسا کی موجودگی اور اس سے گہرے روابط اور رشتہ ہم دونوں ہی کی دل آلودی کا سبب بن گیا ہے۔ اگر تو دونوں کے آزار سے بچنا چاہتا ہے تو خنسا کو جلد از جلد رخصت کر دے۔"

لیٹ نے سختی سے جواب دیا۔ "تجھ پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں خنسا کو جدا کر دوں۔ میں خنسا کو کسی بھی قیمت پر اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔"

ماں نے مایوسی سے کہا۔ "تیری مرضی میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں اپنے رب سے مایوس نہیں ہوں، وہ ان گہرے بارانوں میں سے امید کا سورج طلوع کر سکتا ہے۔ رات کی گہری سیاہیاں یہ اشارہ کرتی ہیں کہ صبح قریب ہے۔ میرا دل بار بار مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ مت گھبرا، اب صبح زیادہ دور نہیں، بالکل قریب ہے۔"

لیٹ ماں کی باتوں سے بیزار ہو کر خنسا کے پاس چلا گیا اور اس سے کہا۔ "خنسا! اس قصر میں مایوسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں، آ، میرے ساتھ چل۔ میں تیرے ساتھ دجلہ کے کنارے کنارے گھومنا چاہتا ہوں۔ چاندنی راتوں میں بڑا مزہ آئے گا۔"

خنسا نے مایوسی سے کہا۔ "میں تیرے ساتھ چل تو سکتی ہوں لیکن ذرا ایک بار سوچ لے، اس مکرر فضا میں میرا تیرے ساتھ گھومنا پھرنا بالکل اچھی بات نہیں۔"

لیٹ نے جواب دیا۔ "کیا اچھا ہے اور کیا برا، مجھ سے زیادہ تو نہیں جانتی۔ عنان مجھے ملے پانہ ملے لیکن میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ میں تجھ سے محبت بھی کرتا ہوں اور عزت بھی۔"

خنسا پھولی نہیں سارے تھی۔ بے اختیار لیٹ سے چٹ

گئی اور فرط جوش میں بولی۔ "لیٹ! تو ایک عظیم انسان ہے۔" خنسا اور لیٹ دونوں دجلہ کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں ہاتھ میں ہاتھ لے کر لیٹ بڑی دیر تک ٹھہرا رہا۔ آسمان پر تیرہ تاریخ کا چاند بھی چودھویں کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لیٹ سے کہا۔ "کبھی کبھی اس چاند کو بھی دیکھ لیا کر، یہ قدرتی مناظر ہمیں بڑی فرحت اور تازگی بخشتے ہیں۔ میں اس وقت کی خوشی کو لفظوں میں کس طرح بیان کروں، یہ بات میرے اختیار اور قابو میں نہیں رہی۔"

لیٹ بھی قدرتی مناظر میں گم تھا۔ ان کی جنت دجلہ کے کنارے اتر آئی تھی۔

☆☆☆

یہیں دجلہ کے کنارے آل یوہ کے نامور فرزند عضد الدولہ کا محل بھی تھا۔ عضد الدولہ عباسی خلیفہ پر اس حد تک حاوی آ گیا تھا کہ بغداد اور اس کے نواح میں حکم عضد الدولہ ہی کا چلتا تھا۔ اس وقت قاضی عضد الدولہ کے پاس آیا ہوا تھا اور اسے کسی شخص نے آکر چپکے سے کان میں یہ بتا دیا تھا کہ لیٹ اور اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے، دونوں دجلہ کے کنارے بخورام ہیں۔

قاضی نے جلدی جلدی گفتگو کر کے عضد الدولہ سے گھر جانے کی اجازت لے لی اور اپنے قصر سے فوراً عنان کی ماں کے پاس روانہ ہو گیا۔ جب اس کی سواری قصر کے بڑے پھانگ میں داخل ہوئی تو پہرے داروں اور دربانوں میں ایک مکمل سی جھج گئی۔

قاضی نے ایک دربان سے کہا۔ "دربان! جا اند جا کر اپنی مالکہ سے کہہ دے کہ قاضی جلدی میں ہے اور اس سے جلدی سے ملاقات کر لے تاکہ وہ فوراً ہی واپس بھی چلا جائے۔"

دربان عنان کی ماں کے پاس سے جواب لایا کہ "آج میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ قاضی کسی اور دن ملاقات کر سکتا ہے۔"

قاضی نے دربان سے کہا۔ "جا اپنی مالکہ سے کہہ دے کہ قاضی کہتا ہے، میری آنکھوں نے بعض تماشے دیکھے ہیں اس لیے ملاقات کر لی جائے تو چند کارآمد اور مفید باتوں کے علم سے دل خوشی محسوس کرے گا۔"

ماں نے دربان سے کہہ دیا۔ "اچھا قاضی کو بخشا، میں آتی ہوں۔"

قاضی کو بخشا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد عنان کی ماں بھی اس کے پاس پہنچ گئی اور پوچھا۔ "خاتون! میں اپنے وعدے کے مطابق نہیں آ سکا۔ اس کی معافی چاہتا ہوں اور معذرت

جولائی 2014ء کا خوش رنگ و خوش کن پاکیزہ حاضر ہے

پاکیزہ

کراچی

افتتاحی سراج اور
عنیزہ سید کے شاہکار ناول
اختتامی راہوں پر گامزن

نایاب جیلانی کا ماہرانہ قلم ترک وفا کی الجھن سلجھاتے ہوئے
فرحانہ ناز ملک کا ساحل ساحل زنجیر ہونے خوبصورت بیان کا مظہر

ہم سب کی بے حد پیاری
غزالہ نگار اور کزنی بنیں ہماری
خاص مہمان وہ آنے بزم میں

اسما قادری کے مشاق قلم کا پُر اثر شاہکار یہی اک راہ ہے

اس کے علاوہ

ہماری مقبول و ہر دلعزیز راسٹرز سکینہ فرخ، غزالہ فرخ،
فرح طاہر قریشی، صائمہ قیصر، عنیقہ محمد بیگ،
تسنیم منیر علوی، غزالہ جلیل راؤ و دیگر کی دلنشین تخلیقات

حسین اور دکش مستقل سلسلوں کا دربار استرجاع صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

پیش کرتا ہوں۔

عنان کی ماں نے جواب دیا۔ ”قاضی! تو کام کی باتیں کر، فضول باتوں میں وقت نہ گنوا، بتا کس لیے آتا ہوا؟“

قاضی نے کہا۔ ”مجھے یاد ہوگا کہ بچپن میں نے ایک پیش کش کی تھی اور اس پر غور کرنے کے لیے میں نے تجھے سات دن کی مہلت دی تھی۔ اب بتا تو نے کیا فیصلہ کیا؟“

عنان کی ماں نے بددلی سے جواب دیا۔ ”قاضی! تو بڑا جھکی ہے۔ آخر یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟ تو تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ میں شادی نہیں کروں گی، نہیں کروں گی، نہیں کروں گی تو جھک نہ کر۔“

”دیکھ اگر تو مجھ سے شادی کر لے تو میں تجھے عراق، ایران اور ترکی کی سیر کروا سکتا ہوں۔ رومیوں کے ملکوں کی تفریح بی کروا سکتا ہوں۔ بس تو ہاں کر دے۔ بقیہ سارے کام میں خود کر لوں گا۔“

عنان کی ماں نے بہت زیادہ سختی سے کہا۔ ”قاضی! میں جانتی ہوں تو اس طرح نہیں مانے گا۔ اب میں عضد الدولہ کے پاس جاؤں گی اور تیرے کروت بیان کر کے تجھے اس کی سزا دلواؤں گی۔“

قاضی اس دھمکی سے واقعی ڈر گیا پھر بھی اپنی اکر قائم رکھی، بولا۔ قاضی نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”خاتون! اب تک میں جو نہیں کرنا چاہتا تھا اب کرنے پر مجبور ہوں۔ میرا جمال تو اچھی طرح دیکھ لیا ہے، یہاں کے لوگوں کو پہلی بار میں اپنے جلال کا بھی مشاہدہ کروادوں گا کیونکہ مجھے میں مومن کی فراست بھی ہے اور غیرت مند کی فطانت اور شجاعت بھی۔“

عنان کی ماں نے بڑی فراخ دلی سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ڈرتی جو جی میں آئے کرو اور اب مجھے اجازت دے۔“

قاضی کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اچانک اٹھا اور عنان کی ماں کو مخاطب کیا۔ ”اے عورت! معلوم نہیں تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے، بہر حال کل میں اپنا انتہائی قدم اٹھا دوں گا اور دیکھوں گا کہ اس سے تو کس طرح محفوظ رہے گی۔ میں تیرے سر پر ایک قند چھوڑ دوں گا جو زندگی بھر کے لیے کافی ہوگا۔“

تیری جو کچھ میں آئے کر۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو اس پر کہ تو مجھے دوسری شادی پر مجبور نہ کر۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”تو اپنے دل سے یہ خیال نکال دے کہ میں تیرا بیچھا چھوڑ دوں گا۔ میرا تعاقب جاری رہے گا اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ میں تمہیں تباہ نہ کر دوں گا۔“

عنان کی ماں نے منہ پھیر کر کہا۔ ”اب میں کسی بات سے بھی خوف زدہ نہیں، جا اور جو جی میں آئے کر۔“

قاضی قصر سے نکلا اور اپنے گھر پہنچا۔ وہ بڑی دیر تک مضطرب اور پریشان ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ یونس کو حاضر کیا جائے۔

یونس کو اسی وقت حاضر کیا گیا۔ قاضی مدقوق بیٹے کی شکل دیکھ کر کانپ گیا۔ اسے سینے سے لگا لیا، بولا۔ ”یونس! مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے تجھے دکھ دیا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔“

یونس بھی جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

قاضی نے اسے قسمل کر دیا، سینے کو پکڑے دیے اور ایک اچھے سے طیبہ کو بلوا کر اس کا معائنہ کروا دیا اور اس کا علاج شروع کر دیا اور اس کی رہائی کو دوسروں سے خفیہ رکھا۔ یونس باپ کی مہربانیوں پر حیران تھا۔ اس دوران لیٹ کئی بار قید خانے گیا اور وہاں سے بھی جواب ملا کہ یونس کو کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے۔ لیٹ یونس کی کشمکش سے پریشان ہو گیا۔

قاضی نے یونس کو ایک ہفتے میں بدل کر رکھ دیا۔ اسے کھانے پینے کا آرام تھا۔ اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے کا سکھ حاصل تھا لیکن وہ یہاں بھی قیدیوں کی طرح بند تھا۔ اپنی مرضی سے کہیں آجائیں سکتا تھا۔ صبح شام، دوپہر کسی بھی وقت وہ قاضی سے ملاقات بھی کر سکتا تھا اور باپ جس وقت بھی ملتا بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا، شفقت پداری کا اظہار کرتا لیکن یونس ان مہربانیوں اور کرم فرمائیوں پر خوش ہونے کے بجائے فکر مند تھا اور یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کا باپ اچانک اتنا نرم اور مہربان کیوں ہو گیا ہے؟

آخر ایک ایسی شب بھی آگئی جب قاضی نے یونس کو اپنے سامنے بٹھا کر اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔

قاضی نے کہا۔ ”یونس! وہ عاق نامہ کہاں ہے؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”لیٹ کے پاس۔ میں نے اس کے پاس رکھوا دیا تھا۔“

قاضی نے کہا۔ ”جب تو وہاں جائے تو عاق نامہ لیٹ

سے لے کر مجھے واپس کر دیتا۔

یونس نے کہا۔ ”بادا جان! میں آپ کی نفرتوں اور سختیوں کا تو عادی ہوں لیکن ان مہربانیوں نے مجھے پھر میں ڈال دیا ہے۔ آخر آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو گئے ہیں؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”یونس میری ناراضگی کا بھی کوئی سبب تھا۔ تو نے میرا نام لے لے کر ناجائز فائدے اٹھائے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ میں خود بھی بدنام ہونے لگا۔ اگر تیرے پاس ضمیر نام کی کوئی شے ہے تو اس سے پوچھ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ تیرے کرتوتوں سے میں اتنا عاجز آ گیا تھا کہ جب میں بغداد آنے لگا اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ تو بھی عازم بغداد ہے تو میں بہت پریشان ہو گیا اور میں نے اس پریشانی اور غصے میں یہ فیصلہ کر لیا کہ تجھے عاق کر دوں چنانچہ میں نے عاق کر دیا۔ مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ تیرے معاملے میں لوگوں کی چغلیوں کا بھی بڑا حصہ ہے پھر جب بغداد میں آ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تو نے تاجر حمدون مغیث کی بیوہ کو میرا نام لے کر بے وقوف بنایا ہے اور وہ تیرے جھانے میں آ کر اپنی بیٹی کی شادی تجھ سے کیے دے رہی ہے تو میں مشتعل ہو گیا اور جب مجھے جشن طرب میں مدعو کیا گیا تو مجھے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ہاتھ آ گیا پھر جیسے ہی تاجر حمدون کی بیوہ نے اپنی بیٹی کے ساتھ تیری نسبت کا اعلان کیا میں نے حالت اشتعال میں وہ اعلان کر دیا جس پر تو مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے بڑھا اور مجھے اور لیث کو قتل کر دینا چاہا اور گرفتار کر لیا گیا۔“

یونس نے پوچھا۔ ”پھر اچانک آپ نے مجھے بے گناہ کس طرح سمجھ لیا؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اس دوران میں تحقیقات کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تو بے گناہ ہے اور میں نے تیرے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ اب کل سے تو تاجر حمدون کی بیوہ کے پاس جا کر رہ سکتا ہے اور اس کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔“

قاضی کا یہ اعلان حیرت انگیز اور ناقابل یقین تھا۔ یونس کو یہ سب کچھ خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ قاضی نے مزید کہا۔ ”وہ عاق نامہ مجھے واپس مل جانا چاہیے۔ شادی میں، میں خود شریک نہیں ہوں گا لیکن تیرے سرپرست کی حیثیت سے میرا ہی نام رہے گا۔ دوسری بات یہ کہ لیث سے مت جھگڑنا۔ وہ برا نوجوان نہیں ہے۔ اس کو میں سنبھال لوں گا۔ حمدون مرحوم کی بیوہ مجھ سے خوش نہیں ہے اس لیے اس کے

سامنے میرا ذکر بھی نہ کرنا۔“

یونس باپ کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور وعدہ کر لیا کہ باپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ اس کے خلاف نہیں کرے گا۔ قاضی نے آخر میں کہا۔ ”اگر تو اپنی اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو میں تیرے اور تیرے مستقبل کے لیے ایک اور منصوبہ رکھتا ہوں۔“

یونس نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیا ہے؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بغداد کا ایک دوسرا حصول شخص اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے سے کرنا چاہتا ہے۔ تیری دوسری شادی اس کی بیٹی سے کروادوں گا لیکن اس کا ذکر کہیں نہیں ہونا چاہیے۔ حصول تاجر قریب المرگ ہے۔ اپنا سب کچھ اپنے داماد کے نام کر دے گا۔ اس طرح تجھے دو حسین بیویاں مل جائیں گی اور ان کے ساتھ ہی دولت اور جائیداد بھی۔“

یونس کی رگ طبع پھڑکی، بہت خوش ہوا بولا۔

”بادا جان! آپ کتنے اچھے ہیں۔“

قاضی نے کہا۔ ”یونس! آخر کو میں تیرا باپ ہوں۔ میں جو کچھ بھی تیرے ساتھ کروں گا، اگر تو مناسب سمجھے تو اس کا ذرا سا معاوضہ بھی ادا کر دینا حالانکہ وہ معاوضہ نہیں ہے لیکن میں مکافات عمل کے ذیل میں اسے معاوضہ ہی کہوں گا۔“

یونس نے بڑے جوش سے جواب دیا۔ ”بادا جان! اگر مجھ کو آپ کی شفقت مل جائے تو میں آپ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔“

قاضی نے کہا۔ ”اب تو مطمئن رہ تجھ کو ہمیشہ میری شفقت حاصل رہے گی۔“

یونس نے بے چینی سے کہا۔ ”اب آپ وہ بتائیے جس کو آپ مکافات عمل کے ذیل میں معاوضہ کہہ رہے ہیں؟“

قاضی نے کہا۔ ”یونس! میں تیری عدم موجودگی میں کئی بار حمدون کی بیوہ کے پاس گیا۔ میں تیرے معاملے میں تحقیق و تمییز کر رہا تھا لیکن اس خبیث عورت نے مجھے ہر بار ذلیل و خوار کیا۔ میں اس کو اس کے کئے سزا دینا چاہتا ہوں چنانچہ جب تیری شادی ہو جائے تو تو پہلا کام یہ کرے گا کہ اپنی دلہن کو یہاں میرے پاس لے آئے گا اور اس قصر کو بکوا دے گا، لازمی طور پر وہ بھی نہیں آجائے گی، اس وقت میں اس کو بتاؤں گا کہ ایک شریف اور معزز قاضی کی اہانت کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔“

یونس کو باپ کی بات مانتے ہوئے ذرا سا تامل ہوا

لیکن پھر یہ سوچ کر کہ بڑی مشکل سے تو باپ سے تعلقات استوار ہوئے ہیں اور اب بحالی تعلقات کے بعد باپ سے بہت زیادہ فائدے پہنچنے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے چنانچہ ان مالی اور مادی فائدوں کے مقابلوں میں ادھیڑ عمر عورت کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ باپ سے کہا۔

”بادا جان! اگر اس عورت نے آپ کی اہانت کی ہے تو قاضی کی حیثیت سے آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو اس کی سزا دیں۔ میں آپ کے مشورے پر پوری فرماں برداری سے عمل کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔“

قاضی کا تیرنشانے پر بیٹھا تھا کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے کہا۔ ”اور یونس! تجھے ایک خاص بات کا خیال رکھنا ہے۔ جب تک تیری شادی نہ ہو جائے تو بیوہ حمدون کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا اور اگر وہ میرا ذکر لے بیٹھے تو اس کو سختی سے منع کر دے گا کہ میرا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”آپ اطمینان رکھیں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس پر اسی طرح عمل ہوگا۔“

اب قاضی کو ذہنی سکون حاصل ہوا تھا کہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب تھا اور وہ دن دور نہیں تھا جب وہ حمدون کی سرکش اور مغرور بیوہ کو بہت زیادہ ذلیل و خوار کر سکے گا۔ اس نے دوسرے دن یونس کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

یونس خلاف توقع شان سے قصر میں داخل ہوا تو قصر کا ہر شخص اس پر بہت حیران ہوا کہ یونس کی محنت، لباس اور مزاجی کیفیت کسی چیز سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ قید میں تھا۔ لیث، خنسا، عنان اور اس کی ماں۔ ان سب نے یونس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سب سے زیادہ خوشی لیث کو تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب یونس عنان کو بھی خوشی اور اپنی موجودگی میں لیث کے حوالے کروا دے گا لیکن یونس نے عنان کی ماں کے علاوہ کسی سے کوئی بات ہی نہ کی۔ اس نے عنان کی ماں سے کہا۔ ”خاتون! اب میں آ گیا ہوں اور یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عنان کو مجھ سے کب وابستہ کیا جا رہا ہے؟ اگر یہ معلوم ہو جائے تو میں اپنی شادی کی تیاریاں کروں۔“

یونس کے طرزِ مخاطب نے سب کو حیران کر دیا۔ عنان کی ماں سوچ رہی تھی کہ یونس کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ وہ عنان کو حکماً طلب کر رہا تھا۔ لیث یہ سوچ سوچ کر پریشان

ہو رہا تھا کہ یونس سے جو کچھ ملے پایا تھا شاید وہ سب بھول چکا تھا اور بظاہر یہ کوئی دوسرا یونس نظر آ رہا تھا۔ خنسا اور عنان اپنی جگہ حیران تھیں۔

لیث نے پوچھا۔ ”یونس! تو کہاں تھا، میں تو کئی بار قید خانے گیا اور وہاں یہی معلوم ہوا کہ تجھے کسی اور جگہ قتل کر دیا گیا ہے۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”ایک لمبی داستان ہے جسے پھر کبھی سناؤں گا۔ کیا وہ عاق نامہ مجھے واپس کر دے گا۔ جسے تو نے بلاوجہ اپنے پاس دبا رکھا ہے؟“

لیث نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔

”یونس! آہم دونوں کچھ دیر ضروری باتیں کر لیں۔ میں تیری روداد سننے کے لیے بے چین ہوں۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”چل، کہاں چلتا ہے، میں چلتا ہوں۔“

لیث اس کو ساتھ لے کر اپنے خاص کمرے میں چلا گیا۔ اب یونس کے ہر ہر انداز اور ایک ایک طریقے سے لگتا تھا گویا وہ اس قصر میں مہمان اور اجنبی ہے، وہ بے دلی سے لیث کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ لیث نے اسے خوش کرنے کے لیے عاق نامہ اس کے حوالے کر دیا۔ یونس نے اس کو پڑھا اور پھر اس کو چاک کر دیا۔ ”اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

لیث نے تذبذب لہجے میں پوچھا۔ ”یونس کہیں تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ تو تو یہاں آ کر ہم سب کے لیے معائنہ کیا ہے۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”میں بالکل صحیح الدماغ ہوں لیث۔ میں پاگل نہیں ہوں۔“

لیث نے کہا۔ ”اگر تو واقعی صحیح الدماغ ہے تو تجھے یہ بات بھی یاد ہونی چاہیے کہ قید خانے میں ہم دونوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”ہاں، مجھے یاد ہے اور خوب اچھی طرح یاد ہے لیکن وہ ایک طاقت ور اور آزادانہ دوسرے مجبور قیدی سے من مانا معاہدہ کر لیا تھا۔ اب بدلے ہوئے حالات میں، میں اس معاہدے سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں۔“

لیث کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی، بولا۔

یونس! خدا کے لیے سب کیا ہے اور وہ بدلے ہو۔ حالات کیا ہیں، ساری تفصیل بتا دے ورنہ میرا ذہنی توازن بگڑ جائے گا۔“

یونس نے بے نیازی سے کہا۔ ”لیث! اب تفصیل میں کہاں جاؤں گا اور کس کس کو سناؤں گا بس یہ مجھ لے کہ اب

میں وہ پریشان حال اور لاوارث شخص نہیں ہوں، اب میں بھی کچھ ہوں اور اس کچھ ہونے نے میری سوئی ہوئی انا کو بیدار کر دیا ہے۔“

لیف نے کہا۔ ”تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”میری کوئی بات اسکی نہیں ہے جو تیری یا کسی کی سمجھ میں نہ آ سکے۔“

لیف نے بھی فیصلہ کن انداز اختیار کیا، پوچھا۔ ”مجھے تو تو بس ایک بات صاف صاف بتادے کہ تو اپنا حصہ لے کر عتاق سے دست بردار ہونے کو تیار ہے؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں تجھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ میں عتاق سے شادی کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا اور رہا یہ قصر تو اس کو فروخت کر دیا جائے گا اور عتاق کی ماں، جہاں میں رہوں گا وہ بھی رہے گی۔“

لیف کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ یونس سے سخت لہجے میں بات کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

یونس نے اور زیادہ سخت رویہ اختیار کیا، کہا۔ ”لیف! میرا تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں۔ میں خواہتا ہوں کہ تجھ سے الجھوں گا بھی نہیں لیکن اب میں یہ بھی برداشت نہیں کروں گا کہ تو مجھ پر حکم چلائے یا میرے معاملات میں دخل دے۔“

لیف خاموش ہو گیا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یونس کو اب کس طرح قابو میں لایا جائے۔

یونس، لیف کے پاس سے اٹھ کر عتاق کی ماں کے پاس چلا گیا۔ وہ یونس سے شاکم تھی کہ اس نے اس کا ادب نہیں کیا۔ یونس کو اپنے سامنے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یونس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، منہ کیوں پھیر لیا؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”میں نے منہ یوں ہی پھیر لیا ہے۔ اول تو تجھے اب عتاق کی رشتے کی بات ہی نہیں کرنا چاہیے۔ تو تو میرا بہت ادب کرتا تھا، خیال رکھتا تھا مگر یہ تو آج کس طرح مجھ سے مخاطب ہے؟“

یونس نے کہا۔ ”ماں! یہ بات ہے کہ پچھلے دنوں اس قصر میں میری حیثیت ایک قاتل انسان جیسی تھی لیکن اب حالات بدل چکے ہیں اور اب اگر میں عتاق سے شادی کروں گا تو مجھ میں اتنی سکت ہے کہ میں کچھ اپنا بھی خرچ کر سکوں گا۔ میں عتاق کو اس قصر کے علاوہ بھی رکھ سکوں گا اور آپ بھی میرے ساتھ ہی رہ سکیں گی۔“

لیکن عتاق کی ماں نے جواب دیا۔ ”مگر قید خانے میں حیرے انکار پر میں نے لیف سے بات کی کر دی ہے اور اب عتاق کی شادی لیف سے ہوگی اس لیے اس بارے

میں مزید گفتگو فضول ہے۔“

یونس نے سختی سے کہا۔ ”لیکن ماں! ایسا نہیں ہو سکتا عتاق کی شادی مجھ سے ہوگی۔“

ماں نے طنز یہ کہا۔ ”ماں نہیں مجھے خاتون کہہ کر پکارا اب لفظ ماں تیرے منہ سے اچھا نہیں لگ رہا۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”ماں، خاتون یا کچھ اور میں ان فضول الفاظ کے پکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں تو شادی کی تاریخ مقرر کرنے آیا ہوں اور میں آپ کو یہ یقین دلانا ہوں کہ اب مجھ سے عتاق کی شادی آپ کے لیے زیادہ خوشی کا باعث بن جائے گی۔ اس سے پہلے میں آپ کے رحم و کرم تھا اور شادی کے بارے میں یوں اعتماد سے بات نہیں کر سکتا تھا مگر اب ان بدلے ہوئے حالات میں، میں اس لاچار ہو چکا ہوں کہ آپ سے پوری خود اعتمادی سے بات کروں۔ میں آپ کو سوچنے کا موقع دے رہا ہوں دو چار دن سوچ لیجئے۔ غور کر لیجئے لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ عتاق کی شادی مجھ سے ہونی ہے اور مجھ سے ہی ہوگی۔ لیف یا کسی اور کا اب ذکر نہیں ہوگا۔“

ماں نے سختی سے کہا۔ ”یونس! میں بھی یہی کہتی ہوں کہ حالات بدل چکے ہیں اور ان بدلے ہوئے حالات میں بات تقریباً ناممکن ہے کہ عتاق کی شادی تجھ سے ہو۔ بات لیف سے ملے ہو چکی ہے اور اب یہ بات توڑی نہیں جاسکتی۔“

یونس ایک طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”یہ فضول بات ہے شادی تو مجھ سے ہوگی۔ لیف سے نہیں ہو سکتی اور اگر اس معاملے میں من مانی کی گئی تو اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”مروت کی بات ہی کچھ اور ہے لیکن دباؤ میں تو میں کسی کے آتی نہیں۔“

یونس یہاں سے بھی چلا گیا اور سیدھا عتاق کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ”عتاق! میں تجھ سے شادی کرنے آیا ہوں لیکن تیری ماں مکر رہی ہے، کہتی ہے کہ میں نے لیف سے بات کی کر دی ہے۔“

عتاق نے جواب دیا۔ ”یونس! پہلے بھی میری شادی میری مرضی سے نہیں ہو رہی تھی اور میں نے اپنا معاملہ اپنی ماں پر چھوڑ دیا تھا اور اب بھی میں اپنی ماں کا حکم مانوں گی وہ میرا ہاتھ لیف کے ہاتھ دے۔ میں ماں سے اختلاف نہیں کروں گی۔“

یونس نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میرے جاتے ہی معاملات بگڑ گئے اور ہوا میرے خلاف ہو گئی۔“

سب میرے خلاف ہو چکے ہو اور ایسا لگتا ہے گویا میں اس

گھر میں ایک اجنبی ہوں۔“

عتاق زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یونس کا کچھ حال ہی عجیب تھا۔ وہ سیدھا عتاق کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لیف سے معروف گفتگو تھی۔ لیف اسے دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر کھڑا ہو گیا، پوچھا۔ ”یہ کیا بات ہے یونس؟ مجھ سے کوئی کام ہے؟“

یونس نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”نہیں، تجھ سے کوئی کام نہیں میں خفا سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اگر تو ذرا سی دیر کے لیے اس کو میرے حوالے کر دے تو مہربانی ہوگی۔“

لیف نے سوالیہ نظروں سے عتاق کو دیکھا، پوچھا۔ ”کیا تو جانے کو رضامند ہے؟“

عتاق نے پس و پیش سے کہہ دیا۔ ”تیرا کیا خیال ہے، جاؤں یا نہ جاؤں؟“

لیف نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تو اگر یونس سے بات کرنا چاہتی ہے تو کر لے، میں کیوں بولوں گا۔“

یونس نے کہا۔ ”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم سب مجھ سے خوف زدہ کیوں ہو؟ ہر شخص مجھے اجنبیوں کی طرح دیکھتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟“

عتاق نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ تیرا فریب نظر ہے چونکہ تو خود ہمیں اجنبیوں جیسی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور بیگانوں کی طرح ہموکام ہے۔ اس لیے تجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اجنبیت کا اظہار ہماری طرف سے ہو رہا ہے۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”اچھا تو ذرا سی دیر کے لیے میرے پاس آ جا۔ میں اس فضول بحث میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔“

عتاق، یونس کے ساتھ خاموشی سے اس کمرے میں چلی گئی جہاں پہلے یونس رہا کرتا تھا اور اب خالی پڑا ہوا تھا۔ یونس اپنے تخت پر بیٹھ گیا اور عتاق کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ عتاق اس کے مقابل ایک دوسری چھوٹی سی چوکی پر بیٹھ گئی۔

یونس کچھ دیر تک عتاق کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔ ”عتاق! اگر میں تجھ سے یہ کہوں کہ تو میرے ساتھ چل، میں تجھے لیف سے زیادہ خوش رکھوں گا تو تو کیا جواب دے گی؟“

عتاق نے جواب دیا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ تیری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی اور جب بات سمجھ میں نہیں آئے گی تو تیری بات کس طرح مان لوں؟“

یونس نے اپنی صحت اور خوشنالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا میری اچھی صحت، اچھا لباس تمہیں یہ سوچنے پر

بولی۔ "لیٹ! خدا کے لیے تو اپنے کمرے کے دروازے بند کر لے کیونکہ یونس مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے لیکن میں اس دیوانے اور سگی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اس کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ غیر معمولی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔"

لیٹ نے تسلی دی، بولا۔ "غصا! تو مت گھبرا۔ اگر یونس نے اس قصر میں کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں قصر کے دربانوں کو بلوا کر اس کی مرمت کروادوں گا اور اس کے بعد یہ ایک بار پھر قید خانے میں چلا جائے گا۔"

کمرے کا دروازہ کھلا رہا لیکن یونس ان دونوں کے پاس نہیں پہنچا۔ لیٹ نے سنجی میں کہا۔ "یونس مجھ سے ڈرتا ہے وہ میرے پاس آئی نہیں سکتا۔ اگر آئے گا تو بچھتا ہے گا۔"

لیکن یونس اب دونوں کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو کمرے کو ہر طرف سے بند کر کے منصوبے بنانے میں مشغول تھا۔ ایک جامع منصوبہ جس سے اس کا مطلب بھی حل ہو جائے اور کسی کو کوئی نقصان بھی نہ پہنچے۔ یونس کا مجرمانہ ذہن جو پہلے کسی حد تک ناسازگار حالات کے دباؤ میں بے کار ہو گیا تھا۔ اب وہ تنہا اپنے سارے ہی حریفوں کو دندان شکن جواب دے سکتا تھا۔ اس میں بلا کی خود اعتمادی اور طمانیت آگئی تھی اور اس کو یقین تھا کہ اب وہ یونس نہیں رہا جو دوستوں پر اپنی جان چھڑکا کرتا تھا اب وہ بلا کا چالاک آدمی نظر آتا تھا۔

☆☆☆

اب حالات اتنے مختلف تھے کہ یونس کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ یونس بڑی شان سے قصر میں رہ رہا تھا۔ نہ وہ کسی سے بولتا تھا نہ کوئی اس سے بولتا تھا۔ انہیں جب بھی موقع ملتا آپس میں صلاح مشورے کرتے بیٹھ جاتے کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ عنان کی ماں لیٹ سے کہتی۔

"تو کسی طرح یہ پتا چلا کہ یونس کو کس کی پشت پناہی حاصل ہو گئی ہے تاکہ اس کے مطابق کوئی قدم اٹھایا جائے ورنہ یوں لاعلمی کے اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے۔"

لیٹ نے پتا لگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس طرح دس بارہ دن گزر گئے۔ لیٹ نے ماں سے کہا۔ "اگر آپ عنان کی شادی میرے ساتھ کر دیں تو جھگڑا ہی ختم ہو جائے اور میں فوراً ہی یونس کو نکال باہر کروں۔"

لیکن ماں کا خیال تھا کہ اب یونس کی موجودگی میں عنان کی شادی کرنا مشکل کام ہے کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ کس

قسم کا ہنگامہ کھڑا کر دے، بولی۔ "لیٹ! مجھے کوئی اعتراض نہیں، تو آج ہی شادی کر لے عنان سے۔ لیکن اگر شادی سے پہلے یونس کا انتقام نہ کر دیا گیا تو معلوم نہیں کس قسم کا ہنگامہ برپا ہو جائے کیونکہ یونس کی خاموشی میں کوئی طوفان چھپا ہوا ہے۔" دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ یونس بھی آدمی کا۔

لیٹ نے یونس کی پروا کیے بغیر کہا۔ "ماں آج آپ بتا دیجیے کہ عنان کی شادی کب تک کر رہی ہیں کیونکہ میں اب اپنی پوری توجہ اپنے کاروبار پر دینا چاہتا ہوں۔ اگر عنان کا مسئلہ حل ہو جائے تو میں پوری یکسوئی سے اپنے دوسرے کام کر سکوں گا۔"

ماں نے یونس کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جب یہ بات طے پاگئی ہے کہ عنان کی شادی بھی سے ہونا ہے تو مجھے مطمئن اور یکسو ہو جانا چاہیے۔"

یونس نے ماں سے کہا۔ "خاتون! مجھ سے آنکھیں ملا کر بات کیجیے۔ یہ کیا کہ کن انکھیوں سے دیکھتی تو مجھ کو بھی اور جواب لیٹ کو دے رہی ہیں۔ میں خود بھی یہی مسئلہ طے کرنا آیا ہوں۔ میں نے شادی کی بارہ تاریخ مقرر کر دی ہے، گویا کہ آج سے چھ دن۔ میں شادی کی تیاریاں کرنے جا رہا ہوں اور آپ بھی تیاری کیجیے۔" پھر لیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تو اگر چاہے تو یہ معاملہ اس طرح طے پاسکتا ہے کہ اپنا آدھا زرد مال اور خنسا کو میرے حوالے کر دے۔ میں عنان سے اسی وقت دست بردار ہوا جاتا ہوں۔"

لیٹ نے جواب دیا۔ "اس طرح اکڑ کر یا دھونس دے کر تو، تو ایک درم بھی نہیں پاسکتا۔ ہاں بھائی چارہ میں اس سے زیادہ حاصل کر سکتا تھا۔"

یونس قہقہہ مار کر ہنس دیا، بولا۔ "بھائی چارہ، خوب گویا میں بھی تیرا بھائی نہیں تھا۔ میں نے بھائی بننے کی خواہش نہیں کی تھی، تو نے خود ہی بھائی بنالیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ تو نے مجھے اپنے بڑے بھائی یعقوب کی جگہ دے دی ہے، تو نے مال و زر کا نصف دینے کا وعدہ کیا تھا مگر تیرے وعدے، وعدے ہی رہے۔ میں اپنے حق اور حصے کو چند قسطوں میں وصول کر لوں گا اور میں نہیں جانتا کہ ان قسطوں کی وصول یابی میں کون کون مزاحم ہوگا، بہر حال جو بھی مزاحمت یا مداخلت کرے گا، میں اس سے نہٹ لوں گا۔"

ماں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "اور میرا فیصلہ یہ ہے کہ اب تو اس قصر میں نہیں رہے گا۔"

یونس نے نرمی سے جواب دیا۔ "خاتون! اس وقت

میں لیٹ سے مخاطب ہوں، آپ سے باتیں بعد میں ہو جائیں گی پہلے لیٹ سے اپنا حساب صاف کر لوں۔"

ماں نے کہا۔ "لیٹ میرا بیٹا ہے اس لیے اس کا معاملہ میرا معاملہ ہے اور میرا معاملہ لیٹ کا معاملہ۔ ہمیں الگ الگ مت تصور کر۔"

یونس پھر ہنسا۔ "خوب لیکن خاتون! پہلے تو تم دونوں الگ الگ تھے۔"

لیٹ نے کہا۔ "ان فضول باتوں سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا، اب تو اس قصر کو خالی کر دے۔"

یونس نے کہا۔ "ہاں تو میں حساب کتاب اور قسطوں کی بات کر رہا تھا۔ میں آج پہلی قسط وصول کر لینا چاہتا ہوں۔"

لیٹ نے پوچھا۔ "کیسی پہلی قسط، کون سی قسط؟"

یونس نے جواب دیا۔ "میں خنسا کو اپنے ساتھ رکھوں گا، اب وہ یہاں نہیں رہے گی۔"

لیٹ گھبرا گیا، بولا۔ "لیکن خنسا تیرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہے۔"

یونس نے بھاری آواز میں کہا۔ "وہ تیرے پاس میری امانت ہے، اب یہ امانت شرافت کے ساتھ مجھے واپس کر دے۔"

لیٹ نے سختی سے کہا۔ "تو جاتا ہے یا دربانوں کو بلواؤں؟"

یونس پھر ہنسا۔ "دربان کیا کریں گے؟ میں اپنا مقدمہ عقد الدولہ کے دربار میں لے جاؤں گا کیونکہ وہ انصاف میں مردت اور رعایت سے کام نہیں لیتا اور وہاں تیری جو خواری ہوگی، خود ہی سوچ لے۔"

لیٹ نے جواب دیا۔ "مجھے عقد الدولہ سے کوئی خوف نہیں، جا کر دے مقدمہ، خنسا واپس نہیں ملے گی۔"

یونس تن کر کھڑا ہو گیا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں خنسا کو اسی وقت اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اگر تو روک سکتا ہے تو روک لے۔"

لیٹ کھڑا ہو گیا، بولا۔ "اگر لے جاسکتا ہے تو لے جا کر دیکھ، آج میں تیری طاقت آزماؤں گا۔"

یونس نے خلاف امید ماں کو مخاطب کیا۔ "خاتون! میں پہلے آپ سے چند باتیں کروں گا اس کے بعد کوئی قدم اٹھاؤں گا۔"

ماں نے پوچھا۔ "مجھ سے کیا باتیں کرے گا؟"

یونس نے بدستور نرمی سے کہا۔ "آپ مجھ سے ڈریے نہیں کیونکہ میں وہی یونس ہوں جس نے دورانِ علالت آپ کی

بڑی خدمت کی تھی اور جس کو آپ لیٹ سے زیادہ چاہتی تھیں۔" ماں نے کہا۔ "کر باتیں۔"

لیٹ نے موقع غنیمت جانا فوراً خنسا کے پاس چلا گیا تاکہ اسے کہیں چھپا دے۔

اس کے جاتے ہی یونس نے کہا۔ "خاتون! آپ میرے لیے اب بھی بمنزلہ ماں ہیں اور میں اب بھی آپ کا احترام کرتا ہوں۔"

ماں، یونس کی ایک ایک بات پر حیرت زدہ تھیں اب وہ نرمی سے عاجزانہ باتیں کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟

یونس نے کہا۔ "خاتون! میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں؟ آپ میری مزاحی کیفیت اور گفتگو کے بدلے ہوئے انداز کے بارے میں سوچ رہی ہیں کہ یہ کیا بات ہے اور کیوں ہے؟ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں زمانے کا ٹھکرایا ہوا انسان ہوں۔ میرا کردار، میری شخصیت مسخ ہو گئی ہے اور بعض اوقات مجھ سے جو سرزد ہو جاتا ہے اس پر دوسروں سے زیادہ میں خود حیران رہ جاتا ہوں۔"

ماں نے بات کاٹ دی، بولی۔ "بات مختصر کر۔ مجھے پریشان نہ کر۔"

یونس نے جواب دیا۔ "میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آپ ذرا تحمل اور صبر سے کام لیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ عنان کی شادی اگر مجھ سے کر دیں گی تو خسارے میں نہیں رہیں گی۔"

ماں نے کہا۔ "اب عنان کی تو بات ہی نہ کر، وہ تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔"

یونس نے درخواست کی۔ "آپ اس پر نظر ثانی کیجیے۔ غلٹ سے کام نہ لیجیے۔ میں نے بارہ تاریخ مقرر کر دی ہے اور آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب میں کوئی بے سہارا اور لاوارث شخص نہیں ہوں۔"

ماں نے بے پروائی سے کہا۔ "تیری باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتیں، اگر تو صاف صاف باتیں کرے تو میں کچھ غور بھی کروں۔"

یونس نے جواب دیا۔ "حالانکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آپ کو اصل واقعہ نہ بتایا جائے لیکن اگر آپ وعدہ کریں کہ میری باتوں کو اپنے ہی تک رکھیں گی تو میں سب کچھ سچ بتا دوں گا۔"

ماں نے وعدہ کیا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں اور یوں بھی ادھر کی ادھر نہیں کرتی۔"

یونس نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "آپ حیرت کریں گی خاتون کہ میرے والد نے اپنا

☆☆☆

جب بیدار ہوا تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس کا دل یونس کے شر اور اس کے خوف یا اندیشے سے بالکل خالی تھا۔ اس نے خنسا سے ہنس ہنس کر باتیں کیں اور عنان کو یونس کا نام لے لے کر خوب چھیڑتا رہا۔ اپنی ماں کے پاس بھی گیا اور اسے تسلیاں دیتا رہا۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ قاضی کے پاس جا کر یونس کی شکایت کرے گا۔ وہ ابھی اس کے پاس جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ چند گھڑ سوار دوڑتے قصر کے اندر داخل ہو گئے۔ اس وقت عنان اور خنسا کسی مسئلے پر بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ لیٹ نے ان دونوں سے کہا۔ ”تم دونوں فوراً قصر کی چھت پر چلی جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں، نہ بولنا نہ نیچے اترنا۔ مجھے خطرے کی محسوس ہو رہی ہے۔“

دونوں نے دروازے کو انداز سے بند کر دیا اور قصر کی چھت پر چلی گئیں۔ لیٹ بھاگ کر قصر کے درختوں والے حصے میں چلا گیا اور وہاں جھاڑی میں روپوش ہو گیا۔ عنان کی ماں جہاں تھی وہیں بیٹھی رہ گئی۔

گھڑ سوار دربانوں کو دھکا دے کر اندر داخل ہوئے تھے۔ یہ چار تھے ان میں یونس تین سے آگے تھا۔ اس نے عنان کی ماں سے عجلت میں پوچھا۔ ”لیٹ کہاں ہے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”وہ شاید تیرے باپ کے پاس گیا ہوا ہے کیونکہ جانے سے پہلے اس نے یہی بتایا تھا۔“

یونس نے دانت پیسے بولا۔ ”اس کی خبر تو میں واپسی میں لے لوں گا جا کر۔ عنان اور خنسا کہاں ہیں؟“

ماں نے بڑی عقل مندی سے جواب دیا۔ ”ان دونوں کو تو اس قصر سے اسی دن ہٹا دیا گیا تھا جس دن میں نے اپنے دربانوں سے تجھے قصر کے باہر بھٹکایا تھا۔“

اُنی دیر میں ان چاروں کے تعاقب میں قصر کے دربان ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ دربانوں نے انہیں لٹکارا۔

”خبردار! جو بھاگنے کی کوشش کی۔“

یونس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”دوستو! تم ان کتوں کو روکو، میں اس پر کالہ آفت سے بچتا ہوں۔“ اس کے بعد عنان کی ماں سے پوچھا۔ ”خنسا اور عنان جہاں بھی گئی ہیں وہ بتا۔ ورنہ میں آج تجھے معاف نہیں کروں گا۔“

ماں نے سختی سے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتی کہ لیٹ نے انہیں کہاں پہنچا دیا ہے۔“

یونس نے کوار کی نوک ماں کے پیٹ پر رکھ دی اور اسے آہستہ سے دہاتے ہوئے کہا۔ ”وعدہ خلاف خاتون! دیکھ، میں آخری بار تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ خنسا اور عنان کا پتا بتا دے ورنہ یہی کوار تیرے پیٹ میں اتار دوں گا۔“

اس واقعے کو کئی دن گزر گئے مگر کوئی خاص بات رونما نہیں ہوئی لیکن لیٹ کا دل بار بار یہی کہتا تھا کہ یونس خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہے، کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی وقت کوئی ہنگامہ ضرور کرے گا اور لیٹ ان ہنگاموں سے نپٹنے یا انہیں ٹال دینے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اسے ابھی تک اس پر حیرت تھی کہ یونس رہا کیونکر ہو گیا۔ اس دوران اسے یاد آ گیا کہ ایک دن عنان کی ماں نے گڑگڑا کر یونس کی رہائی کی دعا مانگی تھی۔ اس نے سوچا، ہو سکتا ہے یونس کی رہائی اسی دعا کے زیر اثر ہوئی ہو۔ اس اندھیرے میں دعا اور مناجات کے علاوہ کوئی ایسی تجویز اور تدبیر نہیں تھی جس پر دل پوری طرح مطمئن ہوتا ہو۔ آخر اس نے بھی خاموشی سے وضو کیا۔ اس وقت رات کے پہلے پہر کا آغاز ہو چکا تھا اور دنیا بخواب تھی۔ زاهدان شب بیدار بھی شاید اونگھ رہے ہوں گے۔ وہ وضو کرنے کے بعد خنسا کے پاس گیا جو گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے سر ہانے کھڑا اسے دیکھتا اور سوچتا رہا۔ وہ خنسا کو یونس کے حوالے کس طرح کر دیتا اس نے خنسا کے قریب ہی جائے نماز بچھائی اور دو رکعت نفل ادا کر کے گڑگڑا کر دعا مانگنے لگا۔

”اے رب العالمین! مجھے یونس کے شر سے نجات دلا اور محفوظ رکھ۔ میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر تو نے اس فتنے کو ختم کر دیا اور میں اس کے شر سے محفوظ رہا تو میں عنان سے شادی بعد میں کروں گا، پہلے حج شکرانہ ادا کروں گا اور دوسو فقرا اور مساکین کو کھانا کھلاؤں گا۔ اے اللہ! عنان کی ماں کے دل کو مجھ پر مائل رکھ تاکہ عنان کی حصولِ بانی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔“

وہ یہ چند جملے سجدے میں مگر کر بڑی دیر تک دہراتا رہا۔ اس کا دل بھر آیا اور وہ واقعی زار و قطار رونے لگا۔ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو رخساروں اور ڈاڑھی کے بالوں پر جمع ہوتے رہے جیسے جیسے آنسو بہہ رہے تھے لیٹ کا دل ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں بڑے جوش و خروش سے کہا۔

”اے اللہ! تو میری دعا اپنے حبیبِ نبی آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں قبول فرما۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ حج شکرانہ کے ساتھ ہی مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے مزار اقدس پر حاضری بھی دوں گا۔“

اس دعا کے بعد اس کو اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوا۔ مناجات کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا۔ صبح

عورت! اپنی زبان کو لگام دے۔ اب میں تیری زبان سے اپنے باپ کی شان میں اہانت آمیز ایک لفظ نہ سنوں گا۔“

ماں نے جاتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو تو اسی وقت اس قصر سے دفع ہو جا، یہ میرا قصر ہے اور تو میرا کچھ بھی نہیں۔ تو اسی وقت یہاں سے چلا جا۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”میں یہیں رہوں گا، اسی قصر میں رہوں گا اور دیکھتا ہوں کہ مجھے کون نکالتا ہے اس قصر سے۔“

ماں نے جاتے جاتے کہا۔ ”اور میں بھی یہ دیکھوں گی کہ اب تو یہاں کس طرح رہے گا۔“

ماں نے باہر جاتے ہی قصر کے دربانوں کو حکم دیا کہ یونس کو زبردستی نکال باہر کیا جائے اور اسے دوبارہ اندر نہ آنے دیا جائے۔ طاقت ور تابعدار دربارن تیزی سے اندر آئے اور یونس کو پکڑ لیا، اسے زبردستی کھینچتے ہوئے بولے۔ ”نکل یہاں سے، ورنہ تیری ہڈیاں توڑ دی جائیں گی۔“

یونس نے چیختے ہوئے کہا۔ ”کم بختو! مجھے چھوڑ دو۔ میں قاضی کا بیٹا ہوں۔ میری بے عزتی کا نتیجہ بہت خطرناک نکلے گا۔“

ایک دربان نے جواب دیا۔ ”دفعان ہو یہاں سے۔ یہ قصر تیرا تیرے باپ کا تو نہیں۔“

دربانوں نے یونس کو قصر سے نکال کر دروازے بند کر دیے۔

اس کے ذرا دیر بعد ماں نے لیٹ کو اپنے پاس بلا دیا اور بڑی تشویش سے کہا۔ ”لیٹ! میں نے یونس کو قصر سے نکلوا تو دیا ہے لیکن میں اشارہ یہ بتائے دے رہی ہوں کہ یونس کو کمزور نہ سمجھ۔ اس کا وار کئی طرف سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کے جوابی حملوں سے خبردار اور چوکنا رہنا چاہیے۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”وہ بے نوا اور بے سہارا انسان ہے۔ وہ کیا حملہ کرے گا۔“

ماں نے کہا۔ ”یہ بات نہیں لیٹ، وہ بہت طاقت ور ہے۔ اگر اس کی باتوں پر یقین کر لیا جائے اور وہ درست بھی ہوں لیکن اگر اس نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا گپ تھی تو پھر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔“

لیٹ نے ماں سے اس کی وضاحت نہیں چاہی لیکن یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا کہ یونس بہت لسان، چرب زبان انسان ہے اور اس کے ساتھ شری بھی۔ وہ اپنی باتوں سے بہتوں کو یا جس کو چاہے دوست بنا لے اور جب چاہے شر پیدا کر دے۔ وہ یونس سے خوف زدہ تھا چنانچہ یونس کے جانے کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، خوف اور اندیشوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

عاق نامہ منسوخ کر دیا ہے اور انہوں نے ہی مجھے قید خانے سے نکال کر اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں عنان سے شادی کر لوں۔“

ماں کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا، بولی۔ ”تو یہ بات ہے۔ وہی تو میں کہوں کہ تیرے مزاج اور انداز میں یہ اتنی بڑی تبدیلی کیونکر آگئی۔ اس کی خواہش ہے کہ عنان کی شادی تجھ سے کر دی جائے، کیوں ہے ناں یہی بات؟“

یونس نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”میرے باپ کی بھی یہی خواہش ہے کہ میں عنان سے شادی کر لوں۔“

ماں ایک دم بڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کہا۔ ”اگر یہ تیرے باپ کی خواہش ہے تو جا اور اپنے باپ سے کہہ دے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

یونس نے حیرت سے پوچھا۔ ”آخر کیوں؟“

ماں نے سختی سے کہا۔ ”یہ شادی اس لیے نہیں ہو سکتی کہ میں تیرے باپ کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تیرا باپ قاضی ہے تو کیا ہوا، میں اس کو خبیث سمجھتی ہوں، اس نے میرا دل دکھایا ہے اور میں نے بھی اسے خوب ذلیل کیا ہے۔ اب وہ اپنی ذلت کا یوں بدلہ لینا چاہتا ہے کہ تجھ کو اپنے گھر میں رکھ کر اور اپنی سرپرستی میں لے کر عنان کو بہو بنا لے اور پھر مجھ سے بدلے لے۔“

یونس بھی ایک دم گرم ہو گیا، بولا۔ ”خاتون! میرے باپ کو گالیاں نہ دے، وہ ایک شریف انسان ہے۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہ جتنا شریف انسان ہے تو بھی جانتا ہے اور تجھ سے زیادہ میں جانتی ہوں۔“

یونس نے اور زیادہ گرمی دکھائی۔ ”میرے باپ کو تو کیا جانے گی، عضد الدولہ سے پوچھ، خلافت عباسیہ کے کسی امیر سے پوچھ، وہ بغداد کے معتبر ترین لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ تیری اور تیری بیٹی کی خوش قسمتی ہوگی اگر عنان کی شادی مجھ سے ہو جائے اور یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اگر میں جا ہوں گا تو عنان سے جبراً شادی کر لوں گا اور بغداد میں کوئی بھی شخص تیری حمایت اور میری مخالفت کی ہمت نہیں کرے گا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ پورا بغداد تیرا اور تیرے باپ کا حمایتی ہے تو جا اور انہیں اپنی حمایت میں بلا کیونکہ میں نے ابھی ابھی یہ طعنے فیصلہ کر لیا ہے کہ عنان کی شادی لیٹ سے ہو یا کسی اور سے لیکن تجھ سے نہیں ہو سکتی کیونکہ تو جس خبیث باپ کا بیٹا ہے وہ میری بیٹی کا خسر نہیں بن سکتا۔“

یونس نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”اے ذلیل

جولائی 2014ء کے شمارے کی ہشک

سرگزشت

ماہنامہ

اھنما

اس نوجوان کا احوال زیست جس نے نشے میں ڈوبی قوم کو بیدار کیا اور آج وہی قوم عالمی طاقت ہے

تاریکی کا آسیب

اپنے قلم کی قوت سے وہ تاریکین کو خوف میں مبتلا کر دیتا تھا۔ عالمی پیمانے پر مشہور مصنف کا احوال

الوداع

تلاش معاش میں ملکوں ملکوں پھرنے والے شخص کا زندگی نامہ، دلچسپ روداد

بھر وہی غلطی

اس کی بیٹی سے ایک بڑی غلطی سرزد ہونے والی تھی کہ ماں نے وہ چال چلی جو شرمات ثابت ہوئی

اسکے علاوہ

بھی بیس سے زائد سچے قصے، دلچسپ واقعات، سبق آموز سچے بیانیات، سلسلے وار طویل روداد، فلمی دنیا کے بھولے بسرے واقعات

اور

بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں آپ کو پڑھنا چاہیے

یونس کے پاس گیا تھا جو تاج کی کوٹھری میں چھپا ہوا تھا۔ قاضی نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ ”یونس! کیا تو یہاں موجود ہے؟ اگر ہے تو باہر آ اور مجھ سے چند باتیں کر۔“ کچھ دیر بعد یونس باہر آ گیا اور حیرت سے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”باوا جان! میں نے اس خبیث عورت کو اس لیے ہلاک کر دیا کہ وہ آپ کو گالیاں دے رہی تھی۔“ قاضی نے پرجوش آواز میں ڈانٹا۔ ”لیکن میں نے تجھے یہ نہیں کہا تھا کہ تو اس کو قتل کر آ۔ یہ تو نے بہت برا کام کیا، اب میں تجھے بچاؤں گا کس طرح؟“ یونس سر جھکائے قدوی بنا کھڑا رہا۔ قاضی نے اپنا سر پکڑ رکھا تھا۔ ”یونس! تو نے بہت غلط کام کیا۔“ یونس نے سرکشی سے جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ کیا، مجھے بھی کرنا چاہیے تھا اور میں اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں۔“ قاضی نے اسے ڈانٹا۔ ”یونس! خاموش رہ۔ تو نہیں جانتا کہ تو نے جو کچھ کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ تیرا باپ قاضی ہے لیکن یہ با اختیار قاضی قتل کے مقدمے میں تجھے معاف نہیں کر سکے گا کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو عدل و انصاف کی پیشانی پر سیاہ داغ لگا دوں گا۔“ یونس نے نیم پاگل کی طرح جواب دیا۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتا باوا جان۔“ قاضی نے کہا۔ ”اچھا تو یہیں رہ، باہر ہرگز نہ آنا۔ میں کچھ سوچتا ہوں۔“ قاضی یہ کہہ کر چلا گیا اور یونس اپنی ہتھیلیوں پر تھوڑی رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد تین سیاہیوں نے یونس کو گھیر لیا اور پھر اسے بے بس کر کے گرفتار کر لیا۔ ان تینوں نے یونس کو زنجیروں سے جکڑ دیا۔ یونس عالم یاس میں اپنے قید و بند کی پچھلی صعوبتیں یاد کر کے ہولنے لگا۔ ☆☆☆ یونس کی گرفتاری کے بعد قاضی، لیٹ کے پاس اس کے قہر میں پہنچ گیا۔ یہاں کا منظر ہی بڑا سوگوار اور ہولناک تھا۔ ابھی تک میت قہر ہی میں رگی تھی۔ آخری رسوم میں شریک ہونے والے جمع ہو رہے تھے۔ انہوں نے قاضی کو دیکھتے ہی کھڑے ہو کر احترام کیا۔ لیٹ بھی قاضی کو قہر میں آیا ہوا دیکھ کر اس کے پاس چلا گیا اور اسے نہایت ادب و احترام سے ایک کمرے میں بٹھا کر پوچھا۔ ”قاضی محترم! کیا قاتل کا کچھ پتا چلا؟“ قاضی نے رقت سے جواب دیا۔ ”قاتل گرفتار کر لیا

قاضی فوراً نکل آیا اور اپنے سامنے لیٹ کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ”لیٹ! کیا بات ہے؟ تجھے کس نے ستایا؟“ لیٹ نے جلدی جلدی واقعہ قتل سنا دیا۔ قاضی نے حیرت سے پوچھا۔ ”تاجر حمدون مغیث کی بیوہ کو یونس نے قتل کر دیا؟ یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟“ لیٹ نے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل درست کہہ رہا ہوں۔“ قاضی نے پوچھا۔ ”یونس ہے کہاں، وہ اس بیوہ کو قتل کر کے چلا کہاں گیا؟“ لیٹ نے جواب دیا۔ ”قاضی! یہ تیرا کام ہے کہ تیری ماں کے قاتل کا پتا لگا کر گرفتار کروادے۔ میں اسے کہاں تلاش کروں گا۔“ قاضی نے جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ”اچھا، اب تو یہ بتا کہ تیری سوتیلی ماں زندہ ہے یا مر گئی؟“ لیٹ نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”اس کا انتقال ہو گیا۔“ قاضی اچھل پڑا، بیوہ کی موت کا قاضی کو بھی ملال ہوا۔ غصے میں بولا۔ ”یہ بہت برا ہوا۔ یونس! تو نے یہ بہت برا کام کیا۔ تو اپنے کیے کی سزا پائے گا کیونکہ شرع بھی کہتی ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان۔ جان کے بدلے جان۔ میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔“ لیٹ نے کہا۔ ”میں اپنی مرحومہ ماں کے پاس جا رہا ہوں۔ قاتل کی گرفتاری اور اسے سزا دینا آپ کا کام ہے۔ میں دوبارہ پھر آؤں گا آپ کے پاس۔“ لیٹ چلا گیا۔ قاضی کچھ دیر کمر صم بیٹھا رہا، پھر آپ ہی آپ بولا۔ ”یونس! یہ تو نے کیا کر دیا؟ تو نے حمدون تاجر کی بیوہ کو ہلاک کیوں کر دیا حالانکہ میں اس کی بیٹی سے حیرتی شادی ضرور کروا دیتا اور اس کے بعد میں اس سے شادی کر لیتا۔ اس طرح اس کی پوری جائداد اور مال و زر میرے قبضے میں ہوتا۔ یونس! تو نے غلطی کی اور تیری پوری زندگی غلطیوں ہی میں گھری رہی ہے۔ تو نے حمدون تاجر کی بیوہ کو ہلاک کر دیا۔ تجھے اس کی سزا ملنا چاہیے۔ تو میرا بیٹا ہے تو کیا ہوا؟ میں دنیا کو دکھا دوں گا کہ ایک عادل اور منصف قاضی کے لیے سب برابر ہیں اور وہ اپنے بیٹے کو بھی معاف نہیں کرے گا تاریخ میں میرا بھی نام آئے گا لوگ میرے عدل و انصاف کے گن گایا کریں گے۔“ اس کے بعد قاضی اندر چلا گیا۔ وہ قہر میں موجود

ماں نے جواب دیا۔ ”تو اپنی نکوار شوق سے اتار دے میرے پیٹ میں۔ جب مجھے ان دونوں کا پتا معلوم ہی نہیں تو میں خاک بتاؤں گی ان کا پتا۔“ اب دربانوں اور یونس کے ساتھیوں میں بڑا سخت مقابلہ ہو رہا تھا۔ یونس نے غصے میں اپنی نکوار ماں کے پیٹ میں اتار دی اور چیخا۔ ”قناتی النار ستر۔“ ماں نے ایک چیخ ماری اور کہا۔ ”ستر میرے لیے نہیں، تیرے لیے ہے، میں شہید ہوں، مظلوم۔“ چیخ کی آواز لیٹ نے بھی سنی اور خنسا اور عنان نے بھی لیکن وقت اور موقع کی نزاکت نے انہیں ہلنے بھی نہ دیا۔ اتنی دیر میں دربان تینوں کو بھگا کر یونس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یونس نے اپنے ساتھیوں کو بھاگتے جو دیکھا تو خود بھی بھاگ کھڑا ہوا اور جتنی تیزی سے قصر میں داخل ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے فرار بھی ہو گیا۔ حملہ آوروں کے فرار ہوتے ہی دربانوں نے قصر کو اندر سے بند کر لیا اور چیخنے چلانے لگے۔ لیٹ بھی بھاگا ہوا اپنی زخمی ماں کے پاس پہنچا۔ خنسا اور عنان بھی نیچے آ گئیں اور ماں کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ ماں بے ہوش پڑی تھی اور خون بہہ بہہ کر فرش کے پتھر کو سرخ کر رہا تھا۔ اسی پتھر میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ یہ گڑھا ماں کے خون سے بھرنے لگا۔ لیٹ اور دربان خون کو بند کرنے کی تدبیریں کرنے لگے لیکن گھبراہٹ اور پریشانی میں کوئی ترکیب بھی یاد نہیں آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ خون کے زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ماں نے آخری ہنسی لی اور چل بسیں۔ عنان اور خنسا جتنیں مار مار کر رونے لگیں۔ لیٹ بھی رو دیا۔ دربانوں نے منہ لٹکا لیا، لیٹ سے کہا۔ ”رونے سے کام نہیں چلے گا، اس لیے ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ یونس کو اسی وقت گرفتار کروا دیا جائے ورنہ یہ فرار ہو جائے گا۔“ لیٹ کو یونس کا باپ قاضی یاد آیا۔ دربانوں سے کہا۔ ”تم قصر کا خیال رکھو، میں یونس کو گرفتار کروانے جا رہا ہوں۔“ لیٹ کی بدحواسی اور شکستہ دلی کا یہ حال تھا کہ وہ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور وہ پڑتا کہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کو اب بھی یونس کی طرف سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ جب وہ قاضی کے دروازے پر پہنچا تو دربانوں نے اسے روکا مگر یہ کسی دیوانے کی طرح اندر داخل ہو گیا اور آواز لگائی۔ ”قاضی لیبیب بخدی! دہائی ہے باہر نکل اور میرا مقدمہ سن اور میری مدد کر۔“

جان! اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ میں نے کہہ تو دیا کہ میں تیری سرپرستی قبول کرتا ہوں۔ تو مجھ پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر سکتا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تو خنسا کو بھی یہیں چھوڑ جا۔ اسے کہاں لیے پھرے گا۔

لیٹ نے کہا۔ ”نہیں، میں خنسا کو تو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔“

قاضی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مال و زر اور عنان کے بعد بھی ایک مسئلہ باقی رہتا ہے اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکلتا چاہیے۔“

لیٹ نے کہا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”مال و زر اور عنان کے بعد تیرے قصر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اس کا بھی بندوبست ہونا چاہیے۔“

لیٹ نے کہا۔ ”آپ نے بالکل صحیح سوچا۔ واقعی اس قصر کا کیا بنے گا، اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اس کا ایک ہی حل ہے قصر کو بیچ کر مال و زر میں تبدیل کر لیا جائے اور مال و زر کا امین میں بن سکتا ہوں۔“

لیٹ نے تردید سے کہا۔ ”جب واپس آؤں گا تو کہاں رہوں گا؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میرے پاس، میرے قصر میں اور اگر علیحدہ قصر کی ضرورت محسوس ہو تو دوسرا خرید لیتا۔“

لیٹ قاضی سے متفق ہو گیا۔ دونوں میں دوسرے کئی امور پر بھی باتیں ہوئیں اور چند گھنٹوں میں وہ دونوں اتنے بے تکلف اور ایک ہو گئے کہ واقعی دونوں باپ بیٹے معلوم ہونے لگے۔ آخر میں قاضی نے پوچھا۔

”تو توج کے لیے کب روانہ ہوگا؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ پہلے یونس کے مقدمے کا فیصلہ ہو جائے، اس کے بعد میں حج کے لیے منصوبہ بناؤں گا۔“

قاضی نے کہا۔ ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“

اس مقدمے کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ خلیفہ کا نائب

عضد الدولہ بھی اس میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا کہ یونس باپ کے روبرو قاتل کی حیثیت سے کھڑا کروایا جاتا اور قاضی اس پر

نظرس ڈالے بغیر اپنی کارروائی میں مشغول رہتا۔ آخر قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا کہ ”اگر مقتول کے ورثہ دیت کے عوض قاتل کو چھوڑنے پر آمادہ ہوں تو قاتل اور مقتول کے ورثہ

معاملات کر سکتے ہیں لیکن اگر دیت سے معاملہ طے نہیں پاتا

قاضی نے پوچھا۔ ”تو شادی کب کر رہا ہے؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”قاضی محترم! میں شادی بھی کر لوں گا لیکن ابھی یہ کام نہیں ہو سکے گا۔“

اس کے بعد اس نے اپنی منت کا سرسری طور پر ذکر کیا، کہا۔ ”اب جب تک میں دو سو فقرا اور مساکین کو کھانا

نہیں کھلاؤں گا اور شکرانے کا حج نہیں کروں گا، شادی نہیں کر سکوں گا۔“

قاضی نے کہا۔ ”تو یہ کام مشکل تو نہیں، جیسا کہ میں تجھ سے کہہ چکا ہوں کہ یونس کے بعد میں تجھے اپنا بیٹا بنانے

پر تیار ہوں۔ آج سے تو میرا بیٹا ہے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو پس و پیش کے بغیر کہہ سکتا ہے۔“

لیٹ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میرا ایک ہی کام آپ اچھی طرح کر سکتے ہیں جس کا اظہار میں چند دنوں بعد کروں گا۔“

قاضی اٹھ کر بیٹھ گیا، بولا۔ ”میں نے تجھ سے کہہ تو دیا کہ تو پس و پیش سے کام نہ لے۔ میں نے تجھے بیٹا یوں ہی

نہیں کہہ دیا۔ میں عملاً بھی ثابت کر دوں گا کہ میں تیرا باپ ہوں اور تو میرا بیٹا۔“

لیٹ قاضی کے پر خلوص جذبات اور دل کو موہ لینے والی پیشکش سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”اگر آپ کی یہ پیشکش

پر خلوص اور سنجیدہ ہے تو پھر آپ میری واقعی مدد کریں۔“

قاضی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آچکی تھی۔ جلدی جلدی بولا۔ ”میں نے کہہ تو دیا کہ اپنے کسی بھی

معاملے میں تو پس و پیش نہ رکھ اور اپنا سارا دکھ درد مجھ سے بیان کر دے۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”میں حج کرنے جاؤں گا، اپنے ساتھ خنسا کو تو لے جا سکتا ہوں لیکن عنان کو نہیں لے

جا سکتا کیونکہ وہ ابھی میری کچھ بھی نہیں ہے۔ میں برابر یہی سوچ رہا ہوں کہ اس کو کس کے پاس چھوڑ کر جاؤں۔ اب

ان حالات میں کہ آپ میری سرپرستی پر آمادہ ہو گئے ہیں اور پورے شہر میں امانت اور دیانت میں آپ کا کوئی جواب

نہیں اس لیے اگر میں عنان کو آپ کے پاس چھوڑ جاؤں گا تو کوئی حرج نہیں؟“

قاضی نے جلدی جلدی جواب دیا۔ ”بالکل، بالکل۔“

تو مجھ پر اعتماد کر سکتا ہے۔“

لیٹ نے مزید کہا۔ ”اور یہ کہ میں اپنا مال و زر بھی آپ ہی کے پاس رکھوا دوں گا کیونکہ اس کو کہاں اپنے ساتھ

لیے لیے پھروں گا۔“

قاضی نے فراخ دلی سے جواب دیا۔ ”عزیز از

خنسا نے اس رات لیٹ سے درخواست کی کہ ”اب وقت آ گیا ہے کہ تو مجھے آزاد کر کے دہن بنا لے۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”اب تو راہ میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں گئی، اس لیے میں تجھے دہن بنا لوں گا لیکن اگر

اجازت دے اور پسند کرے تو یہ کام عنان سے شادی کر لینے کے بعد انجام دوں۔“

خنسا نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ عنان سے شادی کرنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی، جسے

چاہے کر لے۔“

خنسا اور لیٹ نے وہ رات بڑے سکون سے گزاری اور صبح ہی صبح قاضی کے پاس چلا گیا کیونکہ قاضی نے اسے بلا یا تھا۔

قاضی کے محل کا طمطراق اور شان و شوکت دیکھ کر لیٹ پر بڑا اثر ہوا۔ عموماً قاضی سے ملنے کے لیے لوگوں کو زحمت

انتظار سے دوچار ہونا پڑتا تھا لیکن لیٹ نے اپنی آمد کی خبر جیسے ہی اندر بھجوائی اسے فوراً ہی بلا لیا گیا۔ اس وقت تک

قاضی بستر سے نہیں نکلتا تھا۔ لیٹ کو قاضی کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ قاضی نے اسے دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ ”تو آ گیا

اچھا کیا، میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”اس سانچے نے کنبے کے ہر فرد کو نیم جان کر دیا ہے۔ ابھی میرا دل تو نہیں چاہتا تھا آپ

کے پاس آنے کو۔ لیکن میں نے سوچا کہ اس غم کے لیے پوری زندگی پڑی ہے اس لیے جو کام کرنے کے ہیں ان کو

التوا میں ڈالنا ٹھیک نہیں۔“

قاضی نے نظریں نیچی رکھیں، بولا۔ ”تو بڑا سمجھ دار نوجوان ہے۔ اے کاش تو میرا بیٹا ہوتا تو میں بے حد خوش

ہوتا لیکن خیر اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

لیٹ نے پوچھا۔ ”یونس کا کیا ہوا؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”یونس نے جو کچھ کیا ہے اس کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا ہے۔ عضد الدولہ نے مجھے طلب کیا

تھا اور مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا تیرے بیٹے نے کسی کو قتل کر دیا ہے؟ میں نے پوری تفصیل بتادی۔ جس پر عضد الدولہ نے

رائے دی کہ یہ مقدمہ میں کروں گا کیونکہ تو یونس کا باپ ہے۔ اس لیے حج فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ اس پر میں نے یہ جواب دیا

کہ اس مقدمے کا حج فیصلہ تو میں ہی کروں گا اور بظاہر والوں کو دکھا دوں گا کہ ایک دیانت دار اور منصف حرا

قاضی کو کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔“

لیٹ نے کہا۔ ”مجھے بھی آپ سے یہی امید ہے۔“

گیا ہے اور اسے اس کے کیے کی مزا مل کر رہے گی۔“

لیٹ اور قاضی کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ قاضی قصر کی مالیت اور قصر میں موجود چیزوں کی قیمت کا اندازہ لگاتا

رہا۔ اس کو یونس پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا جس نے اس کا بیٹا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ اس نے لیٹ سے کہا۔ ”نوجوان! میں

بیوہ کی بچی سے تعزیت کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تو اس سے ملوانا پسند کرے گا؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی تامل نہیں، ویسے عنان کا برا حال ہے۔“

قاضی کی خواہش پر عنان کو وہیں بلوایا گیا۔ قاضی نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، کہا۔ ”بیٹی! تیرے ساتھ جو کچھ ہوا، میں شرمندہ ہوں۔ یہ ایک ناقابل

تلافی نقصان ہے لیکن پھر بھی اگر اس کی تلافی ہو سکتی ہو تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

عنان تسکین لے لے کر رونے لگی۔ لیٹ نے تسلیاں دیں لیکن تسلیوں سے اس کے غم میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔

قاضی نے لیٹ سے کہا۔ ”تو نے یونس کو اپنا بھائی بنا کر سخت غلطی کی تھی۔ اب میں اس کی تلافی اس طرح کر سکتا

ہوں کہ یونس کی جگہ تجھ کو اپنا بیٹا بنا لوں۔“

عنان کی سسکیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ لیٹ نے قاضی کی بات پر خوشی کا اظہار کیا لیکن یہ موقع خوش ہونے کا

نہیں تھا، اس نے پوچھا۔ ”یونس کا کیا ہوگا؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا۔“

خنسا بھی آگئی، قاضی نے اس حسین و جمیل کنیز کو دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”میری محبوبہ بھی اور کنیز بھی۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”خوب، ماشاء اللہ، خدا نے کیا چیز بنائی ہے۔“

میت اٹھی تو گھر میں کہرام برپا ہو گیا۔

مال کی موت کے بعد پہلی رات بڑی افسردہ اور سوگوار محسوس ہوئی۔ اس رات تنہائی میں لیٹ کو اپنی وہ دعا یاد

آئی جس میں اس نے خدا سے یہ دعا کی تھی کہ وہ کسی طرح یونس سے نجات دلا دے اور عنان کو اس سے وابستہ کر دے۔

اس کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ خدا نے اسے یونس کے شر سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی تھی اور اب اس پر یہ واجب ہو گیا

تھا کہ وہ پہلے حج شکرانہ کرے اور دو سو فقرا اور مساکین کو کھانا کھلائے، اس کے بعد عنان سے شادی کرے۔

لیکن اس منت کا خنسا یا عنان کو کوئی علم نہیں تھا چنانچہ

تو پھر قاتل کو سزائے موت دے دی جائے۔“

یونس چیخا۔ ”میری دیت کون دے گا؟“

قاضی کوئی جواب دیے بغیر عدالت سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

یونس نے سپاہیوں سے کہا۔ ”لوگوں! میرے باپ کو بلاؤ تاکہ وہ لیٹ سے دیت کی رقم ملے کر کے ادا کرے اور مجھے رہائی ملے۔“

جب قاضی کو اس کا علم ہوا تو اس نے جواب میں کہلوا دیا۔ ”میں اس کو پہلے ہی عاق کر چکا ہوں اس لیے میں دیت کا معاملہ کیوں ملے کروں۔“

یونس پاگلوں کی طرح چیختے چلانے لگا۔ ”او ظالم انسان! میں نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔ تو قاضی یا میرا باپ نہیں، ایک ظالم اور سفاک انسان ہے اور مکافات عمل میں تو بھی اپنے کیفر کو دار کو پہنچے گا۔“

فیصلے کی پورے بغداد میں دھوم مچ گئی۔ عضد الدولہ نے قاضی کے گھر آ کر اس کو داد دی کہ قاضی کو اتنا ہی دیانت دار اور منصف ہونا چاہیے۔ لیٹ نے سکون کی سانس لی۔ خنسا بھی مطمئن ہوئی اور عنان کے دل سے اپنی ماں کی یاد میں ایک بار پھر ہوک سی نکلی۔

☆☆☆

یونس کو قتل کر دیا گیا اور لیٹ اس طرف سے مطمئن ہو کر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اب اس کا زیادہ وقت قاضی کے پاس اس کے مشوروں میں گزرتا۔ اس نے اپنے ارادوں کا ذکر عنان سے نہیں کیا۔ عنان کو بس اتنا ہی معلوم تھا کہ اب لیٹ اس سے شادی کر لے گا لیکن خنسا کو یہ معلوم تھا کہ شادی، حج اور مدینہ منورہ میں رسول مقبولؐ کے مزار اقدس کی زیارت کے بعد واپسی پر ہوگی اور اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ اس کے بعد خنسا کو بھی آزاد کر دیا جائے گا اور وہ بھی عنان کی طرح بلند مرتبہ آزادی بن جائے گی۔

لیٹ نے دو سو فخر اور مساکین کو کھانا کھلایا اور عنان کو اپنے منصوبے سے مطلع کیا۔ وہ شام سے ذرا پہلے عنان کو قصر کے پودوں والے حصے میں لے گیا۔ اس نے بڑی آزادی سے کہا۔ ”عنان! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس وقت میں تجھ سے جس موضوع پر بات کرنے والا ہوں، تیری ماں کی موجودگی میں، میں اس طرح یہاں آنے یا بات کرنے کا خیال تک دل میں نہ لاسکتا تھا۔“

عنان نے تردید کی، بولی۔ ”یہ غلط ہے اور میری ماں پر ایک قسم کی تہمت ہے کیونکہ میری ماں کی موجودگی میں یونس

اور تم دونوں ہی نے مجھ سے بڑی آزادی سے باتیں کی ہیں۔“ لیٹ نے جواب دیا۔ ”اب یہ بتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ عنان نے کہا۔ ”یہ سوال بھی فضول ہے کیونکہ تو خود بھی جانتا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔“

لیٹ نے منہ بنا کر کہا۔ ”عنان! بات کیا ہے، یہ تو اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کر رہی ہے؟“

عنان نے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ اب اس قصر میں میری کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے۔ کاروبار، قصر اور قصر کے مال و زر اور سامان کا حقیقی حق دار تو سمجھا جائے گا۔ میں تیری دست نگر ہو گئی ہوں۔ اب تو خود ہی سوچ کہ تیرا مجھ سے یہ پوچھنا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ فضول اور مہمل سوال ہے یا نہیں؟“

لیٹ نے چڑ کر کہا۔ ”عنان! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں تجھے چاہتا ہوں۔ تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں اب تک اس قصر میں نہ ہوتا اور اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہوتا۔ تیری شادی یونس سے ہو چکی ہوتی۔“

عنان سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ لیٹ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اس کے چہرے پر جھک گیا۔ بے چینی سے پوچھا۔

”ارے تو رو رہی ہے! کیوں، یہ رو کیوں رہی ہے؟ بات کیا ہے؟“

عنان نے ایک دم نظریں اٹھائیں اور پوچھا۔ ”اگر میں رونے کی وجہ بتا دوں تو کیا تجھ پر اس کا اثر ہوگا؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”میں اس پر غور ضرور کروں گا۔“ عنان نے کہا۔ ”تو سن! میں چاہتی ہوں کہ تو خنسا کو

ملگ کر دے۔ میں اپنے حصے میں کسی کو شریک نہیں دیکھ سکتی۔“ لیٹ نے سختی سے کہا۔ ”میں مرد ہوں اور تو عورت۔ تو

میرے فیصلوں میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ میرا دوسرا فیصلہ بھی سن لے۔ میں عنقریب حج کرنے چلا جاؤں گا۔ خنسا

میرے ساتھ جائے گی لیکن تو بغداد ہی میں رہے گی کیونکہ مردست تو میرے لیے غیر ہے۔ میں واپس آ کر شادی کروں گا تجھ سے۔“

عنان نے گھبرا کر پوچھا۔ ”آخر میں کس کے ساتھ رہوں گی؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”تو قاضی کے ساتھ رہے گی۔ قاضی لبیب بخدی کے ساتھ کیونکہ اس شہر میں اس سے زیادہ

ایمان دار، اس سے زیادہ منصف مزاج دوسرا نہیں ملے گا۔“ عنان نے کچھ عجیب نظروں سے لیٹ کی طرف

حساب دوستان

دیکھا، پوچھا۔ ”تو تو مجھے میری ماں کے قاتل کے باپ کے حوالے کر کے جائے گا؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس قاضی کے حوالے کر کے جاؤں گا جس نے تیری ماں کے قاتل کو سزائے موت دی۔“

عنان نے بے بس ہو کر کہا۔ ”جو تیری سمجھ میں آئے کر۔ میں خاموش رہوں گی۔“

رات گئے تک یہ بات عام ہو گئی کہ لیٹ، خنسا کو لے کر حج کرنے چلا جائے گا اور عنان قاضی کے پاس بطور امانت رہے گی۔ یہ خبر سن کر بوڑھا غلام کھانسا ہوا لیٹ کے پاس چلا گیا۔ لیٹ، خنسا سے باتیں کر رہا تھا۔ ان دونوں نے بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنی تو اس کا انتظار کرنے لگے۔ بوڑھے نے دروازے پر دستک دی۔ لیٹ نے کہا۔

”اندر آ جا۔“ جواب کے ملتے ہی بوڑھا اندر داخل ہو گیا اور لیٹ

سے نظریں ملانے بغیر سوال کیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ میرے آقا تو خنسا کو ساتھ لے کر حج کرنے جا رہا ہے اور عنان کو

بطور امانت قاضی کے پاس چھوڑ جائے گا؟“ لیٹ نے ناگواری سے کہا۔ ”ہاں تو نے صحیح سنا ہے۔

میں خنسا کے ساتھ بہت جلد حج کرنے چلا جاؤں گا اور عنان میری عدم موجودگی میں قاضی کے پاس رہے گی۔“

بوڑھے نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”میرے آقا! تو ایک بار پھر غلطی کر رہا ہے۔“

لیٹ نے کہا۔ ”وہ کس طرح؟ تو ضرورت سے زیادہ شکی ہے حالانکہ قاضی کی امانت اور دیانت کا پورے بغداد میں شہرہ ہے۔“

بوڑھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ ”میرے آقا! ذرا سوچ تو۔ کیا میں نے اسی طرح یونس کی مخالفت نہیں کی تھی؟“

”ہاں کی تھی مخالفت پھر؟“

بوڑھے غلام نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”یہ قاضی بھی یونس کا باپ ہے اور یہ یونس سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔“

لیٹ نے درشتی سے کہا۔ ”کوئی اور بات کر۔ میں اس عادل اور منصف قاضی کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں

کروں گا۔ جس نے حق و انصاف پر اپنے بیٹے کو قربان کر دیا۔“ غلام پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد

اپنے حواس میں آیا تو بولا۔ ”میرے آقا! تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اس نے اپنی اس اولاد کو حق و انصاف پر قربان کیا ہے جو سب سے زیادہ ناخلف تھی اور جس کی بابت میں نے

یہ بھی سنا ہے کہ قاضی نے اس کو عاق کر دیا تھا ورنہ اس کی چیتا اولادیں اور بیویاں آج بھی اہواز میں رہ رہی ہیں اور انہیں وہ بغداد میں لانا بھی پسند نہیں کرتا۔“

لیٹ نے پوچھا۔ ”تجھے اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا ہے؟“ ”نہیں، کیونکہ اس سے زیادہ اہم کوئی اور بات ہو بھی

نہیں سکتی۔“ ”تو اب تو اپنی کٹھری میں چلا جا اور اپنی زبان بند رکھ۔ یہ اہواز نہیں بغداد ہے۔“

غلام نے لیٹ کے چہرے کو دیکھ کر جاتے ہوئے کہا۔ ”اب خدا! آپ کو شرمندہ نہ کرے ورنہ مجھ کو تو ڈر ہی لگ رہا ہے۔“

غلام کھانسا ہوا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی خنسا نے کہا۔ ”دیکھ لیٹ! میں تجھے

مشورہ دیتی ہوں کہ تو غلاموں وغیرہ کو زیادہ منہ نہ لگا کر۔ تو نے دیکھا یہ کیسی باتیں کر رہا تھا تجھ سے۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”مجھ میں اور تجھ میں یہی فرق ہے کہ میں مجرم کو معاف کر دیتا ہوں۔ میں انتقام وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا۔“

خنسا نے کہا۔ ”تب پھر سوچ کس بات میں، جو کچھ کرنا ہے جلد از جلد کر لے۔ یہ وقت دوبارہ نہیں ہاتھ آئے گا۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”اس وقت تو بس ایک ہی بات سوچتا رہتا ہوں وہ یہ کہ میں کس طرح عنان کو بھی راضی کر لوں۔“

خنسا نے کہا۔ ”وہ بڑی سرکش لڑکی ہے لیکن حالات نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔“ وہ حصے بخرے پر آمادہ

نہیں ہے حالانکہ میں سچ کہتی ہوں کہ اگر وہ مٹنی انداز میں نہ سوچے تو اسے بڑے فائدے پہنچ سکتے ہیں۔“

لیٹ نے کہا۔ ”اب کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔ خنسا! معلوم نہیں کیا بات ہے کہ میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ کل رات تو

میں اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ معلوم نہیں کیا کیا بڑا تار رہا۔ کیا تو اس پہلو پر نہیں سوچتی کہ میں نے بھی بھی.....“

خنسا نے جواب دیا۔ ”میں سب کچھ سوچتی ہوں لیکن اب آج کل میں تیرے ساتھ سفر کو سوچتی رہتی ہوں۔“

لیٹ نے خوش ہو کر کہا۔ ”سفر تو کرنا ہی پڑے گا.....“ ابھی اس کا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ عنان اس کے

کمرے میں روتی ہوئی داخل ہوئی۔ لیٹ نے پوچھا۔ ”عنان! کیا بات ہے؟ تو کیوں رو رہی ہے اور اس

وقت میرے کمرے میں کس طرح آ گئی؟“ لیکن عنان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ روتی رہی۔

خدا، عنان کو جلانے کے لیے اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا سیدھا ہاتھ لیٹ کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ عنان کے رونے کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ زور زور سے سسکیاں اور ہچکیاں لینے لگی۔

لیٹ اپنی جگہ سے اٹھا اور عنان کے برابر جا کھڑا ہوا، پوچھا۔ ”ہاں، اب بتا بات کیا ہوئی؟“

عنان بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ انک انک کر بولی۔ ”لیٹ! تو مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔“

لیٹ نے عنان کو اپنی آنکھوں میں لے لیا اور بڑی محبت سے کہا۔ ”عنان! تو مت رو۔ تیرا دل بہت دکھا ہوا ہے، کچھ دن تو غموں سے پیچھا چھڑا کر رہ لے۔ گھبرا نہیں، اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔“

عنان نے رو رو کر کہا۔ ”میں اپنے بستر پر پڑی، بڑی دیر سے کروٹیں بدل رہی تھی، نیند کا کوسوں پتا نہیں تھا کہ اچانک مجھے خوف سا محسوس ہوا اور میں اپنی جان بچا کر یہاں چلی آئی۔“

لیٹ نے تسلی دی۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں، تیرا کمرایہاں سے اتنی دور تو نہیں ہے اگر تو آواز دے کر بلائے تو میں بھاگ کر آ سکتا ہوں۔ درنہ یوں بھی راتوں کو تیرے کمرے کی دیکھ بھال کرتا رہوں گا۔“

عنان نے کہا۔ ”لیکن میں اب اس کمرے میں رہوں گی خدا کے ساتھ۔“

لیٹ نے خدا کی طرف دیکھا اور مسکراتے لگا، بولا۔ ”اگر عنان، خدا کے پاس رات گزارنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس کمرے میں رہ۔“

خدا نے پس و پیش کیا۔ ”لیکن میرے ہی کمرے میں عنان کا رہنا کیا ضروری ہے۔ یہ میرے برابر والے کمرے میں بھی رہ سکتی ہے جو خالی پڑا ہوا ہے۔“

عنان نے خدا سے کام لیا۔ ”اگر میں تیرے ساتھ رہوں تو اس میں تجھے کیا اعتراض ہے؟“

خدا نے منہ بنایا۔ ”مجھے کیا اعتراض ہوگا لیکن کیا تو نہیں جانتی کہ میرے ساتھ لیٹ بھی رہتا ہے۔ کیا تو لیٹ کے ساتھ بھی رہ سکتی ہے؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”لیٹ کسی اور کمرے میں چلا جائے گا۔“

خدا نے لیٹ کو مخاطب کیا۔ ”لیٹ! میرا خیال ہے عنان خوف زدہ نہیں ہے بلکہ اس کو احساس تنہائی پریشان کرتا ہے۔“

لیٹ نے آنکھ کے اشارے سے خدا کو منع کیا کہ وہ بولنے میں احتیاط سے کام لے لیکن خدا پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ رک کر پھر بولی۔ ”جب عنان بذات خود خیال نہیں کر رہی تو میں تکلف اور شرم و حیا سے کیوں کام لوں۔ اس کا مرض میری سمجھ میں آ گیا ہے اور اس کا میں ہی علاج بتا سکتی ہوں۔“

عنان خدا کی صورت دیکھنے لگی۔ خدا نے کہا۔ ”اس کو تیری ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ مرد کی ضرورت چنانچہ جب تنہائی میں عنان یہ سوچتی ہوگی کہ وہ ایکی بستر پر کروٹیں بدل رہی ہے اور اس کے برعکس میں تیرے ساتھ جو اختلاف ہوں تو اس کا برا حال ہو جاتا ہوگا۔“

عنان غصے میں کھڑی ہو گئی۔ ”بے شرم، بے غیرت! یہ تو میرے لیے کہہ رہی ہے۔“

لیٹ نے محسوس کر لیا کہ خدا شر پر آمادہ ہے اس لیے وہ عنان کا ہاتھ پکڑ کر باہر لیے چلا گیا اور جاتے جاتے خدا سے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“

خدا نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن عنان کا مزاج برہم تھا۔ ”ماں کے بعد اس نے جارحانہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ میں جب تک خاموش ہوں خاموش ہوں لیکن جس دن بھی میں نے یہ طے کر لیا کہ اس قصر میں یا تو خدا رہے گی یا میں، بس اسی دن اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔“

لیٹ نے اس کو سمجھایا۔ ”عنان! زیادہ غصہ نہ کر، میں اس کو سمجھا دوں گا۔“

عنان لیٹ کو اپنے کمرے میں لے گئی اور بے اختیار چٹ گئی، بولی۔ ”لیٹ! میں خدا کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔ میں ایک بار پھر تجھ پر یہ واضح کیے دے رہی ہوں کہ اگر تجھ کو مجھ سے شادی کرنا ہے تو خدا کو رخصت کرنا پڑے گا۔ ہم دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

لیٹ نے اس کی پشت تھپتھپائی اور اسے تسلیاں دینے لگا۔ ”مت گھبرا عنان۔ یہ تمہاریاں ہمیشہ نہیں رہیں گی۔ میں اس کو سمجھا دوں گا اور وہ تیرا ادب کرنے لگے گی۔“

عنان نے لیٹ کو دھکیل کر دوڑ کر دیا اور غور سے اس کی شکل دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ میرا ادب کرنے لگے گی؟ وہ جو تیرا ادب نہیں کرتی، میرا کس طرح ادب کرے گی؟“

لیٹ نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ اس وقت عنان کا دماغی توازن صحیح نہیں ہے، بولا۔ ”اچھا رات بھر آرام کر لو۔ میں تم دونوں سے صبح اس موضوع پر بات کروں گا اور جو کچھ تو چاہتی ہے وہی ہوگا۔“

مانوں کا لیکن اخلاقاً مجھے خدا کو بتا ضرور دینا چاہیے تاکہ وہ میرا انتظار نہ کرے۔“

عنان بھاگ کر دروازہ بند کر آئی، بولی۔ ”میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔ آج تو یہیں میرے ہی کمرے میں رہے گا۔“

لیٹ بے بس ہو گیا۔ عنان نے دوسرے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو اس پر سو جا۔“

لیٹ حیران پریشان کم صدم دوسرے بستر پر جا کر دروازہ ہو گیا لیکن اس نئی صورت حال نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔

عنان اپنے بستر سے اسے فکر مند دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی وہ خدا کو ستا کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ بہت یادگار رات تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے دور الگ الگ بستروں پر کروٹیں بدلتے رہے۔ عنان کا حال زیادہ برا تھا۔

لیٹ کو رہ رہ کر خدا کا خیال آتا رہا۔ اس نے کئی بار یہ بھی ارادہ کیا کہ جب عنان سو جائے تو وہ اس کے کمرے سے چلا جائے لیکن وہ جب بھی اٹھا عنان نے آواز دی۔ ”کہاں؟“

اور لیٹ پھر لیٹ گیا۔ اسے شرارت کہا جائے یا امتحان؟ عنان کو اس میں مزہ بہت آیا لیکن خدا چونک گئی۔ وہ رات بھر لیٹ کا انتظار کرتی رہی اور جب زیادہ کوفت محسوس کی تو غصے میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور یہ طے کر لیا کہ لیٹ کتنا ہی چپچپے چلائے وہ دروازہ نہیں کھولے گی لیکن پوری رات اس انتظار میں گزر گئی مگر لیٹ نہیں آیا۔

صبح عنان نے لیٹ کو کامیاب قرار دیا لیکن خدا نے منہ سجایا۔ لیٹ اسے دیر تک سمجھاتا رہا اور کہا کہ ”عنان بہت جذباتی ہو رہی تھی اس لیے اس کے پاس رکنا بہت ضروری تھا۔ تیرے ساتھ تو میں رہتا ہی ہوں۔ اس کے علاوہ صبح کرنے تو میرے ساتھ ہی جائے گی۔“

خدا نے جواب دیا۔ ”حاجیوں کے قافلے روانہ ہونے والے ہیں اس لیے اب تو سفر کی تیار کر اور اس کے علاوہ جو کچھ کرنا ہے وہ بھی کر لے تاکہ عین وقت پر کوئی امر سفر میں مانع نہ آئے۔“

لیٹ قصر سے نکلا اور سیدھا قاضی کے پاس پہنچا لیکن قاضی گھر میں موجود نہیں تھا وہ عضد الدولہ کے پاس گیا ہوا تھا۔ ان دونوں عضد الدولہ بھی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا اور اس کے بھائی اور بیٹے اس فکر میں تھے کہ کسی طرح سازش یا جنگ کے ذریعے عضد الدولہ کو خلیفہ کی نیابت سے معزول کر کے خود اس کی جگہ لے لیں۔ ان نازک لمحوں میں عضد الدولہ کو قلعہ مشیروں کی ضرورت تھی اور قاضی لبیب

عنان اپنے بستر پر گر کر زار و قطار رونے لگی۔ لیٹ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور سمجھانے لگا۔ ”عنان! اگر میں نے منت نہ مانی ہوتی تو تجھ سے فوراً ہی شادی کر لیتا لیکن اب میں عنقریب حج کے لیے روانہ ہو جاؤں گا اور جلد از جلد واپس آ کر تجھ سے شادی کر لوں گا۔“ پھر پیچھے گھوم کر دیکھنے لگا کہ کہیں خدا تو نہیں آ گئی۔ مطمئن ہونے کے بعد کہا۔ ”اور اس وقت تو جو کچھ کہے گی میں مان لوں گا یہاں تک کہ خدا کو بھی الگ کر سکتا ہوں۔“

عنان نے ایک دم اٹھ کر آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تو یہ دل سے کہہ رہا ہے؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یہ دل سے کہہ رہا ہوں۔“

عنان نے پوچھا۔ ”میں تیرا امتحان لوں؟“

”لے امتحان، میں امتحان میں پورا اتروں گا انشا اللہ۔“

”تیرا امتحان یہ ہے کہ آج کی رات تو میرے ہی کمرے میں رہے گا، خدا کو اکیلے رہنے دے۔“

لیٹ نے کہا۔ ”تیری بدنامی تو نہیں ہوگی اس میں؟“

”تو میری بدنامی سے مت ڈر، جب میں خوف زدہ نہیں ہوں۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں رہ جاؤں گا لیکن تو نے جو کچھ کہا ہے اس پر ایک بار پھر غور کر لے کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔“

عنان نے جواب دیا۔ ”میں نہیں پچھتاؤں گی بلکہ اس امتحان میں دو اطمینان حاصل کر لوں گی، ایک تو یہ کہ اگر تو نے میری بات مان لی اور پوری رات میرے پاس رہا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تو اپنے قول و قرار میں سچا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا سکون یہ ہوگا کہ میں خدا کو رات بھر آتش حسرت میں جلاؤں گی اور اسے بھی یہ معلوم ہو سکے کہ رقابت اور حسد کی سوزش کیا ہوتی ہے۔“

لیٹ سوچ میں پڑ گیا کیونکہ سردست اس پر عمل کرنا بہت مشکل تھا، خدا ناراض ہو جائے گی۔

عنان نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہا ہے؟ دروازہ اندر سے بند کر کے اس کمرے میں رہ جا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

لیٹ نے کہا۔ ”اچھا یہ اجازت تو دے گی کہ میں خدا سے کہہ دوں کہ وہ میرا انتظار نہ کرے۔ میں عنان کے کمرے میں آرام کروں گا۔“

عنان نے حتیٰ سے کہا۔ ”اس کی بھی ضرورت نہیں۔“

لیٹ نے عاجزی سے کہا۔ ”عنان میں تیرا ہی حکم

بخدی ان مشیروں میں سرفہرست تھا۔

☆☆☆

قاضی نے لیٹ کو وہ پیار دیا کہ اسے زندگی بھر۔۔۔ کہیں سے نہ ملتا تھا۔ اس نے قاضی کے مشورے پر قصر خالی کر دیا اور قاضی کے قصر میں منتقل ہو گیا۔ خضاء، عنان اور بوڑھا غلام سبھی یہاں آ گئے۔ قاضی نے اس سب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس نے عنان سے چند دنوں ہی میں ایسا برتاؤ کر لیا کہ قاضی کا دم بھرنے لگی لیکن بوڑھا غلام بدستور ناراض تھا۔ اس لیے لیٹ سے صاف صاف کہہ دیا۔

”آقا! یا تو مجھے اپنے ساتھ لے چل ورنہ میں کہیں اور چلا جاؤں گا کیونکہ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔“ لیٹ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”تو ہمیشہ تو پیار رہتا ہے اس لیے میں تجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ سفر کی صعوبتیں تیرے بس کی نہیں۔ اب رہا سوال کہ تو اس گھر میں نہیں رہے گا تو کہاں رہے گا؟ تو جہاں مناسب سمجھ رہے۔“

☆☆☆

لیٹ نے اپنا قصر فروخت کر دیا۔ کاروبار قاضی کے سپرد کر دیا کہ واپسی تک نگرانی کرتا رہے۔ اپنا سامان اور مال و زر قاضی کے پاس امانت رکھوا دیا۔ قاضی کے پاس رہتے ہوئے اس نے قاضی کی امانت اور دیانت کا بھی اچھی طرح مشاہدہ کر لیا تھا۔ اس نے قصر کے ایک بڑے حصے میں لوگوں کی امائیں رکھی دیکھیں۔ اس کے پاس ہر روز لوگ امائیں واپس لینے اور جمع کروانے آتے رہتے تھے اور قاضی ہر ایک کو خوش دلی اور خندہ پیشانی سے فارغ کر دیتا۔ حاجیوں کے قافلے جا رہے تھے۔ قاضی نے لیٹ کو مشورہ دیا کہ وہ حج کرنے تنہا جائے تو بہتر ہے اس طرح وہ جلد ہی واپس آ سکتا ہے اور سفر بھی آسانی سے کر سکتا ہے لیکن لیٹ، خضاء کو ہر حال میں اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

”نہیں، میں نے خضاء سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کو ساتھ لے جاؤں گا اس لیے خضاء کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ قاضی چپ ہو گیا۔

لیٹ پڑاؤ پر گیا جہاں قافلے رکا کرتے تھے۔ وہ سفر کی معلومات حاصل کرتا رہا گھر میں قاضی نے خضاء کو سمجھایا۔ ”لوکی! تو اس سفر میں خواخوہان ہکان ہونے کیوں جائے گی، یہیں عنان کے ساتھ رہ جا۔“

خضاء نے جواب دیا۔ ”نہیں میں لیٹ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“

قاضی نے اس کے سراپے کو بڑے فور سے دیکھا اور جسم کے ایک ایک حصے کا جائزہ لیا پوچھا۔ ”لوکی! کیا یہ درست ہے کہ تجھے اہواز میں میرے مرحوم بیٹے یونس نے خرید لیا تھا؟“

خضاء اس سوال پر چونک گئی، آہستہ سے جواب دیا۔ ”ہاں لیکن آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟“ قاضی نے کہا۔ ”اور یہ بھی درست ہے کہ یونس نے تجھے بطور نذرانہ لیٹ کے حوالے کر دیا تھا؟“

خضاء نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بھی درست ہے مگر ان سوالوں سے آپ کا مقصد؟“

قاضی نے مسکرا کر کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں اگر چاہوں تو شرعاً تجھے واپس لے سکتا ہوں کیونکہ یونس کی ہر چیز میری ہے اور بیٹے کا مال باپ پر جائز ہے۔“ خضاء گھبرا گئی کہ قاضی یہ کیسی باتیں کر رہا ہے، یہ اس کو کیا ہو گیا ہے؟

قاضی نے خضاء کو سمجھایا۔ ”لوکی! اگر تو پسند کرے تو لیٹ کے ساتھ جانے سے انکار کر دے، میں اس کی عدم موجودگی میں تجھے آزاد کر کے کسی سے نکاح کر دوں گا اور تو کسی کی بیوی بن جائے گی۔“

خضاء اور زیادہ پریشان ہو گئی، بولی۔ ”واپس نہیں رکوں گی، میں لیٹ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“

قاضی نے ہنس کر کہا۔ ”اور میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ اگر تو عزت اور کوئی مقام چاہے گی تو میں خود بھی تجھ سے شادی کر سکتا ہوں لیکن یہ بھی تیری مرضی پر منحصر ہے، اگر پسند کرے تو ورنہ کوئی بات نہیں۔“

خضاء نے قاضی کے روپ کی یہ جھلک آج پہلی بار دیکھی تھی، بولی۔ ”میں لیٹ کے ساتھ خوش ہوں اور اس کے ساتھ ہی رہوں گی۔ مجھے شہرت، عزت یا کوئی مقام نہیں چاہیے۔“

قاضی نے افسوس سے کہا۔ ”تیری مرضی، میں تجھے مجبور نہیں کروں گا لیکن ایک بات کا خیال رہے۔ اس وقت ہم دونوں میں جو باتیں ہوئی ہیں انہیں اپنے ہی تک رکھنا۔ کسی اور سے ذکر نہ کرنا کیونکہ یہ سب مذاق تھا اور اگر یہ مذاق نہ بھی ہوتا بھی اگر تو نے میری گفتگو کا ذکر لیٹ یا کسی اور سے کر دیا تو پھر میں واقعی سنجیدہ ہو جاؤں گا اور شرعاً اور قانوناً میں تجھے حاصل کر لوں گا کیونکہ میں قاضی ہوں اور شرع اور فقہ کو مجھ سے زیادہ دوسرا نہیں جان سکتا۔“

خضاء نے خاموشی اختیار کی کیونکہ وہ قاضی سے الجھتا نہیں چاہتی تھی۔ قاضی نے کچھ دیر تو اس کے جواب کا انتظار

حساب دوستاں

قاضی کھٹکا بولا۔ ”اوشیطان کے ہم مثل! اپنے آقا کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر۔“

لیٹ نے ہنس کر کہا۔ ”قاضی محترم! یہ قابل معافی ہے کیونکہ اس نے جو کچھ کہا ہے میری محبت کے جوش میں کہا ہے۔“ لیٹ نے ہر ایک سے باری باری معاف کیا۔ قاضی نے بڑی گرم جوشی سے لیٹ کو گلے لگایا۔ لیٹ کے پیچھے خضاء کھڑی تھی۔ قاضی نے لیٹ کے کاندھے کے اوپر سے خضاء کو گھورا، وہ نظروں ہی نظروں میں خضاء کو دھکی دے رہا تھا کہ خبردار جو زبان کھولی۔

☆☆☆

قافلہ منزلیں طے کرتا اور منزلوں پر آدمیوں کا اضافہ کرتا مکہ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جب یہ قافلہ مکہ کے قریب پہنچا تو پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ مقدس شہر انہیں دور سے نظر آیا۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ لیٹ کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ خیموں کا شہر آباد ہو گیا۔ لوگوں کا فرط جوش سے برا حال تھا۔ قرین ہی میں لوگوں نے احرام باندھا اور عشاء کے بعد کعبہ کی جانب میں ٹریب۔ انہوں نے مقام منترم پر کھڑے ہو کر خشوع و خضوع سے دعائیں مانگیں کیونکہ یہاں کی دعا باب اجابت تک ضرور پہنچتی ہے۔ لیٹ نے زور زور سے دعا مانگی۔ ”اے اللہ! العالین! تو نے جس طرح مجھے کامیاب و کامران کیا ہے اس طرح میرے دوستوں اور جاننے والوں کے ساتھ کر۔ مجھے واپس بخیریت جانا نصیب کر۔“

لیکن خضاء رو رو کر دوسری ہی دعا مانگ رہی تھی۔ ”اے میرے مولا! تو عظیم و بصیر ہے اور خوب جانتا ہے کہ مجھے کیا دعا مانگنی چاہیے۔ اب لیٹ پر رحم فرما اور اس کو مردم شناسی کی توفیق عطا فرما۔“

لیٹ نے بھی اس کی دعا سن لی پوچھا۔ ”یہ تو کیسی دعا مانگ رہی تھی۔“

خضاء نے جواب دیا۔ ”وہ جو مجھے مانگنی چاہیے۔ اللہ عظیم و بصیر ہے اور خوب جانتا ہے کہ مجھے کیا دعا مانگنی چاہیے۔“ لیٹ کو دال میں کچھ کالا نظر آیا، اس نے خضاء کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ ”خضاء! کیا بات ہے؟ تیری تو کیفیت ہی کچھ سے کچھ ہو رہی ہے اور تو پریشان بھی زیادہ دکھائی دے رہی ہے، آخر بات کیا ہے؟“

خضاء نے جواب دیا۔ ”خاص بات تو کوئی بھی نہیں، اگر ہوگی بھی تو چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔“

کیا اس کے بعد کہا۔ ”تو چپ کیوں ہو گئی؟ تو اقرار کر کہ میری باتوں کا ذکر لیٹ یا کسی اور سے نہیں کرے گی۔ میں تیری زبان سے اقرار سننا چاہتا ہوں۔“

خضاء نے بے دلی سے کہا۔ ”جب میں نے خاموشی اختیار کر لی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں خاموش رہوں گی۔“ قاضی نے سختی سے کہا۔ ”میں ایک بار پھر یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے یہ سب مذاق تھا ورنہ اگر میں اپنی ان باتوں میں سنجیدگی اختیار کر لوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تیری حصول یابی سے مجھے نہیں روک سکتی۔“

خضاء نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں جانتی ہوں۔“ قاضی، خضاء کو دل اور جسم میں اتر جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا، بولا۔ ”اب تو جاسکتی ہے۔“

خضاء، قاضی کی نظروں سے دور ہو گئی لیکن وہ بہت پریشان تھی۔ لیٹ نے ایک بار پھر دھوکا کھایا تھا۔ اب اگر وہ اس کا ذکر لیٹ سے کرتی تو معاملہ بگڑ جانے کا احتمال تھا۔ اگر نہیں کرتی تو لٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ سفر کی تیاریاں مکمل تھیں۔ قافلہ بھی تیار تھا۔ قاضی نے لیٹ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ”خدا تیرا سفر آسان اور کامیاب کرے اور جلد واپس آنا نصیب ہو۔ میں تو باپ کی حیثیت سے تجھے یہی مشورہ دوں گا کہ خضاء کو بھی یہیں میرے پاس چھوڑ جا۔“

خضاء گھبرا گئی، بولی۔ ”لیکن میں یہاں نہیں رکوں گی کیونکہ لیٹ نے اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اگر وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں رک بھی جاتی۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”ہاں میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے ورنہ اس کو آپ ہی کے پاس چھوڑ جاتا۔“

عنان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، بولی۔ ”غلاب کعبہ پکڑ کر میرے لیے دعا ضرور کرنا، میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ لیٹ نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ”عنان مت گھبرا، میں جلد واپس آؤں گا۔“

قاضی نے کہا۔ ”اب تو قافلے میں شامل ہو جا۔ ورنہ وہ اگر چلا گیا تو دوسرے کا معلوم نہیں کب تک انتظار کرنا پڑے۔“ اس وقت غلام بھی کھانسا ہوا آ گیا۔ ”میرے آقا! کیا تو جا رہا ہے؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”ہاں میں جا رہا ہوں۔“ غلام نے کہا۔ ”خانہ کعبہ میں اپنے لیے دعا مانگنا نہ بھولنا کیونکہ ابھی پوری زندگی پڑی ہے، معلوم نہیں کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔“

لیٹ نے کہا۔ ”جب سے میں نے مقام ملتزم پایا ہے، مجھے اپنی ہر مشکل آسان دکھائی دینے لگی ہے۔“

خنسا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”اے میرے رب! مجھ پر، لیٹ پر اور عنان پر رحم فرما، ہمیں تباہی سے بچا۔ مجھ سے زیادہ قاضی لبیب بخدی کی امانت اور دیانت سے تو واقف ہے اگر اس کی نیت سچ ہے تو اس کی سچ نیت کو استقامت اور استقلال عطا فرما اور اگر اس کی نیت سچ نہیں ہے تو اس کی اصلاح فرما۔ میرا رواں روان کانپ رہا ہے کیونکہ لیٹ کے غلام کی طرح مجھے بھی قاضی پر اعتبار نہیں ہے۔“

لیٹ وہاں تو کچھ نہیں بولا لیکن اس کو غصہ ضرور آیا کہ یہ خنسا کو کیا ہو گیا ہے، کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ انہوں نے طواف کیا اور حجر اسود کو بوسہ دیا۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں باب کریم تک جانے کی سعادت مل گئی۔ دروازے کے پاس منبر کے مشاہیر ایک کرسی رکھ دی گئی۔ اس میں بیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کرسی میں چار ہائے اور ہر پائے میں پیسے لگے تھے جنہیں گاڑی کی طرح کھینچ کر کام میں لایا جاتا تھا۔ اس پر چڑھ کر بیت اللہ کو چالی سے کھولا جاتا تھا۔ بیت اللہ کے کلید بردار نے اسے اس طرح کھولا کہ کہنے کا غلاف خدام نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا رکھا تھا۔ دروازہ کھلا اور کلید بردار اندر داخل ہوا۔ اس نے آستانہ عالیہ کو بوسہ دے کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد دوسروں کو آنے کی اجازت دی۔ لیٹ بھی اندر داخل ہوا، اس وقت اس کا دل بھرا آیا اور اس نے رورور دعا مانگی۔

لیکن خنسا نے یہاں بھی وہی دعا مانگی۔ ”اے میرے رب! جو لوگ ہمارے اعتبار اور اعتماد سے کھلیں انہیں اس دنیا میں سزا میں دے تاکہ ہمارے دلوں کو ٹھنک میسر آئے۔“

لیٹ نے خنسا کی طرف دیکھا اور دعا مانگی۔ ”رب کعب! خنسا سادہ لوح لڑکی ہے اس کے قلب کو عنن و قیاس سے پاک کر۔“

دونوں جب دوبارہ اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو لیٹ بہت ناراض تھا۔ وہ خیمے میں مجبور کی چٹائی پر لیٹ گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ خنسا اس کے پاس بیٹھی تھی، جس کو وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

خنسا نے اس کے بالوں میں کنگھی کے انداز میں انگلیاں پھیریں اور پوچھا۔ ”لیٹ کیا مکان بہت زیادہ ہے؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”نہیں۔“

خنسا نے کہا۔ ”پھر اٹھ کر بیٹھ جا، یہ لیٹ کیوں گیا؟“

لیٹ نے کہا۔ ”میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“

خنسا نے پوچھا۔ ”آخر کیوں، تو میری صورت کیوں نہیں دیکھنا چاہتا؟“

لیٹ نے کہا۔ ”تو جانتی ہے میں نے قاضی کو پدر معنوی بنایا ہے اس کے مجھ پر احسانات ہیں۔ اس نے میری اور اپنے حق و انصاف کی خاطر اپنے بیٹے پولس کو سزائے موت دے دی۔ اس نے عنان کو اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیا اور میرے مال و زر کا امین بنا۔ یہ ساری باتیں تیرے علم میں ہیں اور اگر اس کے بعد بھی تو قاضی کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔ قاضی کی نیت اور امانت اور دیانت پر شک کرے تو میرا دل نہیں دکھے گا۔“

خنسا منہ پھیر کر بولی۔ ”اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تو میری باتیں سنتے ہی بغداد واپس چلا جائے گا اور جوش غضب میں اپنا معاملہ بگاڑ لے گا تو میں تجھ سے وہ باتیں کرتی جو تیرے وہم و گمان میں نہ ہوں گی۔“

لیٹ نے بدستور نفرت سے کہا۔ ”اچھا خنسا! اس وقت ہم دونوں آپس میں ایک معاہدہ کر لیں اور دوران سفر اس پر سختی سے عمل کریں۔“

”کس قسم کا معاہدہ؟“

”یہی کہ بغداد سے دور کسی جگہ قاضی لبیب بخدی زیر بحث نہیں آئے گا۔“

خنسا نے جواب دیا۔ ”میں معاہدہ کر لوں گی اور اس کا ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

☆☆☆

چروں پر طمانیت اور دلوں میں جذبہ شوق لیے حجاج مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ان مقامات کی زیارت کی جو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کی وجہ سے مقامات مقدسہ میں شمار ہونے لگے تھے۔

شام سے ذرا پہلے قافلہ مدینہ منورہ کے باہر خیمہ زن ہوا۔ قافلے کے لوگ اپنے خیمے نصب کرنے لگے لیکن لیٹ نے روضہ اقدس کا رخ کیا۔ وہ آنحضرت ﷺ کے روضہ اقدس کے سامنے کھڑا ہوا بچکیاں لے لے کر رونے لگا اور درود و سلام پیش کیا۔ منبر اور مزار مبارک کے درمیان میں جو تھوڑی سی جگہ تھی اس کو روضہ کہتے تھے۔ لیٹ نے اس جگہ تبرکاً نماز پڑھی۔ یہاں سے منبر قدیم کے پاس گیا۔ آنحضرت ﷺ ہمیں اپنے قدم رکھا کرتے تھے۔ لیٹ نے اسے آنکھوں سے لگا لیا۔

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ اس نے یہیں نماز ادا کی اور قافلہ میں واپس چلا گیا۔ خنسا لیٹ کے چلے جانے سے پریشان ہو رہی تھی۔ خنسا کا خیمہ نصب ہو رہا تھا۔

لیٹ نے کہا۔ ”خنسا! میں تو روضہ اقدس پر حاضری بھی دے آیا اور یہاں قافلے والے ابھی اپنے کاموں ہی میں مشغول ہیں۔“

خنسا بہت تھکی ہوئی تھی، بولی۔ ”کل میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی لیکن اس وقت مکان سے میرا برا حال ہے۔“

☆☆☆

مدینے آنے والوں کے قافلے اتنے زیادہ تھے کہ ان کی کثرت کا ذکر محال تھا۔ لیٹ خنسا کے ساتھ ایک ایک مزار پر جاتا اور قوت مخیلہ کے سہارے ماضی میں پہنچ کر وہ اہل مقابر کو اپنے آس پاس چلتے پھرتے محسوس کرتا۔ وہ ان کی مقدس اور نورانی شکلوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا۔ خنسا اس کو ایک بار پھر رسول اللہ ﷺ کے مزار پر لے گئی اور لیٹ سے کہا۔ ”لیٹ! یہاں دعا تو اپنی مرضی سے نہیں میری مرضی سے مانگے گا۔ میں جو کچھ کہوں تو اسے دہراتا رہ۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”خنسا! میں حیران ہوں کہ تو یہاں بھی کاروبار حیات سے نجات نہیں حاصل کر سکی۔“

خنسا نے سختی سے کہا۔ ”دعا کے لیے ہاتھ اٹھا اور میرے ساتھ دعا مانگ۔“

لیٹ نے کہا۔ ”جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ تو کون سی دعا مانگ رہی ہے۔ میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔“

خنسا نے کہا۔ ”تو سن میں کیا مانگ رہی ہوں۔“ اس کے بعد وہ گڑ گڑائی۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! لیٹ اپنی سادہ لوحی سے مردم شناسی سے قاصر رہتا ہے لیکن میں.....“

لیٹ نے کہا۔ ”وقت کیوں ضائع کر رہی ہو، دعا کیوں نہیں مانگتی۔ تو تو میری شکایت کر رہی ہے۔“

خنسا دعا مانگتی رہی۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! میں قاضی کی بد نیتی اور بد طبیعتی سے واقف ہو چکی ہوں، لیٹ نے عنان اور اپنا مال و زر اس کے حوالے کر دیا ہے تو قاضی کے قلب کو بدل دے اور وہ خیانت سے باز رہے ورنہ لیٹ کہیں کا بھی نہیں رہے گا۔ یا رسول اللہ ﷺ! قاضی کے شر اور فساد کو اسی پر الٹ دیجیے۔“

لیٹ نے سختی سے انکار کر دیا۔ ”میں یہ فضول دعا نہیں مانگ سکتا ہے۔“

خنسا نے کہا۔ ”یہ فضول دعا نہیں ہے۔ تجھے یہ دعا مانگنی ہوگی۔ اگر تو نے یہ دعا نہیں مانگی تو زندگی بھر بچھتاے گا۔“

”لیکن جب تک قاضی کی بددیانتی ثابت نہ ہو جائے۔ میں اس پر خواہ مخواہ شبہ کیوں کروں؟ مجھے تو اس پر شبہ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔“

خنسا نے کہا۔ ”مجھ پر قاضی کی بددیانتی واضح ہو چکی ہے اور مصلحتاً اسے ظاہر کرنا نہیں چاہتی، اگر تو مجھ پر اعتبار کرتا ہے اور کہنے سے یہ دعا مانگ لے، آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟“

لیٹ نے بدرجہ مجبوری دعا مانگی اور خاموش خاموش اپنے خیمے میں آیا اور آنکھیں بند کر کے پڑ رہا۔ خنسا اس کے قریب بیٹھ کر واپسی کا سوچنے لگی۔ لیٹ نے کن آنکھوں سے فکر مند خنسا کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”خنسا تو جانتی ہے کہ میں نے تیرا کہنا مان لیا ہے۔“

خنسا نے جواب دیا۔ ”ہاں میں بہت خوش ہوں کہ تو نے میری بات نہیں مانی۔“

لیٹ نے کہا۔ ”اب تو میری بات مان لے۔“

خنسا نے کہا۔ ”مان لوں گی، کہہ کیا بات ہے؟“

لیٹ نے کہا۔ ”تو نے کہا تھا کہ تو نے قاضی کی بددیانتی پکڑ لی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے اس کی کون سی بددیانتی پکڑ لی؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”لیٹ اب چونکہ تمہاری منتیں پوری ہو چکی ہیں اور عقرب واپسی کا سفر شروع ہو جائے گا اس لیے اب میں خود بھی اس راز کو راز نہیں رہنے دوں گی۔“

لیٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خنسا نے قاضی کی گفتگو با التفصیل لیٹ کے گوش گزار کر دی اور کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ قاضی کی نیت خراب تھی اور وہ مجھے روک لینا چاہتا تھا۔“

لیٹ زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ”خوب، خوب تو یہ راز تھا جسے تو اپنے سینے میں چھپائے خواہ مخواہ ہلکان و پریشان ہو رہی تھی۔ یہ فضول ورے سرو پاراز۔“

خنسا نے غصے سے کہا۔ ”لیٹ تو میری باتوں پر ہنس نہیں۔ یہ میں نے جو کچھ بتایا، تیرے حق میں بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

لیٹ نے بے پردائی سے کہا۔ ”قاضی نے تجھ کو نیک نیتی سے روکنا چاہا اور تو اسے بد نیتی پر محمول کر رہی ہے۔“

خنسا نے کہا۔ ”اس نے مجھ کو دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے یہ باتیں تجھے بتائیں تو اس کا بہت برا انجام ہوگا۔“

”یہ مبالغہ ہے، حاشیہ آرائی ہے، قاضی ایسی بات نہیں کر سکتا۔“

خسانے تنگ آکر کہا۔ ”میری باتیں بغداد پہنچ کر تیری سمجھ میں آئیں گی۔“

لیٹ نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی اور منہ پھیر کر پڑا۔

☆☆☆

واپسی کا قافلہ بہت بڑا تھا کیونکہ بہت سے قافلے مل کر ایک قافلہ بن گئے تھے۔ اس قافلے میں بعض حکمرانوں کے خاندان بھی تھے اور ان کے وسائل و انتظامات غیر معمولی تھے۔ قافلے کے آگے آگے مشعل بردار تھے جو راتوں کو روشنی کرتے ہوئے چلتے۔ حکمران خاندانوں کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں فوجی چل رہے تھے۔ پانی اور کھانے کی چیزوں کی بھی افراط تھی اور مذکورہ خاندان حجاج اور اہل قافلہ کی دعائیں حاصل کرنے کے لیے مسافروں کو بڑی سہولتیں اور آسانیاں فراہم کر رہا تھا۔

راستے میں حکمران خاندان کسی اور راہ پر چلے گئے اور لیٹ کا قافلہ پھر مختصر ہو گیا۔

کوفہ سے چھ منزل پہلے قزاقوں نے قافلے پر حملہ کر دیا اور لوٹ مار مچا دی۔ بہت سے مقابلے میں مارے گئے، کچھ پکڑے گئے اور پکڑے جانے والوں میں لیٹ اور خنسا بھی شامل تھے۔ ڈاکوؤں نے لیٹ کو خنسا سے جدا کر دیا اور ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر پہاڑوں کے غاروں میں چلے گئے۔ دوسروں کے ساتھ کیا سلوک ہو الیٹ کو پتا نہ تھا لیکن لیٹ کو ستایا نہیں گیا۔ ڈاکو اس کو کھانا پانی بھی خوب پہنچا رہے تھے لیکن خنسا کا کچھ پتا نہیں تھا۔

دو ماہ کچھ دن بعد اسے ڈاکوؤں کے سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ سردار کو دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ یہ اس کا اپنا بھائی یعقوب تھا جسے کچھ عرصے پہلے ڈاکو گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ اس کے بھائی یعقوب نے کہا۔ ”میں یہاں نہیں تھا لیکن جب مجھے میرے ساتھیوں نے بتایا کہ گرفتار ہونے والوں میں ایک میرا ہم شکل بھی ہے تو مجھے تیرا خیال آ گیا۔“

لیٹ نے افسوس سے پوچھا۔ ”لیکن بھائی آپ تو گرفتار ہو گئے تھے، ڈاکوؤں کے ہاتھوں، پھر اسے پیش کب سے بنالیا؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”ڈاکوؤں کا سردار مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آیا تھا۔ اس نے مجھ کو اپنا بیٹا بنالیا تھا اور مجھ پر اتنے احسان کیے کہ میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا۔“

لیٹ نے کہا۔ ”بھائی آپ گھر بھی نہیں آئے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”سردار نے بہت دنوں تک تو مجھ پر اعتبار ہی نہیں کیا۔ جب اعتماد قائم ہوا تو سردار چل بسا اور میں اس کا جانشین قرار پایا۔ اس کے بعد میں ابواز گیا تو پتا چلا کہ تو ابواز سے بغداد چلا گیا ہے لیکن بغداد جاتے ہوئے میں ڈرتا تھا۔“

لیٹ نے بھائی کو اپنی روداد سنائی اور اس پر جو کچھ بتی تھی پر درو لہجے میں بیان کر دیا۔ یعقوب نے پوچھا۔ ”پھر اب کیا ارادے ہیں؟ اب تو کہاں جانا چاہتا ہے؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”اب میں بغداد ہی جاؤں گا، ہو سکے تو آپ بھی میرے ساتھ چلیے۔ میں قاضی لیب بھدی کو وسیلہ بنا کر آپ کی تمام خطائیں معاف کروا سکتا ہوں۔“

یعقوب نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”نہیں، اب میں تیرے ساتھ نہیں جا سکتا کیونکہ کسی کا بھی وسیلہ مجھے معافی نہیں دلا سکتا اور پھر اب یہ کہ میں اس زندگی کا عادی بھی ہو گیا ہوں۔“

لیٹ نے کہا۔ ”آپ اپنا حصہ لے سکتے ہیں کیونکہ میں بددیانت نہیں ہوں۔“

یعقوب نے ہنس کر جواب دیا۔ ”لیٹ! میں اپنا حصہ بھی تجھی کو بخشا ہوں۔“

اس کے بعد یعقوب نے بھائی کی وہ خاطر مدارت کی کہ لیٹ کو حذر آ گیا لیکن خنسا کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ خنسا کی بابت کچھ پوچھتے ہوئے تکلف سے کام لے رہا تھا۔

آخر پندرہ سولہ دن خاطر مدارت میں گزر گئے۔ اب یعقوب کو کسی مہم پر روانہ ہونا تھا اس لیے اس نے لیٹ سے کہا۔ ”لیٹ! اگر تو رہنا چاہے تو شوق سے رہ، مجھے ایک مہم پر روانہ ہونا ہے۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”نہیں میں نہیں رکوں گا۔ میں جانا چاہتا ہوں۔“

یعقوب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ لیٹ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر بغداد پہنچا دیا جائے۔ لیٹ نے رک رک کر کہا۔ ”لیکن میری کنیز کہاں ہے اسے تو میرے حوالے کیا جائے۔“

یعقوب نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ ”یہ خنسا کون ہے، یہ کہاں ہے؟“

ساتھیوں نے لاعلمی ظاہر کی، لیٹ کا دم گھٹنے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، بولا۔ ”بھائی خنسا میری کنیز کا نام ہے اور اس کو تیرے ساتھی زبردستی مجھ سے چھین کر لے گئے تھے۔“

حسابِ دوستان

لیٹ نے زور زور سے پھاٹک کو تھپتھپایا اور چیخ چیخ کر کہا۔ ”قاضی محترم! میں ممدون مغیث کا بیٹا لیٹ جج کر کے واپس آ گیا ہوں، مجھے اندر آنے دے۔“

کچھ دیر بعد دربان نے پھاٹک کھولا، لیٹ فوراً اندر داخل ہو گیا۔ دربان نے اسے گدی سے پکڑ لیا اور بولا۔ ”یہ تو بغیر اجازت اندر کیسے گھسا چلا آ رہا ہے، پاگل دیوانہ کہیں کا۔“

لیٹ نے عاجزی سے کہا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں، مجھے دیوانہ نہ کہو۔ میرا نام لیٹ ہے، مرحوم ممدون مغیث کا بیٹا۔ میں اپنی ہونے والی بیوی عتبان اور اپنا سارا سامان مال و زر بطور امانت قاضی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ اب میں ان چیزوں کو واپس لینے آیا ہوں۔“

دربان نے اس کو دوبارہ نکال باہر کیا، بولا۔ ”تو سیدھی طرح نہیں مانے گا۔ بھاگ جا ورنہ میں مار مار کر نیم جان کر دوں گا۔“

لیٹ نے پوری قوت سے چیخنا شروع کر دیا۔ ”تو مجھے مار مار کر نیم جان یا جان ہی سے مار دے، میں قاضی سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔ میری عتبان، میرا مال و زر، ہائے میری امائیں۔“

اس کی چیخ و پکار سن کر لوگ جمع ہونے لگے۔ دربان نے اسے اندر کر لیا اور قاضی کے پاس ایک دوسرا آدمی بھیج دیا کہ ایک پاگل آپ سے ملے بغیر واپس جانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے اس کو بار بار پانی کی اجازت دی جائے۔

کچھ دیر بعد وہ آدمی واپس آیا اور کہا۔ ”قاضی نے اس کو اسی وقت یا دفرا مایا ہے۔ چل، میرے ساتھ آ۔“

لیٹ کی جان میں جان آئی اور اس کی امیدیں سرسبز و شاداب ہو گئیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا قاضی کے پاس چل پڑا۔

اس وقت قاضی چند آدمیوں کو ان کی امائیں واپس کر رہا تھا۔ لیٹ بے اختیار قاضی کی طرف بڑھا اور گرم جوشی سے معافی کرنا چاہا لیکن قاضی نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا اور لیٹ سے کہا۔ ”اپنی جگہ بیٹھ جا، تجھ سے ابھی بات کرتا ہوں۔“

قاضی کے لہجے اور انداز میں جو معافرت پائی جاتی تھی اس نے لیٹ کو نیم جاں کر دیا۔ قاضی لوگوں کو ان کی امائیں دے دے کر رخصت کرتا رہا صرف دو مصاحب رہ گئے اور قاضی بھی اطمینان سے بیٹھ گیا تو لیٹ نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

”ہاں تو قاضی محترم! میں جج کر کے واپس آ گیا ہوں۔ اس لیے بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ میری امائیں بھی

ایک ادھڑ عمر ساتھی یعقوب کے قریب گیا اور عرض کیا۔ ”سردار! اب اس کو آپ سے چھپانا فضول ہے۔ تیرے بھائی کی کنیز داؤد کو پسند آگئی تھی۔ اسے وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے اور آج کل وہ دمشق کے آس پاس قزاقی میں مشغول ہے۔ اندازے کے مطابق وہ پانچ چھ ماہ بعد واپس آئے گا۔“

لیٹ کا دل بیٹھا جا رہا تھا، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھائی! اگر خنسا نہ ملی تو میں بغداد نہیں جاؤں گا اور یہیں رہوں گا۔“

یعقوب نے اسے تسلی دی، کہا۔ ”لیٹ! تو زیادہ فکر نہ کر۔ داؤد میرا نائب ہے۔ خنسا جائے گی کہیں نہیں، تجھے واپس ضرور ملے گی لیکن پانچ چھ ماہ بعد تو بغداد چلا جا۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ جیسے ہی ملے گی، میں اپنے آدمیوں کے ذریعے بغداد میں قاضی لیب کے گھر پہنچ دوں گا۔“

یعقوب کے آدمی اس کو بغداد کے باب الکوفہ کے سامنے چھوڑ کر چلے گئے۔ سواری کے لیے ایک گھوڑا اور خرچ کے لیے سودینار بھی دے دیے گئے۔ بغداد میں داخل ہوتے ہی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دھکی چال سے قاضی کے قصر کی طرف بھاگنے لے جا رہا تھا۔ شام سے ذرا پہلے یہ قاضی کے قصر کے دروازے کے سامنے پہنچا اور دربانوں سے قاضی کو مطلع کروا دیا کہ ”کہہ دو لیٹ آ گیا ہے۔“

کچھ دیر بعد اندر سے جواب آیا۔ ”قاضی اندر نہیں ہے وہ عشاء الدولہ کے پاس گیا ہوا ہے۔“

لیٹ کو دربانوں کی لاطعلی گراں مزر رہی تھی۔ اس نے ایک دربان سے کہا۔ ”بھائی تو تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے پھر یہ تو باتیں کس قسم کی کر رہا ہے؟“

دربان نے لیٹ کو بڑے غور سے دیکھا اور ہنک آمیز لہجے میں بولا۔ ”تو کون ہے، میں تجھے نہیں جانتا؟“

لیٹ دربان کی باتوں سے واقعی پاگل ہونے لگا۔ اس وقت قاضی گھوڑے پر سوار اپنے چند مصاحبین کے ساتھ اور دوسرے آدمیوں میں گھرا ہوا اپنے قصر کے دروازے پر آیا۔ دربان نے پھاٹک کھول دیا۔ لیٹ، قاضی کی طرف بڑھا اور بڑی گرم جوشی سے قاضی کو سلام کیا۔ قاضی نے اس پر ایک اچھٹی نظر ڈالی اور سر کے اشارے سے سلام کا جواب دے کر قصر میں داخل ہو گیا۔

قاضی کے پیچھے لیٹ بھی دوڑا اور قصر میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن دربانوں نے اسے دھکیل کر قصر کے باہر کر دیا اور پھاٹک کو اندر سے بند کر دیا۔

واپس فرمادیں۔“

قاضی اپنے مصاحبین سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کھانے پاگل بننے کی جو قسمیں بتائی ہیں، وہ بڑی حیرت انگیز ہیں اور ان میں مایخیو کا مریض سب سے زیادہ عجیب ہوتا ہے۔“

لیٹ نے بڑے بے صبر سے پن سے کہا۔ ”قاضی محترم! مجھے میری امانتیں واپس فرمادیں، یہ آپ مفارقت کیوں برت رہے ہیں آخر؟“

قاضی نے لیٹ کو سرسری نظر سے دیکھا اور اپنی بات مکمل کرنے لگا۔ ”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ مایخیو کا مرض شدت اختیار کر چلا جاتا ہے۔“

لیٹ نے غصے میں کہا۔ ”قاضی! میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تو میری بات کیوں نہیں سنا، کیا میں پاگل ہوں؟ میری عنان کہاں ہے؟ میرا مال و زر، میری امانتیں واپس کر دے ورنہ میں سہم کر اپنی جان دے دوں گا۔“

قاضی مایخیو پر بولے جا رہا تھا۔ ”اگر مایخیو کا مریض اپنے کو تندرست و توانا کر لے تو یہ مرض آپ ہی آپ رفع ہو جاتا ہے۔“

قاضی نے تالی بجا کر ایک خدمت گار کو طلب کیا جب وہ آگیا تو حکم دیا۔ ”اس پاگل نوجوان کو دارالجانین میں داخل کر دیا جائے۔“

لیٹ نے روتے چلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے دارالجانین نہ بھیج۔ میری امانتیں واپس کر دے، خدا کے لیے مجھے نہ ستا۔“

قاضی نے مصاحبین کی طرف دیکھ کر لیٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا تو مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”میری عنان مجھے واپس کر دے اور ساتھ ہی میرا مال و زر بھی۔“

قاضی نے اس کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ میرا دماغ نہ خراب کر۔ تو پاگل ہے اور میں پاگلوں سے زیادہ باتیں نہیں کرتا۔“

لیٹ نے بے چینی سے کہا۔ ”میں اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا بشرطیکہ میری عنان اور میرے مال و زر کو واپس کر دیا جائے۔“

قاضی نے اپنے مصاحبین سے پوچھا۔ ”صاحبان! میری امانت اور دیانت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

ایک مصاحب نے جواب دیا۔ ”آپ کی امانت اور دیانت کا تو عقد الدولہ تک معترف ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اگر آپ کی امانت اور دیانت بھی مشتبہ ٹھہرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سچائی اور شرافت تو اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔“

لیٹ زار و قطار رونے لگا۔ ”لوگوں! میں لٹ گیا، میں تباہ ہو گیا۔ خنسا کو ڈاکو لے گئے اور جو کچھ بچا رکھا تھا اس کو قاضی ہڑپ کر جانے کی فکر میں ہے۔“

قاضی نے کہا۔ ”اچھا تو تو یہ کر کہ اس وقت تو یہاں سے چلا جا۔ کل میں شاہی طبیب کو بلا کر تیرا معائنہ کروادوں گا، اس کے بعد کچھ اور کروں گا۔“ قاضی اکتا گیا اور خدمت گار کو حکم دیا کہ اس کو دارالاضیافت میں ٹھہرا دیا جائے۔

خدمت گار لیٹ کو لے کر جو چلے تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ لیٹ کو دارالجانین بھیجا جاسکتا تھا لیکن ابھی نہیں کیونکہ قاضی خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ بات کو زیادہ طول دیا جائے۔

لیٹ کو مہمان سرا میں ٹھہرا دیا گیا لیکن یہ مہمان سرا نہیں تھی، ایک طرح کا خانہ تھا۔

☆☆☆

کئی دن بعد قاضی نے لیٹ کو طلب کیا اور پوچھا۔ ”اب تیرا کیا حال ہے؟ اگر تو اپنے گھر جانا چاہے تو چلا جا، میں اپنے آدمی تیرے ساتھ کر دوں گا۔“

لیٹ نے کہا۔ ”لیکن میں جاؤں کہاں؟ میرا گھر کہاں ہے؟“

قاضی نے افسوس کیا۔ ”اللہ اللہ، مرض کی شدت کا یہ عالم ہے کہ تجھے اپنا گھر بھی یاد نہیں پھر تو تجھے بیمارستان (ہسپتال) بھیجنا پڑے گا۔“

لیٹ نے بھی سختی سے کہا۔ ”قاضی! کان کھول کر سن لے کہ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ مجھے یوں ہی چلتا کر دے اور میں چلا جاؤں۔ میں عنان اور اپنے مال و زر کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

قاضی غصے میں اٹھ کر ٹہلنے لگا پھر اپنے خدمت گار کو بلا کر حکم دیا۔ ”دیکھ یہ ایک مایخیو کا مریض ہے، میں اس کو بیمارستان میں داخل کرنا چاہتا ہوں اس لیے تو آج بیمارستان کے نگران کو بلا لا۔“

لیٹ ایک دم بھڑک اٹھا، غصے میں کہا۔ ”تو بہت بے شرم اور بد دیانت انسان ہے۔ خنسا نے مجھے بار بار سمجھایا کہ میں تجھ پر اعتماد نہ کروں لیکن میں نے اس کو ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس زمانے میں قاضی جیسا ایمان دار دوسرا نہیں ملے گا لیکن خنسا نے میری اس بات سے کبھی بھی اتفاق نہیں کیا۔“

قاضی نے غصے میں دو ہاتھ رسیں کر دیے۔ لیٹ بھی جوابی حملے میں قاضی کے جھانپڑ رسید کر سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس طرح قاضی کے خدمت گار مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیں گے پھر بھی اکتا کر بولا۔ ”قاضی! تو کچھ بھی کر لے لیکن اپنے دل سے یہ خیال نکال دے کہ تو میری امانتیں ہضم کر لے گا۔“

قاضی نے دوسری طرف جا کر خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ”مایخیو کے اس مریض کو قید کر دیا جائے۔“

قاضی نے اس دن بیمارستان کے نگران کو بلا کر لیٹ کو اس کے حوالے کر دیا۔ لیٹ نے نہایت غنڈے دل سے سوچا کہ اگر وہ قاضی کی ہدایت پر ایک بار بھی بیمارستان میں داخل ہو گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے جکڑ دیے گئے تو پھر زندگی بھر رہائی ناممکن ہو جائے گی۔ لیٹ نے قاضی سے کہا۔ ”قاضی! میں آخری بار تجھے میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

قاضی منہ بنا کر تجھے میں لے گیا اور ساتھ ہی کہا ”کیا۔“ چل تجھے میں کر باتیں۔ ورنہ تجھے سڑی لگتا ہے۔“

لیٹ نے عاجزی سے کہا۔ ”میں بیمارستان نہیں جاؤں گا اور اپنے دعوے سے دستبردار۔ میں تجھ سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کروں گا اور بعد اچھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔“

قاضی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بولا۔ ”تو مطالبہ کس چیز کا کر سکتا ہے۔ میں تجھے اسی شرط پر چھوڑ سکتا ہوں کہ تو بیمارستان کے نگران اور میرے خدمت گاروں کے روبرو یہ اعلان کر دے کہ میں مایخیو کا مریض ہوں اور میں نے لالچ میں آکر جھوٹا دعویٰ کر دیا تھا۔ اب میں اپنے دعوے سے دستبردار ہوں اس لیے مجھے معاف کر دیا جائے۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ ابھی اسی وقت اعلان کر دوں گا اور میں اسی وقت یہاں سے چلا بھی جاؤں گا۔“

قاضی نے فس کر کہا۔ ”اب تو ہوش و حواس کی باتیں کر رہا ہے ورنہ اگر تو ایک بار بیمارستان میں داخل ہو جاتا تو پھر مر کر ہی لگتا۔ اب تو چلا جا اور خبردار جو بعد ادمی نظر آیا۔“

لیٹ نے خوشامدانہ کہا۔ ”لیکن میں تو تقریباً تھی دست ہوں۔ خدا کے لیے میری کچھ مدد کیجیے تاکہ میں بغداد سے کہیں اور چلا جاؤں۔“

قاضی نے سختی سے جواب دیا۔ ”دیکھ پھر تو نے مجھے تنگ کیا۔ اب تو چلا جا یہاں سے ورنہ میں دوسرا قدم اٹھاؤں گا۔“

لیٹ بادل ناخواستہ قصر سے نکلا اور باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کہاں جائے۔ یہاں سے اپنا کاروبار یاد آیا۔ وہ

دکانوں پر گیا تو پتا چلا۔ ان دکانوں کو چھوڑ کر تاجری بیٹی نے ختم کر دیا۔ اب لیٹ کے سامنے رات گزارنے کا ایک ہی گھر تھا۔ وہ رات کو مسجد میں چلا گیا اور مسجد کے میں گر کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ یہیں اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے بھائی یعقوب کو تلاش کرنے کے بجائے مدینہ منورہ چلا جائے گا اور وہیں بقیہ زندگی گزار دے گا۔

تاجر کی نماز کے بعد ایک طرف سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ لیٹ نے ایک کونے میں اپنے غلام کو دیکھا جو چادر اوڑھے بیٹھا کھائیں رہا تھا۔ یہ اٹھ کر اپنے غلام کے پاس گیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

غلام نے چونک کر لیٹ کو دیکھا اور بے اختیار چٹ گیا، پوچھا۔ ”میرے آقا! تو کب آیا؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”مجھے تو آئے ہوئے کئی دن ہو گئے۔“

غلام نے قاضی کی شکایت کی۔ ”لیکن قاضی نے مجھے تو نہیں بتایا کہ تو آگیا ہے بلکہ اس نے تو میرے ساتھ عجیب سا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ میں اس سے جب بھی تیری بابت پوچھتا ہوں تو وہ کچھ اس طرح جواب دیتا ہے جیسے آپ کو جانتا ہی نہیں۔ مجھے تو اس کی نیت پر شبہ ہے۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”تیرا شبہ درست ہے، اس نے تو مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔“

اس کے بعد یہ پردرد استان بھی سنا دی۔ غلام نے ایک سرد آہ بھری۔ ”آہ میرے آقا! تجھ پر تو کئی قیامتیں گزر چکی ہیں۔ خدا نے تجھے برداشت کی بڑی ہمت دی ہے ورنہ دوسرا تو مر جاتا۔“

لیٹ نے کہا۔ ”اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مدینہ منورہ چلا جاؤں اور وہاں روضہ اقدس پر بقیہ زندگی گزار دوں۔“

غلام نے کہا۔ ”میرے آقا! ہمت نہ ہار اور قاضی سے اپنی امانتیں واپس لینے کی کوشش کر۔“

لیٹ نے مایوسی سے کہا۔ ”نہیں اب میں اس غمیٹ کے پاس نہیں جاؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے بیمارستان میں داخل کر کے میری زندگی برباد کر دے گا۔“

غلام نے کہا۔ ”لیکن میرے آقا! تیرے ساتھ میں بھی چلوں گا اور جب تک زندہ ہوں تیری خدمت کروں گا۔“

لیٹ نے ایک بار پھر غلام کو چٹایا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ غلام بھی روتا رہا تھا۔

☆☆☆

لیٹ کے لیے خنسا کا مسئلہ بھی بڑا تشویش ناک تھا۔ وہ سوچتا کہ اگر یعقوب نے خنسا کو بغداد روانہ کیا تو قاضی بددیانتی ضرور کرے گا اور اس کو بھی ہضم کر جائے گا۔ اس لیے اس کا بغداد میں چوری چھپے رہنا بہت ضروری تھا۔ غلام نے بغداد کے جنوبی حصے میں ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کر رکھا تھا۔ وہ لیٹ کو بھی لے گیا۔ اب غلام کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ قاضی کے قصر کے آس پاس چکر لگائے اور اس ٹوہ میں رہے کہ کہیں قاضی کے پاس خنسا آئی تو نہیں۔ قاضی بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا وہ لیٹ کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے اپنے کئی جاسوس اسی کام پر لگا دیے کہ وہ لیٹ کی بغداد میں موجودگی کا پتا چلائیں اور کئی آدمی نہ بچنے اور قاضی کا یہ انتظام اتنا مضبوط اور جاندار تھا کہ اس کے آدمیوں نے لیٹ کی قیام گاہ کا پتا چلا لیا۔ قاضی اس کے پاس خود پہنچ گیا۔ لیٹ قاضی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ قاضی نے سختی سے پوچھا۔ ”مالینو لیا کے مریض، بیمارستان کے لوگ تجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں اور تو یہاں چھپا ہوا ہے۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”قاضی! مجھے زیادہ نہ ستا میں یہاں خنسا کا انتظار کر رہا ہوں وہ جیسے ہی آئے گی میں بغداد سے چلا جاؤں گا۔“

ایک طرف سے غلام بھی کھانسا ہوا آ گیا۔ اس نے قاضی سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

قاضی نے لیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بیمارستان سے بھاگا ہوا مالینو لیا کا خطرناک مریض ہے اور بیمارستان کے لوگ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں اب میں اس کو بیمارستان میں داخل کروادینا چاہتا ہوں۔“

غلाम نے کہا۔ ”قاضی! میرے آقا کو اتنا نہ ستا۔“

قاضی نے غلام کو گھورا۔ ”اس مریض کو تیری سرپرستی حاصل ہے۔ بیمارستان کے خطرناک مریض کو تو نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ تو بھی گرفتار ہوگا تو بھی مجرم ہے۔“

لیٹ نے غلام سے کہا۔ ”دیکھ تو اس معاملے میں نہ پڑ مجھے بغداد سے چلا جانے دے۔“

قاضی نے کہا۔ ”اوہ ہو۔۔۔ اب تو میرے ساتھ یہ بھی جائے گا بغداد سے تو تہا نہیں جائے گا۔“

لیٹ اور غلام دونوں قاضی کی خوشامدیں کرتے رہے لیکن قاضی نہیں پیچھا اور آخر کار یہ طے پایا کہ دونوں فوراً بغداد چھوڑ کر اصفہان چلے جائیں گے۔

چنانچہ ان دونوں کو اصفہان روانہ کر دیا گیا۔ راستے میں ایک جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا تو ہر آدمی اپنے اپنے کام میں لگ گیا لیکن لیٹ اداس اداس ایک ٹیلے پر بیٹھ کر ماضی میں گم ہو گیا۔ قافلے کا ایک مسافر اس کے پاس گیا اور پوچھا۔ ”دوست! تو اداس کیوں ہے؟ کیا تیرا کوئی عزیز فوت ہو گیا؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”بھائی میرے تو ایک عزیز کی بات کرتا ہے یہاں تو اپنے سبھی مر گئے اور مال و دولت بھی ضائع ہو گیا۔“

رحم دل مسافر اسے اپنے خیمے میں لے گیا اور اسے بڑی تسلی دی اور اس کی پوری روداد سنی۔ اس کو لیٹ پر رحم آ گیا، بولا۔ ”تو اب کیا ارادے ہیں؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”ان حالات میں، میں کیا اور میرے ارادے کیا لیکن جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ ظلم و زیادتی کی سر زمین ہے تو میں اس سر زمین کو چھوڑ کر دنیا کے کسی ایسے ملک میں چلا جانا چاہتا ہوں، جہاں عدل ہو، انصاف ہو اور حکمران اپنی رعایا کے معاملات سے باخبر ہوں۔“

مسافر نے جواب دیا۔ ”تو جوان! میں ایک سیاح ہوں جو تجارت بھی کرتا ہے اور سیاحت بھی۔ اصفہان میں میرا گھر ہے، میں اصفہان میں دو دن رہ کر سرفرد چلا جاؤں گا وہاں سے کتنے دن بعد واپسی ہوگی کچھ پتا نہیں لیکن یہ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ سرفرد سے واپس آنے کے بعد میں تیرے لیے کسی ایک ملک کی نشاندہی ضرور کر سکوں گا جہاں عدل و انصاف ہوگا اور وہاں کا حکمران اپنی رعایا کے معاملات سے اچھی طرح واقف ہوگا۔“

لیٹ نے کہا۔ ”لیکن بھائی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میں اصفہان میں کہاں رہوں گا اور کہاں سے کھاؤں پیوں گا یہ بھی تو ایک مسئلہ ہے۔“

مسافر نے جواب دیا۔ ”میں اس کی ذمہ داری بھی قبول کر لوں گا۔ تجھے کسی کے ساتھ کام پر بھی لگا دوں گا، قیام کے لیے میرا اپنا مکان ہے۔ دو وقت کا کھانا بھی میرے گھر سے مل جائے گا تو جو کچھ کمائے گا اپنے مستقبل کے لیے جمع کرتا رہے گا۔“

لیٹ حیران تھا کہ دنیا میں قاضی جیسے لوگ بھی ہیں اور اس مسافر جیسے بھی۔ اس مسافر نے اس کے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اصفہان پہنچنے پر مسافر نے لیٹ کو چند دن اپنے گھر میں رکھ کر ایک تجارتی قافلے کے ساتھ سرفرد روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

شاید قاضی کا نصیب زوروں پر تھا کیونکہ ان دونوں کے

اصفہان جاتے ہی عضد الدولہ مصیبتوں کا شکار ہو گیا۔ قاضی عضد الدولہ کا بہت چہیتا تھا۔ عضد الدولہ کے زوال کا مطلب تھا قاضی کا زوال، چنانچہ لیٹ اور غلام کے چلے جانے کے بعد بھی وہ سکون سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ عضد الدولہ کا آدمی آ گیا۔

”آپ کو یا فرمایا گیا ہے۔“

قاضی اسی وقت عضد الدولہ کے پاس روانہ ہو گیا۔ بغداد میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا کہ عضد الدولہ کا اپنے چچا زاد بھائی عز الدولہ سے مقابلے کا معلوم نہیں کیا نتیجہ نکلے۔ عضد الدولہ کا چچا زاد بھائی خلیفہ کی نیابت حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ عضد الدولہ کو شکست دے۔ وہ بہت بڑے لشکر کے ساتھ عضد الدولہ کے خلاف صف آرا ہونے والا تھا۔ عضد الدولہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اس نے قاضی کو ایک خاص مقصد کے لیے طلب کیا تھا۔ وجہ کے کنارے عظیم الشان محل میں قاضی کو ایک ایسے حصے میں پہنچایا گیا جہاں اس سے پہلے اس کا گزر نہیں ہوا تھا۔ محل کے اس حصے میں محل سے الگ تھلگ ایک اور چھوٹا سا محل بنا ہوا تھا۔ عضد الدولہ اس چھوٹے سے محل میں خوف زدہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے قاضی کو نہایت احترام سے استقبال کیا۔ قاضی نے بڑے ادب سے مصافحہ کیا۔

عضد الدولہ نے قاضی کو اپنے پاس ہی بٹھالیا اور کہا۔ ”قاضی محترم! افسوس کہ اس دنیا میں ثبات کسی کو ملے کو بھی نہیں۔“

قاضی نے عضد الدولہ کے چہرے پر غموں کی ایسی پرچھائیاں دیکھی پہلے نہ دیکھی تھیں، پوچھا۔ ”نصیب دشمنان خیریت تو ہے؟ آج میں آپ کو بہت پریشان دیکھ رہا ہوں۔“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”قاضی محترم! میرے چچا کا بیٹا عز الدولہ اگر مقابلے میں کامیاب ہوا تو میرا معلوم نہیں کیا انجام ہو۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں اپنے بچوں کی فکر ہے۔“

قاضی نے عرض کیا۔ ”میں سلطان کی خدمت کو حاضر ہوں کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ مجھے بغداد میں جو کچھ بھی حاصل ہے سلطان ہی کی بدولت حاصل ہے اگر آپ ہی نہ ہوں گے تو میں کہاں جاؤں گا۔“

عضد الدولہ نے قاضی سے بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کیں اور آخر میں اس نے قاضی سے درخواست کی کہ اگر میں میدان جنگ میں کام آ جاؤں تو میری آپ سے درخواست ہے کہ اپنے گھر میں میرے بچوں کو چھپا لیجے گا کیونکہ میرے بعد ان کا حشر برا کر دیا جائے گا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں ہر وقت سلطان کی خدمت کو حاضر ہوں۔“

قاضی واپس آ گیا، اس دن رات کو چند آدمی خنسا کو لے کر آ گئے انہوں نے لیٹ کو پوچھا تو قاضی نے کہہ دیا کہ ”ہاں وہ یہیں رہتا ہے اور کچھ دنوں کے لیے اہواز گیا ہوا ہے۔“

خنسا، قاضی کے حوالے کر دی گئی۔ قاضی بہت خوش ہوا لیکن اس نے خنسا کو لیٹ کی بابت اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا کہ وہ چند دنوں کے لیے اہواز گیا ہے اور عنان اس کے ساتھ ہی ہے۔ خنسا، قاضی کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ عنان قصر کے اندر ہی موجود تھی اس کو خنسا سے دور رکھا گیا تھا۔ اب دونوں کو ایک ہی قصر میں رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے عنان کو سمجھایا۔ ”عنان بیٹی! لیٹ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں بہت پریشان ہوں میرا خیال ہے کہ اس کی واپسی بہت دُشوار ہے۔“

عنان نے کہا۔ ”لیکن اس کا سارا مال و زر تو آپ ہی کے پاس رکھا ہوا ہے۔“

قاضی نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس تو اس بات کا ہے پچھلے ہفتے اس کا غلام یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ لیٹ نے اپنی امانت واپس منگوائی ہے کیونکہ اس نے خنسا کو آزاد کر کے شادی کر لی ہے اور اب وہ دونوں مدینے میں ہی رہیں گے۔“

عنان نے کہا۔ ”لیکن اس میں میرا حصہ بھی تھا۔“

قاضی نے عنان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ”عنان تو میری بیٹی ہے، میں ہوں تو تجھے مال و زر کی پروا نہیں کرنی چاہیے اور پھر اگر تو پسند کرے تو میں تجھے ایک ایسے شخص سے وابستہ کر دوں جو امیر المومنین کے بعد سب سے بڑا آدمی ہے۔ میں تجھے اس کے حوالے اپنی بیٹی کی طرح کروں گا۔“

عنان نے جواب دیا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی، امیر المومنین کے بعد سب سے بڑا آدمی کون ہے؟“

قاضی نے کہا۔ ”عضد الدولہ جو میرا محسن بھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو بہت خوش رہے گی اور یوں بھی تیری کہیں نہ کہیں شادی تو کرنا ہی پڑے گی۔“

عنان دکھوں اور مصیبتوں سے عاجز آ چکی تھی اور لیٹ کی بے وفائی نے اس کو بالکل مایوس کر دیا تھا جواب دیا۔ ”آپ جو مناسب سمجھیں کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

قاضی اپنے ہر ارادے اور ہر منصوبے میں کامیاب جا رہا تھا۔ اس کا دوسرا شکار خنسا ہی، خنسا کو وہ خود رکھنا چاہتا تھا لیکن جب تک قصر میں عنان بھی موجود تھی خنسا کو چھیننا مناسب نہیں تھا۔ اب اس کو عضد الدولہ سے دوسری ملاقات کا انتظار تھا۔

بعد اد کے باہر عضد الدولہ کا چچا زاد بھائی آچکا تھا اور اس نے عضد الدولہ کو پیغام بھیجا تھا کہ بعد اد کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ خلیفہ میں اتنا دم نہیں تھا کہ دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کی مرضی کی پروا ہوتی۔ عضد الدولہ گفتگو کو طول دے رہا تھا۔ اسی روز اس نے قاضی کو پھر طلب کر لیا۔ اس بار قاضی تنہا نہیں گیا اپنے ساتھ عتقان کو بھی لے گیا۔ عضد الدولہ نے محل کے اس حصے میں ملاقات کی اور عتقان کو دیکھ کر پوچھا۔ ”قاضی محترم! یہ لڑکی کون ہے اور آپ کے ساتھ کیوں آئی ہے؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بندہ پرور، یہ میری بھتیجی ہے آپ کی خدمت کے لیے لایا ہوں، قبول کیجیے۔“ پھر عتقان سے کہا۔ ”عتقان بیٹی! بادشاہ کو سلام کر۔ میں نے تجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں تجھے اس شخص سے ملواؤں گا جو امیر المومنین کے بعد سب سے بڑا آدمی ہے۔“

عضد الدولہ مسکرایا، بولا۔ ”امیر المومنین کے بعد کیا معنی؟ امیر المومنین کی مرضی کے خلاف میں جو چاہوں کروں وہ مجھے منع نہیں کر سکتے لیکن امیر المومنین میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اب قاضی محترم! آپ ہی فیصلہ کریں کہ بڑا میں ہوں یا امیر المومنین؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میرے محسن! بڑے تو آپ ہیں لیکن آپ دونوں میں دنیا کی نظروں میں جو فرق پایا جاتا ہے میں نے اس کا اظہار کیا تھا ورنہ اس سے آپ کا مرتبہ گھٹانا مقصود نہیں تھا۔“

عضد الدولہ نے عتقان کی طرف دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا۔

عضد الدولہ نے عتقان کو اسی وقت حرم میں بھیج دیا اور اس کے بعد دروازے اندر سے بند کر لیے اور کہا۔ ”قاضی محترم! میں کچھ دنوں سے اپنے چچا کے بیٹے سے خط کتابت کر رہا ہوں اور میری کوشش تھی کہ خون خرابہ نہ ہو لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ معاملات خط کتابت سے نہیں میدان جنگ میں لگوار ہی سے طے پائیں گے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا نتیجہ میرے حق میں ہی نکلے۔“

قاضی نے عرض کیا۔ ”لیکن فتح تو حق ہی کی ہوتی ہے اور زمانہ جانتا ہے کہ آپ حق پر ہیں۔“

عضد الدولہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”قاضی محترم! مجھے اپنے لڑکوں کی ذرا بھی فکر نہیں، فکر ہے تو لڑکیوں کی۔ لڑکے پرندوں کے مثل ہوتے ہیں کہ یہ ایک ملک سے دوسرے ملک پرواز کر سکتے ہیں۔ مصیبت تو لڑکیوں کی ہے۔ جب

سے آپ نے اپنے نالائق بیٹے کو حق و انصاف پر قربان کیا ہے میرے دل میں آپ کی عزت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔“

قاضی نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”یہ بھی میرے محسن کی عزت افزائی اور ذرہ نوازی ہے ورنہ دوسرے حکمران باتوں کی قدر کہاں کرتے ہیں؟“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”جیسا کہ میں اپنی پہلی ملاقات میں عرض کر چکا ہوں کہ میں چند دنوں کے اندر ہی اپنی بیٹیاں آپ کی تحویل میں دے دوں گا آپ انہیں اپنی بیٹیوں کی طرح رکھیں گے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، وہ میری محسن زادیاں ہیں۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”میں آپ کو دوسو دینار اسی وقت دوں گا۔ اس سے آپ اپنے قصر میں ایک خفیہ تہ خانہ تعمیر کروائیں۔“

قاضی، عضد الدولہ کی صورت دیکھنا چاہتا تھا لیکن نظر ملانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آہستہ سے کہا۔ ”مزید ارشاد۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”اس تہ خانے میں اپنی بیٹیوں کی امانتیں رکھواؤں گا۔ دینار، ہیرے جو اہرات اور دوسری قیمتی چیزیں ان میں میری بیٹیوں کا جہیز بھی شامل ہوگا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں ہر طرح حاضر ہوں۔ تہ خانے کی تعمیر کا کام آج ہی شروع کروادوں گا۔“

عضد الدولہ نے مزید کہا۔ ”اگر میں میدان جنگ میں مارا جاؤں یا گرفتار ہو جاؤں تو آپ میری بیٹیوں کا بطور خاص خیال رکھیں گے اور ان کی مناسب جگہوں پر شادیاں کروا کے زرو مال مساوی ان میں تقسیم کر دیں گے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”جیسا آپ فرما رہے ہیں اس پر اسی طرح عمل ہوگا۔“

پھر عضد الدولہ کا دل بھر آیا، آواز بھر گئی اور رقت زدہ لہجے میں کہا۔ ”قاضی محترم! آپ اس کام کی اہمیت اور قدر و قیمت کو تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میری بیٹیاں بہت ناز و نعم سے پلی ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں آپ کے پاس جو کچھ رکھواؤں گا اس کی کوئی رسید بھی نہیں لوں گا اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس راز سے ہم دونوں کے علاوہ بس ظالم الخیوب ہی واقف ہوگا اور کوئی نہیں۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بے شک، بے شک۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”اس لیے یہ آپ کے ایمان اور انصاف کی آزمائش کا سب سے نازک اور اہم واقعہ ہوگا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بے شک، بے شک۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اگر آپ نے اس میں کسی قسم کی کوتاہی برتی تو قیامت کے دن آپ کا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ اور وہاں کی پکڑ بڑی خطرناک ہوگی۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بے شک، بے شک۔ خدا اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔“

عضد الدولہ نے اسی وقت دوسو دینار قاضی کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ”یہ تہ خانے کی تعمیر جلد از جلد ہو جانی چاہیے کیونکہ میں اتنے دنوں اپنے چچا کے بیٹے کو خط کتابت میں الجھائے رکھوں گا۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”اور امانتوں اور شہزادیوں کی منتقلی کب تک عمل میں آئے گی؟“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”تہ خانے کے مکمل ہوتے ہی دونوں چیزیں خاموشی سے پہنچادی جائیں گی لیکن قاضی محترم! میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ ان باتوں کا علم کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے۔“

قاضی نے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیں میرے محسن۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”تب پھر آپ اسی وقت تشریف لے جائیں اور تہ خانے کی تعمیر کا کام شروع کروادیں۔“

قاضی کا خوشی سے عجب حال ہو رہا تھا۔ قصر سے نکل کر وہ باؤں کہیں رکھتا تھا اور وہ پڑتے کہیں تھے۔ وہ شرابیوں کی طرح چل رہا تھا۔

اس نے اپنے قصر میں داخل ہوتے ہی بازار سے راج مزدور بلوائے اور خفیہ تہ خانے کی تعمیر کا کام شروع کروادیا۔

☆☆☆

عضد الدولہ اپنے چچا کے بیٹے سے خط و کتابت کو طول دے رہا تھا اور قاضی سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ تہ خانے کی تعمیر کا کام حیرت انگیز طور پر بہت جلد مکمل ہو گیا۔ رادھر خنسا بار بار لیٹ کو پوچھ رہی تھی اور قاضی اس معاملے کو اس وقت تک نالنا چاہتا تھا جب تک کہ عضد الدولہ اپنی امانتیں تہ خانے میں منتقل نہیں کر دیتا۔

لیکن خنسا کے لیے اب صبر مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے قاضی سے کہا۔ ”اگر لیٹ! اہواز گیا ہوا ہے تو میں بھی اہواز چلی جاؤں گی اور اس کو تلاش کر لوں گی۔“

قاضی نے جوری بدل کر جواب دیا۔ ”میں دیکھوں گا کہ تو میری اجازت کے بغیر کیسے چلی جائے گی۔“

”جب مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ لیٹ اہواز کیوں گیا ہے اور کب آئے گا؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں کسی لیٹ کو نہیں جانتا،

اس لیے میں کیا جانوں کہ وہ کہاں گیا ہے، کیوں گیا ہے اور کب آئے گا؟“

خنسا حیران و پریشان قاضی کی صورت دیکھتی رہ گئی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”میں مطلب نہیں سمجھتی؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں کہہ رہا ہوں کہ میں کسی لیٹ سے واقف نہیں اور تجھ کو میرے ایک دوست نے میرے پاس تجھے کے طور پر بھیجا ہے اور اس طرح میں تجھ پر پورا پورا حق تصرف رکھتا ہوں۔“

خنسا نے چیخ کر کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے، مجھے ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا اور ڈاکوؤں کا سردار لیٹ کا بھائی تھا۔ میں لیٹ کی کنیز ہوں چنانچہ ڈاکوؤں کے سردار نے مجھے اپنے بھائی کی امانت کے طور پر واپس بھیج دیا۔“

قاضی نے فوراً کہا۔ ”تو ڈاکوؤں کے پاس سے میرے پاس آئی ہے تاکہ میری خبری کر کے میرے محل میں ڈاکا ڈالو۔“

خنسا نے بھی اکثر برقرار رکھی۔ ”میں تیری باتوں میں نہیں

Alternative & Integrated medicine

جنسی اور قدرتی اجزاء سے تیار کردہ درج ذیل میڈیسن اب آپ گھر بیٹھے ٹھیک کر سکتے ہیں

فریبی کورس برائے مرد حضرات

مردوں میں جراثیموں کی کمی اور کمزوری کو دور کر کے اولاد پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مقوی و منکول ہے

شادی کورس

صرف غیر شادی شدہ مردوں کے لئے زائل شدہ توانائی کی بحالی کا مستقل اور مکمل کورس۔ انشاء اللہ کسی قسم کی کمی اور محرومی محسوس نہ ہوگی

ازدواجی کورس

شادی شدہ حضرات کے لئے بحالی قوت کا فوری اور مستقل علاج۔ کامیاب اور ازدواجی زندگی کے لئے موثر ترین کورس

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین
ایم بی بی ایس (بی ایس سی آنرز)
سابقہ قیادی، 10 سالہ سابقہ قیادی
نزدیک کراچی گورنمنٹ ہسپتال
03216528001, 03008652456
email: b2teleshop@gmail.com

حساب حال

دولت کیا پانی بھرنے کنویں پر گئیں تو آپس میں لڑ پڑیں۔
ایک دوسری سے۔ ”اللہ کرے تمہیں اندھا شوہر ملے۔“
دوسری چلا کر۔ ”اللہ کرے تمہیں لنگڑا خاوند ملے۔“
اتنے میں دو افراد جن میں ایک اندھا اور دوسرا لنگڑا تھا۔ قریب آئے اور بولے۔
”ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ ہم یہاں رکھیں یا چلے جائیں؟“
مرسلہ: ریاض بٹ از حسن ابدال

کا ایک آدمی بھاگ ہوا آیا اور یہ منحوس خبر سنائی کہ لیٹ اصفہان سے کہیں چلا گیا ہے مگر کہاں گیا ہے اس کا کسی کو علم نہیں لیکن سہ پہر کے بعد لیٹ، قاضی کے قصر کے دروازے پر دربانوں سے جھگڑ رہا تھا۔ وہ بعد تھا کہ قاضی سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔

قاضی نے اس کو فوراً ہی اندر بلا لیا اور کہا۔ ”تو جوان! تو اصفہان سے کیوں آیا؟ میرا تیرا کیا ملے ہوا تھا؟“
لیٹ نے جواب دیا۔ ”میں یہ نہیں جانتا کہ میرا تیرا کیا ملے ہوا تھا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ تیرے پاس میری اماں ہیں اور وہ مجھے واپس ملنی چاہیے۔ اب مزید میرے بس کا نہیں۔“

قاضی نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ ”دیکھ تو جوان تو زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کر۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”قاضی پہلے میری پوری بات سن لے، اس کے بعد کچھ کہنا۔ میں نے اپنے غلام کو جدا کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ پہلے میں تجھ سے بات کروں گا، اگر تو مان جائے تو خیر ورنہ پر آشوب حالات میں، میں عضد الدولہ کا در کھٹکناؤں گا کیونکہ میں عام دنوں کی یہ نسبت آج کل عضد الدولہ سے با آسانی رابطہ قائم کر سکوں گا۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ آج کل عدل و انصاف پر بہت زیادہ مائل ہے۔“

قاضی نے دانت بچھ کر کہا۔ ”میں تجھے اس قصر سے

ہوا ہے کہ کنیز کا تعلق ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے ہے اس لیے اب میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟“
عضد الدولہ نے سختی سے جواب دیا۔ ”کنیز سے جمع جاتے رہے۔ پہلے آپ اس کو یوں ہی سمجھائیے کہ وہ اپنے دل سے یہ نکال دے کہ ڈاکو اس کی کوئی مدد کر سکیں گے اور اگر وہ زیادہ تنگ کرے تو آپ کو اس کا اختیار ہے کہ اس سے جیسا سلوک چاہیں کریں، میں کچھ بھی نہیں بولوں گا۔“
قاضی نے شکر یہ ادا کیا۔ ”میں بادشاہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اتنی عزت بخشی۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ بدھ سے جنگ شروع ہو جائے۔ جنگ کے چھڑتے ہی میری لڑکیاں آپ کے پاس آ جائیں گی آپ انہیں چھپا کر رکھیے گا اور جب حالات معمول پر آ جائیں تو آپ دورانہشی سے ابواز منتقل ہو جائے گا اور یہ خزانہ بھی وہیں لیتے جائے گا اور میری لڑکیوں کی شادیاں مناسب جگہوں پر کر دیجیے گا۔“
قاضی نے انکساری سے عرض کیا۔ ”حضور والا جس طرح فرما رہے ہیں بالکل اسی طرح اس پر عمل ہوگا۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”منگل کی رات آپ جاگتے رہے گا کیونکہ میں رات کو کسی بھی وقت خزانے کے ساتھ حاضر ہو جاؤں گا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں پوری رات جاگ کر آپ کا انتظار کروں گا۔“

عضد الدولہ اپنے محل واپس گیا اور قاضی، قصر کے باہر تک عضد الدولہ کو چھوڑ کر سیدھا خنسا کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”خنسا میں نے تیرا ذکر عضد الدولہ سے کر دیا ہے اور اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ میں تجھ سے تنگ کر سکتا ہوں اور اگر تیرا تعلق ڈاکوؤں سے ہے تو تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ڈاکو تیری مدد نہ کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے مجھ کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ میں تجھ پر سختیاں بھی کر سکتا ہوں۔“
خنسا نے پھر وہی جواب دیا۔ ”میں خودکشی کر لوں گی اور اس حرام پر اس حرام کو ترجیح دوں گی۔“

قاضی بننے لگا، بولا۔ ”میری جان! خودکشی کریں تیرے دشمن۔ میں تجھے اپنے قصر کی ملکہ بنا کر رکھوں گا کیونکہ عنقریب مجھے ایسا خزانہ ملنے والا ہے جو صرف بادشاہوں کے پاس ہو سکتا ہے۔“

قاضی نے مارے خوشی کے خنسا کو بھی نہیں ستایا۔

☆☆☆

دوسرے دن پھر کو دوپہر کے بعد اصفہان سے قاضی

قاضی نے جواب دیا۔ ”وہ تو دو دن پہلے ہی چلے ہو گیا تھا میں آپ کی طرف سے طلبی کا خطر تھا۔“
عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”آج کیا دن ہے؟“
قاضی نے جواب دیا۔ ”اتوار۔“
عضد الدولہ نے کہا۔ ”میں پرسوں منگل کو رات کی تاریکی میں اپنا خزانہ اس تہ خانے میں منتقل کروادوں گا۔“
قاضی نے پوچھا۔ ”اس کے لیے مجھے آپ کے پاس آنا پڑے گا یا حضور نے کوئی اور انتظام کر رکھا ہے؟“
عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”رات کی تاریکی میں میں اپنی نگرانی میں یہ خزانہ آپ کے گھر پہنچاؤں گا کیونکہ اس معاملے میں کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

اس کے بعد عضد الدولہ نے قاضی کو ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ قاضی کو کمرے کے آخری حصے میں لے گیا جہاں ایک دروازہ لگا تھا۔ عضد الدولہ نے اس کو کھولا تو پتا چلا یہ ایک تہ خانہ ہے۔ عضد الدولہ، قاضی کے ساتھ تہ خانے میں اتر گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں ایک خزانے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں شمعیں روشن تھیں اور ان کے سامنے زر و جواہر اور ہیروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک سو چالیس آفتابے، تین ڈبے اور یا قوت لعل اور فیروزے سے لبریز پندرہ پیالے رکھے ہوئے تھے۔ قاضی نے آفتابوں کی طرف اشارہ کیا، پوچھا۔ ”حضور والا! ان آفتابوں میں کیا ہے؟“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”دینار۔“
قاضی نے ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور ان میں؟“
جواب ملا۔ ”مردارید۔“

قاضی اس مال کو دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ شادی مرگ سی طاری ہونے لگی۔ عضد الدولہ نے کہا۔ ”آج رات میں آپ کے تہ خانے کا معائنہ کروں گا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بسر و چشم، میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

رات کو عضد الدولہ، قاضی کے قصر میں پہنچ گیا اور تہ خانے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ موقع غیبت دیکھ کر قاضی نے خنسا کی شکایت کر دی کہ۔ ”حضور والا! ان دنوں میں ایک مصیبت میں گرفتار ہوں اور آپ کی مدد چاہتا ہوں۔“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”قاضی محترم! آپ اپنی مصیبتوں کا ذکر فرمائیں ابھی میں بادشاہ ہوں آپ کے حق میں جو کچھ کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔“

قاضی نے کہا۔ ”مجھے ایک شخص نے نذرانے میں ایک کنیز بھیجی ہے وہ کنیز مجھے پسند آگئی ہے لیکن اب یہ انکشاف

آؤں گی تو کچھ بھی کر لے، میں باہر نکل کر شور مچا دوں گی۔“
قاضی نے جواب دیا۔ ”میں تجھے نکلنے ہی کب دوں گا۔“
اس کے بعد قاضی نے خنسا کو پکڑ لیا، بولا۔ ”اب میں وقت کا انتظار نہیں کروں گا اور خنسا میں تجھے کس طرح سمجھاؤں گا کہ تو میرے پاس بہت خوش رہے گی۔ مال و دولت بھی میرے پاس بہتوں سے زیادہ ہے اور عقل و فراست بھی سب سے زیادہ۔“
خنسا نے جواب دیا۔ ”مجھے مال و دولت اور عقل و فراست نہیں لیٹ درکار ہے جس کو تو نے کسی نہ کسی طرح ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔“

قاضی نے کہا۔ ”اب وہ تجھے نہیں مل سکتا اور بحالت مجبوری اب تجھے پوری زندگی میری ہی آغوش میں گزارنی ہوگی۔“
خنسا چیخی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں ہو سکتا۔“
قاضی نے جواب دیا۔ ”اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا، ایسا ہی ہوگا۔“

اس کے بعد قاضی نے خنسا کو زبردستی قابو میں لیتا چاہا لیکن خنسا بدک کر دوسری طرف چلی گئی۔ قاضی پھر چھپتا مگر خنسا نے اس کو دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ قاضی نے غصے میں کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو یہی کہی۔ میں تجھے معاف نہیں کروں گا اور جس طرح بھی بن پڑے گا میں اپنا مطلب حاصل کر کے رہوں گا۔ تجھ کو ان حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے کیونکہ اب انہی حالات اور ماحول میں تجھے اپنی زندگی بسر کرنا ہے۔“
خنسا نے جواب دیا۔ ”خودکشی حرام ہے اور میں اس حرام پر اس حرام کو ترجیح دوں گی۔“

قاضی کو جوش آیا ہوا تھا اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آج کچھ نہ کچھ کر گزرتا ہے لیکن اس وقت اس کو مطلع کیا گیا کہ عضد الدولہ نے یاد فرمایا ہے۔

قاضی نے خنسا کو خوشنظرانہ نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”آج تو مجھ سے بچ تو نہیں سکتی تھی لیکن تیری خوش قسمتی کہ بادشاہ کا بلاوا آگیا۔ تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہ میرے کہنے میں ہے اور وہ میری بہت سنا ہے۔“

خنسا نے جواب دیا۔ ”جا جا، اپنا راستہ لے، بادشاہ تیری سنا ہے تو سنا رہے۔ بس خدا تیری نہ سنے، بادشاہ کا کیا ہے آج وہ ہے کل کوئی دوسرا آجائے گا۔“

قاضی اسی وقت عضد الدولہ کے پاس چلا گیا۔ اس دن عضد الدولہ ہمیشہ سے زیادہ پریشان تھا۔ قاضی کو دیکھتے ہی بولا۔ ”اب بات بگڑ چکی ہے اور جنگ کے علاوہ چارہ نہیں رہا۔ سنا ہوں کہ تہ خانہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔“

نکلے ہی نہیں دوں گا۔“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”اگر تو مجھے اس قصر سے نہیں نکلے دے گا تو کیا ہوا، یہ کام میرا غلام انجام دے گا اور عضد الدولہ کو یہ بھی بتادے گا کہ میں تجھ سے ملنے گیا تھا مگر واپس نہیں آیا۔“

قاضی کو فکر لاحق ہوئی۔ منگل کی شب کو عضد الدولہ اس کے قصر میں اپنا خزانہ منتقل کرنے والا تھا۔ اس نے سوچا، ان حالات میں اگر یہ خبر کسی طرح عضد الدولہ تک پہنچ گئی تو اس کا اعتبار مشتبہ ضرور ہو جائے گا۔ اس نے لیٹ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ ”لیٹ میرے بیٹے! ادھر آ، میرے ساتھ۔“ لیٹ نے سر سے پاؤں تک قاضی کو دیکھا اور اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

قاضی نے کہا۔ ”ارے تو میری شکل کیا دیکھ رہا ہے ادھر آ۔“ لیٹ اس کے ساتھ چلا گیا۔ قاضی اس کو اس گودام میں لے گیا جہاں لوگوں کی امانتیں رکھی جاتی تھیں۔ وہاں قاضی نے لیٹ کو اپنے سینے سے لگالیا۔ بولا۔ ”لیٹ! میرے بیٹے، یہ جو کچھ میں نے تیرے ساتھ کیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ تو مال و زر اور عورت کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرے گا اب چونکہ تو خاصا پریشان ہو چکا ہے اس لیے کہیں مار نہیں کھائے گا۔ تیری امانتیں میرے پاس جوں کی توں موجود ہیں مزدور بلا اور اٹھوالے۔“

اس کے بعد اس نے ان آفتابوں کی طرف اشارہ کیا جو درہم و دینار سے بھرے رکھے تھے۔

لیٹ نے اسی وقت مزدوروں کو بلالیا اور اپنے آفتابے اٹھوالے۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”اور عنان، عنان کہاں ہے؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”وہ اہل خانہ کے ساتھ اہواز گئی ہوئی ہے، دو تین ہفتے کے بعد آجائے گی تو اسے بھی تیرے حوالے کر دوں گا۔“

لیٹ نے کہا۔ ”مجھے اہواز کا پتا بتاتا کہ میں اسے لے آؤں۔“

قاضی نے کہا۔ ”اب تو اتنا بے صبر اپن بھی نہ دکھا۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ تجھے عنان واپس مل جائے گی تو خواجواہ کیوں پریشان ہو رہا ہے۔ اس دوران تو کوئی حویلی وغیرہ بھی خرید لے۔“

لیٹ نے مجبوری سے کہا۔ ”اچھا میں تین ہفتے اس کا انتظار کر لوں گا اور اس دوران حویلی بھی خرید لوں گا۔ اب رہی خنسا تو خنسا آئی تو نہیں؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”ابھی تک وہ آئی نہیں جیسے ہی آئے گی تیرے حوالے کر دی جائے گی۔ تو اطمینان رکھ۔“ لیٹ نے کہا۔ ”اچھا میں اس کا بھی انتظار کر لوں گا لیکن قاضی اگر تو نے خنسا کی آمد سے مجھے مطلع نہیں کیا تو میں اس کا تجھ سے خطرناک انتقام لوں گا۔“

قاضی کو اس کی باتوں پر غصہ تو بہت آ رہا تھا لیکن حالات ایسے نازک تھے کہ وہ ضبط سے کام لے رہا تھا۔ لیٹ اپنے آفتابے لے کر چلا گیا۔ اس نے قاضی کو شکست دے دی تھی اور اس کو یقین تھا کہ وہ عنان کو بھی حاصل کر لے گا اور خنسا کے آجانے پر اسے بھی۔

لیٹ کے چلے جانے کے بعد قاضی نے سکون کی سانس لی کیونکہ اس کے سر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا تھا۔ منگل کی شب آگئی۔ قاضی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں وہ قصر کے پھانک پر دربانوں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کو عضد الدولہ کے آدنی کا انتظار تھا۔ ہر ہر آہٹ پر وہ چونک جاتا اور پھانک کے باہر نکل جاتا اور مایوس واپس آتا۔ خدا خدا کر کے رات کے پچھلے پہر عضد الدولہ کا آدنی آ گیا اور اس نے یہ خفیہ پیغام دیا۔ ”بادشاہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے اور کہا ہے کہ جو کچھ اٹھوانا ہے آپ اپنی نگرانی میں اٹھوا لیجیے۔“

قاضی اس وقت اس آدنی کے ساتھ عضد الدولہ کے پاس روانہ ہو گیا۔ قاضی کو عضد الدولہ کے اس چھوٹے محل میں لے جایا گیا جہاں وہ کئی بار آچکا تھا۔ عضد الدولہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ عضد الدولہ اٹھا اور قاضی کو لے کر تہ خانے کی طرف چلا گیا۔ کمرافانوسوں سے روشن تھا اور تیز روشنی میں کمرے کی ایک ایک چیز دیکھی جاسکتی تھی۔ عضد الدولہ نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور قاضی سے کہا۔ ”قاضی محترم! تہ خانے کے آفتابے، ڈبے اور بیالے ہم دونوں کو مل کر کمرے سے نکالے ہوں گے۔ اس چھوٹے محل کے عقبی دروازے پر گاڑی کھڑی ہے۔ جتنا مال ہم دونوں منتقل کر سکیں گے آج کر دیں گے بقیہ کل منتقل ہو جائے گا کیونکہ میں اپنے اس معاملے میں کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

قاضی نے خوشی سے جواب دیا۔ ”حضور والا! آپ کو بھی زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں اکیلا ہی یہ کام کر لوں گا۔ بوڑھا ہوں تو کیا ہوا میری قوت ایمانی مجھ سے بڑے سے بڑا کام کر دیا کرتی ہے۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں آپ کا ساتھ دوں گا۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے تہ خانے میں داخل ہو گئے۔ وہاں بھی غیر معمولی روشنی تھی۔ قاضی اور عضد الدولہ مال و زر کے انبار کے سامنے جا کھڑے ہوئے یہاں ایک طرف سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا۔ عضد الدولہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں مزید آفتابے رکھ دیے گئے ہیں۔“

قاضی خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ خلاف توقع عضد الدولہ نے تالی بجائی اور اسی وقت سیاہ پردے کے پیچھے سے لیٹ نمودار ہو کر ان دونوں کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ قاضی، لیٹ کو دیکھتے ہی مدھوشی محسوس کرنے لگا۔ اس نے نیم مدھوشی میں عضد الدولہ کی طرف دیکھا، سلطان کے چہرے پر غصہ بھی تھا اور مسکراہٹ بھی۔ قاضی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عضد الدولہ نے کہا۔ ”قاضی محترم! کیا بات ہے، میری جگہ یہ نوجوان تیری مدد کرے گا اٹھا آفتابے اور لے چل باہر۔“

قاضی نے گھٹکیاں ہوائی آواز میں کہا۔ ”سلطان معظم رحم۔“ عضد الدولہ نے طنز آ پوچھا۔ ”قاضی محترم! کس بات پر رحم؟“ پھر پوچھا۔ ”پردے کے پیچھے تیری جتنی عنان بھی موجود ہے۔“ اس نے پردے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”قاضی کی جتنی عنان۔ تو وہاں کیا کر رہی ہے آجا۔“ عنان بھی پردے کے پیچھے سے باہر آئی۔ قاضی گڑ گڑایا۔ ”سلطان محترم رحم۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”قاضی محترم! تو میری بیٹیوں کو بھی اسی طرح کسی سلطان کے حوالے کر دیتا۔ بالکل اپنی جتنی کی عنان کی طرح۔“

قاضی پھر چیخا۔ ”سلطان محترم! رحم۔“

لیٹ اور عنان، عضد الدولہ کے رو برو سر جھکائے کھڑے تھے۔

عضد الدولہ نے لیٹ سے کہا۔ ”تھوون تاجر کے بیٹے خدا گواہ ہے کہ میرے محل میں عنان بیٹی بن کر رہی ہے۔ یہ تیری امانت تھی جو تیرے حوالے کی جا رہی ہے۔“

لیٹ نے رقت سے کہا۔ ”میں سلطان کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”اب تو، تو میری سلطنت سے دور جانے کا ارادہ نہیں رکھتا؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”نہیں حضور والا! میں نے انصاف پالیا۔“

عضد الدولہ نے قاضی سے پوچھا۔ ”خنسا کہاں ہے؟“ قاضی پر بے ہوشی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس نے عضد الدولہ کا سوال اچھی طرح نہیں سنا اور دھڑام سے گر گیا۔

اقوال زریں

☆ دنیا کا سب سے خوب صورت پودا محبت کا ہوتا ہے، جو زمین میں نہیں دلوں میں اگتا ہے۔

☆ اگر تم اپنے روزگار میں ناقابل یقین اضافہ چاہتے ہو تو کبھی بھی دسترخوان پر رکھے کھانے میں عیب نہ نکالو اور شکر کر کے کھاؤ، اس سے تمہیں 2 قاعدے ہوں گے۔

(1) تمہارے حلال رزق میں اضافہ ہوگا۔

(2) تم پر آنے والی 70 بیماریوں سے اللہ پاک تم کو محفوظ رکھے گا۔

☆ دل شیشے سے نہیں بنتا، اگر بتا تو ٹوٹنے کی آواز آتی۔

☆ دل پتھر سے نہیں بنتا اگر بتا، تو گرنے کی آواز آتی۔

☆ دل مٹی سے نہیں بنتا اگر بتا، تو بکھرنے کی آواز آتی۔

☆ دل اگر بتا ہے تو کسی کی محبت سے بتا ہے اگر ٹوٹ بھی جائے، بکھر بھی جائے، گر بھی جائے تو آواز نہیں آتی صرف خاموش آنسو بہتے ہیں۔

☆ سکون کے لیے وضو کا پانی۔

☆ جگر کے لیے قرآن کریم کی تلاوت۔

☆ صحت کے لیے نماز۔

☆ اور خوش رہنے کے لیے اللہ پاک کا ذکر کیا کرو۔

☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھائی کرو کیونکہ پھول بیچنے والے کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

☆ مخلص دوست کے اندر اتنا پیار چھپا ہوتا ہے، جیسے ایک چھوٹے سے بیج کے اندر پورا درخت چھپا ہوتا ہے۔

☆ اچھے الفاظ اور اچھے خیالات ہی خوب صورتیاں تخلیق کرتے ہیں، جس چہرے کے ساتھ ہم پیدا ہوتے ہیں وہ ہمارا انتخاب نہیں ہوتا مگر جس چہرے کے ساتھ ہم مرتے ہیں اسے تراشنے کے ذمہ دار ہم خود ہیں وہ ہمارے لفظوں، خیالوں اور دعاؤں کا عکس ہوتا ہے۔

☆ مرسلہ: رضوان خولی گریڈ وی، اورنگی ٹاؤن، کراچی



معابدہ

کاشف زبیر

اگر انسان کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو تو وہ تمام مشکلات سے بآسانی گزر جاتا ہے کیونکہ اس کی استقامت جو یکسوئی عطا کرتی ہے اس کے ذریعے وہ بہترین منصوبے ترتیب دے لیتا ہے، قطع نظر اس کا نکتہ نظر درست ہے یا غلط، بہر حال وہ بھی ایک عجیب معاہدے کا پابند تھا جس کے خلاف اگر جاتا تو گویا جان سے جاتا... لہذا اس معاہدے کی پاسداری اس کی زندگی کی ضمانت سے مشروط تھی۔ ایسے میں وہ بھلا کیسے وعدہ خلافی کا مرتکب ہوتا۔

موت کی سرگوشیوں اور زندگی کے تلاطم کا

حیرت انگیز قصہ

پریڈی ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں شریف کارلائل کی حکومت تھی اور اسے مجرموں سے سخت نفرت تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ٹیکساس کی وچ وحشی تھا۔ صرف مجرم اور عوام ہی نہیں قانون کے رکھوالے بھی کم نہیں تھے۔ شریف کارلائل ہر مہینے قصبے کے میدان میں ایک تقریب منعقد کرتا تھا جس میں مجرموں کو مزائے موت دی جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہاں کئی افراد کو پھانسی دینے کی تیاری کی جارہی تھی اور ان میں مشہور ترین مجرم

پریڈی ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں شریف کارلائل کی حکومت تھی اور اسے مجرموں سے سخت نفرت تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ٹیکساس کی وچ وحشی تھا۔ صرف مجرم اور عوام ہی نہیں قانون کے

عنان نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔ ”اب ان مہربانیوں کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی۔“ لیکن خنسا نے بادشاہ کو دیکھ کر فوراً نظریں جھکا لیں۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ خنسا کچھ کہنا چاہتی ہے، پوچھا۔ ”خنسا تو کچھ کہنا چاہتی ہے شاید؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”جی کنیز پرور۔“

”پھر کہہ ناؤ رکس بات کا؟“

خنسا نے رک رک کر کہا۔ ”حضور والا ایٹ سے کہیے مجھے آزاد کر کے بیوی بنالے۔“

عنان نے تڑپ کر خنسا کی طرف دیکھا۔ عضد الدولہ نے لیٹ کے بجائے عنان سے پوچھا۔ ”بیٹی! تو لیٹ سے کہہ کر خنسا کی خواہش پوری کرا دے۔“

عنان نے جواب دیا۔ ”آپ کی ایمانی ہم سب کے لیے حکم ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

کچھ دیر بعد غلام بھی کھانسا ہوا آ گیا۔ وہ بادشاہ کو دیکھ کر جھجکا لیکن بادشاہ نے قریب آنے کا حکم دیا۔ ”تو ایک مثالی انسان ہے تیری وفاداری اس لائق ہے کہ تجھے بادشاہ کے برابر بٹھایا جائے۔“

عضد الدولہ نے غلام کو اپنے پاس ہی بٹھالیا اور پوچھا۔ ”تجھ کو کچھ بتا ہے کہ قاضی کہاں ہے؟“

غلام نے کہا۔ ”سننے میں آیا ہے کہ وہ اہواز جانے کی تیاری کر رہا ہے۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”اس کے دوستوں کا اس کے ساتھ کیا رویہ ہے؟“

غلام نے جواب دیا۔ ”جب وہ قاضی القضاۃ کے عہدے پر تھا تو اس کا کوئی دشمن نہیں تھا اور اب معزولی کے بعد کوئی اس کا دوست نہیں۔“

غلام کے جواب نے سبھی کو پھڑکا دیا۔ عضد الدولہ بے اختیار ہنس دیا لیکن اس ہنسی میں غلام کے کھانسنے کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ بادشاہ نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے غلام سے کہا۔ ”اب مجھے ایک کام اور کرنا ہے اور وہ ہے شاہی طبیب سے تیری کھانسی کا تیر بہدف علاج کروانا ہے۔“

☆☆☆

قاضی کی آنکھ کھلی تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ عضد الدولہ نے قاضی کو کوئی سزا نہیں دی، معزول کر کے بغداد خالی کر دینے کا حکم دے دیا۔ قاضی کا قصر لیٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ عضد الدولہ نے اپنے چچا کے بیٹے کو گلست دے دی اور فتح کی خوشی میں جشن منایا تو اس میں لیٹ، عنان اور خنسا کو بھی مدعو کیا۔ یہ تینوں عضد الدولہ کے خاص مہمان تھے۔ یہ تینوں عضد الدولہ کی خدمت میں پہنچے تو اس نے لیٹ سے کہا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ تو نے کسی سے یہ کہا تھا کہ میں بغداد اور اصفہان سے کہیں دور اس لیے چلا جاؤں گا کہ یہاں انصاف نہیں ہے؟“

لیٹ خوف زدہ تھا پھر بھی سچ بولا۔ ”ہاں میں نے یہ بات اصفہان جاتے ہوئے اپنے ایک ہم سفر سے کہی تھی۔“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”تیرا وہ ہم سفر میرا واقع نویس تھا۔ جس نے تیری پوری داستان مجھے لکھ کر بھیجی اور مجھے اس کے لیے اتنا بڑا تماشا کرنا پڑا۔“ پھر خوشی سے پوچھا۔ ”اب تو، تو بغداد ہی میں رہے گا؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”اب مجھے انصاف مل گیا اس لیے اس سرزمین انصاف کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”تیرا غلام کہاں ہے؟“

لیٹ نے جواب دیا۔ ”وہ بھی باہر کہیں موجود ہوگا چونکہ وہ ہر وقت کھانسا رہتا ہے اس لیے اسے بزم میں بلا کر میں حضور والا کی طبع نازک کو.....“

عضد الدولہ نے بات کاٹ دی بولا۔ ”ارے اس کو اسی وقت بلوا۔“ اس کے بعد بادشاہ نے تالی بجائی۔ ایک غلام حاضر ہوا۔ عضد الدولہ نے حکم دیا۔ ”قصر کے باہر اس کا غلام کھڑا ہے، اسے اندر بلا لے۔“

لیٹ نے بات پوری کر دی۔ ”اور اس کی پہچان یہ ہے کہ بار بار کھانسا رہا ہوگا۔“

عضد الدولہ مسکرایا۔ ”خوب خوب، نام سے زیادہ بہتر تعارف اس کی کھانسی ہے، خوب۔“

بادشاہ اچانک خنسا اور عنان کی طرف متوجہ ہوا۔ پوچھا۔ ”تم دونوں کو کچھ کہنا ہے؟“

ساخات

تاریخ طبری، ابن جریر الطبری، تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون، فتوح البلدان، بلاذری، مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، خاکثر حسن ابراہیم حسن، تاریخ الخلفاء، جلال الدین سیرطی، تاریخ اسلام، مصینا الدین ندوی۔

اور ڈکیت جیول بھی شامل تھا۔ اسے ایک بیج نے ان جرائم پر پھانسی کی سزا سنائی تھی جو اس نے کیے تھے۔ جیول تقریباً چالیس سالہ خوفناک شکل اور تاثرات والا مضبوط جسم کا سخت جان شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت نگیں تھی۔ جیول سمیت چار افراد کو پلیٹ فارم پر لایا گیا اور ان کے گلوں میں ری ڈال دی گئی تھی۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے البتہ پاؤں آزاد تھے۔ شریف کا ڈپٹی ان کی سزا کا لکھا ہوا حکم نامہ وہاں تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہونے والی عوام کو پڑھ کر سنارہا تھا۔ وہ بے تابی سے منتظر تھے کہ کب ان چاروں افراد کو سوئی پر لٹکایا جاتا ہے۔ انہیں ڈپٹی کی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے حکم نامہ سنا دیا تو جلاد نے شریف کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلایا اور جلاد لیور کھینچنے والا تھا کہ بریڈی کے داخلی دروازے پر خوفناک دھماکا ہوا اور اس کے پرچے اڑ گئے۔ مجرموں کی پھانسی کے وقت دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ دروازے کے اڑتے ہی چھ سات گھڑ سوار اندھا دھند گولیاں برساتے اندر داخل ہوئے۔ وہ بلا امتیاز ہر شخص پر گولیاں برسا رہے تھے اور اس میں مسلح یا غیر مسلح اور عورت و بچے کی تمیز بھی نہیں کر رہے تھے۔ شریف کا رائل چیچ چیچ کر اپنے آدمیوں کو حملہ آوروں کو بھون ڈالنے کا حکم دے رہا تھا۔ مگر اس کے آدمیوں کو اپنی جانوں کے لالے پڑے تھے۔ وہ جیول کے گروہ کے آدمی تھے جو اسے چھڑانے آئے تھے۔ شریف کا رائل ڈانٹ نہیں رہا تھا۔ جلاد لیور والی جگہ سے غائب تھا۔ شریف خود اس طرف بڑھا اور اس نے لیور تھام کر جیول کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھتا رہا۔ شریف نے لیور کھینچتے ہوئے غرا کر کہا۔

”جہنم میں جاؤ۔“

جیول کو ہوش آیا تو وہ ایک فولادی کرسی پر بندھا پڑا تھا اور اس کے جسم پر صرف ایک تار بھی نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں فولادی کلپ سے بندھے ہوئے تھے۔ وہاں بلا کی گرمی تھی اس کے باوجود اس کے سامنے ایک بڑے سے کڑا ہے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ میں کہاں ہوں؟ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ کرسی ایک گنبد نما جگہ تھی جس پر جا بے جا زنجیریں اور لوہے کے حلقے لٹک رہے تھے۔ گنبد چاروں طرف سے ستونوں پر کھڑا ہوا تھا اور ستونوں کے درمیان محرابیں تھیں۔ اس گنبد کے باہر بھی شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کے باوجود وہاں تاریکی تھی۔ دور اور پاس سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے لوگوں کو تشدد کا

نشاندہ بنایا جا رہا ہو۔ اس کے ذہن میں بے اختیار خیال آیا کہ وہ جہنم میں ہے۔

”تم نے ٹھیک سوچا۔“ عقب سے ایک غراتی ہوئی آواز آئی۔ پھر ایک تو منہ چوہ پوش عقب سے گھومتا ہوا اس کے سامنے آیا۔ وہ کڑا ہے کے دوسری طرف جا کھڑا ہوا اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ”جہنم میں... خوش آمدید۔“

”یہ کون ہے۔“ جیول چلایا۔

چوہ پوش غراتی آواز میں ہنسا۔ یوں لگا جیسے کسی درندے نے ہنسنے کی کوشش کی ہو۔ ”جلد تمہیں یقین آجائے گا میرے دوست۔“

چوہ پوش نے کڑا ہے سے ایک سلاخ اٹھائی اس کے سرے پر آٹھ کا نشان بنا ہوا تھا اور وہ سرخ ہو کر دھک رہا تھا۔ وہ جیول کے پاس آیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ ”نہیں... نہیں...“ اس نے کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی چوہ پوش نے دھکے دیا اور اس کے عریاں سینے پر چسپاں کر دیا۔ جیول کے حلق سے چیخ نکلی اور اس نے اپنا ہی گوشت جلنے کی بوسٹھی۔ اذیت بہت شدید تھی، جیول گہری سانس لے رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے اب تمہیں یقین آ گیا ہوگا۔ یہ صرف آغاز ہے، بہت جلد تمہیں بہت سے عذاب سے گزرنا پڑے گا۔“

”مگر کیوں؟“ جیول چلایا۔

”کیوں؟“ چوہ پوش نے حیرت سے کہا۔ ”تم جہنم میں یہ سوال کر رہے ہو۔“

”مجھے یقین نہیں ہے۔“ جیول پھر چلایا۔ اس کی تکلیف حیرت انگیز طور پر کم ہو گئی تھی اور پھر اس نے اپنے سینے کی طرف دیکھا تو وہاں سے جلنے کا نشان بھی غائب تھا۔ اگر جیول اذیت برداشت کرنے کا عادی نہ ہوتا تو شاید اس تکلیف سے مر جاتا۔ اسے کئی بار گولیاں لگی تھیں۔ ایک بار اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ مگر اس نے کبھی ایسی اذیت برداشت نہیں کی تھی۔ مگر اب وہ حیرت سے اپنے سینے کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے چوہ پوش سے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”میں نے بتایا نا یہ آغاز ہے جلد تمہیں بہت سی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی تھی۔

”ل... لیکن کیوں؟“

چوہ پوش نے کڑا ہے سے ایک اور سلاخ اٹھائی اس

پر دو کا ہندسہ چسپاں تھا۔ ”کیونکہ تم جہنم میں ہو اور تم یہاں آنے کے لیے مناسب ترین امیدوار ہو۔“

چوہ پوش نے دھکے دیا اور اس کے سینے پر بائیں جانب لگا یا تو اس کی چیخ سے گنبد گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

جیول کو زبردستی جہنم سے ناپسندیدہ ترین شخصیت تھا۔ وہ دو سال کا تھا جب اس نے ایک پڑوسی بچے کی ران میں چھری گھونپ دی تھی۔ اسے چار ٹانگے لگے تھے۔ وحشی ٹیکساس کے اس وحشی ترین قصبے میں دیے تو تمام ہی ایسے لوگ آباد تھے جن کے نزدیک سوائے اپنی جان کے اور کسی کی اہمیت نہیں تھی مگر جیول ان سب سے آگے تھا۔ اس پہلے کارنامے کے بعد اس کا ہاتھ رکنا نہیں تھا۔ چھ سال کی عمر میں جب اسے اسکول میں داخل کرایا گیا تو اس کا شہرہ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور بچے تو بچے ٹیچر تک اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ یہاں پہلے دن اس نے اپنی پانی کی چھاگل مار کر ایک بچے کی بھون بھاڑ دی، جس نے بغیر پوچھے اس کی چھاگل سے پانی پی لیا تھا۔ جیول کو کمزاری مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا البتہ دو دن بعد اس نے بچہ کا گھوڑا پاؤں میں ری آجائے سے گرا اور اپنی ہانگ تڑا بیٹھا، جس نے جیول کو مزادی تھی۔

بارہ سال کی عمر میں اس نے اسکول چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے تعلیم سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے چواری باپ نے اسے گھر سے نکال دیا لیکن اس نے پروا نہیں کی۔ وہ پہلے ہی چوروں کے ایک گروہ میں جگہ حاصل کر چکا تھا۔ کسی کو تعجب نہیں ہوا کیونکہ سب کا خیال تھا جیول آنے والے دنوں میں سوائے جرم کے اور کچھ نہیں کرے گا۔ چوروں کا یہ گروہ آس پاس معروف گزرگاہوں سے گزرنے والے قافلوں کا سامان چرائیتا تھا۔ قافلوں پر ہاتھ کی صفائی کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ مقامی پولیس ان کے دواپلے پر توجہ نہیں دیتی تھی۔ اگر وہ قصبے میں چوریاں کرتے تو لوگ ان کے خلاف ہو جاتے۔

☆☆☆

جیول کی جان نکل رہی تھی، اس بار اذیت پہلے سے زیادہ تھی اور اسے سانس بھی مشکل سے آرہی تھی۔ چوہ پوش اپنا کام کر کے آرام سے اس کے آس پاس ٹھہر رہا تھا۔ اب جیول کو کسی حد تک یقین آ گیا تھا کہ وہ واقعی چشم جہنم میں ہے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”تم جہنم کے فرشتے ہو؟“

”فرشتہ؟“ چوہ پوش نے تعجب سے کہا۔ ”یہاں کسی فرشتے کا کیا کام... میں شیطان ہوں اور تمہیں میرے سپرد

کیا گیا ہے۔ دنیا میں تم میرے پیچھے چلتے تھے۔ اب یہاں میں تمہیں اس کا صلہ دے رہا ہوں۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

چوہ پوش ہنسا۔ ”ایک شیطان سے تم توقع بھی کیا کر سکتے ہو۔ لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں شیطان ہوں۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے چہرے سے چوہ ہٹا دیا۔ جیول کے خیال میں وہ سنگ دل شخص تھا اس پر کوئی چیز اثر نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس وقت جو چہرہ اس کے سامنے تھا اسے دیکھ کر اس کا رواں رواں لرز اٹھا تھا۔ چٹنی اور جھلسی ہوئی کھال جس پر جگہ جگہ کٹ گئے تھے اور اس سے سرخ گوشت جھلک رہا تھا۔ ناک کی جگہ ایک تڑا مڑا ٹیلا سا تھا اور گڑھوں میں دھنسی آنکھوں سے سرخی کے ساتھ درندگی جھلک رہی تھی۔ جیول ہچکچایا۔

”تم... تم کچھ شیطان ہو؟“

”وہ والا نہیں جو تم لوگ سمجھتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں صرف مقرر کیا گیا ہوں۔ دنیا میں بھی تمہارے ساتھ تھا اور اب یہاں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“

جیول سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میں تمہاری ذمہ داری ہوں؟“

”صرف تم ہی نہیں یہاں اور بھی ہیں جو میری ذمہ داری ہیں اور میں ان کے ساتھ بھی ہوتا ہوں۔“

”ایک ہی وقت میں؟“

”ہاں ایک ہی وقت میں... میں شیطان ہوں اس لیے میری طاقت بہت زیادہ ہے۔“

”اتنے لوگ کیوں؟“

”یہ میری ڈیوٹی ہے۔“ شیطان نے کہتے ہوئے اس بار سات کا ہندسہ اس کے سینے پر لگا دیا۔ جیول چلا رہا تھا مگر جب تک دھکے دیا تو نگارہ بچھ نہیں گیا شیطان نے سلاخ نہیں ہٹائی۔

”آف میرے خدا... اس اذیت سے تو موت اچھی ہے۔“

”خدا کا نام مت لو... زندگی میں تم نے اسے یاد نہیں کیا اس لیے اب تم اس کا نام نہیں لے سکتے۔“ شیطان نے اسے جھڑک دیا۔ ”تم ایک بار مر چکے ہو اس لیے اب دوبارہ موت طلب نہیں کر سکتے۔“

”میں مر چکا ہوں۔“ جیول نے اذیت برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں مر چکا ہوں تو یہ تکلیف کیوں ہے؟“

”یہ تمہارا مقدر ہے کیا تم کو یاد ہے تم کیسے مرے تھے؟“

جیول سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اسے یاد آنے لگا۔

☆☆☆

حملہ آوروں کی قیادت کو پُر کر رہا تھا۔ کوپر جنگ، جیول کا نائب تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور چہرے سے نرم خون نظر آنے والا انسان تھا لیکن جیول اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کتنا سفاک ہے۔ وہ رحم و مروت کا قائل ہی نہیں تھا اور جس کا دشمن ہو جاتا اس کے خلاف آخری حد تک چلا جاتا تھا۔ جیول کو یاد تھا، ایک بار کوپر نے ذاتی جھگڑے میں گینگ کو استعمال کیا۔ جیول اس وقت وہاں نہیں تھا ورنہ وہ شاید کوپر کو روک دیتا۔ میٹ جین نامی شخص سے کوپر کا ایک جوا خانے میں جھگڑا ہوا۔ میٹ جین نے ماہر کے باز ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کوپر کے چہرے پر نشان ڈال دیے تھے اور اسے اپنا پستول استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگلی رات کوپر گینگ کے چار افراد کو لے کر میٹ کے مکان پر پہنچا۔ اس نے وہاں دھوکے سے میٹ کو قابو کیا اور پھر اسے باندھ کر اس کے سامنے اس کی بیوی اور بیٹی کی اجتماعی آبروریزی کی۔ آخر میں اس نے خاندان کے پانچ افراد کو شوٹ کیا اور وہاں آگ لگا کر نکل آیا۔

جیول کو غصہ آیا تھا۔ اگر کوپر کو میٹ پر غصہ تھا تو وہ اس پر نکال لیتا تو پورے خاندان کو ختم کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ بہر حال جیول کو کوپر سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا اور دونوں بعد وہ ایک واردات کے دوران گرفتار ہو گیا۔ شریف کارلائل، جیول اور اس کے گینگ کا جانی دشمن تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ ان کے خلاف کارروائیاں کرتا رہا تھا۔ جیول ہاتھ آیا تو اس کی باجھیں کل اٹھی تھیں اور اس نے ریکارڈ دو ہفتے میں اس کے خلاف مقدمہ چلا کر اسے پھانسی کی سزا سنوا دی۔ جج اس کا اپنا آدمی تھا۔ جیول کے ساتھ اس کے تین آدمی اور پکڑے گئے تھے۔ وہ تینوں بھی پھانسی کے تختے پر تھے۔ جب کوپر اور اس کے آدمیوں نے حملہ کیا تو جلا و اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا۔ ایسے میں شریف کارلائل نے خود جلا و کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بھاگ کر لیور پھینچ لیا اور وہ چاروں جھٹکے سے خلا میں جا گرے تھے۔

جیول نے گردن سخت کر لی تھی اس لیے وہ ٹوٹنے سے بچ گئی لیکن راساخت ہونے سے اس کی سانس رک رہی تھی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے اس کی آنکھیں باہر آ گئیں اور جسم سے جان نکلنے لگی تھی مگر ایسے لمحے ایک فائر نے وہ رسی کاٹ دی جس سے وہ لٹکا ہوا تھا۔ جیول جھٹکے سے نیچے گرا۔ اس کے گرد وہ ایک نوجوان بھاگ کر اس کے باقی ساتھیوں کی رسیاں کاٹ رہا تھا پھر اس نے نیچے آ کر جیول کے ہاتھوں کی رسی کاٹ دی۔ جیول نے دیکھا، اس کے دوسرا بھی گردن ٹوٹنے سے

پہلے ہی زندگی ہار چکے تھے اور تیسرا بھی کچھ دیر کا مہمان لگ رہا تھا۔ جیول نے رسی کاٹنے والے سے پستول لے کر اس کی اذیت کا خاتمہ کر دیا۔ کوپر اور اس کے آدمیوں نے شریف کارلائل کے بیشتر آدمیوں کا صفایا کر دیا تھا ان کے علاوہ بھی کوئی دو درجن لاشیں وہاں پڑی تھیں۔ اب وہ لوگ جگہ جگہ آگ لگا رہے تھے۔ آگ لگانے کا مقصد شریف اور اس کے بچے کیسے آدمیوں کو تعاقب میں آنے سے روکنا تھا۔ دن منٹ بعد وہ سب وہاں سے جا رہے تھے۔

ساری رات سفر کے بعد انہوں نے ایک وادی میں پڑاؤ ڈالا۔ سخت سردی تھی اور یہاں ہر طرف برف پڑی تھی صرف ایک چشمہ بہہ رہا تھا، اس کا پانی برف نہیں بنا تھا۔ انہوں نے آگ جلائی اور گھوڑے ایک جگہ باندھ کر کھائے کی تیاری میں لگ گئے۔ کوپر جیول کو بتا رہا تھا کہ جیسے ہی اسے پتا چلا اس نے جیول اور ساتھیوں کو آزاد کرانے کے لیے پلاننگ شروع کر دی تھی۔ جیول جن کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کا بیان سن رہا تھا۔ جب کوپر خاموش ہوا تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم نے دیر کی اور تقریباً ناکام رہے تھے۔ ہمارے تین ساتھی اسی دیر کی وجہ سے مارے گئے۔ تمہیں پہلے ہی حملہ کر کے ہمیں رہا کر لینا چاہیے تھا۔“

اس تنقید پر کوپر کا منہ بن گیا۔ ”اس صورت میں ہمیں قصبے کے اندر پولیس اسٹیشن پر حملہ کرنا پڑتا۔ ہمیں بہت جانی نقصان ہوتا لیکن اب ہم ایک بھی آدمی گتوئے بغیر تمہیں آزاد کرالائے ہیں۔“

”تم ان تینوں کو بھول رہے ہو؟“
”وہ تینوں پہلے ہی مردہ تھے۔“ کوپر نے بے پروائی سے کہا۔ ”اصل اہمیت تمہاری ہے اور تم زندہ ہو۔“ جیول کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوپر سے متفق نہیں ہے۔ اس نے فکر مندی سے کہا۔ ”اس حملے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے خلاف فوج حرکت میں آ جائے گی۔“
”ہم فوج سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔“ کوپر نے کہا۔ جیول نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میرا تو خیال ہے ہمیں کچھ عرصے کے لیے منتشر ہو جانا چاہیے۔“

”اس کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔“ کوپر نے کہا۔ ”ہم سب تقریباً خالی ہاتھ ہیں پچھلے کچھ عرصے سے کوئی بڑا ہاتھ نہیں مارا ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ جیول نے کہا۔
”ایک منٹ میری ایک بات سنو۔“ کوپر اسے ندی کے کنارے لے آیا۔ ”ایک بار تم نے کہا تھا کہ تم سونے کے

ایک بڑے ذخیرے سے واقف ہو جو کہیں حفاظت سے رکھا ہوا ہے؟“

جیول نے سر ہلایا۔ ”لیکن وہاں حملہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔“

کوپر نے ترغیب دی۔ ”ہم مشکل کام کرتے رہے ہیں۔“
”تم نے کرسل ریو کا نام سنا ہے۔“

کوپر نے ذہن پر زور دیا۔ ”وہی صحرائی قصبہ جو میکسیکو کی سرحد کے پاس ہے؟“

”بالکل وہی۔“ جیول نے سر ہلایا۔ ”سونا وہیں ہے۔“
کوپر نے بے یقینی سے کہا۔ ”وہ تو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور راستوں سے ہٹ کر ہے۔“

”ایک چھوٹی سی وادی ہے، وہاں زیادہ تر کسان رہتے ہیں۔“ جیول بولا۔ ”لیکن کسی زمانے میں اس سے کچھ دور ہونے کی ایک چھوٹی کان بھی تھی۔ اس کے مالک ہنری رسل نے کان سے سونا نکال لیا تھا۔ کان کنوں کی کمی کی وجہ سے کان بند کرنا پڑی تھی۔ پھر بھی اس نے خاصا سونا نکال لیا تھا۔ مگر اسے فروخت نہیں کیا۔ اب وہ سونا اس کے بیٹے کے پاس ہے۔“

”سونا کہاں ہے.... بینک میں یا اس کے گھر میں؟“
جیول نے اپنے چھ آدمیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ہم صرف آٹھ ہیں۔“
”باقی کی ہم وہاں سے پوری کر لیں گے۔ بکاؤ لوگ کہاں نہیں ہوتے ہیں۔“
جیول خود بھی سوچ رہا تھا کہ انہیں روپوشی کے لیے بھی دولت چاہیے ہوگی۔ اس نے سر ہلایا تو کوپر خوش ہو گیا۔ اس نے اسی وقت جا کر سب کے سامنے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ کرسل ریو یہاں سے کوئی تین سو میل کے فاصلے پر تھا۔

”سونا پولیس اسٹیشن میں ہے اور کان کے مالک کا بیٹا وہاں کا شریف ہے۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ وہاں حملہ کرنا کیوں اتنا مشکل کام ہے۔“

کوپر کی آنکھیں لالچ سے چمکنے لگی تھیں۔ ”اس کے باوجود کوشش کی جاسکتی ہے، دور دراز ہونے کی وجہ سے باہر سے کوئی مدد بھی نہیں آئے گی۔“

جیول سوچ میں پڑ گیا۔ ”سچی بات ہے میں نے بھی سنا ہے، یہ تعقدیق شدہ کہانی نہیں ہے۔“

”ہم تعقدیق کر سکتے ہیں۔“ کوپر عیاری سے بولا۔
”وہیں چل کر۔۔۔ اگر سونا نہ بھی ہوا تو وہاں بینک اور لوگوں کے پاس مال تو ہوگا۔“

جیول نے اپنے چھ آدمیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ہم صرف آٹھ ہیں۔“

”باقی کی ہم وہاں سے پوری کر لیں گے۔ بکاؤ لوگ کہاں نہیں ہوتے ہیں۔“

جیول خود بھی سوچ رہا تھا کہ انہیں روپوشی کے لیے بھی دولت چاہیے ہوگی۔ اس نے سر ہلایا تو کوپر خوش ہو گیا۔ اس نے اسی وقت جا کر سب کے سامنے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ کرسل ریو یہاں سے کوئی تین سو میل کے فاصلے پر تھا۔

دیکھتے جون کی سنگینیاں
مہکتے جاسوسی کی رنگینیاں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



اولین سوغات ● زندگی اور موت کے درمیان جاری خوفناک کھیل کا ماجرا۔ ایچ اقبال کی سرائیکی

آوارہ گرد ● دکھ سکھ کے مشترکہ ماقصوں کی ایک نرالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبد الرحیم بھٹو کی شمولیت

جواری ● احمد اقبال کے شہر با قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نئے نئے انداز

مغرب کے نرالی انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب و ماحول کی عکاسی اور محبت کی پھر وہ ناقابل فرسوش کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

بقی کھانی ● ایک بچی کے غماز کا نئی نئی احوال..... اسماء قادری کا سرورق

دوسری کھانی ● دیوانگی کی حد کو چھو لینے والی چاہ کا دلنشیں قصہ..... کاشف زبیر کی پراثر تحریر



آپ کے تہرے...
مشوے...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھاتیں

انہوں نے آنے والی رات بھی اسی وادی میں گزاری۔ اگلی صبح وہ تازہ دم ہو کر کرسل ریو کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ مسلسل سفر کر کے وہ اگلے دن دوپہر میں کرسل ریو میں داخل ہوئے۔ یہ چھوٹا سا پرامن قصبہ تھا کیونکہ وہاں لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی اپنی عورتوں اور بچوں کو گھروں میں کر کے دروازے بند کر لیے تھے۔ ان لوگوں کے پاس اسلحہ تھا مگر مجموعی طور پر وہ پرامن نظر آ رہے تھے۔ وہ سب قصبے کے مرکزی چوک پر واقع بار میں پہنچے۔ یہاں بازار بھی تھا۔ یہیں دو بارز اور ایک ہوٹل تھا۔ مکانات کی خوب صورتی اور حالت سے لگ رہا تھا کہ قصبے کے لوگ خوش حال تھے۔ زر خیز زمین اور زیر آب پانی کی موجودگی یہاں کی خوشحالی کی بنیادی وجہ تھی۔ بار میں انہیں نہ صرف اپنے مطلب کے لوگ مل گئے بلکہ معلومات بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ یہاں سچ سچ سونا تھا اور ایک اندازے کے مطابق اس کا وزن دو سو کلو گرام سے زیادہ تھا۔

☆☆☆

شیرف کرسل ریو اور شادی شدہ تھا۔ اس کا عالی شان مکان قصبے کے وسط میں تھا۔ اس کی بیوی مالدینا خوب صورت عورت تھی اور دو بچوں کے باوجود اس کی خوبصورتی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس وقت وہ پولیس اسٹیشن آئی ہوئی تھی۔ وہ کرس اور اس کے ساتھیوں کے لیے شام کی چائے لائی تھی۔ ساتھ میں گھر کے بنے ہوئے بسکٹ تھے۔ اس نے کرس کے لیے پیالی میں چائے اٹھ لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”کچھ دیر پہلے آٹھ اجنبی افراد جو بہت زیادہ مسلح ہیں قصبے میں آئے ہیں اور اس وقت بڑی کے بار میں ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ کرس نے بے پروائی سے کہا۔ ”تم فکر مت کرو وہ کتنے ہی مسلح کیوں نہ ہوں میرا اور میرے ساتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔“

مالدینا نے غور سے کرس کو دیکھا۔ ”ضمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔“

”ہے شیرف...“ کرس کے ڈبٹی ایڈم نے پکار کر کہا۔ ”بہتر ہوگا تم دفتر گھر لے جاؤ۔“

اس پر ایک قہقہہ پڑا تھا۔ کرس مسکرانے لگا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے، مالدینا بہت سمجھدار خاتون ہے۔“

”عورت کی سمجھ اس کے سر میں نہیں اس کے لباس میں چھپی ہوتی ہے اس لحاظ سے مالدینا بہت سمجھدار ہے۔“

ایڈم نے پھر کہا تو ایک قہقہہ اور گونجا۔ کرس یا مالدینا نے اس مذاق کا برا نہیں منایا۔ وہ سب ایک خاندان کی طرح تھے۔

کرس نے کہا۔

”بہتر ہوگا اب تم رخصت ہو جاؤ۔“

جس وقت مالدینا پولیس اسٹیشن سے نکل رہی تھی سامنے سڑک پار ہوٹل کی اوپری منزل کے ایک کمرے سے کرس اور جیول جھانک رہے تھے۔ کرس نے مالدینا کو دیکھ کر کہا۔ ”خوب صورت عورت ہے۔“

”ہم یہاں عورتوں کے لیے نہیں سونے کے لیے آئے ہیں۔“ جیول نے اسے یاد دلایا۔ ”جب سونا آئے تو عورتیں خود ہمارے پیچھے آئیں گی۔“

کرس نے پھر خیال نظروں سے دور تک پھیلے قصبے کا جائزہ لیا۔ ”میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ کیوں نہ ہم اس قصبے پر قبضہ کر لیں؟“

جیول نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تمہارا خیال درست ہے، ہم آٹھ افراد اس قصبے پر کیسے قبضہ کر سکتے ہیں جس میں کم سے کم ڈھائی ہزار لوگ رہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے ایسا سوچنا بھی مت، ہمیں صرف سونا لینا ہے اور اپنی راہ لینی ہے۔“

کرس نے ہنتر ابدلا۔ ”میں نے صرف خیال ظاہر کیا ہے۔“

جیول نے اس دوران میں ایک قابل عمل منصوبہ بنالیا تھا۔ پولیس اسٹیشن کے عقب میں ایک گودام تھا۔ انہیں پہلے پولیس کو سامنے سے الجھانا تھا۔ اس دوران میں وہ خاموشی سے گودام پر قبضہ کر کے اس کی پولیس اسٹیشن سے ملی دیوار ڈانٹا مائٹ سے اڑا دیے اور سونا نکال لیتے۔ ان کے آدھے قصبے سے جرائم پیشہ لوگوں کو بھرتی کر رہے تھے۔ ان کی تعداد دو درجن سے زیادہ تھی اور ان میں سے اکثر شیرف کرس کے زخم خوردہ تھے اس لیے وہ خوش خوشی ان کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ رات آٹھ بجے تک جب کہ سر ترین برقانی ہواؤں کی وجہ سے پورا قصبہ سنسان ہو گیا تھا وہ اپنے پلان پر عمل درآمد کے لیے نکلے۔ ایک درجن افراد نے چوک کے چاروں طرف مورچے لگا لیے تاکہ کوئی پولیس اسٹیشن نہ جاسکے۔ سات افراد سامنے تھے۔ جیول اور کرس کے ہمراہ تین افراد عقبی گودام تک پہنچے تھے۔ انہوں نے وہاں موجود دو ملازموں کو خاموشی سے قابو کر کے باغیچہ کے ایک طرف ڈال دیا اور پھر دیوار کے ساتھ ڈانٹا مائٹ کے بندوق لگانے لگے۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پولیس اسٹیشن کے سامنے موجود افراد نے سڑک پار کی۔ پولیس چوکن ہوئی تھی۔ وہ پولیس والے سامنے ہی ٹھل رہے تھے۔ انہوں نے جیول

کے آدمیوں کو لٹکرا اور فوراً ہی تصادم شروع ہو گیا۔ کئی اطراف سے ہونے والی فائرنگ نے دونوں پولیس والوں کو چلتی کر دیا تھا۔ اس دوران میں کئی افراد دوڑ کر پولیس اسٹیشن کے برآمدے تک پہنچ گئے اور کھڑکی اور دروازوں سے اندر گولیاں برسائے لگے۔ اندر موجود کرس اور ایڈم کے ساتھ نصف درجن پولیس والے محصور ہو گئے تھے۔ وہ جواب دے رہے تھے مگر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اسی اثنا میں فائرنگ کی آواز سن کر چھٹی پر موجود پولیس اہلکار اور کچھ قانون پسند شہری باہر آئے تو وہ گلیوں میں موجود جیول کے ساتھیوں کا نشانہ بننے لگے۔ چند منٹ کے اندر پورا قصبہ میدان جنگ بن گیا تھا۔

جس وقت تصادم عروج پر تھا۔ جیول نے اصطبل کے ساتھ پولیس اسٹیشن کی دیوار میں نصب ڈانٹا مائٹس کو آگ دکھا دی اور خوفناک دھماکوں نے پوری دیوار گرا دی تھی۔ کرس اور اس کے ساتھیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح سے بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ دیواریں گرنے سے تین پولیس والے مارے گئے اور دو زخمی ہوئے تھے۔ ابھی اندر دھواں بھرا ہوا تھا کہ جیول اور اس کے ساتھی اندر داخل ہوئے۔ کرس نے حکم دیا کہ ہر شخص کو گولی مار دی جائے چاہے وہ ہتھیار پیچیک دے۔ جیول کو اس سے اتفاق نہیں تھا مگر یہ وقت اختلاف میں پڑنے کا بھی نہیں تھا۔ کرس اور اس نے آدمیوں نے سوائے کرس کے سب کو شوٹ کر دیا۔ صرف کرس کو زندہ بچا تھا۔ سونا ایک فولادی جھگرے میں لکڑی کی پیٹیوں میں بند تھا۔ دروازے پر کئی مضبوط ترین تالے لگے ہوئے تھے مگر چند گولیوں نے ان تالوں کو آسانی سے کھول دیا۔

ساڑھے آٹھ بجے شروع ہونے والی جنگ ساڑھے نو بجے ختم ہو چکی تھی۔ اس میں تقریباً تین درجن افراد مارے گئے تھے اور ان کے بھی دو ساتھی مارے گئے تھے۔ مگر جیول یا کرس کو اس کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے اصل کامیابی حاصل کر لی تھی۔ سونا ان کے قبضے میں آ گیا تھا۔ لکڑی کی بیس پیٹیاں تھیں اور ہر ایک میں دس کلو گرام خالص سونا تھا۔ یہ پیٹیاں کرس کے آدمیوں کی نگرانی میں بندوق کے بارخیز کی گئی تھیں، اب بندوق بھی ان کے ساتھ تھا۔ شیرف کرس نے اسے یہاں جو خانہ کھولنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس طرح یہاں آس پاس سے جرائم پیشہ آ جاتے اور قصبے کا پرسکون ماحول برباد ہو کر رہ جاتا۔ اس لیے بندوق بھی کرس کا دشمن تھا۔ جیول اور کرس پر جام کے ساتھ کامیابی کا جشن منا رہے تھے جبکہ کرس سامنے ایک

ستون سے بندھا ہوا تھا۔ کرس نے کہا۔

”ابھی اس کی بیوی بھی آجائے تو اس کا فیصلہ کرتے ہیں۔“

جیول کی بھویں تن گئی تھیں۔ ”اس کی بیوی... اس کا یہاں کیا کام ہے؟“

”میں اس کے سامنے اس کے شوہر کو اس دنیا سے رخصت کروں گا اور پھر اس کے ساتھ رات گزاروں گا۔ صبح سے پہلے اسے بھی اس کے شوہر کے پاس پہنچا دوں گا۔“

جیول نے نفی میں سر ہلایا، گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہم ابھی سونا لیں گے اور یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، سورج نکلنے سے پہلے ہم یہاں سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ کل جب کسی محفوظ جگہ پہنچیں گے تو سونا تقسیم کر لیں گے۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ کرس نے اپنے تمباکو زدہ دانت نکوس کر کہا۔ ”ضروری نہیں ہے میں اس سے اتفاق کروں۔“

یہ صریحاً بغاوت تھی۔ جیول کا ہاتھ تیزی سے پستول کی طرف گیا تھا لیکن اس سے پہلے کرس نے اپنا پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ جیول کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے سر دلچے میں کہا۔ ”کیا تم بغاوت کر رہے ہو؟“

”نہیں۔“ کرس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بغاوت اس کے خلاف کی جاتی ہے جو کبھی سربراہ ہو، تم سربراہ نہیں تھے۔“

”پھر تم نے مجھے کیوں بچایا؟“

”اس سونے کے لیے۔“ کرس نے سر کی جنبش سے سونے کی طرف اشارہ کیا مگر اس کی نظریں اور پستول کا رخ جیول کی طرف ہی رہا تھا، وہ ابھی طرح جانتا تھا کہ جیول کتنا شارپ شوٹر ہے۔ اسے موقع مل گیا تو وہ اسے سیکڑ کے دوسرے حصے میں ڈھیر کر دے گا۔ ”صرف تم جانتے تھے کہ یہ سونا کہاں ہے۔ اسی لیے ہم نے جان پر کھیل کر تمہیں بچایا اور اب سونا مل گیا ہے اس لیے تمہاری ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔“

”تم بکواس کر رہے ہو۔ اگر تم نے مجھے مارا تو میرے آدمی تمہیں شوٹ کر دیں گے۔“ جیول کا لہجہ درشت ہو گیا۔

”تمہارے آدمی۔“ کرس ہنسا اور گروہ کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ”تم میں سے کون جیول کا ساتھی ہے؟“

”مگر کوئی آگے نہیں آیا۔“

”تم نے سن لیا ان کا جواب۔“ کرس نے کہا۔ ”کوئی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔“

اسی لمحے دھڑ سے بار کا دروازہ کھلا اور دو آدمی کرس کی حسین بیوی کو بازوؤں سے پکڑے ہوئے لائے۔ وہ بری طرح ہل رہی

تھی۔ اسے دیکھ کر کرس چلا اٹھا۔ ”چھوڑ دو اسے۔“
کو پر کی نظر ایک لمحے کے لیے ہٹی تھی اور جیول نے
موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا پستول نکالنا چاہا۔ مگر اس کے ہاتھ
نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ بہ مشکل پستول نکال سکا تھا اور پھر وہ
اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ کو پر سکون سے اسے دیکھ
رہا تھا، اس نے اپنا پستول بھی واپس رکھ لیا۔ جیول کا سر چکرا
رہا تھا اور جسم سے جان نکل رہی تھی، اس نے شراب کے خالی
گلاس کی طرف دیکھا اور بڑی مشکل سے بولا۔ ”تم نے اس
میں کچھ ملایا تھا؟“

کو پر مسکرایا۔ ”ہاں ورنہ تم آسانی سے قابو میں آنے
والے کہاں ہو۔ یہ بہت خطرناک زہر ہے جو تم نے پیا ہے
اور اب تمہارے پاس بس چند منٹ اور ہیں۔“
جیول اسٹول سے اتر کر اس کی طرف بڑھا مگر اس
کے قدموں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ لڑکھڑا کر
فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر اس نے ڈوبتی آنکھوں سے دیکھا،
مالینا کو لا کر کرس کے سامنے پھینک دیا گیا۔ وہ چلا رہا تھا،
مالینا بھی چلا رہی تھی۔ آخری منظر جو جیول نے دیکھا وہ کرس
کی موت کا تھا۔ کو پر نے اچانک پستول نکال کر اسے کرس
کے سینے پر خالی کر دیا تھا۔ مالینا نے تیج ماری اور بے ہوش
ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیول کی آنکھیں بھی بند ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

جیول کو سب یاد آ گیا تھا۔ اس کے سینے کی جلن ٹھیک
ہو گئی تھی اور کھال بھی دوبارہ سلامت ہو گئی۔ اب اسے
پوری طرح یقین آ گیا کہ وہ جہنم میں ہے۔ چوغہ پوش
شیطان نے پھر سلاح اٹھائی تو وہ جلدی سے بولا۔ ”ایک
منٹ... ایک منٹ۔“

”کیا؟“
”یہ کب تک چلے گا؟ میرا مطلب ہے مجھے یوں
اذیت دینے کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟“
”تمہیں اذیت نہیں سزا دی جا رہی ہے۔“ شیطان
نے کہا۔ ”یہ ہمیشہ جاری رہے گا۔“
”ہمیشہ؟“ وہ بے یقینی سے بولا۔ ”کوئی کام ہمیشہ
کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا کوئی نہ کوئی انجام تو ہوگا؟“
جواب میں شیطان نے ایک سلاح اٹھا کر اس کے
پیٹ سے لگا دی۔ اس پر لو بنا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر شدید
درد و اذیت سے چلا اٹھا۔ شیطان نے اس کی تکلیف سے
لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کوئی انجام نہیں ہے تم
ہمیشہ اذیتیں سہتے رہو گے۔ یہ دائمی زندگی ہے یہاں خوشی

بھی دائمی ہوتی ہے اور اذیت بھی ہمیشہ کی ہوتی ہے۔“
”لعنت ہو۔“ جیول چلایا۔ ”اس کا کوئی حل تو ہے
گا... میرے لیے یہ ناقابل برداشت ہے۔“
”ہوگا۔“ شیطان نے بے پروائی سے کہا اور سلاح
واپس بھڑکتی آگ میں ڈال دی۔ جیول گہری سانس لے رہا
تھا، اس کا زخم پھر سے ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔
”دیکھو میں سانس لے رہا ہوں اس کا مطلب ہے
میں زندہ ہوں دوسری صورت میں مجھے سانس لینے کی
ضرورت نہیں ہوتی چاہیے۔“

”تم عادت کے مطابق سانس لے رہے ہو۔ اگر چاہو
سانس روک کر دیکھ لو تمہیں کچھ نہیں ہوگا ہاں تکلیف ہوگی۔“
جیول نے سانس روک لی اور بہت دیر تک روکے
رکھی، واقعی اسے کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ صرف دم گھٹنے کی کیفیت
ہوئی تھی مگر یہ بھی جان لیوا نہیں تھی۔ شیطان درست کہہ رہا
تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی شیطان
نے کڑا ہے کی طرف ہاتھ بڑھا یا وہ جلدی سے بولا۔ ”ایک
منٹ رک جاؤ میری ایک بات سن لو۔“
”میں سن رہا ہوں۔“ شیطان نے کڑا ہے سے ایک
نمبر والی سلاح اٹھا کر اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔
”دیکھو تم شیطان ہو تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہوگی۔
تم مجھ سے سودا کر لو۔“

”مجھے صرف انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ
مجھے ملتے رہتے ہیں۔“
اس بار جیول کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ”تم نے کہا
یہاں وہ شیطان اہمیت رکھتا ہے جس کے قبضے میں زیادہ سے
زیادہ انسان ہوں۔ تم لوگ انسان کیسے حاصل کرتے ہو؟“
”ہم انسان چنتے ہیں... زندگی میں ان سے غلط کام
کراتے ہیں اور جب وہ مرتے ہیں اور اپنے کرتوتوں کی
وجہ سے جہنم کے حقدار ہوتے ہیں تو وہ ہمارے حوالے کیے
جاتے ہیں۔“
”تم مجھ سے ایک معاہدہ کر لو... میں تمہیں اپنے
بدلے چھ آدمی دوں گا۔“
شیطان پہلی بار چونکا۔ ”کیا مطلب؟“
”مطلب واضح ہے، تم مجھے چھوڑ دو میں اپنے بدلے
تمہیں چھ آدمی دوں گا۔“
شیطان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے... اگر
وہ انسان جہنم کے سخت نہ ہوئے تو مجھے نہیں ملیں گے اور میں
نے آج تک کسی انسان سے معاہدہ نہیں کیا ہے۔“

”حالانکہ شیطان تو مشہور ہی اپنے معاہدوں کے لیے
ہے جو وہ انسانوں سے کرتا ہے۔“ جیول نے کہا۔ وہ پر امید
نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شیطان نے انکار نہیں
کیا تھا کہ وہ اسے دوبارہ دنیا میں نہیں بھیج سکتا اس نے چھ
انسانوں کے جہنمی ہونے پر شک کا اظہار کیا تھا۔ اس کا
مطلب تھا کہ وہ اسے دنیا میں بھیج سکتا تھا۔ ”میں جن انسانوں
کی بات کر رہا ہوں ان میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔
بلکہ وہ مجھ سے بھی زیادہ جہنم کے سزاوار ہو سکتے ہیں۔“

شیطان نے ایک بار پھر اپنا ہڈ الٹ دیا اور اس کا
مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس نے پُر خیال انداز میں کہا۔
”ایک کے بدلے چھ...“
”یہ اچھا سودا ہے۔“ جیول نے اسے ترغیب دی۔
”تم طاقتور ہو اگر میں معاہدہ پورا نہ کر سکوں تو تم مجھے دوبارہ
جہنم میں لاسکتے ہو۔“
”میں ایسا کر سکتا ہوں۔“ شیطان نے غرور سے کہا۔
”تب تمہیں اس سودے کو قبول کر لینا چاہیے۔“
شیطان نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے
لیکن میری ایک شرط ہوگی۔“
”کیسی شرط؟“ جیول نے اپنے خشک لبوں پر زبان
پھیری۔

”تمہیں وہ چھ آدمی چوبیس گھنٹے میں دینا ہوں گے۔“
جیول نے سوچا اور مان گیا۔ ”میں انہیں قتل کر دوں
گا، اس کے بعد انہیں یہاں لانا تمہاری ذمہ داری ہوگی۔“
”تم اس کی فکر مت کرو لیکن تم جسے قتل کرو گے اس
کے ماتھے پر چاقو سے کراس کا نشان بناؤ گے۔“ شیطان
نے کہا۔ ”جب تم اسے کسی کے ماتھے پر کراس کا نشان بناؤ
گے تو کچھ لو اس پر میری مہر لگ جائے گی اور وہ میرے پاس
ہی آئے گا۔“
”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔“ جیول نے خوش
ہو کر کہا۔ ”تم مجھے کیسے واپس بھیجو گے؟“
”فکر مت کرو ابھی تمہیں بتا چل جائے گا۔“ شیطان
نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ ”وہ دیکھو۔“
جیول نے دیکھا، ایک گھڑی تھی جس میں سوئیوں نے
دو کے ہندسے سے سفر شروع کر دیا تھا۔ شیطان نے کہا۔
”تمہارے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔“
☆☆☆
جیول کو ہوش آیا تو وہ کچھ میں پڑا ہوا تھا۔ ہلکی بارش
ہو رہی تھی اور اس کا جسم نہایت سرد ہو رہا تھا۔ وہ کراہتے

ہوئے اٹھا تو اس نے دیکھا کہ وہ جانوروں کے لیے مخصوص
ایک احاطے میں پڑا تھا اس موسم میں جانوروں کو اندر باندھا
گیا تھا۔ اس لیے احاطہ خالی تھا۔ اس کا دل متلا رہا تھا اور
پیٹ میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے بہ مشکل
اٹھا اور اس نے بے ساختہ الٹی کر دی۔ اس کے پیٹ میں جو
تھا وہ باہر آ گیا۔ الٹی کرتے ہی اسے سکون محسوس ہوا تھا اس
نے جو زہر پیا تھا وہ نکل گیا تھا۔ پھر اسے شیطان اور جہنم کا
خیال آیا۔ کیا اس نے بے ہوشی کی حالت میں کوئی خواب
دیکھا تھا؟ کو پر کی بات کو اس ثابت ہوئی تھی زہر اتنا پُر اثر
نہیں تھا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ وہ بس بے
ہوش ہوا تھا مگر پھر اسے وہ تکلیف یاد آئی جو اس نے
شیطان کے ہاتھوں برداشت کی تھی تو اس کے رونگٹے
کھڑے ہو گئے۔ اگر یہ کوئی خواب بھی تھا تو وہ کوئی رسک
لینا نہیں چاہتا تھا اسے بہر صورت ان چھ کو آنے والے
چوبیس گھنٹے میں قتل کرنا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔
نزدیکی مکانوں کی کھڑکیوں سے جھلکتی روشنیاں ماحول کو کسی
قدر روشن کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی۔ ایک بار بجلی
چمکی تو اسے کچھ ہی دور چرچ کی عمارت دکھائی دی۔ اس نے
پاس پڑا اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور لڑکھڑاتے قدموں
سے چرچ کی طرف بڑھا۔ بارش نے اس کے کپڑوں پر لگا
ہوا کچھ صاف کر دیا تھا۔ عجیب بات تھی، اسے ٹھنڈ نہیں لگ
رہی تھی۔ حالانکہ بارش کا پانی قیامت خیز حد تک سرد تھا۔ وہ
چرچ کے اندر آیا اور ڈاکس کے سامنے ایک بیچ پر ڈھیر ہو
گیا۔ کچھ دیر بعد اندر سے بوڑھا پادری نمودار ہوا، اس نے
نرم لہجے میں جیول سے پوچھا۔

”تم کون ہو میرے بچے؟“
”میں یہاں پناہ کے لیے آیا ہوں۔“ جیول نے
دھیمے لہجے میں کہا۔
”یہ خدا کا گھر ہے۔“ پادری نے ہمدردی سے کہا۔
”تمہارا لباس بھگا ہوا ہے تمہیں خشک لباس اور گرمائی کی
ضرورت ہے۔“
پادری اسے ایک عقی کمرے میں لایا جہاں آتش
دان میں آگ روشن تھی اسے دوسرے کپڑوں کی ضرورت
تھی کیونکہ ان میں وہ دور سے پہچانا جاتا۔ پادری نے اسے
ایک پتلون، شرٹ اور اس کے سائز کی جیکٹ لادی تھی۔
اس نے لباس تبدیل کیا۔ اس کی بیلٹ سے پستول غائب
تھا۔ وہ یقیناً اسے اس احاطے میں پھینکنے والوں نے ہتھیار لیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، ہائر کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جوان کے سامنے مزاحمت کر سکتے تھے۔ اس وقت کرسل ہوگا، صرف پستول ہی نہیں اس کی جیبوں سے سب کچھ غائب تھا۔ جیول نے قادر کی طرف دیکھا۔ ”مجھے اسلحے کی ضرورت ہے۔“

پادری نے نفی میں سر ہلایا۔ ”چرچ میں اسلحے کا کیا کام؟“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو مجھے کہیں اور سے بندوبست کرنا ہوگا۔“ جیول نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”قادر یہ بتاؤ یہاں خالی تابوت ہیں؟“

بوڑھا پادری چونکا۔ ”ہاں مگر تمہیں کیا کرنا ہے میرے بچے؟“

”کچھ لاشوں کے لیے ان کی ضرورت پڑے گی۔ مہربانی کر کے چھ تابوت چرچ کے سامنے والے حصے میں رکھو ادو۔ میں ان کی ادائیگی کروں گا اور تمہیں ان کی آخری رسومات ادا کرنا ہوں گی۔“

☆☆☆

کو پر نے فاتحانہ نظروں سے مالیتا کی طرف دیکھا جو بستر پر یوں لیٹی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ بیڈ کے سرہانے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا پھٹا ہوا لباس اور خراش خراش جسم بتا رہا تھا کہ اس پر کیا گزر چکی تھی۔ رورو کر اس کی آنکھیں سوچ گئی تھیں۔ گال اور ہونٹ سرخ اور زخمی تھے۔ کو پر نے اس پر تشدد بھی کیا تھا۔ کو پر اپنے لیے جام بنا رہا تھا۔ اس نے نصف گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پھر مالیتا سے پوچھا۔ ”تم پیو گی؟“

جواب میں اس نے کو پر پر تھوک دیا اور چلائی۔

”کتے مجھے بھی مار دے۔“

”جلد تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوگی۔“ کو پر نے خالی گلاس دیوار پر دے مارا اور مالیتا کی طرف بڑھا۔

”لیکن پہلے مجھے اپنی حسرت تو پوری کر لینے دو۔“

کو پر کے پانچ ساٹھی مختلف جگہوں پر تھے۔ ان میں سے دو گیرٹ اور چارلی، بنڈی کے بار میں بیٹھے تھے اور نشے کی حالت میں مختلف چیزوں پر نشانے بازی کی مشق کر رہے تھے۔ ان کے ذمے سونے کی حفاظت تھی مگر انہوں نے بنڈی کا بار تقریباً تباہ کر دیا تھا اور اب وہ بچھتا رہا تھا کہ اس نے کن شیطانوں کی مدد کی تھی۔ یہ لوگ تو پورے قصبے کو تباہ کر کے جاتے۔ بنڈی بار کے عقبی حصے میں تھا جہاں اس کی شرابیں ذخیرہ تھیں اور اب اسے اپنی تمام عمر کی جمع پونجی بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ ان لوگوں نے کرسل ریو کے تمام اوباشوں کو ساتھ ملا کر ایسے تمام افراد کا خاتمہ کر دیا تھا

کسی حد تک محفوظ تھا اور اگر بھیج بھی جاتا تو اسے فرق نہیں پڑتا۔ اب چار باقی رہ گئے لیکن وہ کوپر سے پہلے بارون، ڈیوڈ اور جیمسن کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔

اسے وہ کہہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس کے پاس چوبیس گھنٹے ہیں بلکہ اس میں سے بھی تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ بیڈوں میں زر خرید بد معاش مفت کی شراٹیں پیتے ہوئے جاگ رہے تھے۔ جیول نے دیکھا ہوٹل کے علاوہ دو مکانوں کے سامنے یہ بڑی تعداد میں جمع تھے اس کا مطلب تھا۔ اس کے مطلوب افراد میں سے کوئی یہاں تھا۔ اس نے مکانات کا جائزہ لیا مگر خاموشی سے اندر گھسنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئی تھی۔ ابھی وہ کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا تھا۔ جیول کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ انتظار کرے۔

☆☆☆

مالینا اپنی ذلت کے ساتھ ساتھ کرس کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ اس شخص نے نہایت سفاکی سے اس کے سامنے کرس کا سینہ پھلنی کر دیا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو کوپر کا چہرہ بگڑ گیا تھا، اس نے غرا کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”باس ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ باہر سے بارون کی آواز آئی۔ کوپر ایک جھٹکے سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا، اس نے دروازہ کھولا۔ بارون سامنے متفکر چہرہ لیے کھڑا تھا۔

”باس، گیرٹ اور چارلی بار سے غائب ہیں۔“

”غائب ہیں کیا مطلب؟“

”وہ... وہ بار کے اندر نہیں ہیں۔“ بارون ہٹکا پا۔

”باہر موجود آدمیوں کا کہنا ہے وہ باہر نہیں نکلے... اندر نشے میں فائرنگ کر رہے تھے پھر اچانک خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اندر جا کر دیکھا تو وہ غائب تھے۔“

”سونا موجود ہے؟“

”وہ ہے باس۔“

”بنڈی کہاں ہے؟“ کوپر نے پاؤں شیخ کر کہا۔

”وہ بھی غائب ہے شراب خانہ خالی پڑا ہے۔“

”انہیں تلاش کرو، اپنے آدمیوں کو جمع کر لو۔ جیمسن اور ڈیوڈ کہاں ہیں؟“

”وہ دو گھروں میں ہیں، انہیں یہاں کی لڑکیاں پسند آگئی ہیں۔“

”انہیں بھی بلاؤ۔“ کوپر نے دروازہ بند کیا اور کپڑے پہنے لگا، اس نے مالینا کی طرف دیکھا اور دانت

نکوس کر بولا۔ ”بے بی میں ابھی آتا ہوں۔ پھر تمہارے ساتھ ایک آخری راؤنڈ ہوگا جو تمہاری زندگی کا آخری راؤنڈ بھی ہوگا۔“

کوپر کے باہر جاتے ہی مالینا جواب تک بے بسی سے ستم برداشت کر رہی تھی خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اس کی کلائیوں کی بندشیں نہایت سخت تھیں۔

☆☆☆

جیول اب چرچ کی طرف جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا بنڈی نے اپنا کام کر دیا ہوگا اور اس سے پہلے فادر نے چھ تابوتوں کا انتظام کر دیا ہوگا۔ چرچ کے صحن میں دیوار کے ساتھ چھ تابوت پڑے تھے اور ان میں سے دو میں گیرٹ اور چارلی کی لاشیں موجود تھیں۔ جیول نے چاقو نکالا اور پہلے چارلی کے ماتھے پر اس کی نوک سے کراس بنایا۔ پھر وہ گیرٹ کے ماتھے پر کراس بنانے جا رہا تھا کہ رک گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد جیول نے چاقو واپس رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک تہائی کام مکمل کر لیا تھا اور باقی چار کے لیے اس کے پاس تقریباً پچیس گھنٹے تھے۔

☆☆☆

وہ چاروں بنڈی کے بار میں جمع تھے کیونکہ سونا یہیں تھا۔ ایک مگر گارمین کے فرائض انجام دے رہا تھا اور ان کے گلاس خالی ہوتے ہی بھر دیتا تھا۔ کوپر نے کہا۔ ”وہ دونوں غائب نہیں ہوئے، کیسے گئے ہیں۔ یہ دیکھو یہاں خون پڑا ہے یہ پہلے نہیں تھا۔“ اس نے فرش پر گئے دیووں کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے ساتھ پہلے کچھ ہوا اور پھر انہیں بھیج کر یہاں سے لے جایا گیا ہے۔“

فرش پر کھینچنے کے نشانات بھی تھے۔ بارون نے نشانات کا تعاقب کیا اور واپس آ کر رپورٹ دی۔ ”یہ عقی دروازے تک گئے ہیں۔“

کوپر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اس کام میں بنڈی ملوث ہے، اسے تلاش کرو۔“

ڈیوڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے وہ بزدل آدمی ہے اسے معلوم ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔“

”اگر یہ کسی اور نے کیا ہے تب بھی وہ شامل ہے اسے تلاش کرو، وہی بتائے گا۔“

جیول نے بھیڑ کے اون کا بنا ہوا ایک کھلا سویٹر پہنا ہوا تھا۔ اس میں آستینیں نہیں تھیں۔ یہ اس نے ایک احاطے کی دیوار سے اٹھایا تھا۔ پھر اس نے ایک جگہ سے ہیٹ

چرایا۔ یہ خاصا بڑا تھا اور اس کا چہرہ اس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ وہ اس وقت بنڈی کے بار کے پاس تھا۔ یقیناً گیرٹ اور چارلی کی غیر موجودگی محسوس کر لی گئی تھی اور اب انہیں تلاش کیا جا رہا تھا۔ کوپر کے تمام زر خرید بہت چوکنا انداز میں بار کے آس پاس پھیلے ہوئے تھے اور ان میں سے کچھ ہوٹل کے سامنے پہرہ دینے کے انداز میں موجود تھے۔ کوپر بھی وہیں تھا۔ جیول کو شرف کرس کی بیوی کا خیال آیا۔ شاید کوپر نے اسے ہوٹل میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ہوٹل کے ساتھ والی گلی میں آیا۔ آس پاس کسی کو نہ پا کر وہ ایک پائپ کے سہارے اوپر چھت تک پہنچا اور یہاں ایک کھڑکی سے اندر داخل ہو گیا۔ کھڑکی ایک میٹری میں کھل رہی تھی جس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ وہ اس کمرے تک آیا جو اس نے لیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر آیا تو بستر سے بندھی مالینا اسے دیکھ کر سہم گئی اور جب اس نے چاقو نکالا تو اس کے حلق سے ٹھٹھی سی چیخ نکلنے والی تھی کہ جیول کا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ اس نے چاقو سے مالینا کی بندشیں کاٹ دیں اور آہستہ سے بولا۔

”کپڑے پہنو۔“

مالینا نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے جلدی سے لباس پہنا اور بولی۔ ”تمہیں تو زبردید یا گیا تھا۔“

”ہاں میں مر گیا تھا۔“ اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا، مالینا اس کے پیچھے آئی۔

”تم یہاں کیسے آئے؟“

”تمہیں آزاد کرانے۔“ جیول نے جواب دیا۔ اس نے پہلے مالینا کو نیچے اتارا اور پھر خود بھی نیچے اتر آیا۔

”یہاں تمہارے پاس کوئی ٹھکانا ہے۔“

”ہاں۔“ مالینا سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بولی۔

”میرے ساتھ آؤ۔“

تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ اسے ایک چھوٹے سے کیمین میں لائی۔ یہ کرسل ریو کے آخری حصے میں تھا۔ بظاہر غیر آباد تھا۔ مگر یہاں ضرورت کی بہت سی چیزیں تھیں۔ مالینا نے ایک صندوق سے پینٹ شرٹ اور جیکٹ نکالی اور ایک پردے کے پیچھے لباس تبدیل کرنے لگی۔ پھر اس نے ایک اور صندوق سے اسلحہ نکالا، اس میں جدید صمغ کا ریو اور ایک رائفل تھی۔ اس نے جیول سے کہا۔ ”میں نے خود تمہیں گرتے اور دم توڑتے دیکھا تھا۔“

وہ ایک صندوق پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”یہ سچ ہے، میں مر گیا تھا اور جہنم سے ہو کر واپس آیا ہوں۔ ان چھ کو جہنم بھیجے کے لیے۔“

”تم اپنے ساتھیوں کی بات کر رہے ہو؟“ مالینا اپنی تسلی کر رہی تھی ہولسٹر باندھتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری ان سے دشمنی ہوگئی تھی؟“

”ہاں میں چاہتا تھا ہم سونا لے کر یہاں سے نکل جائیں مگر کوپر دوسرے چکر میں تھا۔“

”کوپر۔“ مالینا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”اسے میں اپنے ہاتھ سے ماروں گی۔“

”بالکل نہیں۔“ جیول غرایا۔ ”ان چھ کو میں نے اپنے ہاتھ سے مارنے کا معاہدہ کیا ہے ورنہ میں واپس جہنم بھیج دیا جاؤں گا۔“

مالینا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”تم نہیں سمجھو گی بس اتنا یاد رکھنا اگر کسی نے ان باقی چار میں سے کسی کو مارا تو میں اسے مار دوں گا۔“

”باقی چار۔“ وہ چونکی۔

”ہاں دو کو میں ٹھکانے لگا چکا ہوں ان کی لاشیں چرچ کے سامنے رکھے تابوتوں میں موجود ہیں۔ اب کوپر سمیت چار باقی ہیں، مجھے رات دو بجے سے پہلے انہیں ٹھکانے لگانا ہے۔“

مالینا کی سمجھ میں اس خوفناک صورت شخص کی بات نہیں آئی تھی مگر وہ خود میں اس سے اختلاف کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

کوپر، بارون، جیمسن اور ڈیوڈ چرچ کے سامنے پڑے تابوتوں میں گیرٹ اور چارلی کی لاشیں ڈکھ رہے تھے، انہیں پوچھتے ہی اطلاع ملی اور لاشیں دیکھتے ہی کوپر نے جیول کی لاش چیک کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ چاروں سر سے پاؤں تک مسخ تھے اور ان کے ساتھ درجن بھر مسخ افراد بھی تھے۔ کوپر نے تابوتوں کے پاس بیٹھ کر دیکھا اور دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ چارلی کے ماتھے پر کراس بنا ہوا تھا۔ یہ کسی تیز دھار اور نوک والے آلے سے بنایا گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ اسی کی حرکت ہے۔“

چند منٹ بعد اطلاع ملی کہ احاطے سے جیول کی لاش غائب ہے۔ ڈیوڈ نے یقینی سے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے... وہ مر چکا ہے۔“

”سارا قصور بنڈی کا ہے اس نے ٹھیک سے زہر نہیں ملا یا ہوگا۔“ کوپر غرایا۔ ”اسے اب تک تلاش کیوں نہیں کیا

ہے۔“
”اتنے بڑے قصبے میں اسے تلاش کرنا ناممکن ہے۔“
جیسن نے کہا۔
”اس کے گھر پر دیکھو۔“

”وہ بار کے اوپر رہتا تھا اور اکیلا آدمی ہے اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔“ جیسن نے اطلاع دی۔ ”اگر جیول بچ بچ زندہ ہے تو ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے وہ بھیڑیے کی طرح عیار اور سفاک ہے۔“
ڈیوڈ بولا۔ ”میرا تو خیال ہے ہمیں سونا لے کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

کو پر نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”صرف یہ سونا اصل مقصد نہیں ہے اصل مقصد کان میں موجود باقی سونا ہے ہم یہاں کے لوگوں سے بیگار کر کے چند بیٹے میں وہ سارا سونا نکال سکتے ہیں اس کے بعد ہم میں سے ہر شخص کے پاس اتنی دولت ہوگی کہ وہ اس جیسا کوئی بھی قصبہ خرید سکتا ہے۔“
”مگر اب ہم چار رہ گئے ہیں اور ان کی تعداد بھی ایک درجن سے زیادہ نہیں ہے۔“ ڈیوڈ نے کہا اس کا اشارہ مقامی بد معاشوں کی طرف تھا۔

”جیسے ہی موسم بہتر ہوگا ہم مزید لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیں گے۔“

بارون، ڈیوڈ اور جیسن مطمئن نظر آنے لگے۔ سوا افراد کی مدد سے وہ بچ بچ اس پورے قصبے کو قابو میں رکھ سکتے تھے اور کان سے سونا بھی نکلا سکتے تھے۔ کو پر نے کہا۔ ”لیکن پہلے جیول کو جہنم رسید کرنا ہوگا۔ اسے تلاش کرو چاہے پورے قصبے کی تلاشی لیتی پڑے۔“
وہ چاروں کئی کئی سال افراد لے کر چاروں طرف روانہ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

”میں تمہاری مدد کروں گی۔“ مایینا نے کہا۔
”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“ جیول نے کہا۔
”ہاں تم اپنے لوگوں کی مدد ضرور کر سکتی ہو۔“
”وہ کیسے؟“

”کو پر اور اس کے آدمیوں نے مقامی بد معاشوں کو ساتھ ملا کر تمام پولیس والوں اور قصبے کے ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا جوڑنے والے اور قیادت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے پورے قصبے پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ ان کے جشن منانے کے انداز سے ایسا ہی لگ رہا ہے کہ انہیں اب کسی سے خطرہ نہیں ہے۔“

”تب میں کیا کر سکتی ہوں؟“ مایینا مایوسی سے بولی۔
”میں لڑ کر مر سکتی ہوں لیکن مرنے سے پہلے میں کو پر کی لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

جیول نے اسے غور سے دیکھا۔ ”جو لوگ لڑ کر مر سکتے ہیں وہ بہادر ہوتے ہیں۔ تم شریف کی بیوی ہو۔ تم میں لیڈ کرنے کی صلاحیت ہے۔ تم ان لوگوں کو تلاش کرو جو تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں اور پھر ان بد معاشوں کا مقابلہ کرو۔ میں ان چاروں کو ختم کر کے تمہاری مدد کر سکتا ہوں لیکن ایک بار پھر بتا دوں وہ چاروں میرا شکار ہیں اگر کسی نے انہیں مارا تو میں اسے ضرور مار دوں گا۔ یہ میرے لیے زندگی اور موت سے بھی بڑا مسئلہ ہے۔“

مایینا نے کچھ سوچا اور سر ہلایا۔ ”تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔“

”روشنی ہوگئی ہے، بہتر ہے اپنا حلیہ بدل لو یا چہرہ چھپا لو۔ وہ لوگ تمہیں اور مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔“ جیول کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس دور یو الو اور ایک رائفل تھی۔ اسلحے کے لحاظ سے صورت حال تسلی بخش تھی لیکن وہ اکیلا تھا۔ اس کا مقابلہ صرف ان چار افراد سے نہیں تھا بلکہ ان کے ساتھ ایک درجن لوگ اور بھی تھے۔ اس کے باوجود اسے اپنا کام کرنا تھا اور اس کے پاس اب صرف اٹھارہ گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس نے اپنا اسلحہ کھلے سوسٹر تلے چھپایا۔ ہیٹ سر پر جھکایا اور باہر نکل آیا۔ اس کا رخ وسط قصبے کی طرف تھا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے جیسن کو تین مسلح آدمیوں کے ہمراہ اسی طرف آتے دیکھا۔ اس کے لیے اچھا موقع تھا۔ اس کا ایک شکار خود دوسروں سے الگ ہو کر اس طرف آرہا تھا۔ یہ اس کے لیے آسانی تھی۔ اگر وہ چاروں ایک ساتھ ہوتے تو انہیں ختم کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ وہ مکانوں کی آڑ لیتا ہوا ان پر نظر رکھنے لگا۔ وہ مکانوں میں گھس گھس کر دیکھ رہے تھے اور جو لوگ مزاحمت کر رہے تھے انہیں تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔

پھر وقت بچانے کے لیے وہ چاروں الگ الگ گھروں میں گھسنے لگے۔ وہ دو دو کر کے دائیں بائیں کے مکانات میں گھس رہے تھے۔ جس طرف جیسن اور ایک آدمی تھا۔ جیول نے اس کے ایک مکان کو دیکھا اور وہ عقی سمت سے مکان کے صحن میں داخل ہوا۔ اس نے عقی برآمدے میں کھلتے والے دروازے کو چیک کیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ جیول اندر جانے کے بجائے وہیں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مکان کا سامنے والا دروازہ دھڑ سے کھلا۔

جیول نے ایک اجنبی آواز سنی۔ وہ کسی عورت سے پوچھ رہا تھا پھر ایک سہمی ہوئی مردانہ آواز آئی۔ جیسن کا سامنی بد معاشی دکھارہا تھا وہ مرد اور عورت کو تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ جیول نے مداخلت نہیں کی وہ چپ کھڑا سنا رہا۔ اسے انتظار تھا کہ وہ عقی صحن کی طرف آئے۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ اس نے نہایت بے پروائی سے دروازہ کھولا اور اس کا خمیازہ بھگتا۔ جیول نے رائفل کا دستہ اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر اندر جا کر اور جیول نے اندر آتے ہوئے لات مار کر دروازہ بند کر کے اس پر رائفل تان لی۔

”تم وہی ہو۔“ اس نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔
”ہاں میں وہی ہوں۔“ جیول نے دوسری بار دستہ مارا تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ دونوں مرد و عورت سہمے ہوئے ایک گوشے میں دبکے ہوئے تھے، مرد کے چہرے پر زخم کے نشانات تھے۔ جیول نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ڈرو مت... یہاں کوئی محفوظ جگہ ہے؟“
”نہیں۔“ مرد نے کہا۔

”تب تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ۔ دوبارہ یہاں مت آنا کم سے کم آج کے دن۔“
مرد اور عورت نے نہایت پھرتی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ان کے جانے کے بعد جیول نے بے ہوش بد معاش کو کرسی پر یوں بٹھایا جیسے وہ آرام کر رہا ہو پھر اس کا ہیٹ بھی اس کے سر پر جھکا دیا۔ اس کے بعد اس نے خود دروازے کے عقب میں پوزیشن لے لی۔ اسے معلوم تھا جلدی یا بدیر دوسرے اسے دیکھنے آئیں گے۔ اس کا اندازہ درست نکلا جب دروازے پر کسی نے دستک دی اور بلند آواز سے کہا۔ ”باہر آؤ۔“

آواز جیسن کی تھی۔ جب کوئی جواب نہیں ملا تو جیسن نے لات مار کر دروازہ کھولا اور جلدی سے آڑ میں ہو گیا پھر اپنے آدمی کو آرام سے کرسی پر براجمان دیکھ کر وہ تیزی سے اندر آیا اور جیول نے اس کی گدی پر وار کیا، وہ اپنے آدمی پر گرا اور اسے لیتا ہوا کرسی سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اتنی دیر میں جیول دروازہ بند کر چکا تھا۔ وہ آگے بڑھا اس نے جیسن کا جائزہ لیا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ جیول نے اس کے سر پر ایک وار اور کیا۔ اس بار وہ بھی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔ جیول نے اسے شانے پر اٹھایا اور گھر سے نکل گیا۔ سارا کام بغیر شور شرابے کے ہو گیا تھا اور ایک آدمی اور ہاتھ آیا تھا۔

☆☆☆

کو پر کا غصے سے برا حال تھا۔ پہلے اسے اطلاع ملی کہ

مایینا غائب تھی، کسی نے اس کی بندشیں کاٹ کر اسے آزاد کر دیا تھا پھر اطلاع ملی کہ جیسن غائب تھا اور اس کے ساتھ موجود ایک آدمی بے ہوش ملا تھا۔ اس کے آدمی اب تک جیول یا بڈی کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس نے فوری طور پر بارون اور ڈیوڈ کو آدمیوں سمیت واپس بلا لیا تھا۔ اس کے شاطر ذہن نے درست نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس طرح الگ الگ رہ کر وہ جیول کے لیے آسان شکار بن جائیں گے۔ ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ ایک جگہ ہوں اور انتظار کریں کہ جیول خود سامنے آئے۔

جیول ان سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ ان کے سامنے جیسن کو ایک گھاس گاڑی میں ڈالے گا رہا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ استیضائش لگ رہا تھا، اس لیے کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ جیول آرام سے گزر کر کرسیل ریو کے چرچ تک آیا۔ یہاں اس نے بے ہوش جیسن کو ایک خالی تابوت میں ڈالا اور پھر چاقو نکال کر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر اتار دیا۔ وہ چند لمحوں تک تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ جیول نے چاقو اس کے کپڑوں سے صاف کر کے رکھ لیا۔ اس کا آدھا مشن مکمل ہو گیا تھا۔ اب تین باقی رہ گئے تھے۔ اس نے جیسن کے ماتھے پر بھی کراس نہیں بنایا تھا۔ وہ واپس بڈی کے شراب خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کو پر، ڈیوڈ اور بارون بڈی کے شراب خانے میں محصور ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی زرخیز سپاہ چاروں طرف لگا دی تھی۔ سونے کی پیٹیاں بھی وہیں تھیں۔ اب وہ اس کے خنجر تھے کہ وہ آئے تو وہ اسے شکار کریں۔

جیول کو معلوم تھا کہ بڈی کہاں ہے؟ وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا موٹی گھر تھا۔ کسی زمانے میں یہ بڈی کی ملکیت ہوتا تھا اور اس کے ساتھ والا گھر بھی اسی کا تھا لیکن پھر اس نے شراب خانہ کے اوپر رہائش کر لی تب سے یہ خالی پڑا تھا۔ بڈی وہیں جا کر چھپا تھا۔ جیول نے دروازے پر دستک دی تو وہ چونک گیا لیکن جیول کی آواز سن کر وہ پرسکون ہو گیا۔ اس نے موٹی گھر کا دروازہ کھولا۔ بڈی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”کیا ہوا تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”وہ سب تمہارے شراب خانے میں جمع ہیں۔ اس کے چاروں طرف اس کے آدمیوں کا پہرا ہے۔“
”تب میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”تم اس قصبے کے رہنے والے ہو... تم جانتے ہو یہاں بارود کہاں سے ملے گا۔“

”رکس ہارڈ ویئر سے۔“ ہنڈی نے جواب دیا۔
”میرے ساتھ چلو۔“ جیول نے مطالبہ کیا۔
ہنڈی خوفزدہ ہو گیا۔ ”نہیں اگر ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تو وہ مار دیں گے۔“

”بکومت۔“ جیول غرایا۔ ”اگر میرا حکم نہ مانا تو میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔“

ہنڈی منت سماجت کرنے لگا تو جیول کو اس پر ترس آ گیا۔ ویسے بھی وہ اب سوچ رہا تھا کہ کارروائی سورج غروب ہونے کے بعد کی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اگرچہ سورج ڈوبنے کے بعد اس کے پاس وقت کم رہ جائے گا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ زندہ رہو تو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ اس طرح چھپ کر تم رہ نہیں سکتے کیونکہ یہ لوگ مستقل یہاں رکھیں گے۔ تم جب نکلو گے ان کے ہاتھ لگ جاؤ گے اور وہ تمہیں بالکل معاف نہیں کریں گے۔“

ہنڈی پریشان ہو گیا۔ ”میں لڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔“

”تمہیں لڑنا نہیں ہے تمہیں صرف میرا ساتھ دینا ہے۔“ جیول نے اسے تسلی دی۔ وہ ایک طرف سوکھی گھاس پر لیٹ گیا۔ اسے نہ تو بھوک پیاس لگ رہی تھی اور نہ ہی آرام کی طلب ہوئی تھی۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ ابھی سورج غروب ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے ہنڈی سے سوال کیا۔ ”تمہارا شراب کا ذخیرہ کہاں ہے؟“

”نہ خانے میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے خفیہ خانہ بنایا ہوا ہے اپنی اصل شرابیوں میں ذخیرہ کرتا ہوں۔ اوپر کا ذخیرہ صرف نمائشی ہے۔“

جیول نے سر ہلایا۔ ”یہ تو اچھی بات ہے۔“

”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔“ جیول نے اسے ٹال دیا۔ دو گھنٹے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ ”اب چلو اور مجھے ریکس ہارڈ ویئر دکھاؤ۔“

سورج غروب ہوتے ہی تیزی سے تاریکی چھا گئی تھی۔ ہنڈی اسے ریکس ہارڈ ویئر تک لایا، اس کے عقب میں ایک بڑا سا احاطہ تھا جس میں جلانے والی لکڑی رکھی تھی، یہ ریکس کا اضافی بزنس تھا۔ عقبی دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ تالا جیول نے رائفل کے بٹ مار کر توڑ دیا۔ شور سے ہنڈی پریشان ہوا مگر جیول پرسکون رہا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔

ریکس سورج غروب ہونے سے پہلے اسٹور بند کر دیتا تھا۔ اس لیے اب وہاں کوئی نہیں تھا کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر گلی میں چلنے والے لپسوں کی روشنی اندر آرہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے اور جیول اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرنے لگا۔ وہاں صرف ڈائنامائٹ ہی نہیں بلکہ بہت ساری کارآمد چیزیں بھی تھیں۔ جیول نے اطمینان سے اپنے مطلب کا سامان سمیٹا۔ اس میں ڈائنامائٹ کی ایک درجن اسکس بھی تھیں۔ ہنڈی سخت مضطرب تھا۔

”کیا تم پورے قصبے کو تباہ کرنا چاہتے ہو؟“

”ان تینوں کو مارنے کے لیے اگر مجھے پورا قصبہ بھی تباہ کرنا پڑا تو میں کر دوں گا۔“ جیول نے کہا۔ ”اب چلو یہاں سے۔“

وہ واپس ہنڈی کے کہیں تک آئے کیونکہ کہیں کا راستہ سامنے کی طرف سے تھا، اس لیے وہ موٹی گھر میں چھپا ہوا تھا۔ جیول جو اضافی سامان لایا تھا اس میں ایک بڑی کمان اور اس کے تیر بھی شامل تھے۔ اس نے چھ تیر لیے اور ہر تیر کے سرے پر ایک ڈائنامائٹ اسٹک لگائی اور اسے کس کرستی سے باندھ دیا۔ ہنڈی اس دوران میں ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں کوئی ڈائنامائٹ غلطی سے نہ پھٹ جائے۔ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر وہ تیروں پر ڈائنامائٹ لگا چکا تھا۔ اس نے یہ سارا سامان ہنڈی پر لادا اور وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ جیول شراب خانے کے سامنے والے ہوٹل میں آیا۔ اس بار بھی اس نے اسی پائپ کا سہارا لیا اور دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ خطرہ بھانپ کر ہوٹل کے دوسرے کہیں اور عملہ فرار ہو گیا تھا۔ اس لیے ہوٹل تقریباً خالی تھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ جیول اسی کمرے میں آیا جہاں اس نے مالینا کو آزاد کرایا تھا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ سرکا کر دیکھا۔ شراب خانے کے سامنے والے حصے میں چھ افراد ٹھہل رہے تھے جبکہ باقی عقب میں تھے۔ جیول نے ایک موم بتی جلا کر اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی کھڑکی سے باہر نہ جائے پھر اس نے پہلا تیر کمان پر چڑھایا اور ہنڈی سے کہا۔

”جیسے میں کہوں کھڑکی کھول دینا۔“

ہنڈی نے سر ہلایا۔ جیول نے ڈائنامائٹ کے فیتے کو آگ دکھائی اور ہنڈی سے کھڑکی کھولنے کو کہا، اس نے پھرتی سے فیتل کی اور جیول نے نشانہ لے کر پہلا تیر شراب خانے کی ایک کھڑکی پر مارا۔ وہ شیشہ توڑتا ہوا اندر جا کر فوراً ہی اس نے دوسرا تیر کمان پر چڑھایا اور اس کے فیتے کو آگ

دکھاتے ہوئے اسے شراب خانے کے دروازے کی طرف پھینکا۔ اس دوران میں اندر ہڑبونگ مچی۔ بارون دروازے سے باہر نکلا تو جیول کا پھینکا تیر اس کے سینے میں اتر گیا۔ ایک دھماکا ہوا اور اندر آگ لگ گئی۔ جب تک دوسرا دھماکا ہوتا جیول نے تیسرا تیر دوسری کھڑکی پر مارا تھا۔ دوسرے دھماکے سے پہلے بارون نے تیر نکال کر پھینک دیا تھا مگر وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ جیول نے اسے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ تیسرے دھماکے نے پورے شراب خانے میں آگ لگا دی تھی۔ ہنڈی بولا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو میرا کاروبار تباہ ہو جائے گا۔“

”وہ تباہ ہو چکا ہے۔“ جیول نے چوتھے ڈائنامائٹ کو آگ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اب اپنی جان کی فکر کرو، وہ بیچ مچی تو دوبارہ بار کھول لو گے۔“

مقامی بد معاش بھاگ رہے تھے کہ چوتھا دھماکا ان کے پاس ہوا، دو اس کا شکار ہو گئے تھے۔ جیول نے کمان رکھ کر رائفل اٹھالی۔ جب تک وہ فرار ہوتے جیول نے رائفل سے مزید دو افراد کو مار گرایا تھا۔ اس کے بعد میدان صاف تھا۔ جیول نے تیر کمان وہیں چھوڑا اور باقی ڈائنامائٹ کے ہنڈل اپنی جیکٹ میں رکھے۔ اس نے ہنڈی کو کچھ سمجھایا اور کہا۔ ”تم یہ کام کرنا اور اگر خطرہ دیکھو تو بھاگ جانا۔“

وہ باہر آیا تو شراب خانے سے دھماکے سنائی دے رہے تھے یقیناً شراب کی بوتلیں اور ڈرم پھٹ رہے تھے۔ جیول سامنے سے جانے کے بجائے سڑک عبور کر کے دوسری طرف آیا۔ اسے یقین تھا کہ کوپر اور ڈیوڈ عقبی راستے سے نکل گئے ہوں گے۔ وہ اتنی آسانی سے مرنے والے نہیں تھے۔ بارون نے سامنے سے نکلنے کی غلطی کی تھی لیکن وہ بھی بیچ نکلا تھا۔ عقبی حصے میں تین مقامی بد معاش موجود تھے۔ دو جیول نے گرائے تو تیسرا بھاگ نکلا۔ جیول نے اس سے تعرض نہیں کیا تھا۔ اسے پیچھے ان تینوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا اس لیے وہ واپس مرکزی سڑک پر آیا۔ یہاں ایک بد معاش ابھی زندہ تھا۔ جیول نے اس کے زخم پر جوتے کی ایڑی رکھی تو وہ چلا اٹھا۔ جیول نے اس سے سوال کیا۔ ”کوپر اور باقی دو کہاں ہیں؟“

”میں نہیں جانتا میں نے ان کو اس طرف جاتے دیکھا تھا۔“ زخمی نے اطمینان کی طرف اشارہ کیا۔ جواب میں جیول نے اس کے سر پر رائفل کا دستہ مارا۔ اس کا اندازہ تھا کہ بارون زخمی تھا وہ کسی کام کا نہیں تھا جبکہ کم سے کم چھ مقامی

بد معاش مارے جا چکے تھے اور دو سے تین زخمی تھے اس لیے اب کوپر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پانچ آدمی تھے۔ بشرطیکہ وہ اب بھی اس کے ساتھ ہوتے۔

☆☆☆

پہلا تیر اندر آتے ہی کوپر نے خطرہ بھانپ لیا تھا۔ اس نے چلا کر عقبی دروازے سے نکلنے کو کہا اور خود بھی بھاگا۔ ڈیوڈ نے اس کا ساتھ دیا لیکن بارون بد قسمتی سے سامنے کی طرف نکلا تھا۔ وہ دونوں باہر نکلے تھے کہ پہلا دھماکا ہوا۔ کوپر نے عقب میں موجود چار افراد سے کہا۔ ”ہمیں رہو اور اگر کوئی آئے تو اسے روکنا۔“

مگر دھماکوں کی آواز سن کر ان بد معاشوں کی ہوا خراب ہو رہی تھی۔ کوپر اور ڈیوڈ آگے بڑھے تو ڈیوڈ نے کہا۔ ”یہ سب بھاگ جائیں گے۔ ہمیں ان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“

”تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ہمیں بھی فی الحال بھاگ جانا چاہیے۔“

کوپر نے مڑ کر شعلے اگلے شراب خانے کو حسرت سے دیکھا۔ سونا وہیں تھا اور اگر وہ محفوظ ہوتے تو بھی وہ سونا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے ڈیوڈ سے اتفاق کیا۔ وہ تیزی سے اطمینان کی طرف بڑھے جہاں ان کے گھوڑے موجود تھے۔ اس کے لیے مرکزی سڑک پر آنا لازمی تھا۔ وہ ایک گلی سے گزر کر سڑک پر آئے تو انہیں بارون مل گیا۔ وہ شدید زخمی تھا اور بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”وہی حرا مزادہ تھا میں نے خود اسے دیکھا تھا۔ وہ ہوٹل کی کھڑکی سے ڈائنامائٹ لگے تیر مار رہا تھا۔“

”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ کوپر نے تیزی سے اطمینان کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ لیکن ابھی وہ اطمینان سے کچھ دور تھے کہ اچانک اس کا دروازہ کھلا اور فائر کی آواز کے ساتھ اندر سے بد کے ہوئے گھوڑے نکلے۔ وہ دوڑتے ہوئے ان کی طرف آرہے تھے۔ کوپر اور ڈیوڈ بھاگ کر ایک برآمدے میں چڑھ گئے لیکن بارون بھاگ نہیں سکا تھا گھوڑے اسے روندتے ہوئے گزر گئے تھے۔ کوپر اور ڈیوڈ اپنے بال بوجھ رہے تھے کیونکہ ان میں ان کے گھوڑے بھی شامل تھے۔ اب فوری طور پر یہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ پہلے انہیں گھوڑوں کا انتظام کرنا تھا۔ کوپر نے پاؤں پیچ کر کہا۔ ”یہ اسی کا حرامی پن ہے وہ ہمیں فرار سے روک رہا ہے۔“

”ہمیں دوسروں کے گھوڑے پکڑنا ہوں گے۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ فائدہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

منٹ بعد ڈیوڈ کی آواز آئی۔ ”میں تیار ہوں۔ لیکن اس کی ضمانت ہے کہ یہ لوگ ہمیں جانے دیں گے۔“

جیول نے مالینا کی طرف دیکھا تو وہ بلند آواز سے بولی۔ ”اگر تم نے بہادروں کی طرح لڑکر فتح حاصل کر لی تو میرا وعدہ ہے تم یہاں سے بیچ سلامت جاسکو گے۔ لیکن یہ سلامتی صرف آج رات کے لیے ہوگی اس کے بعد میں تمہاری تلاش کراؤں گی۔“

”تم نے سن لیا۔“ جیول نے بلند آواز سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں باہر آ رہا ہوں۔“

”تمہارا پستول تمہارے ہولسر میں ہونا چاہیے اور اس کا مشن بند ہو۔“ جیول نے کہا۔ کچھ دیر بعد ڈیوڈ اندر سے نکلا تو اس کا پستول ہولسر میں تھا اور اس کا مشن بھی بند تھا۔ اسے دیکھ کر جیول نے اپنی رائفل اور اضافی ریواور ایک طرف ڈال دیے پھر اس نے ڈائنامائٹ الگ کیے۔ پھر وہ چرچ کے سامنے آگئے۔ ایک آدمی جج بن کر آگے آیا۔ اس نے ڈوئل کے مقامی رول بیان کیے۔ ”میرے تین تنک گنتے ہی تم دونوں گولی چلا سکتے ہو اور ہر شخص تین گولیاں چلا سکتا ہے۔“

دونوں نے سر ہلایا اور تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ہولسر اوپر کر لیے تھے۔ جج نے تین تنک گنتی گنی اور دونوں نے پھرتی سے اپنے ہتھیار نکالتے ہوئے تقریباً ایک ساتھ فائر کیا تھا۔ ڈیوڈ کے ماتھے پر سوراخ ہو گیا اور وہ گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ جیول اپنی جگہ کھڑا تھا، اچانک وہ لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پہلو پر ہاتھ رکھا تو وہ خون سے بھر گیا تھا۔ ڈیوڈ کی چلائی گولی اس کے جسم میں اتر گئی تھی۔ زخم بائیں پہلو میں دل سے ذرا نیچے تھا۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ڈیوڈ کی لاش کی طرف بڑھا۔ جیول نے اس کی جیکٹ کا کارڈ پکڑا اور اسے پیچ کر ایک خالی تابوت تک لایا اور اس میں دھکیل کر لٹا دیا۔ اب صرف ایک تابوت خالی رہ گیا تھا۔ اب وہ بہ مشکل کھڑا تھا اور پھر وہ پشت کے بل گر پڑا۔ مالینا بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اس نے جیول کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ مالینا نے چلا کر کہا۔

”اسے ڈاکٹر فیر کے پاس لے چلو۔“

کچھ لوگ آگے آئے اور جیول کو اٹھا لیا۔ مالینا اس کے ساتھ تھی، ڈاکٹر شپھر ڈاکٹر کا مکان اسی سڑک پر تھا۔ وہ حجرے کا کار اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس قصبے میں دو ڈاکٹر اور تھے مگر سب ڈاکٹر شپھر ڈاکٹر پر زیادہ اعتبار کرتے تھے۔ جیول کو وہ لے

ڈیوڈ نے گھبرائے انداز میں کہا۔

وہ بارون کو نظر انداز کر کے چرچ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے چند لمحے بعد جیول وہاں آ گیا۔ اس نے بارون کا معائنہ کیا، وہ ابھی زندہ تھا۔ جیول نے اپنی ایڈری اس کی گردن پر رکھ دی اور اس نے ایک منٹ سے بھی پہلے جان دے دی۔ جیول نے اسے شانے پر لاد اور چرچ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کوپر اور ڈیوڈ اب کہاں گئے ہوں گے۔ وہ یقیناً چرچ کے پاس موجود چھوٹے اصطبل کی طرف گئے ہوں گے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک جھوم نے اصطبل کو گھیر رکھا تھا۔ انہوں نے مشعلیں جلا رکھی تھیں اور سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے ان کی قیادت مالینا کر رہی تھی۔ کچھ گولیاں بھی چلی تھیں مگر جیول کو دیکھ کر وہ رک گئے۔ اس نے بارون کی لاش چوتھے تابوت میں ڈالی۔ مالینا نے اسے اطلاع دی۔ ”وہ دونوں اندر ہیں۔“

”وہ میرا شکار ہیں۔“ جیول نے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو گولیاں چلانے سے گریز کریں۔“

”یہ بدلہ لینے کے لیے بے چین ہیں۔“ مالینا نے قصبے والوں کی طرف دیکھا۔

”ان سے کہو اپنے آدمیوں سے بدلہ لیں جو دولت کے لیے ان کے ساتھ مل گئے تھے۔“ جیول نے سخت لہجے میں کہا۔ بیچ جانے والے چار مقامی بد معاشوں کو پکڑ کر یہاں لے آیا گیا تھا۔

”ان کو موت کی سزا ملے گی۔“ مالینا نے کہا۔

”ٹھیک ہے ان سے میں منوں گا۔“ جیول نے کہا اور بلند آواز سے بولا۔ ”کوپر تم میری بات سن رہے ہو؟“

”ہاں اور میں حیران ہوں تم بیچ کیسے گئے؟“

”میں بچا نہیں ہوں بلکہ جہنم سے آیا ہوں۔“ جیول نے کہا۔ ”تا کہ تم چھ کو جہنم بھیج سکو۔“

”جہنم تم جاؤ گے۔“ کوپر زبردی لہجے میں بولا۔

”تم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہو بیچ کر جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں تم دونوں باری باری باہر آ کر مجھ سے ڈوئل لڑو۔“

”کیا ہمیں اس کی ضرورت ہے؟“

”بالکل دوسری صورت میں، میں ڈائنامائٹ سے اصطبل کو اڑا دوں گا اور تم اندر ہی مارے جاؤ گے چوہوں کی طرح۔“ میں تمہیں عزت سے مرنے کا ایک موقع دے رہا ہوں۔“

چرچ کی گھڑی میں رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے یعنی اس کے پاس ساڑھے چار گھنٹے رہ گئے تھے۔ چند

کر ڈاکٹر سپر ڈ کے کلینک پہنچے۔ اسے میز پر لٹا کر ڈاکٹر نے قہقہے ہٹا کر اس کا زخم دیکھا اور مایوسی سے سر ہلایا۔ ”مہلک زخم ہے اسے مردہ ہی سمجھو۔“

”پلیز ڈاکٹر تم اپنی سی کوشش تو کرو۔“ مالینا نے التجا کی تو ڈاکٹر سپر ڈ گولی نکالنے میں لگ گیا۔

☆☆☆

جیول کو ہوش آیا تو وہ پھر اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے چوڑے پوش شیطان کڑا ہے کے دوسری طرف موجود تھا۔ جیول نے اپنا سینہ دیکھا۔ وہاں زخم کا نشان نہیں تھا، اس نے شیطان کی طرف دیکھا۔ ”مجھے واپس کیوں بلایا؟“

اس نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میں نے واپس نہیں بلایا۔ تم پھر مر چکے ہو۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ جیول چلایا۔ ”آدی ایک بار مرنا ہے۔“

”کیا میں تمہیں یقین دلاؤں۔“ شیطان نے متنی خیر انداز میں کہا تو جیول لرز اٹھا۔

”نہیں... لیکن مجھے اپنا کام پورا کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ دوسرے میں زندہ نہیں تھا مجھے نہ تو سردی لگ رہی تھی، نہ بھوک اور نہ پیاس... اس کا مطلب ہے میں زندہ نہیں تھا تو مجھے زخم کی وجہ سے مرنا بھی نہیں چاہیے۔ تم نے معاہدہ کر کے اس کی خلاف ورزی کی ہے۔“

”تمہیں گولی میں نے نہیں ماری۔“

”مجھے زہر بھی تم نے نہیں دیا تھا۔“ جیول نے اسے یاد دلایا۔ ”اس کا مطلب ہے مجھے نہیں مرنا چاہیے تھا۔ مجھے صرف ایک شکار اور کرنا ہے اور میں تمہاری شرط پوری کر دوں گا۔“

شیطان ٹپکنے لگا، اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سوچ رہا ہے۔ پھر اس نے جیول کی طرف دیکھا اور عیاری سے بولا۔

”یہ سچ بھی کافی ہیں، چھپتے ہو۔“

”تم شاید جانتے نہیں ہو ان لاشوں کے ماتھے پر کراس کا نشان نہیں ہے۔“ جیول نے جلدی سے کہا۔ ”اس لیے تمہیں ان میں سے ایک ہی ملے گا۔“

شیطان کا چہرہ بڑ کر مزید مکروہ ہو گیا وہ غرایا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو۔“

”تم چاہو تو تصدیق کر لو۔“ جیول نے شانے اچکائے۔

شیطان نے آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر بعد کھولیں تو اس کا غصے سے برا حال تھا۔ اس نے پھٹکار کر کہا۔ ”تم نے

چالاکي دکھائی۔ تم نے انہیں مار دیا لیکن صرف ایک کے ماتھے پر کراس بنایا۔“

”میں نے سوچا کہ باقی سب کے ماتھے پر ایک ساتھ ہی کراس بناؤں گا۔“ جیول عیاری سے بولا۔ ”بے شک تم شیطان ہو لیکن عقل میرے پاس بھی ہے۔ اب تم مجھے واپس سمجھو تا کہ میں آخری آدی کا کام تمام کر دوں اور پھر سب کے ماتھے پر نشان بناؤں گا۔“

شیطان کا سکون اور اطمینان رخصت ہو گیا تھا اور وہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے غضب ناک انداز میں جیول کی طرف دیکھا۔ ”دل تو چاہ رہا ہے کہ ان چھ کو بھول جاؤں اور...“

”اور کیا...؟“ جیول نے اضطراب سے کہا۔

”مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ شیطان نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں واپس بھیج رہا ہوں لیکن اب تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔“

جیول نے سامنے دیکھا تو گھنڑی کی سوئیاں تیزی سے گزریں اور وہ ڈیڑھ بجے پر پہنچ کر رک گئیں۔ جیول چلایا۔

”نہیں یہ دھوکا ہے۔“

شیطان نے دانت نکالے۔ ”تم مجھ سے اور کیا توقع کرتے ہو؟“

☆☆☆

ڈاکٹر سپر ڈ نے گولی نکال کر زخمی دیا تھا اور خون بھی ریک گیا تھا مگر جیول کی بے ہوشی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مالینا وہیں تھی۔ وہ اپنے اعتماد کے آدمیوں کو کوپری نگرانی پر لگا کر آئی تھی کہ وہ اسے کسی صورت فرار نہ ہونے دیں اور اگر وہ اسکی کوشش کرے تو اسے مارنے کے بجائے صرف زخمی کریں۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ تین گھنٹے گزر گئے تھے اور ابھی تک جیول میں ہوش آنے کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر سپر ڈ نے کہا۔ ”اگر اسے دو گھنٹے میں ہوش نہیں آیا تو اس کا پچھتا ممکن نہیں ہوگا۔“

مالینا نے دکھ سے جیول کو دیکھا۔ ”اگرچہ یہ مجرم ہے لیکن ان لوگوں سے جان چھڑانے میں بنیادی کردار اسی کا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو پتا نہیں اس قصبے کا کیا شہر ہوتا۔ کاش کہ یہ بچ جائے اور اس آخری آدی کو بھی اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔“

اسی لمحے جیول کڑا ہوا اور پھر اٹھنے لگا۔ ڈاکٹر سپر ڈ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکنا چاہا۔

”نہیں... نہیں... تمہارا ہوش میں آنا ہی معجزہ ہے۔ اٹھو

مت تمہاری حالت اس قابل نہیں ہے۔“

جواب میں جیول نے اسے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا کر۔ جیول مشکل سے اٹھا۔ اس نے سینے پر بندھی پٹی دیکھی اور مالینا سے کہا۔ ”میرے کپڑے اور ہتھیار کہاں ہیں۔“

”ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے...“ مالینا نے کہنا چاہا۔

”کپڑے اور ہتھیار۔“ جیول غرایا۔ ”میرے پاس آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت ہے۔“

اس بار مالینا نے بلا جوں چرا اس کے کپڑے اور ہتھیار اس کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے کسی قدر مشکل سے جیکٹ پہنی اور ہولسٹر باندھا۔ ڈاکٹر سپر ڈ حیرت زدہ تھا اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ”تم فکر مت کرو میں مروں گا نہیں... باقی علاج کے لیے جلد تمہارے پاس آؤں گا۔“

وہ مالینا کے ساتھ باہر نکلا۔ ”وہ اصطبل میں ہے۔“

دو بجتے میں پچیس منٹ رہ گئے تھے۔ اب اصطبل کے سامنے کم لوگ رہ گئے تھے اور یہ سب مسلح ہو کر چوکی سے پہرہ دے رہے تھے۔ مالینا کے ساتھ جیول کو دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے تھے۔ مالینا نے پوچھا۔ ”وہ اندر ہی ہے نا؟“

”ہاں میڈم۔“ ایک آدی نے کہا اور اسی لمحے اندر سے گھوڑے کے تھنہ کی آواز آئی اور اصطبل کا دروازہ دھماکے سے کھلا، ایک گھوڑا تیر کی طرح نکلا اور اس پر کوپر سوار تھا۔ مالینا کے آدمیوں نے بے ساختہ اس پر ہتھیار تانے، اس سے پہلے کہ وہ اس پر گولی چلاتے، جیول چلایا۔

”نہیں... گولی مت چلانا۔“

وہ لوگ گولی چلاتے چلاتے رک گئے تھے۔ جیول نے شانے سے رائفل اتاری اور کوپر کا نشانہ لینے لگا۔ وہ ذرا سی دیر میں سو گز دور جا چکا تھا اور ہرگز رتے لمحے دور ہوتا جا رہا تھا۔ جیول نے سانس روکی اور گولی چلا دی۔ دھماکا ہوا مگر کوپر بے دستور گھوڑے پر موجود رہا۔ جیول پھر نشانہ لینے جا رہا تھا۔ اگرچہ اب وہ دور نکل گیا تھا مگر جیول آخری لمحے تک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا اچانک گھوڑے کی رفتار سست ہوئی اور پھر کوپر اس سے لڑھک گیا۔ وہاں موجود لوگ بے ساختہ اس کی طرف بھاگے۔ جیول لڑکھڑایا تو مالینا نے اسے سنبھال لیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”چرچ کی طرف چلو۔“

وہ چرچ کے پاس آئے۔ اس دوران میں کوپر کی لاش بھی وہاں لائی گئی اور اسے آخری تابوت میں ڈال دیا گیا۔ جیول نے چاقو نکالا اور پہلے اس نے ڈبوڈ کے کراس بنایا۔ مالینا اور دوسرے اسے خاموشی سے ایسا

کرتے دیکھ رہے تھے۔ جیول باری باری سب کے ماتھے پر چاقو کی نوک سے کراس بنا رہا تھا۔ آخر میں اس نے کوپر کے کراس بنایا اور بلند آواز سے بولا۔ ”میں نے اپنا معاہدہ پورا کر دیا ہے، اپنے بدلے تمہیں چھ آدی دے دیے ہیں۔“

یہ کام کرتے ہی جیول کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ جھولا اور اپنے پیچھے موجود آدمیوں کے بازوؤں میں جا کر۔ دو ہفتے بعد جیول گھوڑے پر اپنا سامان لا رہا تھا۔ موسم کسی قدر بہتر ہو گیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہونے والا تھا کہ مالینا وہاں آ گئی۔ اس نے اداسی سے کہا۔ ”تم جا رہے ہو؟“

جیول نے اس کی طرف دیکھا۔ ان دو ہفتوں میں اس کے جسم اور کسی حد تک روح کے زخم بھر گئے تھے اور وہ پہلے جیسی حسین لگ رہی تھی۔ ”ہاں، میرا جلد از جلد یہاں سے چلے جانا بہتر ہے۔“

مالینا بھی سمجھتی تھی۔ جیول مجرم تھا اگرچہ ان کا محسن بھی تھا۔ مگر وہ یہاں رکتا تو اس کے دشمن بھی یہاں آ جاتے اور پر سکون کر سل ریو پھر بے چین ہو جاتا۔ ”میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے تم نے میری دیکھ بھال اور علاج کر کے شکر یہ ادا کر دیا ہے۔“ جیول نے کہا۔ ”مجھے تمہارے شوہر کا افسوس ہے۔“

مالینا کا چہرہ غم زدہ ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے شانے پر لٹکا بیگ اتار کر جیول کی طرف بڑھایا۔ ”اس میں تمہارے لیے ایک تحفہ ہے۔“

جیول نے بیگ لے کر اپنے تھیلے میں ڈال لیا اور پھر اچانک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اسے بیگ کے وزن سے اندازہ ہو گیا کہ اس میں سونا ہے۔ اس نے مالینا کی طرف دیکھ کر اپنے ہیٹ کو ہاتھ لگایا اور گھوڑے کو ایڑ دی۔ چند لمحوں بعد وہ قصبے کے باہر وسیع میدان میں جا چکا تھا اور اس کا رخ شمال مغرب کی طرف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے حقیقت کیا تھی۔ یہ کوئی خواب تھا یا کچھ اور... کس ان دیکھی طاقت نے اس سے یہ کام لیا تھا... اور اس پر سکون قصبے کو ان بدکاروں سے چھٹکارا دلانے کا ذریعہ جیول کو بنایا تھا۔ جو بھی تھا اب وہ پر سکون تھا کہ وہ اس منجھد ہونے والی کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔ ہاں شاید سوتے جاگتے وہ ایک خواب ہی تھا جو اس کو ہدایات دیا کرتا تھا۔



ستاروں پر کمند

طاہر جاوید معن

اصول اور انقلاب... ہمیشہ دو مختلف طبقات کے درمیان عمل اور ردِ عمل کی ایسی گہلی جنگ کا نام جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ازل سے جاری ہے۔ چاہتوں کو دروہام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں... کیونکہ روزن کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے اسے دہانہ بنا دیتے ہیں... وہ بھی عجیب دہرے نظام اور مزاج کا شکار تھا جیسے کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کے چھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی وہ بھی سرانٹھا کر چینے کی خواہش میں اپنی جڑیں زمین میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے بچپن کی دیوار سے ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا لیکن... اس کی امیدوں کے دیے تیز ہواؤں کے سرکش جھونکے بھی نہ بجھا سکے... دوسری جانب اس کی چاہت تھی جو سودوڑیاں کی حد کھینچے بیٹھی فاصلوں کو سمٹنے ہی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ جو ایک پل کی رفاقت میں قید تھا... ان گنت اندیشوں کے باوجود اسے انہونیوں کی امید تھی اگرچہ برسوں سے اس کے آنگن میں دشت کی ویرانی تھی لیکن دل کی گلیوں میں وہی چل تھل موسم کی کسک لیے وہ ایسی مسافت کے لیے رخت سفر باندھ بیٹھا تھا جس میں اس کے پاس حوصلوں اور عزم مصمم کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو خوش گمانیوں میں آکر ستاروں پر کمند ڈال چکا تھا... جس کے پیر تو زمین میں دھنسے تھے مگر... آنکھیں آسمانوں کی بلندیوں میں گم تھیں ایسے میں لگنے والی ہر ٹھوکرا سے ایک نئے رمز... اور ہر دکھ اسے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستارے فلک سے زمین کی طرف نہیں آتے مگر... کمند تو زمین سے فلک کی جانب جاسکتی ہے۔ لہذا دور بہت دور اس کے مقدر کا ستارہ بھی اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

رقیبوں کی زہریلی چالوں..... پیار کی مدھرتالوں اور بدلتی رتوں کا

رومان انگیز طویل سلسلہ



عادل بھاگ رہا تھا۔ اس کا جوان جسم ہاتھ رہا تھا۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے اور کشادہ سینے میں غم کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ وہ سخت سردی میں کھیتوں کھلیاں اور پگھلنے والیوں پر بھاگتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے پیچھے پھڑپھڑے پھٹنے لگے، اس کی ہمت جواب دینے لگی لیکن وہ خود کو اذیت دینا چاہ رہا تھا۔ ایسی بے پناہ اذیت کہ اس کا دھیان اس جسمانی اذیت کی وجہ سے اپنے جانکاہ غم سے ہٹ جائے۔ وہ بھاگتا ہوا نیکر اور ٹاپلی کے گھنے درختوں میں داخل ہو گیا۔ اس جھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکٹے بھی تھے جن کے اوپر کے سفید سرے بے پناہ ہوا میں ہولے ہولے بل رہے تھے۔ وہ سرکٹوں کے اس حصار میں چلا گیا۔ یہاں ٹاپلی یعنی شیشم کا ایک نوخیز لکڑا پودا بھی تھا۔ تنے کا لپیٹ بہ مشکل چودہ پندرہ انچ ہوگا۔ اس تنے کے اوپر ایک بوسیدہ لحاف پینٹا گیا تھا بلکہ یہ لحاف کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس سفید لحاف کے ٹکڑے پر سیاہ روشنائی سے کسی بندے کا ٹیڑھا میڑھا چہرہ بنایا گیا تھا۔ نیچے لکھا تھا۔ ”نوری نت“

عادل نے اپنی سانسیں ذرا درست کیں۔ تب اس نے جڑے سے چھینچ لیے اور دونوں کے کس کر نوری نت پر چل پڑا۔ اس نے اسے اندھا دھند ٹھوکریں، گھونے اور گھٹنے رسید کیے اس پر جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ اس کی ضربوں میں تواتر اور سختی تھی۔ دم دم کی آوازوں سے ویرانہ گونجنے لگا تھا۔ سردی کے باوجود اس کا خستہ حال لباس پسینے سے تر ہو گیا اور چہرے کی رگیں ابھر آئیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے شعلے قدرے ماند نظر آنے لگے۔ وہ لحاف پوش تنے پر کے برساتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”..... ڈھائی کروڑ کی حویلی..... ڈھائی کروڑ کی حویلی..... ڈھائی کروڑ اور صرف ڈھائی کروڑ۔ اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا..... کچھ نہیں آتا۔“

بری طرح ہانپنے کے بعد وہ کھٹوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی سفید شلوار مٹی میں لٹھڑی تھی۔ کرتہ بھیگ کر پٹنے سے چپک گیا تھا اور ایک تعویذ کھلے گریبان میں سے نکل کر ہوا میں جھول رہا تھا وہ پھر بڑبڑایا۔ ”ڈھائی کروڑ کی حویلی۔“

اس کے بعد وہ کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ دور کہیں ٹیوب ویل چلنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ قریب ہی زمیندار مختار کے ڈیرے پر کوئی بھیمنس ڈکرائی اور اس کی آواز سنائے میں دور تک گئی۔ اس کے بعد آوارہ کتوں کا شور

سنائی دیا اور تب..... ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ عادل کے بس میں ہوتا تو وہ ساری رات یہیں سرکٹوں کے بیچ بیٹھا رہتا اور اپنے اندر کی آگ کو اس بے پناہ ہوا کی مار مارتا رہتا لیکن وہ جانتا تھا کہ ماں گھر میں اکیلی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کی نگاہ بار بار دروازے کی طرف اٹھتی ہوگی اور وہ کھدکے پرانے لحاف کو بار بار اپنے ناتواں جسم کے گرد لپیٹتی ہوگی۔ وہ جیسے ایک نادیہ ڈور ہے اسے باندھ کر رکھتی اور شام ہوتے ہی اپنی طرف کھینچنے لگتی تھی۔ شاید ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

وہ چند گہری سانسیں لینے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا۔ چہل دو بارہ پہنی اور دھیمے قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ یہ بہاولپور کا ایک دور افتادہ گاؤں تھا۔ کچی سڑک یہاں سے کم و بیش پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ گاؤں میں صرف ایک پرائمری اسکول تھا جو چھپروں کے نیچے قائم کیا گیا تھا اور ڈاکٹر و اسپتال وغیرہ کا تو یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا..... ڈاک بھٹے میں ایک بار ماسٹر بشیر کے گھر میں آتی تھی اور لوگ خود اپنے خط و کچھ دیکھ کر وہاں سے لے جاتے تھے۔ سڑک کی طرح بچی کا تاری بھی ابھی اس گاؤں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کے ارد گرد کی زمین سیم اور تھور کا شکار تھی اور یہ مسئلہ ارد گرد کے آٹھ دس دیہات میں موجود تھا۔ زمین کے اس مرض نے سڑک اور بچی کی طرح خوش حالی کو بھی اس گاؤں سے کافی فاصلے پر رکھا ہوا تھا، بس گزر بسر ہوتی تھی۔

عادل گاؤں کی تاریک گلیوں سے گزرتا ہوا ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جا رہا..... یہ گاؤں کے مختصر ترین گھروں میں سے ایک تھا جہاں عادل اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا..... برآمدے میں تاریکی تھی، اندر کمرے میں لائٹن کی مدھم روشنی زندگی اور حرکت کا احساس دلاتی تھی۔ ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اتنی دیر کردی عادی پتر۔ مجھے تو نیند آنے لگی تھی۔“

”بس ذرا کام پڑ گیا تھا ماں! تجھے اتنی واری کہا ہے، دیر ہو جائے تو سو جایا کر۔ چولہے کے پاس سے روٹی سالن ڈھونڈنا کون سا مشکل کام ہوتا ہے۔“

”مگر تجھے دیکھتے بغیر سو جانا تو میرے لیے مشکل کام ہوتا ہے نا۔ چل اب منہ دھو لے، میں تیرے لیے کھانا لاتی ہوں۔“ ماں نے کہا۔ منہ دھو کی بات کرتے ہوئے اس کی نگاہ عادل کے چہرے پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ ایسے معاملے میں ماؤں کی حس تیز ہی ہوا کرتی ہے۔ ”کیا بات ہے عادی۔ تو کچھ پریشان سا ہے۔ کہیں پھر اپنے تاجے کی

طرف تو نہیں چلا گیا تھا؟“

”نہیں ماں! تو بھی ہر ویلے تائیں..... بار یکیاں ہی ڈھونڈتی رہتی ہے۔“ وہ جھلا کر بولا اور جلدی سے نکلے کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اپنی چادر سے ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آیا تو ماں نے چار پائی پر کھانے کی چنگیر رکھ دی اور لائٹن کچھ قریب کھکا دی۔ عادل آلتی پالتی مار کر بیٹھا تو اس نے کبل اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ ”تو نہیں کھائے گی؟“ عادل نے پوچھا۔

”میں نے تو نماز کے بعد ہی کھالیا تھا۔ شریفان کے گھر سے تڑکے والے چاول آگئے تھے۔ تو، تو کھانا نہیں ہے۔ میں نے ہی کھا لیے..... بلکہ کچھ زیادہ ہی کھا لیے۔“

دال کدو کا کل والا سالن ہی تھا مگر روٹی تازہ تھی اور پھر اس میں ماں کے ہاتھ کا سوا بھی تھا۔ عادل کا دل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر ماں سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے دو چار لقمے لیے تو پھر دل بھی کرنے لگا۔ ”کھانا کھا کر اس نے ڈکاری اور گڑ کی ڈھیلی ڈھونڈنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ گڑ بھی ختم ہو چکا تھا، بس کنستر کے نیچے تھوڑا سا بھور چور پڑا تھا۔ اس نے گڑ کھا کر ایک اور چھوٹی سی ڈکاری۔ نکلے کے تازہ پانی سے کلی کی اور اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔ ماں نے لائٹن کی لو بالکل بجی کر دی تھی۔

وہ کبل کے نیچے کروٹ پر کروٹ لیٹا رہا۔ بدن اور دماغ میں پھر چنگاریاں سی بھرنے لگی تھیں۔ تا یا فراست کی شکل بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی اور ان کے کہے ہوئے وہ الفاظ جنہوں نے اس کا سینہ چھید دیا تھا اور کسی وقت اسے لگتا تھا کہ شاید انہوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ کہاں وہ اونچی حویلیوں میں رہنے والے، مربعوں اور باغوں کے مالک، کہاں وہ کسی کے فارم پر دیہاڑی پر کام کرنے والا مزدور اور مزدور بھی وہ جسے ابھی پچھلے تین ہفتوں کی بیکار بھی نہیں ملی تھی۔ مہینے کے پہلے ہفتے کی بیکار فارم کے مالک گرم دانے اسے پھل کی صورت میں دی تھی بلکہ کھانا چاہیے کہ اس کے گلے ڈال دی تھی۔ یہ کوئی تیس درجن مالے ہوں گے۔ مالٹوں کو بوری میں بھر کر بیس کلومیٹر دور قصبے تک لے جانا اور ان کو منڈی میں بیچنا عادل کے لیے کافی مشکل تھا۔ آنے جانے کے لیے بھاڑا درکار تھا، اس لیے یہ کچے کپے مالے وہیں چھوٹے کمرے کے ایک کونے میں پڑے رہے تھے۔ ماں نے تھوڑے بہت اڑوس پڑوس کے بچوں کو دے دیے تھے، باقی وہیں پڑے سوکھ رہے تھے۔ اتنی سردی میں ان مالٹوں کو کھانا بھی خود پر جبر کرنے کے مترادف ہی تھا۔

عادل کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ اچانک اسے آہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے کبل میں سے سر نکال کر دیکھا۔ ماں اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ اسے برآمدے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ لائٹن کی مدھم روشنی بھی اسی طرف تھی۔ وہ ہولے سے چار پائی پر سے اتر آیا۔ اور کچے فرش پر بیٹھے پاؤں چلتا ہوا برآمدے کی طرف آیا۔ ماں چولہے کے پاس بیٹھی تھی، اس کے سامنے مرج مسالا کونٹے والی کونڈی تھی۔ عادل نے روٹی کے جو ٹکڑے چھوڑے تھے وہ اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ انہیں کونڈی میں رگڑ رگڑ کر کھانے کی کوشش کر رہی تھی..... اس نے ایک آہ بھری اور چپکے سے واپس آکر بستر پر لیٹ گیا۔

وہ مسلسل جاگ رہا تھا۔ آج بڑی سخت رات تھی، کسی زہری طرح اس کے رگ و پے میں اتر رہی تھی اور آگ بن کر اس کے خون میں گردش کر رہی تھی۔ کیا وہ اسے کھودے گا؟ کیا وہ ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہو جائے گی؟ کیا وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکے گا اور کیا..... وہ زندہ نہ رہا تو اس کی ماں زندہ رہ پائے گی؟ ان گنت سوالات تھے اور ہر سوال اس کی گردن پر کند چھری کی طرح حرکت کرتا تھا۔

اچانک کمرے کی بجلی دیوار پر مخصوص ٹھک ٹھک سنائی دی۔ عادل کا بستر اس دیوار کے بالکل ساتھ تھا۔ عادل نے اس ٹھک ٹھک کا جواب دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے دو تین بار دیوار پر ہلکی سی چوٹ لگائی اور پھر گرم کبل سے باہر نکل آیا۔ ماں سو رہی تھی، اس کی بھاری سانسیں نیم تاریک کمرے میں گونج رہی تھیں۔ عادل نے کبل کو درست کر کے چار پائی پر رکھا بغیر آواز پیدا کیے چہل پہنی اور کمرے سے نکل آیا۔ چند ہی لمحے بعد وہ گھر کی کچی میڑھیان چڑھ کر چھت پر آچکا تھا۔ ساتھ والے گھر کی چھت پر ایک کچا ڈھارا سا بنا ہوا تھا۔ اس ڈھارے کی دیوار کے سائے میں کوئی موجود تھا۔ یہ عادل کی پڑوس ریحانہ تھی۔ ریحانہ ان ملازموں میں سے تھی جو تا یا فراست کی وسیع و عریض حویلی میں صفائی ستھرائی کا کام کرتے تھے۔ ریحانہ، عادل کو بھائی کہتی تھی اور اس کی حیثیت عادل اور شہزادی کے رازدار کی سی تھی۔ شہزادی تا یا فراست کی اکلوتی بیٹی کا نام تھا۔ وہی بیٹی جو عادل کے رگ و پے میں سا جھکی تھی..... جو سانس بن کر اس کے سینے میں آتی جاتی تھی، دھڑکن بن کر اس کے دل میں دھڑکتی تھی اور لہو بن کر اس کی رگوں میں سنسناتی تھی۔

قدرے فریبہ اندام ریحانہ نے خود کو گرم چادر میں لپیٹا ہوا تھا اور ڈھارے کی دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی

تھی۔ دونوں چھتوں کے درمیان بس دو تین فٹ اونچی کچی منڈیر تھی۔

ریحانہ بولی تو اس کی آواز بھڑائی ہوئی تھی۔ ”عادے بھائی! شہزادی شام سے رو رہی ہے۔ آج جو کچھ ہوا اس کا بہت دکھ ہے۔ بہت زیادہ دکھ ہے۔“

”خیر، یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔“ عادل نے لمبی سانس کھینچی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا جوان سینہ کچھ اور بھی پھیل گیا۔

ریحانہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھل آواز میں بولی۔ ”عادے بھائی! شہزادی نے مجھے تمہارے لیے ایک پیغام دیا ہے۔“

”کیا کہتی ہے؟“

”ریحانہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔“عادے بھائی! وہ کہتی ہے کہ اس کا اور تمہارا میل نہیں ہو سکتا۔ بدنامی اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے چنگا بکھا ہے کہ اپنے رستے دھڑکے کر لیے جائیں۔ وہ کہتی ہے کہ مجھ میں اور وہ کہنے کی ہمت نہیں ہے اور نہ وہ تم کو اور ماں جی کو دیکھ سکتی ہے۔ اس نے..... تمہارا دیا ہوا..... یہ چھٹا بھی واپس کیا ہے۔ اور تم سے معافی مانگی ہے۔“ ریحانہ نے ریشمی کپڑے کی دچی میں لپٹا ہوا چاندی کا چھٹا عادل کی طرف بڑھایا۔

عادل کم مسم بیٹھا رہا۔ اس نے چھٹا واپس لینے کے لیے بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”کیا سوچ رہے ہو عادے بھائی؟“

وہ تپتی سے بولا۔ ”یہ چھٹا اسے واپس کر دو ریحانہ!“

اس سے کہنا کہ یہ میں نے اسے دے دیا ہے، چاہے اپنے پاس رکھے یا کوڑے میں پھینک دے۔“

”بھائی! یہ بات نہیں ہے کہ وہ تم سے پیار نہیں کرتی۔ وہ جتنا کرتی ہے بس میں ہی جانتی ہوں، پر وہ مجبور ہے۔ وہ اپنے ماں بچہ کی مرضی کے خلاف نہیں جاسکتی۔ وڈے مالک نے اسے بہت زیادہ جہیز کیا دی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب کبھی اسے گھر سے اکیلے باہر نکلنے دیں گے اور اگر اس نے کہیں ایسا کیا تو وہ اس کا خون پی جائیں گے۔“

”مطلب یہ کہ وہ حوصلہ چھوڑ رہی ہے۔ ہار مان رہی ہے پر میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا ریحانہ! میں پوری کوشش کروں گا۔ آخری دم تک کروں گا۔ تباہی فراست نے جو بات کہی ہے، میں اسے دیاہ کر دکھاؤں گا۔ چاہے اس میں جان ہی چلی جائے۔ انہوں نے تین سال کی مہلت

دی ہے اور ابھی اس میں سے بس ایک دن کم ہوا ہے۔“ اس کی آواز غصے اور جوش سے لرز رہی تھی۔

ریحانہ نے التجا کے لہجے میں کہا۔ ”عادے بھائی! ابویں ہوا کے پیچھے نہ بھاگو، جو کام ہو نہیں سکتا اس کے لیے خود کو روٹنے سے کیا فائدہ اور پھر وڈے وڈے تو یہی کہتے ہیں تاکہ جوڑے آسانوں پر بنتے ہیں۔ اگر تمہارا جوڑا ابھی بننا ہوگا تو کسی نہ کسی طرح خود ہی بن جائے گا۔ نہیں تو خود کو جتنا مرضی ہلکان کرو، کچھ نہیں ہو سکے گا، اس لیے.....“

”اجھا زیادہ پڑانی نہ بن تو۔“ عادل نے تپتی سے اس کی بات کاٹی۔ ”میں نے جو کچھ کرتا ہے وہ میں چنگی طرح جانتا ہوں اور تو جا کر اس سے کہہ دینا۔ میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا اور اگر ہار ہی گیا تو پھر صرف اس کو ہی نہیں ہاروں گا، ساتھ میں اپنی جان بھی ہاروں گا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا سیز جیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ رات تو جیسے تیسے کٹ گئی۔ اگلا دن اس کے لیے اور بھی کبیر تھا۔ وہ صبح سویرے ناشتا کیے بغیر ہی گھر سے نکل گیا۔ ماں اس وقت پچھے ہوئے لحاف میں گھٹنے پٹ سے لگائے پڑی تھی۔ جاتے جاتے عادل نے اپنا والا میل بھی آہستہ سے اس پر ڈال دیا تھا۔ سورج ابھی آگاہ نہیں تھا۔ زمین پر گڑگڑاؤ اور گلیوں میں کھرے کی چادر تھی۔ وہ بے مقصد پیدل چلتا رہا اور ایک بار پھر درختوں کے اسی جھنڈ میں پھنچ گیا جہاں شیشم کے ایک ٹوٹنے سے کے ساتھ پرانا گدلا سا بندھا ہوا تھا اور چھوٹا سا اکھاڑا بھی تھا۔ عادل کے ہجولی لڑکے یہاں زور آزمائی کرتے تھے..... اور کبھی کبھی سچ لڑ بھی پڑتے تھے۔ مگر ان لڑائیوں میں نفرت یا عداوت نہیں ہوتی تھی بس وقتی غصہ ہوتا تھا، کسی نے کسی کے چلیے کے بارے میں کوئی بات کہہ دی، کسی کی محبوبہ کے بارے میں کوئی بھتی کس دی، یا ایسی ہی کوئی اور بات۔ ایسی لڑائیاں جتنی جلدی شروع ہوتی تھیں اتنی ہی جلدی ختم بھی ہو جاتی تھیں۔

مگر اس وقت صبح سویرے درختوں کے اس جھنڈ میں، ہنٹھڑے ہوئے سرکندوں کے درمیان اور کوئی نہیں تھا۔ بس ایک آوارہ کتا ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر خاموشی سے ایک طرف نکل گیا۔ عادل نے ”لوری نت“ پر چند زوردار کے برسائے مگر یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ وہاں سے نکل آیا اور درختوں کے درمیان پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ شانے چوڑے، جسم دبلا پتلا لیکن بہت مضبوط، کمر چیتے کی

مرح تپتی اور ٹانگیں سبک۔ غربت کے باوجود چہرے پر صحت مندی کی جھلک تھی اور ایک انگ سے جوانی کی سرمستی اور توانائی پھوٹی محسوس ہوتی تھی..... ہاں وہی عمر جب چال میں چھاڑی ندیوں کی سی طغیانی ہوتی ہے اور لب و لہجہ میں برقی لہرائی ہے، جب مشکلات ہیچ محسوس ہوتی ہیں اور سنگا خ رکاوٹوں کے ساتھ نکلنے کو دل چاہتا ہے۔

وہ کسی جوان چیتے ہی کی طرح لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے جسم میں بے پناہ چمک ہے اور اس کی حیات بے حد چیز ہیں۔ وہ کافی دور نکل آیا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور ”سردیوں“ کی زبرد محسوس، کھرے کی چادر کو چیرنے کی کوشش کر رہی تھی، ایک ویران جگہ پر سویا (چھوٹی نہر) کا پانی جھلک دکھا رہا تھا۔ کناروں پر گھاس تھی اور دھوپ تیزی سے ساتھ اس گھاس پر سے اوس کے موتی چن رہی تھی۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بہتے پانی کو دیکھنے لگا۔

یہ جگہ ان یادگار جگہوں میں سے تھی جہاں شہزادی اس سے ملی تھی۔ یہ ملاقاتیں بہت زیادہ تو نہیں تھیں لیکن جتنی بھی تھیں انہیں حریف میں عادل کے دل پر نقش تھیں۔ وہ سوچنے لگا۔ ”یہاں وہ بیٹھی تھی، اس نے اس شاخ پر ہاتھ رکھا تھا، یہاں اس نے ٹیک لگائی تھی۔ عید سے ایک دن پہلے کی وہ کتنی خوب صورت شام تھی۔ ان گنت اندیشوں کے باوجود ان کی آنکھوں میں سہنوں کی جھلک تھی، آنے والے دنوں میں آنہویوں کی امید تھی۔ انہوں نے خاموشی کی زبان میں وعدے کیے تھے، بیان باندھے تھے۔ اس نے ایک آہ بھری اور سوچنے لگا۔ یہ آنہویوں کی امید انسان کا چچھا کیوں نہیں چھوڑتی، یہ دریاؤں اور ندی نالوں کا پانی کیوں وہیں سرنگراتا ہے جہاں اسے رستہ نہیں ملتا۔

وہ دیر تک اس چھوٹی نہر کے کنارے بیٹھا رہا۔ آخر اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی بوڑھی والدہ کو اپنے منہ بولے طفیل ماموں کے گھر چھوڑ کر شہر کا رخ کرے گا اور اپنی قسمت آزمائے گا۔ شہزادی کو جیتنے کے لیے ایک ایسی بھرپور کوشش جو کوشش کے لفظ کا حق ادا کر دے اور جس کے بعد دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔ ابھی تک اس نے لاہور کا صرف نام سنا تھا۔ وہاں گیا نہیں تھا لیکن اس ”شہر ہفت رنگ“ کے بارے میں اسے کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ سب سے بنیادی ”علم“ تو یہی تھا کہ لاہور یہاں سے کم و بیش 500 میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے پہلے پیدل، پھر تانکے، پھر بس اور آخر میں ریل گاڑی پر سفر کرنا

ہوگا یا آخر میں پھر کسی اور بس میں بیٹھنا ہوگا۔ اس سفر کے لیے اسے کم از کم ایک ہزار روپے کرایہ درکار تھا۔ اس کے علاوہ اضافی طور پر دو تین سو روپے تو اس کی جیب میں ہونا چاہیے تھا یعنی کل ملا کر تقریباً تیرہ سو روپے..... اور عادل کے لیے یہ ابھی خاصی رقم تھی۔ وہ آج کل ایک مقامی زمیندار کرم داد کے فارم پر درختوں سے پھل اتارنے اور ان کو چھانٹنے کا کام کر رہا تھا۔ اس کی پچھلے تین ہفتے کی مزدوری اکیس سو روپے بنتی تھی لیکن عادل کو معلوم تھا کہ ملک کرم داد اسے یکمشت تیرہ سو روپے سے زیادہ نہیں دے گا۔ اس سے کرایے کا انتظام تو ہو جاتا لیکن وہ جو پچھلے دو مہینے سے ماں کے لیے نئے لحاف کا سوچ رہا تھا اس کا کیا بننا اور گھر کے راشن کا کیا ہوتا۔ بے شک اس نے ماں کو ماموں طفیل کے گھر چھوڑ کر جانا تھا مگر کھانے پینے کا خرچہ تو ماموں طفیل کو دینے بغیر گزارا نہیں تھا۔ ماں کو تھوڑی بہت دوا کی ضرورت بھی پڑتی رہتی تھی اور عادل کو ہرگز کواریا نہیں تھا کہ وہ یہ سارا بوجھ ماموں طفیل پر ڈالے.....

وہ بہت دیر تک اس کبیر ”معاشری مسئلے“ کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا..... ایک بار ریل میں بلا ٹکٹ سفر کرنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں آیا لیکن پھر اس نے خود ہی اس کو رد کر دیا۔ سوچے سوچے اچانک عادل کے ذہن میں امید کی ایک کرن چمکی..... پانچ چھ دن بعد ساتھ والے گاؤں شاہ نوانہ میں میلا تھا۔ علاقہ کے لوگ سال بھر اس میلے کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں بہت سے کھیل تماشے بھی ہوتے تھے۔ کبڈی، کشتی، رسائی اور اس طرح کے دیگر مقابلے میلے کی جان تھے۔ ان میں سے ایک مقابلہ درختوں پر چڑھنے کا بھی ہوتا تھا۔ پچھلے سے پچھلے سال عادل نے بھی اس مقابلے میں حصہ لیا تھا اور پندرہ سو روپے نقد کا پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ پچھلے سال والدہ بیمار تھیں اور وہ اسے لے کر تحصیل اسپتال گیا ہوا تھا، اس لیے اس مقابلے میں حصہ نہیں لے سکا تھا اور چودھری مختار کے باغ میں کام کرنے والا ملازم فیروز عرف جشی پہلے نمبر پر آ گیا تھا۔ میلے اور مقابلے کا سوچ کر عادل کے رگ و پے میں حرارت سی جاگ گئی اور سینے میں میٹھا میٹھا جوش لہر لینے لگا۔

درخت پر چڑھنے والا مقابلہ اس میلے میں پچاس ساٹھ سال سے منسلک ہو رہا تھا۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ عرصے سے ہو رہا تھا۔ یہ بڑا دلچسپ مقابلہ تھا۔ ایک ہموار جگہ پر درخت کے چار بانگ سیدھے تھے۔ یہ مجبور کے سوکھے ہوئے درخت تھے۔ قریب ایک ہی جتنے موٹے تھے

سپینس ڈائجسٹ 91 جولائی 2014ء

اور ان کی اونچائی ٹھیک 12 گز یعنی 36 فٹ تھی (ممکن تھا کہ ان کی اصل لمبائی کم زیادہ ہو لیکن انہیں کاٹ کر برابر کر دیا گیا تھا) مقابلے کے وقت ان چاروں خشک تنوں کے بالائی سرے پر ایک ایک سرخ جھنڈا گاڑا جاتا تھا۔ کھلاڑیوں کو خالی ہاتھ تیزی سے ان درختوں پر چڑھنا ہوتا تھا۔ جو سب سے پہلے جھنڈا اتار لیتا تھا جیت جاتا تھا۔ بالکل سادہ سا مکمل تھا۔ نجانے کیوں عادل کو یقین ہونے لگا کہ اس مرتبہ وہ نہ صرف کھیلے گا بلکہ جیتے گا بھی اور یہ جیت اسے دور دراز گھر زدہ گاؤں سے اٹھا کر روشنیوں کے شہر لاہور تک پہنچانے میں مدد دے گی۔

☆☆☆

چھ سات روز بعد یہ میلے کا منظر تھا۔ شاہ نواز گاؤں کے ارد گرد کھیتوں اور کھلے میدانوں میں دور تک رنگ برنگے خیمے اور عارضی چیمبر نظر آرہے تھے۔ چھوٹی بڑی انگنت دکانیں بھی ہوئی تھیں۔ تھیمز، سرکس، جمولے وہ سب کچھ یہاں موجود تھا جو پنجاب کے دیہی میلوں ٹھیلوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ آج میلے کا دوسرا اور بھرپور دن تھا۔ عادل کو معلوم تھا کہ آج تایا فراست اور ان کے گھر کی عورتیں بھی میلے میں آئیں گی۔ وہ صبح ہی سے شہزادی کی دید کا منظر تھا۔ دس بجے کے قریب تین سچے سچے تانگوں کا قافلہ میلے کی حدود میں داخل ہوا۔ آگے پہلے دو دو مسلح گھڑسوار تھے۔ ان تانگوں کی چاروں جانب ریشمی چادروں سے پردہ کیا گیا تھا۔ یہی علاقے کا رواج تھا۔ تایا فراست خود بھی ایک سفید گھوڑی پر سوار تھے۔ ساتھ میں ان کے دو بیٹے قاسم اور عاصم بھی گھڑ سواری کر رہے تھے۔ دونوں تومند جوان تھے۔ تایا فراست کی طرح ان دونوں کے زرق برق لباس اور اونچے شیلے بھی ان کی شان و شوکت کو نمایاں کر رہے تھے۔ دیکھا جائے تو قاسم اور عاصم رشتے میں عادل کے تایا زاد بھائی تھے لیکن ”حیثیت“ کے فرق نے جہاں اور بہت سے فاصلے پیدا کیے تھے وہیں ان دونوں کو بھی عادل سے بہت دور رکھا تھا۔

عادل دور ایک مٹھائی فروش کی عارضی دکان کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ درمیانی تانگے کی طرف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شہزادی اسی تانگے سے اترے گی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دوسری عورتوں کے ساتھ شہزادی اسی تانگے سے اتری۔ عادل کی پیاسی نگاہیں اس کی جھلک دیکھنے میں کامیاب رہیں۔ وہ ستاروں کے جمرٹ میں چاند کی طرح تھی۔ گورا رنگ، سبک بدن، مہندی رنگ کے جھلملاتے لباس میں وہ سچ سچ

”شہزادی“ ہی نظر آتی تھی۔

سب عورتیں میلے کے اس حصے کی طرف چلی گئیں جہاں صرف عورتوں کے لیے اسٹال وغیرہ لگائے گئے تھے۔ اس جانب مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ عادل اپنے دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومتا رہا اور سہ پہر کا انتظار کرتا رہا۔ درختوں پر چڑھنے والا دلچسپ مقابلہ سہ پہر کے وقت ہی ہوتا تھا۔ مقامی رواج کے مطابق اسے ”چڑھائی“ یا ”چڑھائی کا مقابلہ“ کہا جاتا تھا۔

کھلے میدان میں گھجور کے چار بالکل سیدھے سے کھڑے تھے۔ عام دنوں میں بھی لڑکے بالے ان پر اترنے چڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بڑے ڈنڈل قدرے ہموار اور پختے ہو چکے تھے۔ یہ چڑھائی کرنے والوں کے جسموں کو زیادہ پھیلتے نہیں تھے۔ آج ہر درخت کے اوپر ایک چھوٹا سا سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا اور درختوں کے نیچے زمین پر چونے سے دائرے بنائے گئے تھے۔ میدان میں سیکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے اور بے چینی سے مقابلے کے آغاز کے منظر تھے۔

عادل کو امید تھی کہ تایا فراست اور ان کے گھر والے بھی مقابلہ دیکھنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اور اگر والوں میں شہزادی بھی تھی مگر یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ تایا کے گھرانے میں سے صرف ان کا ایک سمبندھی اور بیٹے قاسم اور عاصم ہی تماشائیوں میں موجود تھے۔ آج کافی کچھ معمول سے ہٹ کر ہوا تھا۔ اس سے پہلے شہزادی اور دیگر لڑکیاں پورے میلے میں گھومنا پھرا کرتی تھیں مگر آج وہ صرف زنانے حصے تک ہی محدود رہی تھیں۔ یہاں چڑھائی کے مقابلے میں بھی تایا کے گھر کی کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ ہاں کچھ دوسرے زمینداروں کی طرح چودھری مختار کے گھر کی عورتیں اور ملازما بھی تماشائیوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ چودھری مختار کا ”کاماں“ فیروز عرف جمشی، عادل کا سب سے گنڈا حریف تھا۔ وہ اصل سرخ کی طرح اکڑا پھر رہا تھا۔ اسے پچھلے سال کی جیت کا ٹھنڈ تھا۔

عادل کا دوست کوڈا اس کے پاس آیا اور کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”لے میرے یار! تھوڑا سا اور خوش ہو جا۔ چودھری مختار صیب نے بتایا ہے کہ اس بار انعام کی رقم پندرہ سو سے بڑھا کر دو ہزار کر دی گئی ہے۔ سو والے لال رنگ کے پورے وی لوٹ۔ آج جان لڑا دے۔

”جمشی کدھر ہے؟“ عادل نے پوچھا۔

ستاروں پر لٹکتا

”ادھر گرم شرم کر رہا ہے اپنے آپ کو۔ ڈنڈے ٹھیکس لگا رہا ہے۔ ابھی باداموں کی پوری آدھ کلو گریاں کھلائی ہیں اسے چودھری مختار نے۔ اوپر سے دو کلو گرم دودھ پیا ہے اس نے۔ تو بھی تھوڑا سا کچھ کھاپی لے۔ حلوا پوری لاؤں گے لے؟“

”نہیں، میں نے بھی ابھی دودھ پیا ہے۔“

”جمشی نہ بول عادی۔ مجھے تو لگتا ہے تو نے ناشتا بھی چکی طرح نہیں کیا۔“

”تو نے میرے پیٹ میں وڈ کر دیکھ لیا ہے؟“ عادل نے خشک لہجے میں کہا تو کوڈا چپ ہو گیا۔ ویسے کوڈا کہہ ٹھیک ہی رہا تھا۔ سویرے باسی روٹی کے ساتھ اس نے تھوڑا سا اچار کھایا تھا اور بس۔ شاید کھانے کو کچھ ہوتا بھی تو اس کا دل نہ چاہتا۔ آج کل کچھ عجیب کیفیت تھی اس کی۔ ہر چیز سے دل اچاٹ تھا۔ وہ بس جلد از جلد اس خشکی مارے گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کے لیے اور شہزادی کے لیے ایک بھر پور لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ تایا فراست نے ٹھیک ہی تو کہا تھا اس سے کہ وہ خود پر غور کرے اور دیکھے کہ شہزادی کے مقابلے میں وہ کہاں کھڑا ہے۔

ڈھول پر چوٹ پڑی اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ کل سولہ لڑکے اس مقابلے کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ ان میں عادل اور فیروز عرف جمشی بھی شامل تھے۔ چار چار لڑکوں کی چار ٹولیاں تھیں۔ ہر ٹولی میں سے ایک لڑکے کو جیتنا تھا۔ آخر میں جیتنے والے چاروں لڑکوں کا فائنل مقابلہ ہونا تھا۔ پہلے نمبر پر آنے والے کو دو ہزار اور دوسرے پر آنے والے کو پانچ سو روپے حوصلہ افزائی کے ملنا تھے۔ آج ایک نئی بات جمشی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ شہر سے ایک مووی کمرے والا بھی یہاں آیا ہوا تھا اور فلم بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

پہلے چار لڑکوں کا مقابلہ ہوا۔ وہ تنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے جوتے اتار دیے تھے اور نظریں 36 فٹ اوپر سرخ جھنڈوں پر گاڑ دی تھیں۔ ان میں فیروز عرف جمشی بھی شامل تھا۔ چودھری مختار اس کی حوصلہ افزائی کے لیے خود موقتے پر موجود تھا اور بار بار اس کی پیٹھ ٹھونکتا تھا۔ آخر ڈھول پر چوٹ پڑی اور چاروں لڑکوں نے تیزی سے درختوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں کیوں عادل کے دل میں یہ دلی ہوئی خواہش موجود تھی کہ جمشی اس مکمل میں آگے نہ جائے اور یہیں ہار جائے۔ شاید ہر سخت حریف کے حوالے سے دوسرے حریف کی یہی

خواہش ہوتی ہے۔ بہر حال ہوا دہی جس کی توقع تھی۔ آدمی چڑھائی کے فوراً بعد گہری رنگت والا جمشی آگے نکل گیا۔ اور آخر تک آگے ہی رہا۔ اس نے سب سے پہلے جھنڈا اکھاڑ کر ہوا میں لہرایا اور فضا تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھی۔ عادل کی طرح فیروز عرف جمشی بھی ”باغ مزدور“ تھا اور ہر طرح کے درختوں سے پھل اتارنے کا کام کرتا تھا۔ یقیناً اس کا یہ پیشہ بھی ”چڑھائی“ والے مکمل میں اس کی مدد کرتا تھا۔ عادل کی باری تیسری ٹولی کے ساتھ تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگا تو کوڈے نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”لال رنگ کے پورے وی لوٹ۔“

چاروں لڑکے تنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈھول پر چوٹ پڑی اور تیزی سے چڑھائی شروع ہو گئی۔ شروع میں عادل تھوڑا سا پھسل گیا۔ دوسرے آگے نکل گئے، اس کے باوجود اس نے ہمت کر کے زور بارا اور آخر میں یہ مقابلہ جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ (اب وہ فائنل کھیلنے کا حق دار تھا) درخت کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے سرخ جھنڈا ہوا میں لہرا دیا۔ اس کے دوستوں اور ہمدردوں نے شور مچا کر اسے داد دی۔ بلندی سے اسے پورا میلہ نظر آرہا تھا۔ دور تک شامیانوں اور عارضی جمونپڑوں کی قطاریں، بچکانوں کی دکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں، عادل کی نگاہیں ایک کھیت کے کنارے کھڑے تین عدد تانگوں پر جم گئیں۔ ان کے گرد ریشمی چادروں کا پردہ تھا۔ پردوں میں سے کچھ چہرے بھی جھانک رہے تھے۔ ان میں ہی سے ایک چہرہ یقیناً شہزادی کا بھی ہوگا۔ عادل نے سوچا اور اس کا کشادہ سینہ خوشگوار دھڑکنوں سے بھر گیا۔ اس نے ایک بار پھر جھنڈا ہوا میں لہرایا اور نیچے اتر آیا۔

اگلے مقابلے میں وہ چاروں لڑکے شامل تھے جو اپنی اپنی ٹولی میں پہلے نمبر رہے تھے اور یہ بڑا سخت مقابلہ تھا، کسرتی جسم والا تومند جمشی اس کی طرف جلتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک لمبا کچھا (نیکر) اور بنیان تھی۔ عادل کے جسم پر فقط شلوار تھی، اس کے سینے پر درخت کی رگزیں تھیں۔ جمشی کے مقابلے میں عادل کا جسم چھریا تھا۔ خاص طور سے اس کی کمر دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کشادہ سینے کے نیچے یہ پتلی کمر بالکل جیتے کے جیسی تھی۔

فائنل مقابلہ سنسنی خیز تھا۔ ڈھول پر چوٹ پڑتے ہی چاروں لڑکوں نے تیزی سے تنوں پر چڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے تانگوں اور بازوؤں کو کلا دوس کی شکل دے دی تھی اور چھوٹی چھوٹی جستوں کی صورت میں اوپر چڑھ رہے

تھے۔ عادل کے جسم میں عجیب سی آگ بھری ہوئی تھی۔ اس آگ نے اس نہایت سخت مقابلے کو اس کے لیے آسان بنا دیا۔ وہ آدھا رستہ طے ہونے سے پہلے ہی آگے نکل گیا اور پھر اس فرق کو بڑھاتا چلا گیا۔ جیسی سر توڑ کوشش کے باوجود اس کے قریب بھی نہیں چٹک سکا۔ ایک نہایت واضح فرق کے ساتھ عادل نے یہ مقابلہ جیتا اور سرخ جھنڈا ہوا میں لہرا دیا۔ نیچے ڈھول کی تھاپ پر ہنگڑے ڈالے جانے لگے۔ جیت کی خوشی منانے والے زیادہ تر کھیت مزدور اور غریب غربا ہی تھے۔ عادل نے ایک بار پھر دور نیچے ریشمی پردوں والے سچے سجائے تانگوں کو دیکھا۔ کیا وہ خوش رنگ، ہر نی جیسی آنکھوں والی بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”شہزادی! تو مجھے دیکھ رہی ہے یا نہیں دیکھ رہی..... لیکن یقین رکھ کہ تیرا عشق مجھے ایسے ہی آگے بڑھائے گا، میں ایک دن ایسے ہی تیرے نام کا جھنڈا ہوا میں لہراؤں گا اور تجھے گلے سے لگاؤں گا۔“

☆☆☆

اب عادل کے پاس راشن کے میسے موجود تھے۔ ماں کے اوپر نیا لحاف بھی آچکا تھا..... پہلے والی روٹی میں کچھ بڑید روٹی ڈال لی گئی تھی اور اس پر چھینٹ کا نیا کپڑا چڑھا دیا گیا تھا۔ ماں نے بڑی محبت سے لحاف کو اپنے ارد گرد لپیٹا ہوا تھا۔ لائین کی زرد روشنی میں ماں کے سفیدی پائل بال چمک رہے تھے اور چہرے پر مسرت کی جھلک تھی۔ وہ چار پائی پر پائنتی کی طرف بیٹھا ماں کے پاؤں دبا رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ اس کو اپنی روائی کے بارے میں کس طرح بتائے۔ وہ تو اس سے ایک دو دن کی دوری بھی برداشت نہیں کرتی تھیں، کہاں اب ہفتوں اور مہینوں کی جدائی پڑنے والی تھی۔ ماں بہت خوش تھی۔ عادل نے سوچا، چلو ابھی اس خوشی کو برقرار رہنے دیتے ہیں، کل اطمینان سے، پہلے ان کا ذہن بتائیں گے پھر بتائیں گے۔ ماں سو گئی تو وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنے بستر پر آگیا۔ کمبل لپیٹ کر اور دیوار سے قیک لگا کر لیٹا رہا۔ روزن میں سے درمیانی راتوں کا چاند جھانک رہا تھا۔ اس نے سوچا یہی چاند پال پور گاؤں کے آخری سرے پر تایا فراست کی شاندار حویلی پر بھی چمک رہا تھا۔ حویلی کے برجوں پر، اس کے بانچوں پر، کھلے برآمدوں کے فرش پر، کیا پتا، شہزادی بھی کسی اودھ کھلی گھر کی یا نیم واروزن میں سے اس چاند کو دیکھ رہی ہو۔ (پال پور تایا فراست کا گاؤں تھا۔ عادل کے گاؤں لالی اور پال پور میں مشکل سے تین چار فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔

جی۔ ان کے دونوں بیٹے قاسم اور عاصم بھی زبردست کاروباری ذہن کے مالک تھے۔ بلکہ بڑا بیٹا قاسم تو کاروباری ہونے کے ساتھ ساتھ جھگڑالو اور پھنڈے باز بھی تھا۔ یہ تو کسی حد تک تایا فراست نے اسے لگام دے رکھی تھی ورنہ وہ کئی زمینوں پر ناجائز قبضے کر چکا ہوتا۔ اب تایا فراست اور عادل کے گھرانے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اپنے باپ کی طرح عادل بھی کاشت کاری یا کاروبار میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سخت جان اور سختی ہونے میں تو کوئی شک نہیں تھا لیکن روپیہ کمانے کے لیے جس خاص قسم کی حسابی ذہانت اور عمومی سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں دور دور تک نہیں تھی۔ اس کے بجائے اس پر ایک طرح کا کلنڈر اپن طاری رہتا تھا۔ وہ اپنے بھولیوں کے ساتھ آوارہ بگلے کی طرح لالی گاؤں کی گلیوں میں چکراتا رہتا تھا۔ تایا کی حویلی زیادہ دور نہیں تھی۔ دو چار فرلانگ کا ہی تو فاصلہ تھا لالی گاؤں میں اور پال پور میں لیکن ”یہ دو چار“ فرلانگ کا فاصلہ دراصل ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ یہ وہی فاصلہ تھا جو امیر اور غریب رشتے داروں کے درمیان پیدا ہوتا ہے اور اولادیں بڑی ہونے کے بعد مزید بڑھتا جاتا ہے۔ معاشی حیثیت کا روز افزوں فرق بھی اس فاصلے کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ تایا اور اس کے بیٹوں نے بھی نظر اٹھا کر اپنے اس غریب رشتے دار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ عادل اور اس کے گھر والوں کو شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں نہیں بلایا جاتا تھا اور اگر کبھی بھار کسی محفل میں آتا سامنا ہو بھی جاتا تو ان کا تعارف کرانے سے گریز کیا جاتا تھا۔ ایک ایسے ہی موقع پر عادل کو یادگار شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تایا فراست کے ڈیرے پر ان کے کچھ ہم عصر زمیندار آئے ہوئے تھے۔ شہر سے آیا ہوا ان کا کوئی مجسٹریٹ دوست بھی موجود تھا۔ شکار وغیرہ کا پروگرام تھا۔ عادل کا سہ کی حیثیت سے ملک کرم داد کے باغ میں ہی کام کر رہا تھا۔ انہوں نے آموں کی دو بڑی نوکریاں تایا فراست کے لیے ڈیرے پر بھجوائی تھیں۔ یہ نوکریاں عادل ہی لے کر گیا تھا۔ روائی میں اس نے مہمانوں کے سامنے تایا فراست کو تایا ابا کہہ کر مخاطب کر دیا تھا۔ تایا فراست کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں انہوں نے عادل کو بری طرح بے عزت کیا اور خبردار کیا کہ آئندہ وہ انہیں اس طرح مخاطب نہیں کرے گا۔ اس کے بعد انہوں نے عادل کے مالک کرم داد کو بھی سخت سرزنش کی اور کہا کہ وہ عادل کو

کسی کام سے ڈیرے یا حویلی پر نہیں بھیجیں گے۔ اپنے تایا زاد کزنوں سے بھی عادل کی ملاقات نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے شہزادی کو بھی بس ایک دو بار ہی دیکھا تھا۔ حویلی کے اندر شہزادی کو اس نے آخری بار شاید تب دیکھا تھا جب وہ چھ سات سال کی ہوگی۔ عادل اس وقت بہ مشکل دس سال کا تھا۔ عادل کی دادی فوت ہوئی تھی اور وہ ٹھوڑی دیر کے لیے تایا فراست کی شاندار حویلی میں گئے تھے۔ حویلی کی ان ادنیٰ دیواروں کے پیچھے کیا ہوتا تھا، کیا روٹھیں تھیں، کیا روز و شب تھے عادل کو کچھ معلوم نہیں تھا..... اور وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن پھر دو سال پہلے بہار کی ایک شام ایسی آئی تھی جب سات پردوں میں چھپی ہوئی شہزادی اس کے سامنے آشکار ہوئی اور اس طرح ہوئی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہاں وہ بہار کے دن تھے، جب دلوں میں گلاب کھلتے ہیں اور ہواؤں میں نشہ سرایت کر جاتا ہے اور جب رگوں میں جوان لہو بھی دوڑتا ہو تو خواجہ ناچنے گانے اور اچھلنے کودنے کو دل چاہتا ہے۔ اس شام عادل بھی ہوا کے کسی آوارہ جمونکے کی طرح درختوں میں گھوم رہا تھا۔ یہاں بانس کے بھی بہت سے درخت تھے۔ عادل بانسری بنانے کے لیے کسی اچھی لکڑی کی تلاش میں تھا۔ اچانک اسے چلانے کی نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ ایک درخت پر چڑھتا چڑھتا ٹھٹک کر رک گیا۔ آواز دوبارہ آئی تو وہ دیوانہ وار اس سمت میں بھاگا تھا۔ اس نے گھٹے پیڑوں کی اوٹ سے دیکھا، پال پور کی حویلی کا ایک سجا یا تا گارا رستے پر آڑھتا چھا کھڑا تھا۔ ایک پرانی سی کھٹارا جیب پاس ہی موجود تھی۔ جیب پر سے اترنے والے تین ڈھانٹا پوش افراد تانگے کے گھڑسوار محافظوں سے مارا ماری کر رہے تھے۔ ایک گھڑسوار زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس پر غالباً کلھاڑی سے وار کیا گیا تھا۔ عادل کے دیکھتے ہی دیکھتے بارہ بور کی رائفل سے ایک فائر ہوا جو سیدھا گھڑسوار کے گھوڑے کی پچھلی ٹانگ میں لگا۔ گھوڑا بدک کر بھاگا۔ اس سے پہلے کہ رائفل بردار گھڑسوار سنبھل سکتا، گھوڑا سر پٹ ہو گیا۔ گھڑسوار کا سر شیشم کی ایک تباہ و تاراج سے ٹکرایا اور وہ الٹ کر زمین پر آ رہا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں جھاڑ جھکاڑ میں گھس گئی تھی۔ ڈھانٹا پوشوں میں سے ایک دراز قد شخص نے گرنے والے کے قدموں میں سیون ایم ایم کے سنگل فائر کیے۔ وہ بوکھلا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس دوران میں ڈھانٹا پوش تانگے کے گرد لپٹی ہوئی ریشمی چادر کھینچ کر علیحدہ کر چکے تھے۔ اندر موجود ایک ادھیڑ عمر

عورت کے سر پر رانگل کے کندھے سے بے رحم ضرب لگائی گئی۔ وہ وہیں نشست پر گر گئی۔ تانگے میں موجود نوجوان لڑکی کو اٹھا کر کھٹاراجیب میں ڈال لیا گیا۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی اور مدد کو پکار رہی تھی۔ حال نے کسی حد تک پہچان لیا۔ ہونہ ہو یہ تیا فراست کی بیٹی شہزادی تھی۔ جیب ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ اب عادل کے لیے صرف تماشائی بنے رہتا ممکن نہیں تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک برق سی کوندی۔ کسی شکاری جانور کی طرح جھپٹنے ہوئے اس نے پندرہ بیس قدم کا فاصلہ بھاگ کر طے کیا اور ہر خطرے کو نظر انداز کرتے ہوئے کھلی جیب میں کود گیا۔ جیب کے اندر زبردست دھینکا مٹی ہوئی۔ عادل ڈھانٹا پوش ڈرائیور پر جا پڑا۔ اس نے گاڑی رکوانے کی کوشش کی۔ ایک شخص تو شہزادی کو دبوچے بیٹھا تھا، دوسرا عقب سے عادل کے ساتھ چٹ گیا۔ عادل نے اس کی پسلیوں میں کہنی کی شدید ضرب لگائی اور جیب کے انکیشن میں سے جانی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران میں جیب کا رخ مڑ گیا۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں گھومی اور بانس کے چند نوزائندہ پودوں کو توڑتی ہوئی سر کے بل ایک جوڑ میں جا گری۔ اس کے پچھلے پیسے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور بونٹ دلدلی جوڑ میں ڈوب چکا تھا۔ عادل کو عقب سے دبوچنے والا الٹ کر جوڑ میں گر چکا تھا۔ دوسرے کو اپنے سر کی زوردار ٹکر سے عادل نے جوڑ میں پہنچا دیا۔ جیب کے جوڑ میں گرنے سے ڈرائیور کے سر پر کوئی اندرونی ضرب آئی تھی اور اس کی ناک سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ نیم جان سا نظر آ رہا تھا۔ عادل نے اس کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ جمایا اور اسے بالکل ہی بے سدھ کر دیا۔ اس ڈرائیور کی بارہ بور ڈبل بیرل رانگل جیب کے فرش پر ہی پڑی تھی۔ عادل نے بلا توقف یہ رانگل اٹھائی اور رخ بستہ جوڑ میں کود گیا۔ جوڑ میں گرنے والے دونوں افراد اب نہتے تھے۔ عادل کے ہاتھ میں رانگل تھی اور جسم میں بجلی کوند رہی تھی۔ یوں بھی وہ لڑکپن سے ہی لڑائی بھڑائی کا شوقین تھا اور اس حوالے سے اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کافی کھول لیے تھے۔۔۔ دو منٹ کے اندر اس نے دونوں ڈھانٹا پوش افراد کو جوڑ سے نکل کر بھاگتے برمجور کر دیا۔ ان میں سے ایک نے تھوڑی سی مزاحمت دکھائی لیکن جب عادل نے اس کی ٹانگوں پر بارہ بور کا فائر مارنے کا ارادہ کیا تو اس نے بھی پیٹھ دکھائی اور سر کنڈوں میں روپوش ہو گیا۔

شہزادی ابھی تک جیب میں تھی۔ اس نے کھلی چھت والی جیب کا ایک راڈ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور مدد کے لیے

پکار رہی تھی۔ جیب لمحہ بہ لمحہ جوڑ کی گھار میں دھنستی جا رہی تھی۔ عادل جیب تک آیا، اس نے بھی ہوئی شہزادی کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا، اس کا ایک ہاتھ شہزادی کی گھار کے نیچے اور دوسرا اس کی ٹانگوں کے نیچے تھا، وہ ایک طرح سے اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے اسی طرح لے کر جوڑ سے باہر نکل آیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہ پائی۔ ”تم..... عادل ہونا؟ چچی کے بیٹے؟“

عادل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

ان کے کنارے پر پہنچنے سے پہلے ہی تیا فراست کے گھڑسوار موقع پر پہنچ چکے تھے۔ ان سب گھڑسواروں میں سب سے آگے تیا کا بڑا بیٹا قاسم تھا۔ بڑی گراری والا ریوالتوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان لوگوں کو وہی محافظ بلا کر لایا تھا جو پیچھے درختوں کے اندر روپوش ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔

”مجھے اتار دو“ کنارے پر پہنچتے ہی شہزادی نے لڑ کر کہا تھا۔

قاسم کی انگارہ آنکھیں دیکھ کر عادل نے شہزادی کو اتارنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔

قاسم نے تو کچھ نہیں کہا لیکن چند منٹ بعد جب تیا فراست موقع پر پہنچا تو اس نے شکر لیے کے دو چار بول عادل کے لیے کہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بہ امر مجبوری تھا۔ لڑائی بھڑائی کے دوران میں عادل کی کھائی پر چوٹ بھی آئی تھی اور یہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ تیا فراست نے اپنے ایک کارندے سے کہا تھا کہ وہ عادل کو فوراً گاؤں کے جراح کے پاس لے جائے اور مرہم پٹی کرائے۔

بعد ازاں حملہ آوروں کے بارے میں یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ تیا کی فیملی کے ایک دیرینہ دشمن چودھری سہراب خان کے کارندے تھے اور انہوں نے ایک پرانا بدلہ چکانے کی کوشش کی تھی۔

بہر حال اس واقعے کے تیسرے روز عادل کی پڑوسن ریحانہ خاموشی سے عادل کے گھر آئی۔ وہ صبح سویرے حویلی کے کام کاج کے لیے پال پور چلی جاتی تھی اور شام پڑنے والیں آتی تھی۔ آج بھی وہ وہیں سے آ رہی تھی۔ ”چاچا کہاں ہے؟“ اس نے دائیں بائیں دیکھ کر عادل سے پوچھا۔

”سور ہی ہے۔“ عادل نے جواب دیا۔

ریحانہ کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر ابھرا۔ ذرا شوقی سے عادل کو دیکھ کر بولی۔ ”حویلی میں شہزادی نے حیرتی چوٹ کا حال پوچھا ہے اور..... تیرا شکریہ بھی کہا ہے۔“

عادل کے دل میں جیسے ایک جلتی رنگ سانج اٹھا تھا۔

اس نے اپنی چڑھی ہوئی سانس کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اور کیا کہتی تھی وہ؟“

”تیرے لیے تو اور کچھ نہیں کہا۔ ویسے تیرے بارے میں باتیں شائیں پوچھ رہی تھی۔ تو کس طرح کا ہے، کیا کرتا ہے، چاچا کی طبیعت آج کل کیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔“

عادل خاموش کھڑا رہا۔ دل کی کیفیت کچھ عجیب تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ریحانہ اس کی طرف دیکھ کر پھر شوخ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ”تجھے بھی کچھ کہنا ہے شہزادی باجی سے؟“

عادل نے دھڑکتے دل کے ساتھ سر گوشی کے لہجے میں کہا۔ ”کہہ دینا، یہ ذرا سی چوٹ ہے۔ اپنے خاندان کی عزت کے لیے تو جان بھی چلی جائے تو معمولی بات ہے۔“

”ٹھیک ہے، کہہ دوں گی۔“ فرہ اندام ریحانہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔

اس کے بعد نامہ و پیام کا ایک سلسلہ شروع ہوا، اور دو دلوں کے درمیان ایک ایسا دروازہ کھلا جو کسی کو نظر نہیں آتا تھا مگر جس میں سے گزرنے والی خوشبودار ہوا عادل اور شہزادی کے سینوں میں محبت کے گلاب کھلا رہی تھی۔ مہینے دو مہینے بعد کسی نہ کسی بہانے انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع بھی مل ہی جاتا تھا اور پھر پچھلی عید کے موقع پر جب حسب دستور پال پور گاؤں کی بہت سی لڑکیاں چوڑیاں چڑھوانے کے لیے لائی گاؤں آئی تھیں۔ عادل کو کماد کے ایک بلند وبالا کھیت میں شہزادی سے مختصر سی ملاقات کا موقع بھی مل گیا۔۔۔ یہ ملاقات قابل اعتماد رازداں ریحانہ کی کوشش سے ہی ہو پائی تھی۔ اس روز عادل نے شرماتی لڑتی شہزادی کو چھوا تھا، اسے گلے بھی لگا تھا۔ سرما کی سونا رنگ دوپہر کی وہ چند ساعتیں عادل کے لیے یادگار اور بے مثال تھیں۔ اس روز ان کی محبت کو کس کی سچی گواہی ملی تھی۔ وہ نام ہی کی نہیں، دیکھنے میں بھی شہزادی ہی تھی۔ سرخ و سپید رنگ، نرم و نازک جسم، بڑی بڑی شریقی آنکھیں، اس کے طور اطوار میں ایک طرح کا دلکش وقار تھا۔ وہ سات آٹھ ماہ کے اندر ہی عادل کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ اسے اپنے باپ کے اونچے شملے اور عزت کا بے پناہ خیال تھا۔ اسی لیے وہ اپنے اس تعلق کے سلسلے میں بے حد محتاط تھی۔ وہ دونوں یہ بھی بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں ہیں۔ اونچی شان والا تیا کا گھرانہ اپنی بیٹی ایک باغ مزدور کو دینے پر کیسے آمادہ ہو سکتا تھا۔ شہزادی نے ایک دوبار اسے اشاروں

کناہوں میں کہا بھی تھا کہ وہ اپنے گھر کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے عادل کو اپنے ایک ماموں زاد شیر کی مثال بھی دی تھی۔ اس کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں تھی۔ اس نے زمین ٹھیکے پر یعنی شروع کی اور محنت کر کے کچھ ہی عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔

عادل کے ذہن میں بھی ایسے کئی خیالات پلخار کرتے رہتے تھے لیکن ابھی اس کے اندر شاید وہ ٹھہراؤ نہیں تھا جو بندے کو بڑے اور سنجیدہ کاموں پر آمادہ کرتا ہے۔۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں جھپٹتے۔ حالانکہ شہزادی اپنے اس تعلق کے سلسلے میں بے حد محتاط تھی لیکن پھر بھی آشکار ہونے والی بات آشکار ہو کر رہی۔ یہ سب کچھ دس بارہ دن پہلے ہوا تھا۔ شہزادی حویلی کی اونچی دیواروں کے پیچھے کم تھی۔ وہ وہاں سے کم ہی نکل پاتی تھی لیکن کبھی کبھار کوئی موقع مل ہی جاتا تھا۔۔۔۔۔ شہزادی کی ایک خالہ زاد کی شادی تھی۔ یہ بھی زمیندار لوگ تھے اور ایک قریبی گاؤں فتح پور میں رہتے تھے۔ ایسی شادیوں پر عادل اور اس کی ماں کو شاذ و نادر بلا یا جاتا تھا۔ اس شادی پر بھی نہیں بلا یا گیا تھا۔ بہر حال اس شادی کے موقع پر عادل کو شہزادی سے ملنے کا کوئی بہانہ مل سکتا تھا۔ شہزادی کو دو دن وہاں فتح پور گاؤں میں رہنا تھا۔ عادل اور شہزادی کی رازداں ریحانہ بھی ساتھ جا رہی تھی۔

پروگرام کے مطابق مہندی کی رات عادل بھی خاموشی سے فتح پور گاؤں پہنچ گیا۔ شام کے وقت کچھ لڑکیاں دو تین بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکلیں۔ کچھ لڑکیاں کچے کے امرود توڑنے کے لیے ایک باغیچے میں گھس گئیں۔ کچھ پھلواری میں گھومنے پھرنے لگیں۔ جو لڑکیاں باغیچے میں گھسیں ان میں شہزادی بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عادل اسی باغیچے کے پچھواڑے درختوں کے جھنڈ میں موجود ہے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ جھنڈ میں آئی۔ عادل نے اس کے لرزاں ہاتھ تھامے۔ ویلوٹ کے عنابی کا مدار جوڑے میں وہ جگمگا رہی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”عادل! مجھے ایسے کاموں کے لیے نہ کہا کرو، مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔“

”میں اپنے دل کا کیا کروں شہزادی، میری بھجھ مٹر نہیں آتا۔“ عادل نے اسے سمجھ کر گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

اس نے چند سیکنڈ بعد خود کو عادل سے علیحدہ کیا اور بولی۔ ”اچھا اب مجھے جانے دو۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ خالہ کی بیٹی فوزی کو خشک ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی وہ مجھے گھور رہی تھی۔“

”ایک تو تمہیں وہم بھی بڑے ہوتے ہیں شہزادی۔“
عادل نے اس کے نرم گلاب ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔
لیکن یہ وہم نہیں تھا۔ فوزی کے حوالے سے شہزادی کا
شک بالکل درست تھا۔ اچانک شاخوں میں سرسراہٹ
ہوئی۔ شہزادی تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ شام کی نیم تاریکی
میں ایک لڑکی کا چہرہ اور بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں۔ یہ
فوزی ہی تھی۔ چہرہ جلدی سے اوجھل ہو گیا۔ ”ہائے میں
مری“ شہزادی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔
پھر وہ بھی جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئی۔ عادل اپنی جگہ
ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ خالہ زاد
فوزیہ نے ساری بات شہزادی کی والدہ کو بتائی تھی۔ شہزادی
کی والدہ یعنی تائی مجیدہ تو عادل کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں
تھی۔ کہاں یہ کہ وہ ان کی بیٹی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ایک
طوفان کھڑا ہو گیا۔ حویلی میں اندر خانے جیسے ایک آگ سی
بھڑک گئی تھی۔ ایک دن عادل کی ہمراز ریحانہ نے اسے
اطلاع دی۔ ”عادلے! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ
ہو کہ قاسم یا عاصم میں سے کوئی تجھے پکڑ لے۔ مجھے لگتا ہے کہ
ان دونوں کو بھی اس گل کا پتا چل گیا ہے۔“

”جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“ عادل نے سینہ تان کر کہا تھا۔
لیکن اگلے ہی دن تایا فراست نے عادل کو ڈپرے
پر بلا بھیجا تھا۔ ڈپرے کے ایک کمرے میں تایا فراست اور
عادل میں طویل گفتگو ہوئی تھی۔ تایا فراست نے دھمے لہجے
میں بات شروع کی تھی، مگر پھر یہ دھیما لہجہ بتدریج گھن گرج
میں بدل گیا تھا۔ ایک موقع پر تو یوں لگا تھا کہ شاید تایا
فراست غصے سے چمٹ پڑیں گے اور کوئی آتشیں ہتھیار نکال
کر عادل کو شوٹ کر دیں گے۔ لیکن پھر کچھ دیر بعد یہ سنگین
ترین مرحلہ گزر گیا اور گفتگو پھر سے قدرے دھیما انداز اختیار
کر گئی۔ اسی مرحلے میں تایا فراست نے وہ بات کہی تھی جس
نے عادل کے تن بدن میں ایک اور طرح کی آگ بھڑکائی
تھی۔ تایا فراست نے کہا تھا۔ ”عادلے! وہ جو کپڑے پہنتی
ہے اس کا ایک جوڑا..... تیری سارے مہینے کی کمائی میں نہیں
آسکتا۔ تیری اور ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق
ہے۔ باقی باتوں کو چھوڑ وہ سامنے جو حویلی نظر آرہی ہے نا
تجھے، اس کی قیمت ہی ڈھائی کروڑ سے زیادہ ہے۔ کبھی کروڑ
کا یا لاکھ کا یا پندرہوی ہزار کا ہی منہ دیکھا ہے تو نے؟“
عادل خاموش کھڑا رہا تھا۔

تایا فراست نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا

تھا۔ ”میں ظالم باپ نہیں ہوں اور نہ ہی ظالم تایا ہوں۔“
اپنی اولاد کا اچھا برا سوچنے کا مجھے پورا حق ہے۔“
عادل نے ہولے سے کہا تھا۔ ”مگر تایاجی! منہ دیکھو
ایک جیسا تو نہیں رہتا، کہتے ہیں کہ چنگا ویلا گزر جاتا ہے پتہ
بھی گزر جاتا ہے۔“
”تو تیرا چنگا ویلا گزر گیا ہے نا۔ اب میں اپنی دلی
برے ویلے میں دکھا دے دوں؟“
”مجھے تھوڑا سا وقت دیں تایاجی! میں کچھ کر کے دکھا
دوں گا۔“

”کیا کر کے دکھا دے گا تو؟ کیا کر کے دکھائے گا؟“
عادل نے اپنے بال پیشانی سے ہٹا کر کھڑکی سے باہر
تایا کی بلند وبالاحویلی کو دیکھا تھا۔ ان لمحوں میں اس کے اندر
ایک نیلا شعلہ سا بھڑک رہا تھا۔ اس نے غصہ بھرے ہوئے لہجے
میں کہا۔ ”تایاجی! آپ نے ڈھائی کروڑ کی حویلی کی بات
کی ہے۔ آپ مجھے دو ڈھائی سال کی مہلت دے دیں۔
میں آپ کو کم از کم..... اتنے پیسے ضرور اکٹھے کر کے دکھا دوں
گا۔ حق حلال کے پیسے۔“

”سبحان اللہ..... سبحان اللہ۔“ تایاجی نے اپنی
بھاری مونچھوں کو سہلاتے ہوئے ہوئے کہا۔ ”میں ڈھائی
کروڑ کی بات کر رہا ہوں..... ڈھائی لاکھ کی نہیں۔“

”میں نے سن لیا ہے تایاجی۔ اچھی طرح سن لیا ہے۔“
اور پھر وہیں، ڈپرے کے اسی کمرے میں تایا اور
بیٹے کے درمیان یہ مکالمہ عجیب سے انداز میں اپنے اختتام
کو پہنچا تھا۔ عادل نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے
دھوے سے کہا تھا کہ وہ تین سال کے اندر اندر کم از کم ڈھائی
کروڑ روپیہ اکٹھا کر کے دکھا دے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ
بھی کہا تھا کہ وہ اس دوران میں کبھی شہزادی سے ملنے کی
کوشش نہیں کرے گا۔ اس کے بعد وہ ”سلام تایا“ کہہ کر تیز
قدموں سے باہر نکل آیا تھا۔

اور اب عمل کا وقت آچکا تھا۔ وہ گاؤں سے لاہور
جانے کے لیے تیار تھا اور سوچ رہا تھا کہ صبح ماں کو کس طرح
بتائے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اس سے دور جا رہا ہے۔
تین بہت رات میں روزن کے اندر سے چاندنی کی ککیر
کو دیکھتے دیکھتے اس کے خیالات دور دور کی پرواز کر کے
واپس آ گئے۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے اونگھنے لگا۔ رات کا تیسرا
پہر شروع ہو رہا تھا۔ لالی گاؤں کی گلیوں میں ستائے کا رواج
تھا۔ سڑکی صبح اس کے سر پر تھی، وہ سو گیا۔
ٹھیک دو روز بعد وہ ایک طویل سفر طے کر کے

روشنیوں اور رنگوں کے شہر لاہور پہنچ چکا تھا۔ دریائے راوی
کے کنارے کی وہ وسیع و عریض آبادی جہاں پنجاب بھر سے
ہلکے بھرے لوگ کھینچے چلے آتے ہیں۔ اس گھر کی بائیں
بہت کشادہ ہیں۔ یہ مواقع کا شہر ہے، یہ داتا کی گہری ہے۔
بہت دروازے گاؤں سے آنے والا عادل یقیناً یہاں کھوکھرا جاتا
لیکن ایک آسرا یہاں اس کے لیے موجود تھا۔ یہ اس کے
گاؤں کا رہائشی اور بچپن کا دوست عبدالقادر تھا۔ قدیر آٹھ نو
سال پہلے لاہور چلا آیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے ہتھ
ریڑھی پر کباڑا اکٹھا کیا تھا، پھر اپنا کباڑ خانہ کھولا..... بعد میں
اس نے پرانے لوہے کو ڈھالنے والی ایک بھٹی لگا لی اور سلاکی
مشینوں کے ڈھانچے تیار کرنے شروع کر دیے۔ اب اس کا
اچھا بھلا کارخانہ تھا اور وہ مزید ترقی کر رہا تھا۔ اس کا ایڈریس
عادل کے پاس موجود تھا۔ عادل سیدھا اسی کے پاس بادوامی
باغ میں پہنچا۔ قدیر نے اسے خوش آمدید تو کہا لیکن اتنی
گرج جوش سے نہیں جتنا عادل سمجھتا تھا..... دو تین روز کی سوچ
بچار کے بعد قدیر نے اسے اپنے ایک کباڑ خانے میں کباڑ
وغیرہ تولنے کے کام پر لگا دیا، اس کی تنخواہ چھ ہزار روپے
ماہوار مقرر ہوئی۔ اسی میں اسے کھانا وغیرہ بھی کھانا تھا۔ ہاں
کباڑ خانے کے اندر ہی ایک کونٹھری میں اسے رہائش ضرور
میں آگئی۔ نوکری کے پہلے دن، شام تک ردی کاغذ، لوہا اور
پلاسٹک وغیرہ تول تول کر وہ نڈھال ہو گیا۔ رات کو جب وہ
بان کی چار پائی پر لیٹا اور اس نے حساب لگایا تو دل ہی دل
میں مسکرا دیا۔ تین سالوں میں ڈھائی کروڑ اور پہلے دن کی
کمائی دو سو روپے۔ جن میں سے پچاس روپے خرچ ہو چکے
تھے۔ اس رفتار سے سفر جاری رہتا تو اسے منزل تک پہنچنے
میں چار، ساڑھے چار سو سال تو لگ ہی جاتے تھے۔

دوسری طرف لالی گاؤں میں ایک اور کام ہو رہا تھا۔
رات کے نو بجے تھے جب دھول سے اٹی ہوئی ایک کار گاؤں
میں پہنچی اور چودھری مختار کے حویلی نما مکان کے سامنے آ کر
رکی۔ اس میں سے دو افراد نکلے۔ ایک تو وہی جواں سال شخص
تھا جس نے پانچ چھ روز پہلے میلے میں گھوم پھر کر ڈوب بتائی تھی
اور خاص طور سے ”چڑھائی“ والے میلے کو عکس بند کیا تھا۔
دوسرا بھاری تو نند والا ایک سیٹھ نما شخص تھا۔ اس نے سفید شلوار
قمیص پر براؤن کوٹ پہن رکھا تھا۔ چودھری مختار کو مہمانوں
کی آمد کا شاید پہلے سے ہی پتا تھا۔ اس نے گھر کے دروازے
پر سیٹھ کا استقبال کیا۔ دونوں گلے ملے، لیکن ملنے سے پہلے
عادل دونوں کی توندوں نے معائنہ کیا۔

دس پندرہ منٹ بعد یہ لوگ گھر کی وسیع بیٹھک میں

بیٹھے تھے اور گرما گرم دودھ پتی کی چکیاں لے رہے تھے۔
چودھری مختار کا بیٹا ناصر بھی یہاں موجود تھا۔ یہ لمبے قد کا دبلا
پتلا لیکن کرخت سا لڑکا تھا۔

چودھری مختار نے اپنا بڑا سا سراو پر نیچے ہلاتے
ہوئے کہا۔ ”میں سمجھ گیا، میں سمجھ گیا رانا صاحب! آپ اس
لڑکے کے عادے کی بات کر رہے ہو، مائی سکینہ کا پتر ہے
وہ..... پر..... شاید آپ کو پتا نہیں..... وہ تو بس اتفاق سے
ہی جیت گیا اس دن۔ ورنہ میرے کاٹے جھٹی نے تو اس کی
مت مار کے رکھ دیتی تھی۔ پچھلے دو تین سالوں سے جھٹی ہی
پہلا نمبر لیتا ہے جی چڑھائی والے میلے میں۔“

”جھٹی؟“ کیمرا مین نے سوالیہ نظروں سے چودھری
مختار کو دیکھا۔ ”یہ وہی کالا سا لڑکا ہے جو دوسرے نمبر پر آیا تھا؟“
”آہو جی۔ پر دوسرے نمبر پر تو وہ اس لیے آیا
تھا..... کہ..... اسے..... چوٹ لگی ہوئی تھی۔ ورنہ میں نے
کہا ہے ناجی کہ اس نے تو مت مار دیتی تھی عادے کی۔ یہ
جھٹی میرا جدی پشتی ملازم ہے۔ اصلی نام فیروز ہے اس
کا..... ہمارے باغوں میں پھل توڑنے کا کام کرتا ہے۔
اوکھے سے اوکھے درخت پر بالکل باندھ کر کی طرح چڑھتا ہے
جی۔ لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں تو میں ابھی
تھوڑی دیر میں اسے ملواتا ہوں آپ سے۔“

رانا صاحب نے ٹٹولنے والی نظروں سے چودھری مختار
کو دیکھا، پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا۔ ”چلیں آپ کے
بندے سے بھی مل لیتے ہیں لیکن یہ عادا کہاں ہے اب؟“
”وہ تو کہیں چلا گیا ہے اب..... شاید لاہور گیا ہے
محنت مزدوری کے لیے۔“ چودھری مختار نے گول مول
انداز میں کہا۔

”کچھ اتنا پتا ہے اس کا؟“ اس بار جواں سال کیمرا
مین نے پوچھا۔

”آہو جی، وہ.....“ چودھری کے بیٹے ناصر نے کہنا
چاہا لیکن چودھری نے انگلی کے ہلکے سے اشارے سے اسے
مٹھ کر دیا۔ ناصر جلدی سے بات بدل کر بولا۔ ”وہ ادھر
پرانے لاہور کے علاقے میں ہی کہیں ٹھہرے گا۔ یہی بتایا
تھا اس نے۔“

”پرانا لاہور تو بھی بہت بڑا ہے۔ پورا ایک علیحدہ شہر
ہے۔“ رانا صاحب نے کہا۔

چودھری مختار نے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جاؤ
چوکیدار رشید سے پوچھو، شاید اس کو کچھ پتا ہو۔ اس کے ساتھ
کافی یارانہ ہے اس کا۔“

ناصر ”جی اچھا“ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ چودھری مختار نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ ”اور حبشی کو بھی دیکھ۔ شاید واڑے میں بیٹھا ریڈ یوسن رہا ہو۔“

ایک دو منٹ بعد چودھری مختار بھی ”ابھی آیا“ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ برآمدے میں دروازہ کھڑا تھا۔ چودھری نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر تیز سرگوشی میں کہا۔ ”تیرا دماغ کام کرتا ہے یا نہیں۔ ہمیں کیا لوڑ ہے عادی کے بارے میں بتانے کی۔ یہ رانا صاحب لاہور کے کافی وڈھے سیٹھ ہیں۔ انہوں نے دو چار دن پہلے ”چڑھائی مقابلے“ کی فلم دیکھی ہے۔ یہ کھیڈ ان کو بڑی پسند آئی ہے۔ آج کل رانا صاحب نے لاہور میں کوئی نمائش وغیرہ لگا رکھی ہے۔ یہ وہاں بھی یہ کھیڈ کرانا چاہتے ہیں۔ اگر عادی کے بجائے یہ ہمارا حبشی وہاں جائے گا تو چنگ بھلا روپیہ ملے گا۔ مشہوری علیحدہ سے ہوگی اور پھر تجھے تو پتا ہی ہے عادی کے کرتوتوں کا۔ اس کی نظریں جہاں پر جمی ہوئی ہیں تو بھی جانتا ہے۔ ہمیں کیا لوڑ ہے اسے اس معاملے میں آگے کرنے کی؟ بات سمجھ رہا ہے نامیری؟“

ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔ چودھری مختار بولا۔ ”تجھے کیا پتا ہے عادی کے بارے میں؟“

”اس نے یہی کہا تھا کہ وہ شاید قدیر کبڑا پے کے پاس جائے گا۔ قدیر بادامی باغ میں رہتا ہے۔“

”اس گل کا اور کس کو پتا ہے؟“

”میرے خیال میں چوکیدار رشیدے کے سوا اور کسی کو پتا نہیں۔“

”تو بس ٹھیک ہے جا کر رشیدے کو سمجھا دے کہ کوئی پوچھے تو بتانا کچھ نہیں۔ کسی کو بھی نہیں بتانا۔“

”ٹھیک ہے اب جی۔“

”اور دیکھ اس حبشی کو۔ ادھر ادھر ہی کہیں ہوگا۔ اس کو لہے کے لے آ۔“

چودھری مختار واپس مہمانوں کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوشیاری اور لالچ کی چمک تھی۔

پانچ دس منٹ بعد دروازہ ناصر واپس بیٹھک میں پہنچ گیا۔ اس نے والد کو بتایا کہ چوکیدار رشیدے کو بھی عادی کا کچھ پتا نہیں۔

چودھری مختار نے بیٹے سے کہا۔ ”تم ادھر مہمانوں کے پاس بیٹھو۔ میں حبشی کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔“

چودھری مختار باہر گیا۔ حبشی ایک قریبی کمرے میں

موجود تھا۔ وہ ابھی ابھی پہنچا تھا۔ اس کا قد زیادہ لمبا تھا۔ مگر جسم مضبوط اور کسرتی تھی۔ چال ڈھال میں عجیب کی طرح کی چستی اور تیزی تھی۔ وہ جدی پشتی اس گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گہرے سانولے رنگ کی وجہ سے اس کا نام حبشی پڑا تھا۔ ”خیر ہے چودھری جی! آپ نے بلایا تھا۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے چودھری کو دیکھا۔

”خیر ہی ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی خیر ہے۔ لیکن اس طرح کرنا ہے جس طرح میں کہوں۔“

”آپ حکم کرو جی۔“

”اپنی قمیص اوپر اٹھا اور منہ دو بچے پاس کر۔“

حبشی نے روبوٹ کی طرح ہدایت پر عمل کیا اور قمیص اٹھانے کے بعد منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔

چودھری مختار نے جیسے سب کچھ پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔ اس نے دروازے میں سے ایک استرا نکالا اور حبشی کی پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان دو تین انچ کا کٹ لگا دیا۔ غصے سے لگا۔ چودھری نے پرانے کپڑے سے خون پونچھا اور ایک دوسرے ملازم فحری کو آواز دی۔ چودھری کی ہدایت پر فحری ایک تھالی میں چولہے کی راکھ اور زخم پر باندھنے کے لیے کپڑے کی پٹی اور روئی وغیرہ لے آیا۔ راکھ سے خون کا رساؤ بند کیا گیا۔ پھر روئی رکھ کر بغلوں کے نیچے سے پٹی باندھ دی گئی۔ اس کے بعد حبشی نے اپنی بنیان اور قمیص جو اوپر کندھوں پر چڑھائی ہوئی تھی، نیچے گرا دی۔

پانچ دس منٹ بعد حبشی اور چودھری مختار دوبارہ بیٹھک میں مہمانوں کے پاس موجود تھے۔ ”لیس جی یہ ہے فیروز۔ ہم پیار سے اسے حبشی حبشی کہتے ہیں۔“ چودھری مختار نے رانا سیٹھ سے کہا۔ ”پھر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”چڑھائی کے مقابلے کا اصل ہیرو تو یہی ہے۔ وہ تو اس کی چوٹ کی وجہ سے مائی سکینہ کا پتر عادی آگے نکل گیا۔“

چودھری مختار حبشی کو سب کچھ سمجھا کر لایا تھا۔ دونوں مہمانوں نے حبشی سے بات چیت کی۔ حبشی نے مہمانوں کو اپنی کمر پر بندھی ہوئی پٹی بھی دکھائی اور اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

رانا سیٹھ اور کیرامین ابرار نے رات وہیں چودھری کے حویلی نما گھر میں گزاری۔ صبح وہ لالی گاؤں کے دو چار اور بندوں سے بھی ملے ان میں عادی کی ماں سکینہ بھی تھی۔ ان ملاقاتوں کے بعد رانا سیٹھ اور نادر کو یقین ہو گیا کہ عادی روزگار کے سلسلے میں لاہور یا کراچی جا چکا ہے اور فی الحال اس کا کوئی اتنا پتا نہیں اور نہ اس کا کسی سے رابطہ ہے۔

ستاروں پر کمند

”کیا مطلب؟“

”یہاں ایک جگہ کئی طرح کے مقابلے ہوتے ہیں۔ کئی طاقت دیکھنا، بھاری وزن اٹھانا، بازو چھڑانا، بازو لڑانا، پانی میں دیر تک ڈبکی لگانا وغیرہ وغیرہ..... ایسے مقابلوں پر انعام شام بھی ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی رانا کلب ہے، وہاں ہوتا ہے یہ سب کچھ۔“

”لیکن اندر جانے کی ٹکٹ بھی تو ہوتی ہوگی۔“

”یار! اگر ٹکٹ ہوگی تو واپس آ جائیں گے۔ انہوں نے کوئی پکڑ کر تھوڑا بٹھالینا ہے ہمیں۔“

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں نمائش کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے رانا کلب کے وسیع احاطے کے سامنے پہنچ گئے۔ رانا کلب کے الفاظ ایک بڑے پورڈ پر روشنیوں کی شکل میں جگمگا رہے تھے۔ اندر بھی وافر لائٹنگ کی گئی تھی۔ احاطہ تماشاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں پہنچنے ہی عادل تھوڑا سا چونکا۔ احاطے کے بیچوں بیچ درخت کے دو بلند تنے سیدھے کھڑے تھے۔ یہ خشک سمجھور کے ولے ہی تھے تھے جوشاہ نوانہ کے میدان میں پرانے وقتوں سے کڑے ہوئے تھے۔

”یہ کیا چکر ہے بھی؟“ عادل نے صادق علی سے پوچھا۔

صادق نے قریب کھڑے ایک نوجوان سے پوچھا۔

”بھائی جان! یہ سوکھے درخت یہاں کیوں کھڑے کئے گئے ہیں؟“

”بڑا زوردار مقابلہ ہوتا ہے بھی یہاں۔ زیادہ لوگ یہاں اسی مقابلے کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہیں۔“

”کس طرح کا مقابلہ ہے؟“ عادل نے پوچھا۔

”رانا کلب والوں نے تین لاکھ روپے کا نقد انعام رکھا ہوا ہے۔ ان کا بندہ صرف چودہ سیکنڈوں میں اس 36 فٹ اونچے درخت پر چڑھ کر دکھاتا ہے۔ جو اس سے کم وقت میں درخت پر چڑھے گا اسے فی الفور یہ انعام ملے گا۔ دو ہفتے ہو گئے ہیں، ابھی تک کوئی نہیں جیتا۔ بلکہ دگنے وقت والا مقابلہ بھی بس چھ سات لڑکے ہی جیتے ہوں گے۔“

”دگنے وقت والا مقابلہ؟“ عادل نے پوچھا۔

”ہاں، کلب والوں کا دوسرا چیلنج یہ ہے کہ جو بندہ دگنے وقت یعنی 28 سیکنڈ میں چڑھ کر دکھائے گا اسے پانچ ہزار روپیہ دیا جائے گا۔“

عادل کے چہرے پر دبا دبا جوش لہر لینے لگا تھا۔ اس نے جواں سال شخص سے پوچھا۔ ”کوئی ٹکٹ بھی ہے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے؟“

اس روز تو پروگرام نہیں بن سکا لیکن اگلے روز شام سات بجے کے قریب وہ دونوں اس صنعتی نمائش میں گھوم رہے تھے۔ یہاں بچوں اور بڑوں کی تفریح کے بہت سے سامان بھی موجود تھے۔ جھولے، سرکس، جادو کے کھیل وغیرہ۔ گھومتے گھومتے صادق نے کہا۔ ”اوائے عادی..... باگڑیلے! زور آزمائی کرتی ہے تو نہ؟“

وہ لوگ چودھری کے پندے، حبشی کو لاہور لے جانے پر رضامند ہو گئے۔

☆☆☆

کبڑا خانے میں کبڑا توڑتے توڑتے عادل کو بیس بیس روز ہو چکے تھے اور یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ چکی تھی کہ یہاں سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ قدیر کے روپے نے بھی اسے مایوس ہی کیا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ کوئی اور کام دیکھے۔ ان دنوں ابھی موبائل فون وغیرہ کا رواج زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ رابطے کا ذریعہ عام فون یا خط وغیرہ تھا۔ فون تو اس کے گاؤں میں تھا نہیں، آجاکے خط کا ہی سہارا تھا۔ وہ خط لکھنا جانتا تھا۔ اس نے خود ہی خط لکھ کر گاؤں کے چنے پر پوسٹ کر دیا تھا اور ماں کو بتایا تھا کہ وہ خیر خیریت سے ہے۔ باغ میں مزدوری کرنے کے باوجود اس نے میٹرک پاس کیا تھا اور اسے آگے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ گاؤں کے لڑکوں میں وہ پڑھا لکھا سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں میں جب مقامی ماسٹر صاحب نہیں ہوتے تھے، گاؤں کے لوگ عادل سے خط کے علاوہ ٹیلی گرام وغیرہ بھی پڑھوا لیتے تھے۔

کبڑا خانے میں ہی صادق نام کا ایک لڑکا اس کا دوست بن گیا تھا۔ وہ بھی یہاں کبڑا خانے میں اپنے کام سے مطمئن نہیں تھا اور یا لک قدیر کے روپے سے بھی شاک تھا۔ اس کی سوچ بھی یہی تھی کہ اسے کہیں اور قسمت آزمائی چاہیے۔

ایک دن جب وہ دونوں سارے دن کے تھکے ہارے، کبڑا خانے سے ملحقہ کھڑکی میں بیٹھے تھے اور کوڑے کرکٹ کی بو سونگ رہے تھے۔ صادق نے آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔

”عادی! یہاں ایک نمائش لگی ہوئی ہے۔ وہی جسے وہ کیا کہتے ہیں..... صنعتی نمائش، یہاں بہت طرح کے اسٹال لگے ہوتے ہیں، لوگ رنگ برنگی چیزیں بیچتے ہیں۔“

”تو وہاں جا کر کیا کریں گے۔ وہاں تو بھری ہوئی جھپول والے لوگ جاتے ہیں۔“

”یار خریدنے نہیں جائیں گے۔ دیکھنے جائیں گے۔ کیا پتا کسی چھوٹے موٹے کاروبار کا آئیڈیا ہمارے دماغ میں بھی آجائے۔“

اس روز تو پروگرام نہیں بن سکا لیکن اگلے روز شام سات بجے کے قریب وہ دونوں اس صنعتی نمائش میں گھوم رہے تھے۔ یہاں بچوں اور بڑوں کی تفریح کے بہت سے سامان بھی موجود تھے۔ جھولے، سرکس، جادو کے کھیل وغیرہ۔ گھومتے گھومتے صادق نے کہا۔ ”اوائے عادی..... باگڑیلے! زور آزمائی کرتی ہے تو نہ؟“

کبڑا خانے میں ہی صادق نام کا ایک لڑکا اس کا دوست بن گیا تھا۔ وہ بھی یہاں کبڑا خانے میں اپنے کام سے مطمئن نہیں تھا اور یا لک قدیر کے روپے سے بھی شاک تھا۔ اس کی سوچ بھی یہی تھی کہ اسے کہیں اور قسمت آزمائی چاہیے۔

ایک دن جب وہ دونوں سارے دن کے تھکے ہارے، کبڑا خانے سے ملحقہ کھڑکی میں بیٹھے تھے اور کوڑے کرکٹ کی بو سونگ رہے تھے۔ صادق نے آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔

”عادی! یہاں ایک نمائش لگی ہوئی ہے۔ وہی جسے وہ کیا کہتے ہیں..... صنعتی نمائش، یہاں بہت طرح کے اسٹال لگے ہوتے ہیں، لوگ رنگ برنگی چیزیں بیچتے ہیں۔“

”تو وہاں جا کر کیا کریں گے۔ وہاں تو بھری ہوئی جھپول والے لوگ جاتے ہیں۔“

”یار خریدنے نہیں جائیں گے۔ دیکھنے جائیں گے۔ کیا پتا کسی چھوٹے موٹے کاروبار کا آئیڈیا ہمارے دماغ میں بھی آجائے۔“

اس روز تو پروگرام نہیں بن سکا لیکن اگلے روز شام سات بجے کے قریب وہ دونوں اس صنعتی نمائش میں گھوم رہے تھے۔ یہاں بچوں اور بڑوں کی تفریح کے بہت سے سامان بھی موجود تھے۔ جھولے، سرکس، جادو کے کھیل وغیرہ۔ گھومتے گھومتے صادق نے کہا۔ ”اوائے عادی..... باگڑیلے! زور آزمائی کرتی ہے تو نہ؟“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ملکہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ☆ کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ☆ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ☆ ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ☆ کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

صرف کیا تھا یعنی چودہ اعشاریہ دس سینکڑے۔
تھوڑی سی دیر بعد ایک نوجوان قسمت آزمائی کے
لئے میدان میں آگیا۔ یہ کوئی کالج اسٹوڈنٹ تھا اور
جمناسٹک کرتا تھا۔ بہر حال جمناسٹک ایک علیحدہ چیز ہے۔
مجموعہ کے کمرے درخت پر ہاتھ پاؤں کی مدد سے چڑھنا
ایک دیگر بات۔ اس نوجوان نے پہلے آزمائش کے طور پر
درخت پر تھوڑی سی چڑھائی کی، پھر اصل مقابلہ شروع ہوا۔
وہ تنے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک گھنٹہ یا
چوٹ پڑی، اس کے ساتھ ہی نوجوان نے اوپر چڑھنا
شروع کر دیا۔ جمناسٹک کا کھلاڑی ہونے کے باوجود وہ
دگنے وقت والا مقابلہ بھی نہیں جیت سکا۔ اس نے درخت
کے آخری سرے تک پہنچے اور ہاتھ مار کر سرخ جھنڈی بچے
گرنے میں تقریباً تیس سینکڑے لگائے۔
یہ منظر دیکھنے کے بعد عادل کا جوش سوا ہو گیا۔ اس
نے صادق کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم اس
مقابلے میں حصہ لیں گے۔ میرے پاس ڈھائی سو روپے
ہے۔ پچاس روپے دو، ہم ٹکٹ لیتے ہیں۔“
کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد صادق نے
پچاس روپے عادل کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ان کے ارد گرد
موجود لوگ مختلف تبصروں میں مصروف تھے۔ بہت سے
ایسے تھے جو ناقابل یقین نظروں سے چودہ اعشاریہ دس کے
نکڑ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ اپنی آنکھوں سے چودہ
اعشاریہ دس والی کارکردگی دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔
عادل نے تنے کی بلندی دیکھ لی تھی اور باقی ساری صورت
حال بھی بھانپ لی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ یہ
چودہ اعشاریہ دس سینکڑے والا ریکارڈ توڑ لے گا۔ تو کیا واقعی
اسے وعدے کے مطابق تین لاکھ روپے انعام دے دیا
جائے گا؟ کیا کلب والے، حسب اندیشہ، کوئی کھپلا شکار
دیں گے؟ بہر حال اطمینان کی بات یہ تھی کہ یہاں کافی لوگ
موجود تھے اور ایک دو نوگرافرز پر بھی عادل کی نظر پڑی
تھی۔ صادق نے بتایا تھا کہ یہ اخباری نوگرافر ہیں۔
اچانک ایک ہاتھ عادل کے کندھے پر آیا اور وہ بڑی
طرح چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ اس
کے سامنے چودھری عتار کا بیٹا چھوٹا چودھری ناصر کھڑا تھا۔
”چودھری ناصر! تم یہاں؟“ عادل نے حیران ہو کر کہا۔
”ہاں..... ہاں، آؤ میرے ساتھ۔“ دراز قد ناصر
نے جواب دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جھوم سے باہر نکلنا شروع
کر دیا۔ عادل نے صادق کو بھی اشارہ کر دیا۔ وہ بھی اس

”تین سو روپے۔ کافی سارا روپیہ تو یہ لوگ ٹکٹوں پر ہی
کما چکے ہوں گے۔ اس کے علاوہ شرطیں وغیرہ بھی لگتی ہوں۔
پرسوں ملتان سے دوڑ کے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے
کافی سخت مقابلہ کیا ہے کلب کے لڑکے سے..... پر جیت
نہیں سکے۔“
عادل اپنے دوست صادق کو ایک طرف لے گیا۔
بڑے اعتماد سے بولا۔ ”صادق! مجھے لگتا ہے میں یہ کام کر سکتا
ہوں۔ ادھر ہمارے گاؤں کے پاس شاہ نوانہ میں بھی ایسی
کھیڑ ہوتی ہے، پرانے وقتوں سے ہو رہی ہے۔ اس کو
چڑھائی کہتے ہیں۔ ابھی کوئی ایک مہینہ پہلے میں نے پہلے میں
یہ مقابلہ جیتا ہے۔ پورے دو ہزار کا انعام ملا تھا مجھے۔“
”پر یہ تیرا گاؤں نہیں شہر ہے باگڑ بلے! کلب والوں
کا کھلاڑی کوئی ایویں شیویں تو نہیں ہو گا نا۔ یہ نہ ہو کہ خواخواہ
تین سو روپے برباد ہو جائے ہمارا۔“
”نہیں ہو گا یار! تجھے کہا ہے نا میں جیت کر دکھا سکتا
ہوں اور اگر نہ بھی ہوا تو..... دگنے وقت والا مقابلہ تو سمجھو
اپنی جیب میں ہے۔ دگنے وقت کا پانچ ہزار بتایا ہے نا اس
بندے نے؟“
صادق نے اثبات میں سر ہلایا اور پرسوج لہجے میں
بولا۔ ”اچھا ایسے کر۔ پہلے ایک آدھ مقابلہ دیکھ لے۔ پھر
تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ویسے مجھے
نہیں لگتا کہ یہ لوگ آسانی سے کسی کو جیتنے دیتے ہوں گے۔“
عادل اور صادق کچھ اور آگے چلے گئے۔ احاطے میں
داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں تھا..... لوگ باہر کھڑے ہو کر
بھی یہ تماشا دیکھ سکتے تھے۔ بہر حال یہ دونوں جھوم میں گھس
کر درختوں کے کچھ اور قریب ہو گئے۔ کلب کے احاطے
میں زور آزمائی کے دیگر مظاہرے بھی جاری تھے۔ کچھ
تونمند نوجوان ایک طرف ویٹ لفٹنگ میں مشغول تھے۔
کھلاڑیوں کے حامی نعرے بازی کر رہے تھے۔ ایک
جانب ہاتھ کی گرفت کا زور ناپنے والی بڑی سی مشین پڑی تھی
اور نوجوانوں کی ایک ٹولی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ اس
طرح کی دیگر مصروفیات بھی تھیں لیکن لوگوں کی اصل توجہ
اسی مجموعہ کے تنوں والے کھیل کی طرف تھی۔ تنوں کے پیچھے
دائیں طرف ایک بڑا کلاک تھا۔ یہ کلاک چودہ پندرہ فٹ
اونچے پول پر نصب تھا اور اس پر چودہ اعشاریہ دس کا ہندسہ
روشنیوں کی صورت میں جگمگا رہا تھا۔ یہ دراصل ایک ڈیجیٹل
اسٹاپ واچ تھی۔ اس اسٹاپ واچ پر وہ ریکارڈ ٹائم درج تھا
جو کلب کے کھلاڑی نے 36 فٹ اونچے تنے پر چڑھنے میں

کا جواب دو۔ جیسی کو ہر لوگ..... اس کا نام وہاں سامنے لکھا ہوا ہے گھڑی پر قریباً 14 سیکنڈ۔“

عادل نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”اگر یہ جیسی کا نام ہی ہے تو میں اس سے کم وقت میں چڑھ کر دکھا دوں گا جی۔“

”ٹھیک ہے، دیکھ لیتے ہیں۔“ رانا سیٹھ نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد عادل کھلے میدان میں جیسی کا ریکارڈ توڑنے کے لیے تیار تھا۔ چھوٹا چودھری ناصر اور جیسی بھی وہاں موجود تھے۔ چھوٹے چودھری ناصر کی آنکھوں میں ناراضی تھی۔ جیسی بھی ٹیکسی نظروں سے عادل کو گھور رہا تھا۔ چودھری ناصر کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اندر سے کھول رہا ہے اور اگر اسے موقع ملے تو وہ بھی جیسی عادل کو اس مقابلے میں حصہ نہ لینے دے۔ بہر حال رانا سیٹھ کی موجودگی میں وہ چپ رہنے پر مجبور تھا۔

تین چار سو تماشائیوں اور میڈیا والوں کی موجودگی میں عادل نے چند منٹ کے لیے خود کو ”وارم اپ“ کیا اور پھر چڑھائی کے لیے تیار ہو گیا۔ حسب معمول گھڑیاں پر چوٹ پڑی اور عادل نے پھرتی سے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ اسٹاپ واچ کے ہندسے بھی تیزی سے متحرک ہو گئے۔ تماشائی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ جب عادل نے تقریباً 36 فٹ کی بلندی پر جا کر سرخ جھنڈی نیچے گرائی تو اسٹاپ واچ بارہ اعشاریہ دس سیکنڈ پر رک گئی۔ عادل نے جیسی کے ریکارڈ نام سے پورے دو سیکنڈ کم وقت لیا تھا۔ قرب وجوار تالیوں اور حوصلہ افزائی کی آوازوں سے گوج اٹھے۔ عادل نے نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ساتھی صادق خوشی سے چلا رہا تھا اور اچھل رہا تھا۔ کیراٹین ابرار اور رانا سیٹھ کے چہرے بھی جوش سے تھمٹائے ہوئے تھے۔ وہ نیچے اترتے لوگوں نے اس پر شاباشی ٹھیکوں کی بارش کر دی۔ صادق نے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر اسے کندھوں پر اٹھالیا۔

عادل نے اسی پر بس نہیں کیا۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے ایک بار پھر ثرائی کیا۔ اس دفعہ اس کی رفتار مزید بہتر ہوئی۔ اس نے تقریباً ایک سیکنڈ مزید کم وقت لیا۔ اب اس کا ریکارڈ گیارہ اعشاریہ پندرہ سیکنڈ تھا۔ ہندسے جگمگا رہے تھے اور جیسے خاموشی کی زبان میں پکار رہے تھے ہاتھ نکلن کو آرسی نہیں۔ اگر کسی میں اس سے زیادہ دم ہے تو آئے اور کر کے دکھائے۔

عادل نے دیکھا۔ فیروز عرف جیسی واضح طور پر

کھیل تماشوں کی وڈیو بناتا رہا تھا۔ عادل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ناصر اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو یا گفتگو کا کچھ حصہ سن لیا ہے۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ وہ عادل سے معاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے پہچان لیا ہے جیسی تمہیں۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ یہاں اتنے بڑے شہر میں تم سے ایسے اچانک ملاقات ہو جائے گی۔ زبردست..... ونڈرفل۔“

عادل نے دیکھا، چودھری ناصر کا رنگ پیکا پڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کیراٹین نے عادل کی کھائی پکڑی اور بولا۔ ”آؤ تمہیں رانا صاحب سے ملاؤں، بڑا خوش ہوں گے۔“

وہ عادل کو اپنے ساتھ لیتا چلا گیا۔ عادل نے سوالیہ نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ ناصر جیسے کچھ نہیں پارہا تھا کہ اس موقع پر کیا کرے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا، کیراٹین اسے کھینچتا ہوا کلب کے عارضی دفتر کی طرف لے آیا۔

دو منٹ بعد عادل، شامیانے کے سچے سجائے دفتر کے اندر ایک فریہ اندام نیم گھنے شخص کے رو برو کھڑا تھا۔ کیراٹین اس کا تعارف کراتے ہوئے نیم گھنے شخص سے کہہ رہا تھا۔ ”رانا صاحب! یہی ہے وہ لڑکا جسے آپ نے وڈیو میں دیکھا تھا۔ یہ آج کل یہاں بادامی باغ میں کباڑے کا کام کر رہا ہے۔ بس اتفاق ہی ہے کہ یہاں نمائش میں چلا آیا ہے۔“

رانا صاحب نے عادل کو سر تاپا دیکھا اور ان کی آنکھوں میں تعریف کی جھلک نظر آئی۔ عادے کا سراپا واقعی متاثر کرنے والا تھا۔ اس کی سب سے اہم جسمانی خصوصیت اس کا کشادہ سینہ اور غیر معمولی پٹی کمر تھی۔ کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے جسم میں بہترین اٹلیٹس والی ٹیک اور سبک روی ہے۔ کیراٹین چند قدم چل کر رانا سیٹھ کے قریب پہنچا پھر منسوب انداز میں جھک کر ان کے کان میں ایک طویل سرگوشی کی۔ رانا سیٹھ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ اس سرگوشی کا تعلق شاید چودھری ناصر اور اس کے رویے سے ہے۔

رانا سیٹھ نے عادل کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ عادل جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔ رانا سیٹھ بولا۔ ”جیسی کو ہر اسکتے ہو تم؟“

”ہرانے کو تو..... ہر اسکتا ہوں..... لیکن..... وہ چودھری ناصر کہہ رہا تھا کہ.....“

”چودھری ناصر کو چھوڑ دو تم..... جو میں کہہ رہا ہوں اس

لوگ ان کو ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں ایک کام ہو سکتا ہے۔“ آخر میں ناصر نے ذرا پرسوج انداز میں کہا۔

عادل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

ناصر بولا۔ ”رانا صاحب نے دو ڈھائی سیٹے پھر فیصل آباد کی نمائش میں بھی اپنا کلب لے کر جانا ہے۔ انہیں نے وہاں یہ آٹم رکھا تو پھر تم اس میں حصہ لے لیتا۔“

وہاں شامیانوں کے عقب میں کھڑے کھڑے ناصر اور عادل میں قریباً بیس پچیس منٹ بات ہوئی۔ اس گفتگو لب لباب یہی تھا کہ فی الوقت عادل سامنے نہیں آ سکتا۔ بلکہ آئندہ اسے یہاں نمائش میں ہی نہیں آنا چاہیے۔ ناصر نے اسے یہ عندیہ بھی دیا کہ وہ یہاں قدیر کباڑے کی نوکری وغیرہ چھوڑ دے اور پرسور چلا جائے۔ وہاں اس کا کوئی دوست فٹ بال وغیرہ بنانے کا کام کرتا تھا اور ناصر کی سفارش پر عادے کو مناسب اور مستقل ملازمت مل سکتی تھی۔ آخر میں ناصر نے یہ بھی کہا۔ ”پھر اگر تم نے سیالکوٹ والی نمائش میں حصہ لینا ہوا تو تمہیں آسانی رہے گی۔ تم پرسور سے سیالکوٹ دو گھنٹے میں آ جاسکتے ہو۔“

عادل شہر میں نیا نیا ضرور آیا تھا مگر اتنا بھولا بھی نہیں تھا کہ ناصر کی باتوں کا مطلب نہ سمجھتا۔ ناصر فی الحال اسے اس نمائش اور کلب سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی پچھلے چند ماہ سے ناصر اسے بڑی کڑی نظروں سے دیکھتا تھا۔ عادل کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ تا یا فراست کے گھرانے سے چودھری مختار کے بڑے بچے رابطے ہیں۔ کئی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ چودھری مختار اپنے بیٹے ناصر کے لیے فراست کی بیٹی شہزادی کا رشتہ لینا چاہتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ ناصر کو شہزادی اور عادل کے حوالے سے ٹھوڑا بہت شک بھی ہو چکا ہو۔ دلی دلی باتیں تو گاؤں میں گردش کرتی ہی رہتی تھیں۔ گفتگو ختم کرنے سے پہلے ناصر نے عادل سے کہا۔

”اب کہاں جانا ہے تم نے؟“

”واپس بادامی باغ ہی جاؤں گا۔“

”چلو پھر میں رانا کے ڈرائیور سے کہتا ہوں، وہ تمہیں

چھوڑ آئے۔ اس نے بھی ادھر یا دگر کی طرف ہی جانا ہے۔“

ہاں..... مگر کل ہماری ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔ ڈرائیور تمہارا

ٹھکانا دیکھ لے گا۔ میں کل وہیں آ جاؤں گا۔“ پرسور والی نوکری

کے بارے میں تفصیل سے کل بات کر لیں گے۔“

اچانک سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ ایک بندہ خیمے کی

اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ عادل نے پہچان لیا۔ یہ وہی

کیراٹین تھا جو چند ہفتے پہلے شاہ نوانہ کے میلے میں آیا تھا اور

کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ تینوں ایک بڑے شامیانے کے پیچھے نیم تاریکی میں کھڑے تھے۔

”تم یہاں کیسے عادے؟“ ناصر نے پوچھا۔

”بس نمائش دیکھنے کے لیے آ گیا۔ تمہیں بتایا تھا

ناکہ یہاں بادامی باغ میں قدیر کے پاس ٹھہرتا ہے۔“

”ہاں بتایا تو تھا تو نے.....“ ناصر نے کہا۔ وہ کچھ

گھبرایا اور شیشا یا سانظر آ رہا تھا۔

عادل نے کہا۔ ”تم نے دیکھا ناصر بھائی! یہ ویسا ہی

مقابلہ ہے جیسا ہمارے گاؤں میں ”چڑھائی مقابلہ“ ہوتا

ہے۔ کیا پتا کسی نے وہیں میلے میں یہ سارا تماشا دیکھا ہو اور

یہاں بھی شروع کر دیا ہو۔“

ناصر خاموش رہا۔

عادل نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”ناصر بھائی! یہاں

پورے تین لاکھ کا انعام ہے..... اور..... اور مجھے لگتا ہے کہ

میں کوشش کروں تو یہ جیت سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

ناصر نے مسکرا کر کہا۔ ”خیال تو صحیح ہے لیکن اصل

بات کا تمہیں پتا نہیں۔“

”کیا مطلب ناصر بھائی؟“

”یہاں یہ سارا بکھیرا میں نے ہی پالا ہوا ہے۔ کلب

کا مالک رانا سیٹھ یار ہے اپنا۔ وہی ادھر گاؤں گیا تھا۔ اسے

یہ کھینچ پسند آئی تھی۔ کوئی وڈیو شیڈیو دیکھی تھی اس نے۔“

عادل کے ہونٹ بے ساختہ دائرے کی شکل میں سکڑ

گئے۔ چودھری ناصر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”یہاں ہم جیسی سے کام لے رہے ہیں۔ اس نے رانا سیٹھ

کی مرضی کے مطابق کام کیا ہے۔ رانا سیٹھ خوش ہے اس

سے۔ لوگ بھی اس کے کام کو پسند کر رہے ہیں۔ وہ دیکھو

پیچھے..... وہ تصویر لگی ہے اس کی۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے

ہر روز دھڑا دھڑ یہاں پہنچتے ہیں۔“

ایک طرف پندرہ بیس فٹ اونچے کھمبے پر فیروز عرف

جیسی کی بڑی سی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی انگلیوں

سے ”وی“ بنائی ہوئی تھی اور چیلنج کرنے والے انداز

میں کھڑا تھا۔ عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن

ناصر بھائی! تم تو جانتے ہو میں جیسی کو آسانی کے ساتھ ہرا چکا

ہوں۔ میں یہاں کے لوگوں کو اور زیادہ حیران کر سکتا ہوں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو عادے! لیکن..... مسئلہ یہ ہے

کہ اب لوگ یہاں صرف جیسی کو دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔

وہ کیا کہتے ہیں کہ اس کی مارکیٹ بن گئی ہے اب..... وہ جس

طرح فلم ایکٹروں کی مارکیٹ نہیں بنتی؟ پھر وہ جیسے بھی ہوں

پڑ مردہ دکھائی دیتا تھا۔ ناصر کی ہلاشیری پر اس نے خود کو گرم کیا اور خود کو پیش میں لا کر اپنا وقت بہتر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا یا مگر اپنے ریکارڈ میں چوتھائی سیکنڈ کی معمولی سی بہتری ہی لاسکا۔ سیکڑوں لوگوں کے سامنے رانا سیٹھ نے عادل کی کلائی اپنے ہاتھ میں پکڑی اور اس کا بازو ہوا میں بلند کر کے اس کی فتح کا اعلان کیا۔

اس موقع پر بہ ظاہر چھوٹا چودھری ناصر بھی خوش نظر آیا اور اس نے عادل کو مبارک باد دی لیکن عادل کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اندر سے چودھری ناصر بری طرح تپا ہوا ہے۔ یہ دو تین گھنٹے عادل کے لیے ”کایا پلٹ“ ثابت ہوئے تھے۔ وہ جیب میں ڈھائی تین سو روپیہ لے کر نمائش دیکھنے کے لیے آیا تھا مگر اب اس کے کندھے پر آنا فانا رانا سیٹھ کا ہاتھ آ گیا تھا۔ رانا کے ملازم اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ رانا سیٹھ نے مسکراتے ہوئے عادل کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ظاہر ہے بھی اعلان شدہ انعام تو تمہیں نہیں ملے گا کیونکہ تم اپنی ہی فیلڈ کے بندے ہو لیکن میں اپنی طرف سے تمہیں تیس ہزار کا نقد انعام دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ تمہیں فوری ملازمت کی بھی آفر ہے۔ تیس ہزار روپے ماہانہ۔ کھانا رہائش اور دیگر سہولتیں کلب کے ذمے۔ اس کے علاوہ ترقی کے بھی پورے پورے موقعے موجود ہیں۔“

”لیکن مجھے کرنا کیا ہوگا سیٹھ صاحب؟“

”یہی جو ابھی کر کے دکھایا ہے۔ اور یہ بھی روز تو نہیں۔ جب بھی ضرورت پڑے گی۔ آرام زیادہ کام کم۔۔۔۔۔“ سیٹھ پھر مسکرایا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کاروباری چمک تھی۔

عادل نے کن آنکھوں سے چھوٹے چودھری ناصر کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا مگر عادل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس سپاٹ چہرے کے پیچھے گہری کدورت موجود ہے۔ عادل کو خاموش پا کر صادق نے اسے پیچھے سے شہوکا دیا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ کیا حماقت فرما رہا ہے، فوراً آفر قبول کرے۔

عادل نے آفر قبول کر لی۔

”کب سے شروع کرو گے؟“ رانا سیٹھ نے پوچھا۔

”کل ہی حاضر ہو جاؤں گا جی۔ یہاں بادامی باغ میں میرا کچھ سامان پڑا ہے۔ وہ لانا ہے اور ایک دودوستوں سے ملتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، کل شام تک پہنچ جاؤ۔“ سیٹھ نے کہا پھر جیٹی اور چودھری ناصر کی طرف دیکھ کر ان کی اٹک شوٹی

کے لیے بولا۔ ”چودھری ناصر! تمہارے بندے کی ملازمت بھی برقرار ہے بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کی موجودگی سے مقابلے کا ماحول پیدا ہوگا اور مقابلے کا ماحول کسی بھی کام کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔“

لیکن اگلے چند گھنٹے کے اندر ”مقابلے کا یہ ماحول“ کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گیا۔ عادل اور صادق نمائش سے بادامی باغ واپس آ گئے۔ اپنے دوست کی کامیابی پر صادق بھی بہت خوش تھا۔ اسے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ عادل کی اچھی ملازمت کی وجہ سے اسے بھی رانا سیٹھ کے پاس کوئی ڈھنگ کا کام مل جائے گا۔ اپنی کپڑا خانے والی کوٹھری میں بیٹھ کر دونوں دوست لوہے کی آنکھیں پڑا ہاتھ سینکتے رہے اور اس حیران کن کایا کلب کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ پھر صادق تو سو گیا لیکن عادل جاگتا رہا۔ رانا سیٹھ نے اسے تیس ہزار روپے نقد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ماہانہ تیس ہزار کی نوکری تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آنا فانا یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ اسے ماں اور شہزادی دونوں شدت سے یاد آئیں۔ اس کا جی چاہا، شہزادی اس کے سامنے ہو۔ وہ اسے بتائے کہ اس نے سپنوں کی منزل کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ اس سفر کو تیز سے تیز کرے گا، اور اس کی محبت کی دی ہوئی طاقت سے منزل پر پہنچ کر دکھائے گا۔ اس نے تصور ہی تصور میں دیکھا کہ شہزادی نے یہ باتیں سنی ہیں۔۔۔۔۔ وہ شرمائی ہے اور اس نے ذرا آگے جھک کر اپنی پیشانی اس کے سینے سے لگا دی ہے، اس نے شہزادی کو بانہوں میں لے لیا ہے۔

اچانک عادل کو اپنے تصورات سے باہر آنا پڑا۔ کوٹھری کے دروازے سے باہر آئیں ستائیس دیں اور پھر زوردار دستک ہوئی۔ یہ رات قریباً دو بجے کا وقت تھا۔ ”کون ہے؟“ عادل نے لحاف سے سر نکالتے ہوئے پوچھا۔

”دروازہ کھول عا دے۔“ باہر سے چھوٹے چودھری ناصر کی بھاری آواز سنائی دی۔

”یا اللہ خیر“ عادل نے دل ہی دل میں کہا اور چارپائی سے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ اس دوران میں صادق بھی جاگ گیا تھا۔ دروازہ چودھری ناصر تک پہنچنے کی طرح اندر داخل ہوا۔ جیٹی کے علاوہ ایک اور ہٹا کٹا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ بھی ناصر کے یا تو ملازموں میں سے تھا۔ صادق نے لائین کی لو اوچی کی۔ ناصر نے کینہ توڑ نظروں سے عادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کہا تھا عا دے! اس معاملے میں نہ آ۔ تو نے اپنی من مانی کی ہے۔“

”کیا چاہتا ہے تو؟ کمر لے گا ہم سے۔۔۔۔۔؟“

”اللہ معاف کرے ناصر بھائی! میں اپنے چودھریوں سے ٹکر لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے جو کچھ ہوا ہے میری مرضی کے بغیر ہوا ہے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔“

”اچھا، سیٹھ صاحب نے تجھے بولنے ہی نہیں دیا۔ لیکن اب تو سیٹھ یہاں نہیں ہے نا۔ اب تو تو ”اپنی مرضی“ چلا سکتا ہے نا۔ بتا اب کیا کرنا ہے؟“

”میں کچھ سمجھا نہیں ناصر بھائی۔“

”دیکھ عا دے! تو اتنا کا کا نہیں ہے۔ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور پہچان بھی رہا ہے۔ جس طرح تو سوچ رہا ہے اس طرح کام چلے گا نہیں۔ جیٹی کی ناکامی ہماری بدنامی ہے۔ تجھے پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ میں نے تجھے کل ہی کہا تھا۔ چپ کر کے پرسور چلا جا۔ میں نے ادھر اپنے دوست سے کل کر لی ہے۔ تجھے کئی نوکری مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر میں تجھے کوئی ٹھکانا بھی لے دوں۔ وہاں فٹ بال کا بہت زیادہ کام ہے۔ گیند اور بلا وغیرہ بھی بنتے ہیں۔“

عادل نے چند لمحوں سوچا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”پر ناصر بھائی! اب تو سیٹھ صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ میں تمہارے سامنے ہی زبان دے چکا ہوں ان کو۔“

”یعنی تو نہیں جائے گا۔“ ناصر کی آنکھوں میں انکار سے دھک اٹھے۔

”ناصر بھائی! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ میں بھی تو تمہارے ہی پنڈ کا بندہ ہوں۔ اگر مجھے کچھ کامیابی ملے گی تو وہ بھی تمہاری ہی کامیابی ہے۔ چودھری مختار صاحب کی کامیابی ہے، بات تو ایک ہی ہے جیٹی نہ سہی میں سہی۔“

”دیکھ عا دے! زیادہ باتیں نہ بنا۔“ ناصر نے آنکھیں نکالیں۔ ”مجھ سے دوحرفی گل کر۔ تو نے یہاں سے جانا ہے یا نہیں۔“

عادل ذرا سنبھل کر بولا۔ ”ناصر بھائی! تم کیوں مجھے پیچھے رکھنا چاہ رہے ہو۔ ادھر سیٹھ کے بندے ابرار نے مجھے بتایا ہے کہ وہ لوگ میرا پوچھنے کے لیے پنڈ گئے تھے مگر تم نے اور بڑے چودھری جی نے میرا پتا دینے سے انکار کر دیا۔ کہہ دیا کہ عا دالا ہو یا کراچی میں ہے اور اس کی کچھ خبر نہیں۔ حالانکہ میں تمہیں پورا پتا دے کر گیا تھا۔“

”وہ پتا کم ہو گیا تھا چودھری صاحب سے۔“ جیٹی نے آنکھیں نکال کر کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ایسے نہیں مانے گا تو؟“ ناصر کا

لہجہ زہر ناک ہو گیا۔ ”اپنی ماں کی طرح اڑیل ہے تو۔۔۔۔۔ پورا پورا اڑیل ہے۔“

عادل کے سینے میں شعلے بھڑک اٹھے۔ ”دیکھو چودھری! میری ماں کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔“

چودھری زہر خند لہجے میں گویا ہوا۔ ”لو جیٹی، سلطان راہی جاگ گیا ہے اس کے اندر۔ اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ ایسی سچی کھری ماں ملتی بھی کہاں سے ہے۔ نہ ہی ایسا پتر کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ دونوں جھونپڑے میں بیٹھ کر حوٹیلوں اور جاگیروں کے سند سنے دیکھ رہے ہیں۔ ماں گر سکھا رہی ہے اور پتر عشق پیچ لڑا کر بتایا کہ گھر میں سن (نقشب) لگانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ پر یہ گندی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی عا دے پتر۔ خود بھی جوتے کھائے گا اور ماں کو بھی پڑوائے گا۔“

ناصر کی آنکھوں میں غضب کے شعلے تھے۔ اب عادل کے لیے مزید سہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ چودھری ناصر پر جا پڑا۔ وہ جیسے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے ٹانگ رسی کی۔ وہ اچنتی سی عادل کے سینے پر پڑی۔ مگر یہ ضرب عادل کو روکنے میں ناکام رہی۔ وہ سیدھا چودھری ناصر پر آیا اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا چارپائی پر گرا۔ چارپائی ٹوٹ گئی۔ عادل کا بھرپور گھونسا چودھری ناصر کے منہ پر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا گھونسا مارتا عقب سے جیٹی نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا اور ایک دھاڑ کے ساتھ اسے ہوا میں اٹھانے کی کوشش کی۔ عادل نے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر ناصر کے منہ پر ماریں اور اسے پھر سے زمیں بوس کر دیا۔ جیٹی اسے چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھا۔ عادل نے اپنے سر کے عقبی حصے سے اس کی ناک پر ضرب رسید کی لیکن وہ سہ گیا۔

عادل بچپن سے ہی لڑائی بھڑائی کا شوقین تھا۔ خالی ہاتھ دو تین بندوں سے نبٹ لیتا اس کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا انتہائی لچک دار اور سبک جسم بنا ہی بار دھاڑ کے لیے ہے، مگر یہاں صورت حال اچانک ہی گمبھیر ہو گئی تھی۔ جیٹی کے ساتھ ہی ہٹا کٹا جابھی عادل پر جھپٹ پڑا۔ اب عادل کے دوست صادق نے بھی اس لڑائی میں کودنا ضروری سمجھا۔ اس نے عادل کو جیٹی سے چھڑانے کے لیے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور پورے زور سے کھینچنے لگا۔ اس دوران میں تاجے نے اپنی کہنی کی ایسی شدید ضرب صادق کو لگائی کہ اس کا جیڑا ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ نیم جان سا ہو کر گمٹ گمٹھی پر گرا اور ادھ

بجھے انگارے چاروں طرف بکھر گئے۔ چودھری ناصر سمیت تینوں افراد نے اب عادے کو دیوچ لیا تھا۔ ”حرامزادے، کتے، ہمارے نگڑوں پر ملنے والے“ چودھری ناصر پھنکارا اور عادل کے چہرے پر گھونٹے رسید کرنے لگا۔ عادل نے ایک بار پھر زور مارا۔ وہ جھشی کی گرفت سے قریباً نکل ہی گیا تھا مگر تاج نے چار پائی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی، وہ اوندھے منہ گر گیا۔ چند ادھ بجھے انگارے اس کے سینے اور بازوؤں پر برچیوں کی طرح چبھے۔ ”ہڈیاں توڑ دو حرامی کی“ چودھری ناصر دھاڑا۔ اس کی ساری اندرونی نفرت اور کدورت اب شیش ناگ کی طرح پھن پھیلا کر باہر نکل آئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ عادل کو ایانچ کرنے کے چکر میں ہے۔

دھاچوٹڑی کی آوازوں سے کباڑ خانے کے دو دیگر ملازم بھی جاگ گئے تھے۔ غالباً ان کی آوازوں نے ہی ڈھلائی کے کارخانے میں سوئے ورکروں کو بھی جگا دیا۔ کئی افراد بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ وہ چودھری ناصر اور اس کے کارندوں کو عادل سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ ناصر وغیرہ پر ٹوٹ بھی پڑتے لیکن تب تک ہٹا کٹنا بد معاش تا جا اپنی نہیں کے نیچے سے بٹن سے کھلنے والا چاقو نکال چکا تھا۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ اگر اندر آنے والے افراد نے لڑائی میں شرکت کی کوشش کی تو وہ چاقو کا بے دریغ استعمال کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندر آنے والے افراد صرف بچ بچاؤ تک محدود رہے۔ گلی کا چوکیدار اور چند مزید افراد بھی اندر آ گئے۔ کچھ لوگوں نے معزوب عادل کو گھیر لیا۔ کچھ چودھری ناصر اور اس کے کارندوں کو دھکیل دھکال کر کوشٹری سے باہر لے گئے۔ یہ لڑائی کسی بڑے سانحے میں تبدیل ہونے سے بچ گئی۔ صادق کا جیڑا ٹوٹ چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ دبائے کوشٹری کے نیم پختہ فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

معاملہ تھانے پکھری تک پہنچ سکتا تھا لیکن رانا سیٹھ بچ میں کودا..... اس نے کوشش کر کے اس گرما گرمی کو ٹھنڈا کیا۔ عادل کے کباڑیے دوست نے بھی (جواب کارخانے دار بھی تھا) بچ بچاؤ میں کردار ادا کیا۔ یہ لوگ ایک دو معزز بندوں کے ساتھ لالی گاؤں بھی گئے اور چودھری بخار کے ساتھ مل کر صلح صفائی کرائی۔ عادل کا ساتھی صادق میو اسپتال کے ہڈی وارڈ میں زیر علاج تھا۔ اس کے جیڑے کا علاج ہو رہا تھا۔ اس سارے واقعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جھشی، رانا سیٹھ کی

ملازمت چھوڑ کر گاؤں واپس چلا گیا۔ چھوٹے چودھری ناصر اور رانا سیٹھ کے تعلقات بھی تقریباً ختم ہو گئے۔ بہر حال عادل اور چھوٹے چودھری ناصر کی دبی دبی دشمنی میں جو پچھاریاں بھڑکی تھیں وہ بد دستور چمکتی رہیں۔ عادل کو بڑی اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ پچھاریاں جلد یا بدیر پھر سے شعلہ بنیں گی اور ان کی پیش کسی نہ کسی شکل میں اس تک پہنچے گی۔ ایک دن رانا سیٹھ کے دفتر میں چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے عادل نے مؤدب انداز میں کہا۔ ”سیٹھ جی! میں سمجھتا ہوں کہ اب میری ماں کا وہاں گاؤں میں رہنا ٹھیک نہیں۔ چودھری اسے کسی نہ کسی طرح پریشان ضرور کریں گے۔ وہ بوڑھی جان ہے۔ پہلے ہی صدموں کی ماری ہوئی ہے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“

”کیا کوئی ایسا انتظام ہو سکتا ہے کہ میں ماں کو یہاں لاہور لے آؤں۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا گھر مل جائے۔“ رانا سیٹھ نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور ناک سے دھواں چھوڑ کر بولا۔ ”اچھا، میں کوشش کروں گا کہ ایسا ہو سکے لیکن..... لیکن تمہاری ماں کو تو پھر بھی زیادہ تر اکیلا ہی رہنا پڑے گا کیونکہ ہم تو مختلف نمائشوں میں شرکت کرتی ہوتی ہے۔ ادھر سے ادھر سفر کرتے ہی رہنا ہوتا ہے ہم نے کیا تمہارا کوئی اور ایسا رشتے دار نہیں جو کسی دوسرے گاؤں میں یا شہر میں تمہاری والدہ کو رکھ سکے؟“

عادل نے کہا۔ ”نہیں سیٹھ جی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، ہمارے سارے رشتے دار کھاتے بیٹے لوگ ہیں اور..... غریب رشتے داروں سے میل جول رکھنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔“

”گھبراؤ نا۔ بہت جلد تم اتنے غریب نہیں رہو گے۔“ رانا سیٹھ نے اس کا کندھا چپکتے ہوئے کہا۔ ”میں ہر طرح کی محنت کو تیار ہوں سیٹھ جی۔ کلب کا کام تو شام کے بعد ہی ہوتا ہے، سارا دن تو فارغ ہوتا ہوں۔ آپ بے شک کوئی اور کام بھی میرے ذمے لگا دیں۔“

سخت مقابلہ کرے گا تمہارا۔ ان لوگوں نے کہیں اخبار میں خبر پڑھی ہے، ہمارے اس چڑھائی والے آئٹم کی اور انعام کا بھی پتا چلا ہے ان کو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ انعام اب چار لاکھ کر دیا ہے ہم نے۔ چار لاکھ کا معاملہ ہے اور عزت بے عزتی کا بھی۔“ سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں جی۔ میں جان لڑا دوں گا۔“

عادل نے واقعی اس مقابلے میں جان لڑادی۔ یہ مقابلہ سات آٹھ روز بعد ہوا۔ سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ اخباری نمائندے اور ٹی وی کے دو چار رپورٹرز بھی آئے ہوئے تھے۔ کھجور کے دونوں تنوں کے ارد گرد سیکڑوں تماشاخی منتظر تھے۔ پورا احاطہ روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ رانا سیٹھ نے عادل کو کھل کر تو نہیں بتایا تھا لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس مقابلے پر موٹی رقموں کی شرطیں وغیرہ بھی لگائی گئی ہیں۔ عادل کا مد مقابل لڑکا اپنے سائیں اور کچھ دیگر لوگوں کے ہمراہ یہاں پہنچا تھا۔ وہ گہری گندی رنگت والا چہرے بدن کا تھا۔ سنا تھا کہ وہ درخت پر چڑھنے کے علاوہ بلندی سے پکی زمین پر چھلانگ لگانے اور تھپے ہوئے رے پر چلنے جیسے کاموں میں بھی ماہر ہے۔ اس لڑکے نے واقعی خوب مقابلہ کیا۔ پہلی چڑھائی میں تو اس نے عادل کو تقریباً ہرا ہی دیا تھا۔ مگر دوسری چڑھائی میں عادل نے حقیقی معنوں میں سر توڑ کوشش کی۔ اس کی کھال نے کئی جگہ سے چھل کر خون اگلا اور اس کی سانس لینے میں خنجر کی طرح چلی مگر وہ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کی طرح اپنے ہدف کی طرف بڑھتا گیا اور اپنے مد مقابل کو ایک واضح فرق سے ہرا دیا۔ اس چڑھائی میں عادل نے اپنا سابقہ ریکارڈ بھی آدھے سیکنڈ کے فرق سے بہتر کر لیا۔

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ عادل کا خیال تھا کہ اسے کچھ انعامی رقم دی جائے گی لیکن اس بار بھی دس ہزار روپے کا صرف وعدہ ہی ہوا (ابھی پچھلا تیس ہزار والا انعام بھی اسے نہیں ملا تھا) ہاں اتنا ضرور ہوا کہ سیٹھ صاحب نے اسے ماہانہ تنخواہ مقررہ مدت سے تین روزہ پہلے ہی دے دی۔ یعنی تیس ہزار کے نوٹ اس کی جیب میں آ گئے۔ کلب کے احاطے میں اب جھشی کے بجائے اس کی پینٹنگ، بلند پول پر آویزاں تھی۔ سیٹھ صاحب نے وعدے کے مطابق ابھی اس کی والدہ کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ عادل نے سوچا چلو جتنی دیر تک لاہور میں کسی رہائش کا بندوبست نہیں ہوتا وہ والدہ کو گوجرانوالہ میں اپنے بڑے خالو عطا شاہ کے ہاں منتقل کر دے۔

وہ رات کو اندھیرا ہونے کے بعد اپنے گاؤں لالی پہنچا۔ وہ یہاں کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا اور چودھریوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔ چودھری کے بیٹے ناصر کے ساتھ اس کی لڑائی کی خبر پورے گاؤں کو مل چکی تھی۔ عادل نے راتوں رات ہی والدہ کو تیار کیا اور پھر منہ اندھیرے انہیں وہاں سے لے کر گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

گوجرانوالہ میں والدہ کا انتظام ہو گیا تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ اب وہ زیادہ یکسوئی سے اپنی مصروفیات کی طرف توجہ دے سکتا تھا۔ وہ کام تو کر رہا تھا مگر اپنی آمدن اور آگے بڑھنے کی رفتار سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈیرے پر کھڑے ہو کر دھوئی بھی تو غیر معمولی کر لیا تھا۔ یہ کوئی پانچ دس لاکھ کی بات نہیں تھی، دو ڈھائی کروڑ کی بات تھی۔ تین سال میں ڈھائی کروڑ یہ جاکتی آنکھوں کا خواب ہی لگتا تھا۔

عادل کے پاس دن کے زیادہ تر حصے میں کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ اپنے گاؤں کے عبدالقدیر کی طرح خود بھی کباڑ کا کام شروع کر دے۔ قدر نے اسی کام سے پچھلے ڈھائی تین سال میں نہ صرف بہت سی کمائیں خرید لی تھیں بلکہ اپنا ایک پلاٹ بھی لے لیا تھا۔ اس پلاٹ سے بھی اسے کافی فائدہ ہوا تھا۔ یعنی وہ دو چار سالوں میں صفر سے پچاس ساٹھ لاکھ کی اسامی بن چکا تھا۔

بہر حال ایسا کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ رانا سیٹھ سے اجازت لے لی جائے۔ ایک دن اس نے رانا سیٹھ سے بات کی۔ سیٹھ نے کہا۔ ”عادے! دیکھو اصل بات پھر تمہارے ذہن سے نکل رہی ہے۔ ہم نے لاہور میں مستقل نہیں ٹھہرنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ماہ بعد ہمیں سیالکوٹ جانا ہوگا اور پھر آگے کسی شہر میں۔ تم اپنے کباڑ کے اس کام کو ساتھ ساتھ تو لے کر نہیں پھر سکتے نا؟“

”سیٹھ جی! میں نے اس کا بھی سوچا ہے۔“ عادل نے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میرا یا راب آپ کی دعا اور مدد سے صحت یاب ہے۔ میں یہ کام شروع کر کے اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ جب ہم لاہور میں نہیں ہوں گے، وہ دیکھ بھال کرتا رہے گا۔“

”ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔“ رانا سیٹھ نے کہا۔ عادل کے اندر ایک عجیب سی بے قراری تھی جو ہر وقت اسے متحرک رکھتی تھی۔ ایک ترنگ ایک لہر، آگ کی ایک لپٹ سی..... اس کے سینے میں ہر ذل کچھ سلگتا رہتا تھا جو اسے غیر معمولی توانائی فراہم کرتا تھا۔ دو تنخواہیں اکٹھی ہو چکی

جاتے ہیں۔“
 ”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... جہاں تم بیٹھ سکتے ہو، وہاں میں بھی بیٹھ سکتا ہوں۔ ہم دونوں انسان ہی تو ہیں۔“ وہ ہولے سے مسکرایا اور اس کی آنکھوں کے گرد خوب صورت سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ اس کے لب و لہجہ میں عجیب سا فلسفیانہ آہنگ تھا۔

”آئیے۔“ عادل نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔
 بارش کچھ تیز ہو گئی تھی۔ وہ دونوں جلدی سے اس چھوٹے سے کمرے میں آگئے جہاں اینٹوں کے چولہے میں آگ روشن تھی۔ عادل کے اشارے پر صادق نے پلاسٹک کی ایک کرسی کو اچھی طرح جھاڑا۔ ”بیٹھے جناب!“ عادل نے کہا۔ وہ شخص بڑی حکمت سے بیٹھ گیا۔ نجائے کیوں اب عادل کو لگ رہا تھا کہ اس نے اس باوقار چہرے کی جھلک پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ اس کا ملازم، جو ڈرائیور تھا، واپس گاڑی میں چلا گیا۔ عادل کے اشارے پر صادق بھی باہر نکل گیا اور ٹین کی چھت والے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ڈاڑھی والے شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام سرمد ابدال ہے۔ بس گزر اوقات کے لیے یہاں لاہور میں ایک چھوٹی سی ٹیکسٹری رہی ہوگی ہے۔ وہاں ایمر سائز کی مشینیں وغیرہ بنتی ہیں۔ ویسے میرا اصل شوق سیاحت ہے۔ اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق بہت سے سفر کیے ہیں۔ ملک کے اندر بھی اور باہر بھی۔ خیر یہ ایک علیحدہ موضوع ہے، ہم اس پر بعد میں بھی بات کر سکتے ہیں۔ فی الحال میں تمہیں یہاں اپنے آنے کی وجہ بتانا چاہتا ہوں اور یقیناً یہی سوال اس وقت تمہارے ذہن میں بھی شدت سے ابھر رہا ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔“
 ڈاڑھی والے شخص نے اپنی چھوٹی سی ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور کہا۔ ”میں پچھلے دس پندرہ روز سے وہاں نمائش میں جا رہا ہوں..... اور تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم جو کچھ وہاں کر رہے ہو اس نے مجھے حیران کیا ہے اور..... کسی حد تک مایوس بھی۔“ ایک لمحہ توقف کر کے اس شخص نے بے غور عادل کا چہرہ دیکھا۔ عادل کو لگا کہ یہ شخص بندے کے اندر تک جھانک لیتا ہے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”حیرانی کی وجہ تو یقیناً سامنے کی بات ہے اور یہ بات سب کو ہی معلوم ہے تم درخت پر چڑھنے کا جو مظاہرہ کرتے ہو وہ بے حد متاثر کرنے والا ہے۔ بے شک اس میں تمہاری بہت سی مشق بھی شامل ہے اور تجربہ بھی۔ بہر حال

اور..... ہو سکتا ہے کہ خود کو مٹی کے نیچے ہی چھپالوں۔“
 عادل کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر شاید بھی اداس ہو گیا۔
 بھرائی آواز میں بولا۔ ”ایسی باتیں نہ کریا۔“ تیرے ارادے نیک ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ سوہتا کوئی نہ کوئی راہ نکال دے گا۔ ویسے تو کوئی پیغام شیخام بھیج دے شہزادی بہن کو۔ اس کو حوصلہ ملے گا۔“

”نہیں شاہد! میں نے تاپا سے وعدہ کیا ہے۔ اب شہزادی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھوں گا۔ اگر بھی ملوں گا تو ان کی اجازت سے ملوں گا۔“
 شاہد اس کا بچپن کا یار تھا۔ سمجھ گیا کہ اب وہ اس معاملے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”تیرا یہ کباڑ والا کام کیسا جارہا ہے؟“
 ”بس چل ہی پڑا تھا لیکن..... اب ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“
 ”وہ کیا؟“

”یہ کرایہ کا پلاٹ ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ اگلے مہینے خالی کر دو۔ اب پھر کوئی اور جگہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ پتا نہیں کوئی ڈھنگ کا ٹھکانا ملتا بھی ہے یا نہیں۔“ عادل کے لہجے میں پریشانی کی جھلک تھی۔

اسی دوران میں پلاٹ سے باہر کوئی بڑی گاڑی رکنے اور دروازے بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ ساتھ ہی گیٹ پر دستک ہوئی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ موسم ابر آلود تھا۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش ہو رہی تھی۔ عادل، ایک پلاسٹک کانکڑا سر پر اوڑھ کر پھانگ پر گیا۔ باہر ایک کروڑا کار کھڑی تھی۔ گیٹ پر بچپن ساٹھ سال کا ایک دراز قد شخص موجود تھا۔ اس کی کاٹھی مضبوط اور سر کے بال لمبے تھے۔ گھنی بھوڑوں اور چھوٹی چھوٹی سفیدی مائل ڈاڑھی نے اس کے سرخ و سپید چہرے کو ایک باوقار رنگ دے رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نمایاں چیز اس کی بڑی بڑی پُرسوج آنکھیں اور اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی مضبوط ہڈیاں تھیں۔ یہ ہڈیاں اس کی سخت جانی اور جاں فشانی کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس نے پنٹ کے اوپر سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ایک ملازم ٹائپ شخص اس کے سر پر چھتری تانے کھڑا تھا۔

”جی فرمائیں۔“ عادل نے ذرا حیرت سے کہا۔
 ”تمہارا نام ہی عادل ہے نا۔“ عادل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کیا میں تمہارا تھوڑا سا وقت لے سکتا ہوں؟ دراصل میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“
 عادل نے کہا۔ ”یہاں آپ کے لائق بیٹھنے کی جگہ تو نہیں ہے۔ اگر..... آپ مناسب سمجھیں تو گاڑی میں بیٹھ

اپنے گھر میں۔ شہزادی بھی گئی ہوئی تھی۔ لمبے چوڑے انتظام تھے وہاں۔“
 ”لمبے چوڑے کیا مطلب؟“

”بڑے ٹھاٹھ باٹ دکھائے ہیں چودھری مختار نے تمہارے تاپا صاحب کو۔ گوجرانوالہ سے باورچی بلائے گئے تھے۔ کوئی بیس طرح کے کھانے تھے۔ مرغابی اور ہرن وغیرہ کا گوشت تھا۔ لوگ پنجابی گیت گانے والے بھی آئے ہوئے تھے۔ سنا ہے چار پانچ لاکھ روپیہ تو ان گانے والوں کو ہی دیا گیا ہے۔“
 ”دعوت کس سلسلے میں تھی؟“

”یار! یہ وڈے لوگ جب وڈے لوگوں کی دعوتیں کرتے ہیں تو اس کے لیے کسی وجہ کی لوڑ نہیں ہوتی۔ ویسے اس دعوت میں تو شاید تھوڑی بہت وجہ ہے بھی۔“
 ”کیا مطلب؟“ عادل نے پوچھا۔

”ریحانہ نے بتایا ہے کہ چودھری مختار تمہارے تاپا سے جوئیل جول بڑھارہا ہے تو اس کے پیچھے شہزادی کا رشتہ ہی ہے۔ اس نے چھوٹے چودھری ناصر کے لیے سرسری طور پر شہزادی کا رشتہ مانگا ہے اور اندر خانے کی خبر یہ ہے کہ تمہارے تاپا جی نے انکار نہیں کیا۔“
 ”کیا مطلب، اقرار کیا ہے؟“ عادل کی دھڑکن رک سی گئی۔

”نہیں، اقرار بھی نہیں کیا۔ یعنی ابھی یہی کہا ہے کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ شاید ان کا مطلب یہ ہوگا کہ شہزادی ابھی چھوٹی ہے۔“
 عادل ایک طویل ”ہوں“ کر کے خاموش ہو گیا۔ چند لمبے بعد پُرسوج انداز میں بولا۔ ”ریحانہ نے کچھ اور بھی بتایا ہے؟“

”یہی کہ شہزادی آج کل بہت اداس رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں رونے سے سرخ نظر آتی ہیں لیکن اب وہ ریحانہ سے تمہارے بارے میں کسی طرح کی کوئی بات نہیں کرتی۔ شاید اس نے اس بارے میں کوئی قسم کھائی ہوئی ہے۔ ویسے تم نے شہزادی کو کوئی پیغام دینا ہے تو دے دو۔ ہو سکتا ہے کہ ریحانہ تمہاری بات شہزادی تک پہنچا دے۔“
 ”پیغام کیا دوں شاہد! میں نے جو کچھ اس سے کہنا تھا کہہ دیا ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔ میں اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کروں گا جو میرے بس میں ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو ایک دن اس کے پاس گاؤں پہنچ جاؤں گا اور اگر ناکام ہو گیا تو..... پھر بھی اسے شک نہیں دکھاؤں گا

تھیں۔ وہ بڑی کفایت شعاری سے خرچ کرتا تھا۔ قریباً پچیس ہزار روپیہ اس کے پاس موجود تھا، دس پندرہ ہزار کی بچت صادق کے پاس بھی تھی۔ انہوں نے ایک خالی پلاٹ کرایے پر لے لیا۔ اس پر ٹین کی بری بھلی چھت ڈالی۔ بڑے سائز کا ترازو یعنی کنڈا خرید اور کباڑ کا کام شروع کر دیا۔ سائیکوں اور ریڑھیوں والے کباڑیے ان کے پاس آنے لگے اور اپنا مال فروخت کرنے لگے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ بندہ جب کسی کام میں پڑتا ہے تو پھر اس کی اصل مشکلات اور اونچ نیچ کا علم ہوتا ہے۔ عادل بالکل ایمان داری سے کام کرنا چاہتا تھا مگر دیگر کاموں کی طرح اس کام میں بھی کئی ہیر پھیر تھے۔ خاص طور سے وزن اور تول کی چکر بازی اس میں شامل تھی۔

عادل کا دوسرا کام بھی کامیابی سے جاری تھا۔ اس کی وجہ سے رانا سیٹھ کے کلب کی کافی شہرت ہو گئی تھی۔ رانا سیٹھ کلب کے ساتھ ہی ایک سرسائز کی جدید مشینوں کا اسٹال بھی لگاتا تھا۔ یہ اسٹال بھی معمول سے زیادہ چل رہا تھا۔ ان دنوں ابھی ٹی وی چینل اتنے زیادہ تو نہیں تھے پھر بھی ایک چینل نے اس کے مظاہرے کو اپنی اسکرین پر دکھایا اور تعریف کی۔ وقتاً فوقتاً سخت مقابل بھی کلب میں آتے رہتے تھے مگر ابھی تک کوئی بھی عادل سے سبقت لے جانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ موقع پڑنے پر وہ بڑے اعتماد سے اسٹارٹنگ پوائنٹ پر آتا۔ گھڑیاں پر چوٹ پڑتے ہی بجلی کی رفتار سے 36 فٹ اونچے تنے پر چڑھتا اور دیکھنے والوں کو حیران کر دیتا۔ آج کل ڈیجیٹل اسٹاپ وایچ پر اس کا ریکارڈ قائم، گیارہ اعشاریہ پانچ سینکڑ چمکتا تھا اور دیکھنے والوں کو حیرت کراتا تھا۔

رانا سیٹھ نے اسے ابھی تک رہائش فراہم نہیں کی تھی۔ وہ اس خالی پلاٹ میں ہی رہ رہا تھا جہاں وہ اور صادق کباڑ کا سامان اکٹھا کرتے تھے۔ یہاں مٹی چھت ڈال کر انہوں نے ایک اور نیم پختہ کمرہ بنالیا تھا۔ ایک روز گاؤں سے اس کے بچپن کا دوست شاہد عرف ڈاکٹر اس سے ملنے کے لیے آیا۔ وہ دونوں آپس میں ہر طرح کی بات کر لیا کرتے تھے۔ عادل اور شہزادی کی ہزار ریحانہ جولا لیا گاؤں میں عادل کی پڑوسن تھی، شاہد کی ماموں زاد بھی تھی۔ ریحانہ کے ذریعے تاپا فراست علی کی حویلی کی باتیں شاہد کو معلوم ہوئیں اور اس نے یہ صورت حال آکر عادل کو بتائی۔

شاہد نے کہا۔ ”یار! وہاں اندر خانے کوئی کچھڑی شجڑی پک رہی ہے۔ پچھلے ہفتے چودھری مختار نے تمہارے تاپا جی اور ان کے سارے گھر کی کافی بڑی دعوت کی ہے

بجلی کی سی رفتار سے درخت کی چوٹی پر پہنچنا اور ہاتھ مار کر سرخ جھنڈی کو گرانا ایک قابل دید منظر ہوتا ہے۔ مجھے نظر نہیں آتا کہ کوئی جلد ہی تمہارے اس ریکارڈ کو توڑ سکے گا۔ یہ بالکل گاؤں کا گھنٹہ ہے۔

”بہت شکریہ۔“ عادل نے کہا۔
”اب اگر تم براہ مانو تو میں مایوسی والی بات کی طرف آتا ہوں۔“

”جی فرمائیں۔“
”مجھے لگا ہے کہ تم خود کو ضائع کر رہے ہو۔ بالکل ضائع کر رہے ہو۔ یہ کرکٹ، ہاکی یا جتنا سبک وغیرہ کی طرح کوئی ایسا کھیل نہیں جس میں بندہ آگے بڑھ سکے، نام پیدا کر سکے، ملک میں اور ملک سے باہر کامیابیاں سمیٹ سکے۔ میں اپنے تجربے اور اپنے مانع کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ قدرت نے تمہیں ایک زبردست صلاحیت دی ہے۔ اس صلاحیت کو اگر کوئی مناسب راستہ نہ ملا تو یہ تمہیں بھجور کے درختوں پر چڑھ چڑھ کر اور اگلے سیدھے کاموں میں حصہ لے کر ضائع ہو جائے گی۔“

”میں سمجھا نہیں جناب! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ اس شخص نے کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔
”سیاہ بادلوں نے عین دوپہر کے وقت ہی شام کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ اس لہریے کا عکس اس شخص کی سوئی سوئی خوب صورت آنکھوں میں نمایاں ہو کر اوجھل ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ کے وقفے سے بادل دھاڑے اور یوں لگا کہ اس کمرے کے بلکہ پورے شہر کے درو دیوار لرز گئے ہیں۔ اس نے جو لمبے میں روشن آگ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم مستقبل بنی کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ میرا مطلب ہے آنے والے وقت کے بارے میں پہلے سے جان جانے کا علم؟“

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ میری تعلیم بہت کم ہے۔ بس اتنا پتا ہے کہ غیب کا علم صرف اوپر والے کو ہے۔ ہم تو صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ غیب کا علم صرف اوپر والے کو ہے، ہم تو صرف اندازے لگا سکتے ہیں۔ یہ اندازے ہم اس اوپر والے کی دی ہوئی عقل سمجھ سے ہی لگاتے ہیں۔ یہ کام بھی اوپر والے نے ہمارے اوپر ہی چھوڑ دیا ہے کہ ہم اپنی عقل کو کتنی توجہ اور یقین کے ساتھ کام میں لاتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں جاننے کا علم کیا ہے؟ یہ کوئی سفلی عمل یا جادو تو نہیں ہے۔ یہ سارا کچھ بوجھ اور سوچ بچار کا کھیل ہے۔ اگر ہم اپنے خدا کی دی ہوئی عقل کو ٹھیک سے استعمال کریں اور چیزوں کو

پوری باریک بینی سے پرکھ کر حالات پر غور کریں تو ہم مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔“

”لیکن جناب! یہ تو صرف اندازہ ہوتا۔“
”اندازہ لگانے کی صلاحیت جب عروج پر پہنچتی ہے تو یہی پیش گوئی اور مستقبل بنی بن جاتی ہے۔ ہمارے ارد گرد کے حالات اور مناظر میں بہت چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہر وقت رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارا ذہن ان میں سے کچھ کو نوٹ کرتا ہے اور اکثر کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن جو لوگ مستقبل میں جھانکتے ہیں وہ زیادہ کو نوٹ کرتے ہیں اور کم کو نظر انداز کرتے ہیں، دھیرے دھیرے وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ بدلنے والے حالات کے بارے میں ٹھیک اندازے لگا لیتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ آج کے سائنسدان اور دانشور یہی سمجھتے ہیں کہ انسان اپنی دماغی صلاحیت کا بالکل مختصر سا حصہ استعمال کرتا ہے، باقی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا رہتا ہے اور لاش کے ساتھ قبر میں چلا جاتا ہے۔“

”آپ کی کچھ باتیں سمجھ میں آرہی ہیں اور کچھ نہیں۔ پھر بھی آپ کی ساری باتیں دل پر اثر کر رہی ہیں۔“ عادل نے کہا۔

”دیکھو، میں اپنے خیال کی وضاحت ایک معمولی سی بات سے کرتا ہوں۔“ سرد صاحب نے کہا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سیاہ نوٹ بک نکالی، پھر جیکٹ کی جیب سے ایک قلم نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ عادل سمجھا کہ وہ اس بارے میں شاید کوئی بات کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ عادل کے والدین اور اس کے گھر بار کے بارے میں عمومی سوالات کرتے رہے۔ جو لمبے میں آگ روشن تھی اور چند سوئی لکڑیوں کو لگنے کے بعد آگ مزید روشن ہو گئی تھی۔ عادل نے تپش سے بچنے کے لیے اپنی کرسی تھوڑی سی پیچھے کھسکائی۔ شیشے کے ایک گلاس میں کچھ چائے بنی ہوئی تھی وہ الٹ گئی۔ تاہم کپے فرش کی وجہ سے گلاس ٹوٹنے سے بچا رہا۔ عادل نے گلاس کو جلدی سے اٹھا کر سیدھا کیا۔ ایسا کرنے کے لیے وہ جب نیچے جھکا تو اس کی قمیص کی سامنے والی جیب سے کئی کاغذات پھسل کر گر گئے اور ادھر ادھر بکھر گئے۔ ان میں رسیدیں وغیرہ تھیں اور چالیس پچاس روپے کے کرنسی نوٹ ہوں گے۔ عادل نے انہیں جلدی جلدی سمیٹا۔

سرد صاحب مسکرائے۔ ”لگتا ہے کہ میری موجودگی تمہیں زبردست کر رہی ہے۔ میرا مطلب ہے پریشان ہونے۔“ ”نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تو آپ کی

باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔“
”پتا ہے کیوں اچھی لگ رہی ہیں؟“ وہ سوالیہ نظروں سے سرد صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔ نیم تاریک کمرے میں آگ کی روشنی چہرے کو عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ لمبے بالوں کی ایک لٹ ان کی کشادہ پیشانی پر جمول رہی تھی۔ ہولے سے بولے۔ ”اس لیے کہ میں تمہیں بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے تمہارے اندر کچھ نظر آرہا ہے۔ تمہارا مستقبل۔ تمہاری آنے والی زندگی اور جو کچھ نظر آرہا ہے وہ بہت خوش کن ہے اور حیرت انگیز بھی۔ میں۔۔۔۔۔ تمہیں۔۔۔۔۔ ایک بہت اونچی جگہ پر دیکھ رہا ہوں عادل۔۔۔۔۔ ایک ایسے مقام پر جہاں کم ہی لوگ پہنچتے ہیں لیکن تمہارے اور اس مقام کے درمیان کوئی سیدھا راستہ نہیں ہے۔ ایک بڑا مشکل اور پرہیز سرفہ ہے۔ یہ آگ اور برف کے سات سمندر ہیں۔ کیا تم آگ اور برف کے سات سمندر پار کرنے کی ہمت رکھتے ہو؟“ وہ کھوٹی کھوٹی سی آواز میں پوچھتے چلے گئے۔

عادل ہونٹوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔ انہوں نے اس کی پریشانی دیکھی اور بولے۔ ”میرا مطلب مشکلات سے ہے۔ میں تمہیں بہت اونچے مقام پر دیکھ رہا ہوں مگر بہت سی مشکلات کے بعد اور پتا نہیں کیوں۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے کہ تم مشکلات سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے ہو۔ کوئی توانائی ہے تمہارے اندر جو تمہیں آگے بڑھا سکتی ہے، ایک بے قراری ہے، ایک ایسی بے چینی جو لوگوں میں شاذ و نادر ہی نظر آیا کرتی ہے۔ اس بے پناہ بے چینی اور توانائی کو اگر درست راستہ مل گیا تو تمہارا مشکل سفر آسان ہو سکتا ہے۔ کیا تم نے کسی سے پتہ کیا ہے؟“

انہوں نے آخری الفاظ ایک دم ہی کہہ ڈالے تھے، عادل بھونچکا سا رہ گیا۔ ”جج۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔“ وہ ہکلا یا۔

”کسی سے پتہ کیا ہے تم نے۔۔۔۔۔ کسی کو بہت شدت سے چاہا ہے۔ بہت زیادہ شدت سے۔“ اس مرتبہ سرد صاحب کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا، آگاہ کرنے والا تھا۔

وہ خاموش رہا۔ ”شر ماؤ مت عادل۔ یہ سلسلہ تو آدم حوا سے چلا آرہا ہے اور تمہاری عمر میں پتہ نہیں ہوگا تو کب ہوگا۔ مجھے بتاؤ۔۔۔۔۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ، میں بھی تمہیں تمہارے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔ میں نے بتایا ہے تاکہ میں پچھلے کافی دنوں سے نمائش پر جا رہا ہوں اور تمہیں وہاں دیکھ رہا ہوں۔ میں اگر یہاں پہنچا ہوں تو اس کے پیچھے

کہانیاں

☆ اگر کسی اچھے انسان سے غلطی ہو جائے تو درگزر کرنا چاہیے کیونکہ موتی اگر کچھڑ میں بھی گر جائے تو بھی قیمتی ہی رہتا ہے۔

☆ ایک اچھے دوست کی مثال ایک اچھی خوشبو کی طرح ہوتی ہے جب بھی تم اس کو یاد کرو گے تو تمہیں اس کی مہک ضرور آئے گی۔

☆ اپنی زندگی میں ایسے دوستوں کو شامل کرو جو ہمیشہ آئینہ اور سایہ بن کے رہیں کیونکہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور سایہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔

☆ انسان کو جتنا لگاؤ رزق سے ہے، اگر اتنا لگاؤ رزق دینے والے سے ہوتا تو اس کا مقام فرشتوں سے بڑھ کر ہوتا۔

☆ رشتے بھی پودوں کی طرح ہوتے ہیں جس طرح پانی نہ ملنے سے پودے مرجھا جاتے ہیں ویسے ہی وقت اور پیار نہ ملنے سے رشتے مرجھا جاتے ہیں۔

☆ رزق کے لیے اپنا ایمان خراب نہیں کرو کیونکہ نصیب کا رزق انسان کو ایسے تلاش کرتا ہے جیسے مرنے والے کو موت۔

☆ صبر انسان کی بنیاد ہے

☆ نرمی کامیابی کی گنجی ہے۔

☆ سچائی حق کی زبان ہے۔

☆ سخاوت انسان کی زینت ہے۔

☆ اور موت ایک بے خبر ساتھی ہے۔

اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا ایک بہترین خصوصیت ہے، اس سے نفس میں عاجزی پروان چڑھتی ہے اور تکبر کمزور ہو جاتا ہے۔

☆ اکثر اوقات سچ کڑوا نہیں ہوتا، سچ بولنے کا انداز کڑوا ہوتا ہے۔

مرسلہ: رضوان تھولی کریڈوی اورنگی ٹاؤن، کراچی

کوئی وجہ ہے، بہت خاص وجہ۔ تم مجھے اپنے بارے میں معلومات دو عادل۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ باتیں بس میرے اور تمہارے درمیان رہیں گی۔ پلیز عادل! مجھے غیر نہ سمجھو اور..... اپنا بزرگ بھی نہ سمجھو۔ مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں جانتا ہوں، تم مشکل میں ہو۔ میں تمہیں اس مشکل سے نکال کر ایک بہت بڑی آسانی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔“

پتا نہیں کیوں عادل کا دل اس مہربان شخص کی طرف جھٹکا چلا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے ساتھ کے بعد ہی اسے لگنے لگا تھا کہ وہ انہیں مدتوں سے جانتا ہے..... اور وہ ایسے ہیں جن پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ خود کو اپنی تمام تر اچھوتوں کے ساتھ ان کی غیر معمولی دانش کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ذات میں کئی باتیں انوکھی محسوس ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی کہ عادل کو ان کے خوب صورت ہاتھوں پر کچھ گھٹے سے نظر آرہے تھے۔ سیاہی مائل سخت جلد..... جس کی وجہ سے کڑی محنت مشقت ہی ہوتی ہے۔

باہر بارش مسلسل جاری تھی۔ صادق نہ جانے کہاں سے صاف سحرے برتنوں میں چائے لے آیا تھا۔ اس نے ایک پیالی باہر گاڑی میں ڈرائیور کو پہنچا دی تھی باقی سرد صاحب اور عادل کے سامنے رکھ دی تھی..... عادل نے اپنے حالات ابتدا سے لے کر انتہا تک سرد صاحب کے گوش گزار کر دیے۔ اپنی قیمتی، بہنوں کی شادیاں، بیماری، غربت اور پھر غربت میں شہزادیوں جیسی شہزادی سے محبت۔ اور محبت بھی ایسی جس نے اسے بنیادوں تک ہلا دیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح لالی گاؤں کے چودھری اس کی محبت پر ڈاکا ڈالنے کی فکر میں ہیں اور کس طرح اس نے ڈھائی تین ماہ پہلے اپنے تایا کے ڈیرے پر کھڑے ہو کر ایک بلند بانگ دعویٰ کر لیا ہے اور اب اس دعوے کی لاج رکھنے کے لیے شب و روز انگاروں پر چل رہا ہے۔

عادل کی اس روداد کے دوران میں سرد صاحب گاہے بگاہے اس سے سوالات بھی پوچھتے رہے۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے عادل جو کچھ بھی بتا رہا ہے ان کی توقعات اور اندازوں کے مطابق ہی ہے۔ عادل کی بات اپنے اختتام کو پہنچی تو سرد صاحب نے ایک طویل سانس لے کر چوہے میں آگ درست کی اور بولے۔

”بہت لمبا سفر ہے تمہارا۔ بہت تیز تیز چل رہے ہو۔ لیکن تمہارے قدم بہت چھوٹے ہیں۔ ان چھوٹے قدموں کے ساتھ بہت تیز چلو گے یا بھاگو گے تو گر پڑو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں، بہت کچھ سمجھ رہا ہوں۔ کیا تم گرنا چاہتے ہو؟“

”میں پھر کہوں گا۔ مجھے آپ کی باتیں پوری طرح سمجھ میں نہیں آرہی ہیں سر! لیکن میں گرنا نہیں چاہتا۔ میں شہزادی کو پانے کے اس سفر میں گرنا نہیں چاہتا۔“

”پورے ہوش و حواس اور ارادے سے کہہ رہے ہو؟“

”جی سر۔“

”تو پھر..... آج یہاں اس ”برستی بارش والی شام“ میں، اس آگ کے سامنے اور اس چھت کے نیچے، ایک فیصلہ کرلو۔“

”کیسا فیصلہ سر؟“

”جو میں کہوں گا مانو گے۔ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن اس پر عمل کرو گے۔ اس کے بدلے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں عادل! میں تمہیں منزل تک پہنچاؤں گا، وہ سب کچھ تمہیں حاصل ہوگا جس کا تم نے ارادہ کیا ہے۔ ہاں عادل! میں ایک حقیر سا بندہ ہوں لیکن قدرت نے مجھے تھوڑی سی باریک بینی عطا کی ہے۔ اس کی بخشی ہوئی عقل کا حق تو ہم میں سے کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا، بس اس عقل میں سے تھوڑا سا حصہ میں استعمال کرنے کے قابل ہو سکا ہوں اور میری اتنی سی کامیابی نے مجھے کافی دور تک دیکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔“

”یعنی آپ کا خیال ہے کہ آپ آنے والے وقت کے بارے میں جان جاتے ہیں؟“

سرد صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ”اللہ مجھے معاف کرے۔ شاید میں نے بے دھیانی میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے۔ میں تو کسی اندھے کی طرح ٹاک ٹوئیاں مارتا ہوں۔ وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی وقت میرے ذہن کو درست سمت میں منتقل کر دیتا ہے۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ یہ کوئی جادو یا ماورائی علم نہیں۔ نوع انسانی کو خدا کی بخشی ہوئی دانش ہے، جس کا کچھ حصہ مجھ جیسے لوگ استعمال کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔“

”ابھی آپ نے اس ڈائری میں کچھ لکھا تھا اور بتایا بھی نہیں کہ کیا لکھا تھا؟“

”ہاں..... میں بھول گیا۔ بس ایک چھوٹی سی بات تھی۔ جنہیں فقط یہ سمجھانے کے لیے کہ مستقبل کے بارے میں اندازے لگانے کی کس طرح پروان چڑھتی ہے؟“

انہوں نے ڈائری کھولی اور لکھا ہوا صفحہ عادل کے سامنے کر دیا۔ یہ بس دو فقرے تھے۔ لکھا تھا۔ ”عادل! میں ممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر میں تم اپنی کرسی کچھ پیچھے ہٹاؤ اور وہ

میں گراد جس میں بیٹھی ہوئی چائے ہے۔“

عادل دنگ رہ گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ یہ فقرے سرد صاحب نے چائے کرنے والے واقعے سے پہلے لکھے تھے۔ شاید تین چار منٹ پہلے۔ ”یہ کیسے..... ہوا سر؟ آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”بہت سادہ ہے۔ تمہاری کرسی آگ کے زیادہ قریب تھی۔ تم باتیں کرتے ہوئے بے دھیانی میں بار بار اپنی پنڈلی کو سہلا رہے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ تمہیں پیش محسوس ہو رہی تھی۔ چوہے میں مزید لکڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ انہیں ایک دو منٹ میں مزید آگ پکڑنا تھی اور پیش کو بڑھانا تھا۔ یعنی بات تھی کہ تم اپنی کرسی کچھ پیچھے ہٹاؤ گے۔ کرسی کے پیچھے پائے کے بالکل ساتھ یہ گلاس رکھا تھا یہ تمہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے اٹنے کا امکان بہت زیادہ تھا اور دیکھو ایسا ہی ہوا۔ میں تھوڑا سا مزید غور کرتا تو اس پیش گوئی کو مزید حیران کن بنا سکتا تھا۔ تمہاری قمیص کی جیب میں کاغذات اور پر اٹھے ہوئے تھے۔ تمہارے جھٹکنے کے سبب پھسل کر نیچے گر سکتے تھے اور یہ گرے بھی۔ اگر میں یہ منظر بھی پیش گوئی میں شامل کر دیتا تو تم اور بھی ہکا بکا ہو جاتے۔ یہ سب ایک چھوٹی سی مثال ہے عادل! ہم اپنے ارد گرد ہونے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے لے کر بڑے بڑے عالمی واقعات تک پر غیر معمولی غور کرنا شروع کر دیں اور اپنے پیچھے تجربات کو خوبی سے استعمال کر پائیں تو حیران کن پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔ چہرے پڑھ سکتے ہیں۔ انسانوں کے اندر جھانک سکتے ہیں۔“

”نہیں سر۔ یہ اتنا سادہ نہیں۔ مجھے لگتا ہے، آپ ایک غیر معمولی شخص ہیں۔ کچھ ہے آپ کے پاس، خیر چھوڑیں اس بات کو۔ آپ مجھے بتائیں، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”ایک سفر۔“ سرد صاحب نے غمگین آواز میں کہا۔

”بہت لمبا نہیں، اور بہت چھوٹا بھی نہیں۔“

”کہاں کا سفر سر؟“

”وہاں کا۔“ سرد صاحب نے عجیب انداز سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش کچھ ہلکی ہو گئی تھی لیکن لاہور کے آسمان پر تاریک بادل موجود تھے اور ان میں کبھی کبھی ہلکی کالہر یا دوڑتا تھا۔ خستہ حال کمرے کی یہ کھڑکی شمال کی طرف کھلی تھی اور سرد صاحب کی نگاہ جیسے دور کہیں شمال میں دیکھ رہی تھی۔

”آپ اس طرف کیوں دیکھ رہے ہیں سر؟“

”اس طرف پہاڑ ہیں۔ بلندیاں ہیں، برف سے

ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہیں۔ ان چوٹیوں کے بالائی سرے گہرے بادلوں میں چھپے رہتے ہیں..... اور انکی چوٹیوں کے اوپر کہیں تمہارے لیے کچھ موجود ہے۔“

”مم..... میرے لیے؟“

”ہاں، تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے جو اپنے اندر رہمت رکھتا ہے اور تکلیفیں سنے کا عزم رکھتا ہے..... یہ چوٹیاں دل والوں کا امتحان لیتی ہیں اور جو اس امتحان میں پورا اترتے ہیں انہیں کچھ نہ کچھ دیتی بھی ہیں۔ اس لیے مجھے ہمیشہ ان سے پیار رہا ہے۔ یہاں کی سچ ہوائیں، یہاں کی برقی ڈھلوانیں، یہاں کی پرخطر پگھلندیاں..... سب مجھے محبوب رہی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے تاکہ میری عمر کا زیادہ حصہ سیاحت میں گزرا ہے اور اس سیاحت کا ساٹھ ستر فیصد حصہ کوہ نور دی پر مشتمل ہے۔“

”لیکن آپ مجھے وہاں کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟“

سرد صاحب نے عادل کی آنکھوں میں جھانکا، بہت اندر تک، پھر اپنے مخصوص دھمکے لہجے میں بولے۔ ”تمہیں بتایا ہے تاکہ تمہارے لیے وہاں کچھ موجود ہے۔ ایک راستہ جو صرف تمہارے لیے بنا ہے۔ جسے بس تم جیسا شخص ہی طے کرے گا۔“

”آپ کی باتیں مجھے الجھا رہی ہیں سر، کیا آپ کل کر کچھ بتانا پسند کریں گے؟“

”بتا دوں گا۔ بلکہ ضرور بتاؤں گا لیکن وقت آنے پر ہی ایسا ہو سکے گا۔ فی الحال یہ ایک غیر متعلق موضوع ہے۔ تم مجھے صرف بتاؤ، کیا تم اپنا ذہن بنانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ مجھے بہت جلدی بھی نہیں۔ میں تمہیں اچھی طرح سوچنے کے لیے مناسب وقت دے سکتا ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟“

”جی ہاں، سوال تو بہت سے ذہن میں آرہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر میں آپ کے ساتھ کسی سفر پر جاتا ہوں تو یہ سفر کتنے دن میں ختم ہوگا۔ اس دوران میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ مجھ پر میرے گھر کی کچھ ذمے داریاں بھی ہیں۔ میرے روزگار کا کیا ہوگا.....؟“

”میرے اندازے کے مطابق اس سفر کا دورانیہ تین سے چار ماہ ہو سکتا ہے۔ یہ کسی بھی طرح سے کوئی غیر قانونی کام نہیں ہوگا۔ ہاں ہم جونی اور کوہ پیما والے عام خطرات تو اس میں موجود ہوں گے۔ تم نے ابھی بتایا ہے کہ تم رانا سیٹھ کے پاس ماہانہ بیس ہزار روپیہ لے رہے ہو۔ تمہارا یہ بیس ہزار والا اعزاز یہ برقرار رہے گا۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی سہولتیں

بھی ملیں گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے تمہیں بتا دوں کہ رانا سیٹھ تم سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس درختوں پر چڑھائی والے کھیل پر درپردہ بھاری شرطیں لگا کر جاری ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق زیادہ نہیں تو آٹھ دس لاکھ روپیہ ہفتے کا یہ شخص تمہارے ذریعے سے بن رہا ہے۔

ایک دم عادل کو وہ تیس ہزار روپیہ بھی یاد آ گیا جس کا وعدہ، رانا سیٹھ نے انعام کے طور پر کیا تھا اور ابھی تک وعدہ بس وعدہ ہی تھا۔ اسی طرح رہائش مہیا کرنے والے معاملے کو بھی وہ مسلسل ٹالتا چلا جا رہا تھا۔ سرمد صاحب نے کہا۔

”میں کچھ زیادہ بتاؤں گا تو یہ چٹلی ہو جائے گی لہذا تھوڑے کبے کو ہی زیادہ سمجھو۔ رانا سیٹھ تمہیں اور تمہاری خاص الخاص صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرے گا۔ تمہیں اس کے گھبرے سے نکل کر آگے بڑھنا ہے۔ بہت اونچی پرواز کرنی ہے عادل۔ اور مجھے پتا ہے تم کر سکتے ہو۔“

”مجھے اس بات پر معاف کیجیے گا سر! مجھے شہرت، ناموری، عیش و عشرت کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میری سب سے بڑی ضرورت روپیہ ہے۔ وہ روپیہ جو اس وقت میرے اور شہزادی کے کام آ سکے۔ میں کمانا چاہتا ہوں سر! بہت تیزی سے کمانا چاہتا ہوں۔“

”تم بہت تیزی سے کماؤ گے۔ ایک ہی چھلانگ میں اس جگہ تک پہنچو گے جہاں پہنچنے کا لوگ بس تصور ہی کرتے ہیں۔ جس سفر کی میں بات کر رہا ہوں اس کا اختتام تمہارے لیے ایک بہت ہی اچھی جگہ پر ہونے والا ہے۔“

”کوئی..... اشارہ دیں گے آپ؟“

”ابھی نہیں، لیکن کہا ہے نا وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گا۔“

آخر عادل نے کرسی پر پہلو بدلا اور مؤدب انداز میں بولا۔

”مجھے فیصلہ کرنے کے لیے دو دن کا وقت چاہیے سر۔“

”میں تمہیں چار دن کا وقت دیتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ تم اچھا فیصلہ کرو گے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا براہ راست ملنا زیادہ مناسب نہیں۔ میں تمہیں اپنا موبائل فون نمبر دیتا ہوں۔ تم رات کے سات آٹھ گھنٹوں کو چھوڑ کر جب چاہو اس پر رابطہ کر سکتے ہو۔“

☆☆☆

یہ اگلے روز شام کی بات ہے۔ عادل نمائش گاہ میں تھا۔ معمول کے مطابق وہ ہر روز دوبار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ایک دفعہ آٹھ بجے کے لگ بھگ پھر دس بجے کے لگ بھگ۔ آج اس کے گاؤں کے عادی کا نام شہر میں

مشہور ہے۔ اس کی تصویریں لگی ہوئی ہیں اور شہری لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ آج عادل نے اپنا ایک ہاتھ پشت پر باندھ کر صرف ایک ہاتھ سے درخت پر چڑھنے کا مظاہرہ کیا اور احاطہ دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔

عادل کے یار دوست گاؤں سے اس کے لیے کئی سوغاتیں لائے تھے۔ باداموں والا گڑ، شکر پارے اور پنچیری وغیرہ..... عادل کا جگری دوست شاید بھی ساتھ آیا تھا۔ وہ بھی اطلاع کی صورت میں ایک سوغات لایا تھا اور اس سوغات نے عادل کا منہ کافی کڑوا کر دیا۔

وہ عادل کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ ”یار عادل! تجھے پنڈ سے دور نہیں رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آہستہ آہستہ شہزادی والی گیم تیرے ہاتھ سے نکل جائے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، تو خواخواہ پریشان ہوگا لیکن وہ جو بیان کہتے ہیں کہ بوتل کی طرح آنکھیں بند بھی نہیں کرنی چاہئیں۔“

”اچھا چل بتانا۔“ عادل نے توری چڑھا کر کہا۔

”تمہارے تایا اور چودھری مختار کا گھرانہ تیزی سے قریب آ رہا ہے۔ تمہارے تایا اور چودھری مختار نے مل کر وہاں پنڈ میں چاول صاف کرنے والی مشین لگا کر ہے۔ کافی پیسا خرچ ہوا ہے اس مشین پر۔ سمجھو، اب وہ دونوں سا جھے دار بھی ہو گئے ہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ چودھری مختار کے دماغ میں وہی رشتے داری والی بات ہے۔ اس لیے وہ اس طرح کی سا جھے داریاں بنا رہا ہے۔“

عادل کے سینے میں تیز چھین سی تو ہوئی لیکن وہ نارمل لہجے میں بولا۔

”شاید! جب تک شہزادی میرے ساتھ ہے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ہم سب کچھ اپنے حق میں کر لیں گے۔“

”پر یار! یہ بھی تو سوچ کہ کئی دفعہ دوری سے نقصان بھی ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ بندے کا ذہن بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو پچھلی جمعرات کو راہ پورے میں بکے سائیں کا عرس تھا۔ پنڈ کے سارے لوگ جج دج کر عرس پر گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح تمہارے تایا کے گھر والوں نے پردے والے تانگوں پر جانا تھا مگر چودھری مختار نے دو گڈوں (نیل گاڑیوں) کا انتظام کرایا۔ ان کو بڑی چٹلی طرح سجایا سنوارا گیا۔ دونوں گھروں کی زنانیاں مل جل کر ان گڈوں پر بیٹھیں۔ مرد گھوڑیوں پر سوار ساتھ ساتھ تھے۔ خوب ڈھول ڈھمکا ہوتا رہا۔ عورتیں پردے کے اندر ہی ڈھولکی وغیرہ بجاتی رہیں۔ میں سارے راستے دیکھتا رہا وہ لبو چودھری ناصر، شہزادی والی گڈ کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔

عرس میں بھی وہ سیل کڑی طرح ساری عورتوں کو ساتھ لے کر پھرتا رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ ناصر کی چھوٹی بہن فاخرہ پوری کوشش کر رہی ہے شہزادی اور ناصر کو ایک دوجے کے قریب لانے کی۔ ریجانہ بتا رہی تھی کہ وہ کئی بار تمہارے تایا کی حویلی بھی آ جاتی ہے اور گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے شہزادی سے۔ اس کی ضد پر ایک دفعہ شہزادی بھی چودھریوں کے گھر گئی ہے۔“

یہ سب کچھ عادل کے لیے دوسو تھا مگر اس نے شاید پر کچھ غائب نہیں ہونے دیا۔ شاید نے ایک بار پھر کہا۔ ”بھی کبھی تو لگتا ہے عادے! کہ تو نے ماں جی کو گوجرانوالہ بھیج کر چکا نہیں کیا۔ وہ ادھر ہوتیں تو ان سے ملنے کے بہانے تو پنڈ آتا جاتا رہتا۔ تجھے وہاں کی خبر خبر رہتی۔“

عادل تب کر بولا۔ ”تو تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں پنڈ آنے جانے کی خاطر ماں جی کو مصیبت میں ڈال رہا تھا۔ مجھے پتا ہی ہے چودھری ناصر سے جھگڑے کے بعد کتنی ٹین شین بن گئی تھی۔“

شاید نے جلدی سے موضوع بدل کر کہا۔ ”اچھا، چل تو کوئی پیغام وغیرہ ہی بھیج دے شہزادی بہن کو۔ اسے کچھ احساس تو ہو کہ تو دن رات اس کے لیے سوچ رہا ہے۔“

عادل نے آہ کے انداز میں سانس لی۔ ”شاید! کہہ کر احساس دلا یا تو کیا دلا یا۔ اسے خود ہی پتا ہونا چاہیے اور میں جانتا ہوں کہ اسے پتا ہے۔“

عادل نے اصرار کر کے گاؤں والوں کو رات اپنے پاس ٹھہرایا، کھانا وغیرہ کھلایا۔ صبح وہ لوگ چلے گئے تو وہ بیٹھا دیر تک سوچتا رہا۔ شاید کی باتیں پریشان کن تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ عادل، شہزادی سے رابطہ رکھے اور کسی بہانے گاؤں میں آتا جاتا رہے۔ مگر وہ تو اب گاؤں جانے کے بجائے کہیں اور جانے کا سوچ رہا تھا۔ کہیں بہت دور..... نا معلوم راستوں پر۔ اس دھواں دھار برستی شام میں سرمد صاحب نے جیسے اس پر ایک جادو سا کر دیا تھا۔ وہ اسی طرح سوچتے پر مجبور ہو رہا تھا جس طرح وہ چاہتے تھے کچھ خاص تھا ان میں۔ ان کے ارد گرد جیسے ایک نظر نہ آنے والا کشش کا ہالہ تھا..... اور وہ اس ہالے میں سے اپنا ہاتھ نکال کر اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے..... یہ ہاتھ تمام لو۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن تمام لو۔ جو کچھ تم چاہ رہے ہو اور جتنی جلدی چاہ رہے ہو، وہ اسی طرح ممکن ہے کہ میرے کہنے پر چلو۔

عادل اور سرمد صاحب کی اگلی ملاقات سرمد صاحب کے گھر میں ہوئی۔ ان کا گھر لاہور کے مضافات میں ایک

فارم ہاؤس کی شکل میں تھا۔ یہ گھر بھی سرمد صاحب کی طرح انوکھا اور ناقابل فہم تھا۔ تین ایکڑ کے فارم ہاؤس کے بیچوں بیچ یہ خوب صورت عمارت تھی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک تو نہایت آرام دہ اور زندگی کی سہولتوں سے آراستہ تھا۔ تاہم دوسرا حصہ بالکل مختلف اور کسی درویش کا ڈیرا نظر آتا تھا۔ عادل یہ دیکھ کر حیران ہوا۔ یہاں گیس پانی اور بجلی جیسی سہولتیں بھی میسر نہیں تھیں۔ کمرے ہر طرح کے فرنیچر سے تقریباً عاری تھے۔ سونے کے لیے فرش پر چٹائیاں بھی ہوئی تھیں۔ ہاں ضرورت کے لیے الماریاں وغیرہ موجود تھیں۔ روشنی کے لیے لائٹنیں تھیں۔ جب بجلی ہی نہیں تھی تو اسے ہی اور بجلی وغیرہ کا وجود کہاں ہو سکتا تھا۔ احاطے میں پانی کے لیے دو پنڈ پم موجود تھے۔ عادل نے اندازہ لگایا کہ یہاں کھانا وغیرہ بھی لکڑی کی آگ سے پکایا جاتا ہوگا۔ سرمد صاحب عجیب ہیست کڈائی میں یہاں موجود تھے۔ عادل حیران رہ گیا۔ سخت سردی میں انہوں نے بس ایک ٹیکر پہن رکھی تھی جو ان کے گھٹنوں تک پہنچتی تھی۔ بیان پسنے میں بھیگی ہوئی تھی، ہاتھ پاؤں مٹی میں لٹھڑے تھے جیسے وہ کہیں کاشت کاری کرتے رہے ہیں (بعد ازاں یہ کاشت کاری والا اندازہ بھی درست ثابت ہوا۔ عادل پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے گھر کے پچھواڑے قریب ایکڑ رقبے پر چاول گندم اور دو تین قسم کی دالیں کاشت کر رکھی ہیں ایک چھوٹا سا ٹریکٹر ہے جسے وہ خود ہی چلاتے ہیں۔ ایک چھوٹے پمپ کے ذریعے اس زمین کو پانی ملتا تھا۔ پمپ کو بجلی، گھر کے دوسرے حصے سے فراہم ہوتی تھی)

اپنے گھر میں جدید سہولتوں کی عدم موجودگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرمد صاحب مسکرائے اور بولے۔

”دیکھنا عادل! کتنا آسان حل ہے، بجلی گیس اور پانی کے بھاری بلوں کا۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔“

عادل کس کس بات پر حیرت کا اظہار کرتا۔ وہ سرمد صاحب کے ساتھ گھر کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ یہاں ایک کمر درمی چٹائی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف لکھنے پڑھنے کے لیے لکڑی کی چوکی پڑی تھی۔ چوکی کے قریب گیس لیپ رکھا تھا۔ پیچھے ایک دیوار گیر الماری میں نیچے سے اوپر تک کتابیں جچی ہوئی تھیں۔ گھر کے اس حصے میں شاید ایک آدھ ملازم بھی ہوگا لیکن اس وقت وہ بھی موجود نہیں تھا۔ عادل کے بہت منع کرنے کے باوجود سرمد صاحب نے خود ہی چائے بنائی اور خود ہی لے کر عادل کے پاس چٹائی پر آ بیٹھے۔ قریباً پچپن سال عمر کے باوجود ان کا جسم

”آپ کا رہن بہن مجھے حیران کر رہا ہے۔“
وہ مسکرائے۔ ”یہ کوئی دکھاوا نہیں ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔ پھل پھول اگانا اور کھیتی باڑی کرنا میرا شوق بھی ہے اور اس سے میری ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ بلکہ اس سے میں اوروں کی خاطر تواضع بھی کر سکتا ہوں۔ یہ جو پیچھے مرغی خانے کے ساتھ چاول کی فصل نظر آرہی ہے یہ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ میرے تین خاص ملازم ہیں۔ جو اس سارے کام میں میری مدد کرتے ہیں۔ جب میں یہاں نہیں ہوتا وہ سب کچھ اچھی طرح سنبھال لیتے ہیں۔“

”اور آپ کے..... بیوی..... بچے؟“

وہ پھر مسکرائے۔ ”ایک بچہ تو میرے سامنے بیٹھا ہے..... اور بھی کچھ بچے ہیں۔“

”کیا مطلب سر؟“

”اللہ نے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہوا ہے۔ ایک بیٹا تھا بہت کم سنی میں فوت ہو گیا۔“

”اور..... آپ کی وائف؟“

”وہ بہت اچھی عورت ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ اس دیوانے پن میں میرا ساتھ دے سکے۔ وہ علیحدہ رہتی ہے ہم اکثر ملتے رہتے ہیں اور..... اچھا وقت گزارتے ہیں۔ بہت مہربان اور نفیس خاتون ہے وہ۔“

عادل نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”سر! اس دن جب میں نے آپ کے ہاتھوں کے گٹھے دیکھے تھے تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آپ جیسا خوش حال شخص اپنے ہاتھوں پر یہ نشان لیے کیوں پھر رہا ہے۔ لیکن آج بہت کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔“

”محنت مشقت میں ہی زندگی کا حسن ہے عادل۔ سچی خوشی دراصل مشقت اور تکلیف کے اندر سے ہی پھوٹی ہے۔ جو لوگ یہ رونا روتے ہیں کہ ان کی زندگی میں خوشیاں نہیں، وہ غور کریں تو انہیں پتا چلے گا کہ ان کی زندگی میں کڑی مشقت کی تکلیفیں بھی نہیں۔ بہر حال یہ بہت لمبا موضوع ہے۔ تم بتاؤ کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟“

عادل کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ ”سر! آپ اتنے مہربان ہیں کہ آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن..... میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اپنے دل میں کوئی الجھن لے کر آپ کے ساتھ چلوں گا تو شاید اس توجہ اور ذوق و شوق کا مظاہرہ نہ کر سکوں جو مجھے

کرنا چاہیے۔“

”تو کیا چاہتے ہو تم؟“ سرمد صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔

”سر! آپ مجھے تھوڑا بہت بتا دیجیے۔ تاکہ مجھے پتا ہو کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں اس حساب سے اپنے آپ کو تیار کروں اور خود میں حوصلہ پیدا کروں۔“

”تمہاری بات میں وزن ہے عادل، بس یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری اس خاص جسمانی صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں جس کا مظاہرہ تم رانا کے کلب میں کرتے ہو۔“

”لیکن سر! معافی چاہتا ہوں، میرا سوال تو وہی ہے مجھے کرنا کیا ہوگا؟“

”اچھا ہم اس مسئلے کا ایک درمیانی حل نکالتے ہیں۔“ وہ ہولے سے مسکرائے اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے روانہ ہونے کے تین چار دن بعد میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت ہم ایسی جگہ پر ہوں گے جہاں سے ہمارا اصل سفر شروع ہوتا ہے، اگر تم سب کچھ جاننے کے بعد واپس آنا چاہو گے تو باآسانی واپس آ سکو گے۔ آٹھ دس گھنٹے کا پیدل سفر ہوگا۔ پھر تم کی سڑک پر آ جاؤ گے۔ وہاں سے تمہیں کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی، جو تمہیں کسی قصبے یا پھر اسکر دو تک پہنچا دے گی۔ دوسری صورت میں ہم آگے بڑھ جائیں گے۔“ اسکر دو کے نام نے عادل کو تھوڑا سا ٹھٹھا کیا لیکن وہ خاموش رہا۔

”ہمارے ساتھ اور کون ہوگا؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے خیال میں صرف دو بندے ہوں گے۔ ان میں ایک برٹش خاتون ہے جو بہت اچھی ہمسفر ثابت ہوگی۔ یعنی ہم چار ہوں گے۔“

عادل کچھ دیر سوچ میں رہنے کے بعد بولا۔ ”تو سر.....

پھر میں ایسا کرتا ہوں کہ ابھی رانا سیٹھ سے آٹھ دس روز کی چھٹی لے لیتا ہوں۔ میرا مطلب ہے لگی لگائی روزی ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اگر تم نے سفر آگے جاری رکھنا ہوا تو پھر؟“

”کیا وہاں سے فون وغیرہ پر رابطہ نہیں ہو سکے گا؟“

”نہیں، یہ تو ممکن نہیں ہوگا۔“

”تو..... ٹھیک ہے، میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ فی الحال دس پندرہ روز کی رخصت چاہتا ہوں۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آ سکا تو وہ دوسرا انتظام کر لے۔“

”اور تمہارے اس کباڑ والے کام کا کیا ہوگا؟“

”یہ کام تو ابھی پوری طرح جمائی نہیں ہے سر! پلاٹ

بھی خالی کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر کوئی نئی جگہ مل گئی تو صادق وہاں شفٹ ہو جائے گا۔ ورنہ پھر بعد میں دیکھا جائے گا۔“

کچھ دیگر تفصیلات طے کرنے کے بعد سفر کا فیصلہ ہوگا۔ عادل کے پیش نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ تھوڑے وقت میں زیادہ پیسا کماتا چاہتا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل سے کہا۔ ”عادل! ایک بات پھر ذہن نشین کر لو۔

اس سفر میں خطرے بھی ہیں اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لو کہ خطروں کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا.....“

”میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں سر!“

”تو درست ہے، کل گوجرانوالہ جا کر والدہ سے مل آؤ اور ان سے اجازت وغیرہ لے لو۔ ہم انشا اللہ پیر کے روز یہاں سے روانہ ہوں گے۔ صبح پانچ بجے کے قریب اور یہ لودو باہ کا ایڈوائس۔ چالیس ہزار ہیں۔ تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری والدہ کو ضرورت ہوگی۔“ انہوں نے کرسی نوٹ عادل کی جیب میں ڈال دیے۔

☆☆☆

عادل اور سرمد صاحب لاہور سے بذریعہ بس روانہ ہوئے۔ ان کے ہمسفروں میں ایک تو خوب رو انگلش لڑکی کرشل تھی..... دوسرا ایک چھبیس ستائیس سال کا نوجوان ہمایوں تھا۔ ہمایوں گوجرانوالہ تھا لیکن بہت چھوٹی عمر میں والدین کے ساتھ انگلینڈ چلا گیا اور وہیں پلا بڑھا تھا۔ وہ پاکستان اور رومن اسٹائل کشتی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ خوب صورت کسرتی جسم کا مالک، بال ٹھنکریا لے اور آنکھیں ہلکی براؤن تھیں۔ کرشل جتنی چپکٹی اور کھلکھلائی ہوئی لڑکی تھی ہمایوں اتنا ہی خاموش طبع تھا۔ ان کا پہلا پڑاؤ ایٹ آباد میں تھا۔ ڈائیو کی بس کے ”ٹیچ کپارٹمنٹ“ میں ان کا کافی سامان موجود تھا۔ جن میں دو درمیانے سائز کے خیمے اور ایک چھوٹا خیمہ تھا۔ اس کے علاوہ سفری تحیلے اور کوہ پیما کے جملہ لوازمات تھے۔ اس سارے سامان میں جس چیز نے عادل کو زیادہ حیران کیا وہ دو چھوٹے سائز کے پیراشوٹ تھے۔ دونوں پیراشوٹس کو پیک کر کے بالکل مختصر کر دیا گیا تھا۔ دیکھنے میں لگتا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا کتہ ہو۔

ایٹ آباد کے ایک اچھے ہوٹل میں ان کے لیے کمرے بک تھے۔ یہ انگریزوں کے دور کا لیکن بڑا صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ سرمد صاحب نے کچھ سامان یہاں ایٹ آباد سے بھی اپنے ساتھ لیتا تھا۔ سرمد صاحب اور ہمایوں شاؤنگ کے لیے نکل گئے۔ ہوٹل کی اونچی چھت والی نیم گول لابی میں بید کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ عادل اور کرشل وہاں

بیٹھ گئے اور سڑک کی گہما گہمی کا نظارہ کرنے لگے۔ کرشل اردو بھی بول لیتی تھی، تاہم یہ گلابی اردو تھی۔ ہم کو ”ہام“ اور تم کو ”توم“ کہتی تھی۔

”ہام کو پاکستان ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا۔“ وہ اپنے خاص اسٹائل سے آنکھیں جھپک کر بولی۔

”آپ کتنی دفعہ پاکستان آ چکی ہیں؟“ عادل نے پوچھا۔

”سب سے پہلے کوئی سات سال پہلے۔ تب ہام ڈاکٹری کے فوریئر میں تھا۔ ہام سے بالکل پڑھا تھا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں نہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریمڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

عمارت کی چھت اونچی تھی اور چھت سے ڈیڑھ دو فٹ نیچے مستطیل روشندان تھے۔ کرشل کے کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ عادل نے کچھ دیر سوچا پھر کھڑکی کے نچلے کنارے پر پاؤں رکھا اور اچک کر روشندان کا نچلا کنارہ پکڑ لیا۔ انگلیوں اور کلائیوں کے زور پر اس نے خود کو اوپر اٹھایا۔ ایسا کرنا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ جلد ہی وہ روشن دان سے کمرے کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے پاؤں کے پنجوں کو کھڑکی کی دواچھ چوڑی کارنس کا تھوڑا سا سہارا مل گیا تھا۔ روشندان کا شیشہ بند تھا لیکن مچلی جانب معمولی سی درز موجود تھی جس میں سے باریک آوازیں عادل کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ نیچے سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر کرشل نظر آ رہی تھی۔ اس نے مہین سا گلابی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا جس میں سے اس کا تو بہ شکن پیکر جیسے پھٹا پڑ رہا تھا۔ تاہم اس کے حسین چہرے پر ایک بے چینی سی چمک تھی۔ کرشل کے عین سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ عادل کو نظر نہیں آیا۔ وہ بھی غیر ملکی تھا۔ اس نے مہین، جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جسم سڈول اور کسرتی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کرشل کو اس کے نیم عریاں کندھوں سے تھما اور کمر درے لہجے میں کچھ بولا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔ اس کا پہلا فقرہ تو عادل کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن دوسرا فقرہ اس نے صاف سنا اور سمجھا بھی۔ ”ہاؤ لونگ آئی ہو نو ویٹ..... ہاؤ لونگ..... (میں کب تک انتظار کروں گا..... کب تک؟) کرشل نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”زیادہ دیر نہیں اب۔“

”تم ہمیشہ یہی کہتی ہو۔“ نوجوان بولا۔ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے وہ تھوڑا سا گھوما اور عادل نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ مخصوص انگلش ناک اور چہرے مہرے والا ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ قدرے چھوٹی اور انچی ہوئی ناک کے قریب رخسار پر ایک پرانے زخم کا نشان تھا۔ اور نہ جانے کیوں اس نشان کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک تندخو، جھگڑالو نوجوان ہے۔ بہر حال یہ نشان اس کی مجموعی ”قبول صورتی“ کو متاثر نہیں کرتا تھا۔

اگلے دو چار منٹ میں ان دونوں کے درمیان کچھ اور جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ ان میں سے کچھ تو عادل کو سنائی ہی نہیں دیے۔ کچھ سنائی تو دیے لیکن ان کی انگلش اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ جو تھوڑا بہت سمجھ میں آیا اس سے عادل کو اندازہ ہوا کہ کرشل اس نوجوان کی بہت قریبی گرل فرینڈ یا مگیٹر ہے، اور یہ نوجوان اس سے ملنے کے لیے اسلام آباد

انگلینڈ میں ہی اس کی ملاقات سرمد صاحب سے ہوئی اور وہ ایک طرح سے ان کی مرید بن گئی۔ ان کا دوسرا ہمسفر ہمایوں بھی سرمد صاحب کو کسی رہنما اور قائد کی حیثیت دیتا تھا۔ چند سال پہلے جب وہ پاکستان میں تھا لاہور آیا تھا۔ وہ سرمد صاحب کا ورزشی مشینوں والا کارخانہ دیکھنے گیا، وہیں اس کی ملاقات سرمد صاحب سے ہوئی اور چند ہی ماہ میں یہ ملاقات ایک نہایت قریبی روحانی تعلق میں بدل گئی۔

گفتگو کے دوران میں عادل نے کرشل سے تھوڑی بہت ٹوہ لینے کی کوشش کی۔ وہ اس سفر کا مقصد جانتا چاہتا تھا۔ اس کے اندیشے کے عین مطابق کرشل نے اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا اور ہر بار خوب صورتی سے بات کول کر گئی۔ وہ بڑی بولڈ لڑکی تھی۔ ایبٹ آباد کی سردی اس کے بھرے پرے جسم پر کوئی خاص اثر ڈالنے میں ناکام رہی تھی۔ اب بھی وہ بڑے سکون سے ایک شارٹ پینٹ اور ہاف سلیو شرٹ میں عادل کے سامنے بیٹھی تھی اور بار بار اپنے سنہری ریشمی بالوں میں انگلیاں چلاتی تھی۔ مئی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ایبٹ آباد میں کافی ٹھنڈی تھی۔

ہمایوں اور عادل ایک ہی ڈبل بیڈ کمرے میں تھے۔ ان کے ساتھ کرشل کا کمرہ تھا۔ اس سے آگے ایک کمرہ چھوڑ کر سرمد صاحب کا کمرہ تھا۔ سرمد صاحب جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کے عادی تھے۔ وہ صبح سویرے تین چار کلومیٹر کی دوڑ لگاتے تھے اور یہی ان کی جسمانی چستی کا راز تھا۔ عادل اور ہمایوں بھی جلد ہی سو گئے کیونکہ کل انہیں پھر سفر پر روانہ ہونا تھا۔ رات کی وقت پیاس کے سبب عادل کی آنکھ کھلی۔ منہ میں پیاز اور مچھلی کا ذائقہ تھا۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ یہ کوئی رات ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ اچانک اسے کھڑکی سے باہر ایک سایہ سا نظر آیا۔ چند لمحوں بعد اسے یوں لگا جیسے کرشل والے کمرے کا دروازہ ہولے سے کھلا ہے اور کوئی اندر داخل ہوا ہے۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟ ہمایوں تو ساتھ والے بیڈ پر سو رہا تھا۔ سرمد صاحب کا کمرہ بائیں جانب تھا اور سایہ دائیں طرف سے آیا تھا۔ ویسے بھی سرمد صاحب کو اس وقت کرشل کے کمرے میں جانے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر عادل نے کمرے کا دروازہ بے آواز کھولا اور باہر کوریڈور میں آ گیا۔ کوریڈور میں نیم تاریکی تھی۔ ویسے بھی کوریڈور یہاں آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ اس جانب کسی کے آنے جانے کا امکان نہیں تھا۔ پرانی عمارتوں کے انداز میں

سے یہاں پہنچا ہے۔ کرشل واضح طور پر اس سے دہلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کی ساری شوخی ایک طرح کے ہراس کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ وہ جیسے جلد از جلد نوجوان سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی مگر وہ اس کے ساتھ چکا جا رہا تھا۔ اس نے اس کے رخساروں اور ہونٹوں پر انگلیاں چلائیں پھر اسے ذرا دھکیل کر دیوار سے لگا دیا۔ اس کے طویل بو سے کرشل نے خاموشی سے برداشت کیا۔ اس کی خاموشی نوجوان کے لیے مزید حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ اس نے کرشل کو کئی بار چوما اور اپنے ہاتھوں کو آزادانہ کرشل کے سر پر حرکت دی۔ آخر کرشل جزبہ نظر آنے لگی۔ اس نے ناگوار لہجے میں نوجوان سے کچھ کہا۔ ان فقرہوں میں بس لیو پڈ..... ڈونٹ..... اور کریشی کے الفاظ ہی عادل کی سمجھ میں آ سکے۔ لیو پڈ غالباً اس نوجوان کا نام تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی خاص قسم کا تنازعہ ہے۔

یوں لگتا تھا کہ اب یہ ”لیو پڈ“ کسی بھی وقت کمرے سے باہر آ سکتا تھا۔ عادل کے ذہن میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کوئی اسے اس طرح روشندان سے چپکے ہوئے نہ دیکھ لے۔ وہ جلدی سے نیچے اتر آیا اور بے آواز چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کا یہ اقدام بالکل درست ثابت ہوا۔ صرف چند سیکنڈ بعد کرشل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور مردانہ قدموں کی آواز سنائی دی۔ لیو پڈ کا سایا کھڑکی کے سامنے سے گزر کر نیچے جانے والے زینوں کی طرف چلا گیا۔ عادل بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک سوچتا رہا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ کرشل جیسی شوخ و شنگ لڑکی اس نوجوان کے سامنے بھیگی ملی کیوں بنی رہی تھی۔ اس فقرے کا کیا مطلب تھا کہ اب اس کے بوائے فرینڈ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا؟ کرشل اور لیو پڈ ایک مادر پدر آزاد معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر وہ چوری جیسے کرشل سے ملنے کے لیے کیوں پہنچا تھا۔ یقیناً سرد صاحب کو بھی اس ملاقات کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ انہی سوالوں میں الجھا الجھا عادل، نرم و گداز بستر پر سو گیا۔ وہ رات کچھ عجیب انداز میں گزری۔ عادل کے دل و دماغ کو نہ جانے کن سوچوں نے جکڑے رکھا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب اسے ہماہوں نے جگایا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ لگتا تھا کہ کہیں سے لمبی دوڑ لگا کر آیا ہے..... یقیناً وہ بھی صبح سویرے سرد صاحب کے ساتھ ہی جاگنگ پر نکلا ہوا تھا۔ بعد ازاں عادل کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ کرشل بھی ان کے ساتھ شامل تھی۔ وہ بھی ٹریک سوٹ میں تھی۔ اس کے بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے۔ چہرہ

تمتایا ہوا تھا۔ رخسار سرخ سیبوں جیسے اور نیلگوں آنکھوں میں ستاروں کی چمک، وہ حسب عادت چپک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ہرگز اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ چند گھنٹے پہلے اپنے کمرے میں وہ ایک نہایت ناگوار و نا پسندیدہ صورت حال سے دوچار رہی ہے۔

دو بڑی جھپٹیں ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ چکی تھیں۔ ان میں سے ایک میں تو صرف ان لوگوں کا ساز و سامان ہی آیا تھا۔ دوسری میں وہ چاروں سوار ہوئے۔ اس جیب کا ڈرائیور مرجان خاں نام کا ایک قبائلی تھا۔ وقت رخصت سرد صاحب نے عادل کو بس اتنا بتایا کہ وہ ماںسرہ سے بٹام کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کا اگلا پڑاؤ ”داسو“ میں ہوگا جو قریباً نو گھنٹے کا سفر ہے۔ انہیں مسلسل شاہراہ قراقرم یعنی KKH پر چلنا تھا۔

پر پچ پہاڑی راستوں پر ان کا سفر جاری رہا۔ سورج نے ہلکے بادلوں کے پیچھے منہ چھپایا ہوا تھا۔ چوٹیوں پر برف تھی اور ٹنڈ منڈ پہاڑی درخت، سبز بستہ ہواؤں کی مار جھیل رہے تھے۔ ہمایوں بہت ہی کم بات کرتا تھا۔ کم گولوگ ڈرا پر اسرار نظر آتے ہیں ہمایوں بھی کچھ ایسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے بشرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نہایت سخت جان شخص ہے اور موقع پڑنے پر لڑائی بھڑائی بھی کر سکتا ہے۔ سخت جانی اور جفاکشی میں کرشل بھی کچھ کم نظر نہیں آتی تھی تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ دلکش اور خوش گفتار بھی تھی۔ وہ اپنی گلابی اردو میں گاہے بگاہے کوئی لطیفہ بھی سنا دیتی تھی۔ بہر حال سرد صاحب سے براہ راست بات کرتے ہوئے وہ ذرا مودب ہو جاتی تھی۔

عادل کے ذہن میں کئی سوال مسلسل کھلبلی مچا رہے تھے۔ یہ کرشل کون ہے؟ کیا وہ کسی بڑے لارڈ وغیرہ کی بیٹی ہے۔ وہ اتنے ذوق شوق سے سرد صاحب کی ہمسفر کیوں ہے؟ وہ خود کو اتنا بے خبر کیوں محسوس کر رہا ہے۔ سرد صاحب اسے اس سفر کا مقصد اور اس کی منزل کے بارے میں کیوں نہیں بتا رہے۔ وہ کون سا مقام ہوگا جہاں پہنچ کر وہ اسے فیصلہ کرنے کا اختیار دیں گے۔ عادل اپنی مرضی سے چلنے والا شخص تھا۔ وہ اپنا راستہ خود منتخب کرتا تھا۔ بہت سے سوالوں کے باوجود اگر وہ اب تک سفر کر رہا تھا تو اس کی وجہ صرف سرد صاحب تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن وہ آنکھیں کہاں تک بند کر سکتا ہے، اس کا فیصلہ ابھی ایک دو دن میں ہو جانا تھا۔ عادل کا ایک قافیہ یہ بھی تھا کہ شاید سرد صاحب اسے اس خاص مقام پر پہنچ کر کوئی

خاص چیز دکھانا چاہتے ہیں۔

☆☆☆

ان کا سفر پروگرام کے مطابق جاری رہا۔ اس کا مختصر احوال یہی تھا کہ وہ پہلے داسو پہنچے۔ وہاں ایک ریست ہاؤس میں رات گزاری اور کسی حد تک تھکن دور کی۔ چلاس تک انہوں نے مسلسل شاہراہ قراقرم یعنی KKH پر سفر کیا اور پھر ہیکرو روڈ کی طرف مڑ گئے۔ جوں جوں وہ بلند پہاڑی سلسلوں میں داخل ہو رہے تھے، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بلند و بالا برفانی چوٹیاں جیسے انہیں اپنے گھیرے میں لیتی جا رہی تھیں۔ ان لائننگی پہاڑی سلسلوں کو دیکھ کر یہی لگتا تھا جیسے روئے زمین پر برفانی چوٹیوں، ڈھلوانوں اور جے ہوئے ندی نالوں کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ ایسے مناظر سے گزرتے ہوئے بہاولپور کا تصور کرنا اور بہاولپور سے آگے اپنی جنم بھومی ”لالی گاؤں“ کے کھیتوں کھلیاؤں اور چلچلاتی دھوپوں کا تصور کرنا عادل کو بہت عجیب لگتا تھا۔ اس کا تصور کھلا کر اسے اپنی ماں کے پاس لے گیا اور پھر شہزادی کی کے پاس لے گیا۔ اس نے سوچا شاید شہزادی اپنی حویلی کی ہوادار چھت پر مکمل کا کڑھائی دار کرتے پہنے بیٹھی ہو۔ کوئی ملازمہ اس کے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی ہو۔ کرم داد کے باغ سے قلمی آموں کی پھلی ڈالی آگئی ہو اور اس کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خوشبو اسے عادل کی یاد دل رہی ہو۔ وہ جب کرم داد کے باغ میں تھا انہوں نے ایک ہی آم کو باری باری چوسا تھا اور وہ آم دنیا کا سب سے خوشبودار اور میٹھا آم تھا۔ کیا یہ یاد اور اس طرح کی دوسری چھوٹی چھوٹی یادیں اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں؟ کیا وہ چاندی کے تھیلے کی طرح ان یادوں کو خود سے دور کرنے..... دور ہٹانے کی کوشش تو نہیں کر رہی۔ اور اگر کر رہی ہے تو کیا یہ کوشش کامیاب ہو جائے گی؟

وہ سوچتا رہا اور لینڈ روور جیب دشوار راستوں پر دھناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ سرد صاحب کی اجازت سے ڈرائیور مرجان خاں میٹھی آواز میں گفتگو کرتا رہا۔ جانے والے میں تیرے قربان خدا حافظ۔ اے میرے خدائیں بہنوں کے مہمان خدا حافظ (وہ سپنوں کا لفظ اپنی طرف سے استعمال کر رہا تھا)

ان کا اگلا پڑاؤ اسکردو میں تھا۔ کنکورڈیا گلیشیر اور کے ٹو وغیرہ کی طرف جانے والوں کے راستے میں آخری بڑی آبادی اسکردو ہی ہے۔ سرد صاحب نے عادل کو بتایا تھا کہ سردیوں میں اسکردو کا درجہ حرارت منفی دس سے منفی

پندرہ سولہ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ بہر حال اب بھی یہاں سردی کم نہیں تھی۔ ہاتھ پاؤں جتنے محسوس ہو رہے تھے۔ تاہم عادل کے تینوں ہمسفروں بشمول کرشل پر یہ سردی کچھ زیادہ اثر نہیں کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ یا پھر انہوں نے اپنے اندر غیر معمولی قوت برداشت پیدا کر لی تھی۔

اسکردو اور کنکورڈیا گلیشیر کے درمیان ایک جگہ پر انہوں نے جھپٹیں چھوڑ دیں..... یہاں دو مقامی افراد کے ساتھ سرد صاحب کے معاملات پہلے سے طے تھے۔ ان دونوں افراد کے پاس چار صحت مند ٹٹو موجود تھے۔ سامان ان ٹٹوؤں پر لادایا گیا اور آگے کا سفر پانچواں شروع ہوا۔ عادل اس سے پہلے مری سے آگے نہیں گیا تھا۔ مری کی اونچائی چھ ہزار فٹ کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ اب اس کے ارد گرد اس سے چار گنا اور پانچ گنا اونچی چوٹیاں موجود تھیں۔ وہ خود کو ایک نہایت سبز بستہ لیکن طلسمانی ماحول میں محسوس کر رہا تھا..... ان کا اگلا پڑاؤ، برفانی پہاڑوں کی گود میں ایک نہایت حسین قطعہ زمین پر تھا۔ یہاں کیپ لگا دیے گئے اور کھانے پینے کا انتظام ہونے لگا۔ کھانے پینے کا انتظام فی الحال انہی لوگوں کے ذمے تھا جنہوں نے ٹٹو فراہم کیے تھے۔ دیسی مرغیاں، دنبے کی دو روست رائیں۔ تیز پشادری قبوہ، ڈرائی فروٹ اور تھوڑا ساٹن پیک نوڈ..... یہ تھا ذرا کمینو۔

رات کے کوئی بارہ بجے کا عمل تھا۔ عادل اور سرد صاحب، نیم گرم، جدید خیمے میں آنے سامنے بیٹھے تھے۔ عادل کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اہم گفتگو شروع ہونے والی ہے..... ہواؤں سے پھڑ پھڑاتے ہوئے خیمے سے باہر وہ عجیب منظر تھا۔ ٹھنہری ہوئی چاندنی نے برفانی چوٹیوں کو روپوشی تاج پہنا رکھے تھے۔ سپید ڈھلوانوں پر یہ چاندنی منعکس ہوتی تھی تو یوں لگتا تھا کہ چاندی کے آبشار بڑی خاموشی سے بہہ رہے ہیں۔ فلک بوس پہاڑوں کے درمیان یہ وادی ایک عظیم الشان پیالے کی طرح تھی اور اس پر کسی ماورائی منظر کا گمان ہوتا تھا۔ کسی گاڑی کا شور، نہ کسی پرندے کی چہچہاہٹ، نہ کسی مشینی اڑن کھٹولے کی آواز..... یہاں جو کچھ تھا بس خالص قدرت کے زمرے میں آتا تھا اور یہ جو کچھ بھی تھا، دل پر اثر کر رہا تھا۔ ایک ہیبت ناک لیکن دلکش اثر۔

سرد صاحب نے خیمے کے مختصر روزن سے دور کنکورڈیا گلیشیر اور گلیشیر سے آگے کے ٹو کی عظیم الشان چوٹی کو دیکھا اور ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ”تمہیں پہاڑوں سے دوستی کرنے کا کہا جائے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“

”میں سمجھا نہیں سر؟“

”کیا تم پہاڑوں میں سفر کرنا، ان پر چڑھنا پسند کرو گے؟“
عادل نے ذرا توقف سے کہا۔ ”میں نے آپ سے
سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے سر! اور میں سچ ہی بولوں گا۔ جو کچھ
آپ نے کہا، مجھے یہ پسند نہیں۔“
”لیکن تمہیں پیسا حاصل کرنا تو پسند ہے، کیونکہ وہ
تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری اور شہزادی کی ضرورت۔“
”جی سر۔“

”تو پھر اس کا مطلب یہی ہے کہ تم میرے پہلے
سوال کا جواب ”ہاں“ میں دے رہے ہو۔ عادل! ہمیں
چند ہفتے یہاں پہاڑوں میں گزارنے ہیں۔۔۔۔۔ میں تمہیں
اس قابل بنانا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کے ٹو کے پہلو میں
ایک خاص راستے پر سفر کر سکو۔ وہ ارد گرد پھیلی ہوئی بیسیوں
چوٹیوں میں سے ایک چوٹی ہے۔ وہ کے ٹو سے کافی چھوٹی
ہے لیکن وہ اس لیے مشکل ہے کہ ہم اس پر اس جانب سے
نہیں چڑھ سکتے جس جانب سے ہمیں چڑھنا چاہیے۔ ہمیں
اس کے لیے ایک مشکل راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور یہ
ہماری مجبوری ہے، اور یہی مسئلہ ہے۔“

”سر! میں کوہ پیما کی وغیرہ کے بارے میں زیادہ نہیں
جانتا لیکن۔۔۔۔۔ اگر آپ کوئی ایسی مشکل چوٹی سر کرنا ہی
چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو تجربہ کار کوہ پیما مل سکتے
ہیں۔ باہر کو تو چھوڑیے سر! ہمارے پاکستان میں ہی بڑے
بڑے ہم جو پڑے ہوئے ہیں اور۔۔۔۔۔ آپ تو ماشاء اللہ خود بھی
کوہ پیما کی کا بہت تجربہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی نظر
مجھ پر ہی کیوں پڑی ہے؟“

”بہت اچھا سوال ہے اور تمہیں کرنا بھی چاہیے تھا۔
اس سوال کا جواب یہ ہے عادل۔۔۔۔۔ کہ وہ ایک ایسی چوٹی
ہے جسے صرف تم سر کر سکتے ہو۔ ایک ایسا راستہ۔۔۔۔۔ جو شاید
صرف تمہارے جیسے ہی کسی شخص کے لیے بنا ہے۔“

”میں کچھ بھی سمجھ نہیں پار ہاں سر صاحب! میں جانتا
ہوں کہ کچھ چوٹیاں چڑھائی کے لیے بڑی مشکل سمجھی جاتی
ہیں لیکن شاید ہی کوئی ایسی چوٹی ہو جسے سر نہ کیا جاسکتا ہو۔
جب کے ٹو اور ماؤنٹ ایورسٹ جیسی چوٹیاں سر ہو چکی ہیں تو
پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ معاف کیجیے گا، مجھے آپ کی یہ
دوسری بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس چوٹی پر آسان
راستے سے چڑھنا نہیں جاسکتا۔ آپ آسان کو چھوڑ کر مشکل
راستہ کیوں اختیار کرنا چاہ رہے ہیں؟“
”ایک وجہ ہے۔ بہت ٹھوس وجہ۔ وہ بالکل بے آباد

چوٹی نہیں ہے۔ اس کی برقی ڈھلوانوں کے دامن میں کچھ
لوگ آباد ہیں۔ ایک کوہستانی برادری جو شاید مغل بادشاہ
جلال الدین اکبر کے زمانے سے وہاں موجود ہے۔ یہ
پاؤندوں کی نسل کے کچھ لوگ ہیں۔ سخت ترین موسموں میں
زندگی گزار لیتے ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی مہم جو کو اس چوٹی کی
طرف جانے نہیں دیتے۔“
”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”جس طرح کچھ لوگ نانگا پربت کو مقدس سمجھتے ہیں
اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے پاؤں تلے روندنے والوں پر
آفت نازل ہوتی ہے، اسی طرح اس چوٹی کے بارے میں
بھی مقامی لوگوں کا ایک پختہ عقیدہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس
چوٹی پر انسانی قدموں کا پہنچنا بہت بڑی نخواست کا سبب
ہوگا۔ وہ اس نخواست سے بچنے کے لیے کسی بھی ملکی یا غیر ملکی مہم
جو کو اس طرف کا رخ نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے ایک
ایسی فضا بنائی ہوئی ہے کہ ہم جوؤں کی توجہ بھی اس پر متاثر
غیر اہم چوٹی کی طرف سے ہٹ گئی ہے۔ وہ خود کو خواہ مخواہ
مشکل میں ڈالنے کے بجائے نسبتاً بہتر چوٹیوں کی طرف
متوجہ کر لیتے ہیں۔“

”یہ کون سی برادری ہے سر! میرا مطلب ہے ان کا
مذہب۔۔۔۔۔؟“

”مذہب کے بارے میں جاننے سے زیادہ اہم
سوال ایک اور ہے اور وہ یہ کہ کیا یہ واقعی کوئی روحانی معاملہ
ہے یا کچھ لوگوں نے اپنے کسی خاص مقصد کی وجہ سے اسے
روحانی یا مذہبی رنگ دے رکھا ہے۔۔۔۔۔ اور چوٹی پر پہنچنے کو
مخمس قرار دیتے ہیں۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھی سوال
پوچھنا چاہیے تھا۔“

”اس کا جواب یہ ہے عادل! کہ اصل میں یہ کوئی
روحانی معاملہ نہیں ہے۔ یہ کچھ خاص لوگوں کی سازش ہے،
جنہوں نے اپنے مقصد کے لیے سادہ لوح لوگوں کو بے
وقوف بنایا ہے اور وہ باہر سے آنے والے ٹریڈرز اور کھانڈ
کو ”پیک“ کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔“

”یہ کس طرح کا مقصد ہے سر؟“
”بہت خاص۔۔۔۔۔ اور بہت گہرا۔ ایک ناقابل فہم پیچیدہ۔“

زندگی کے دشوار گزار رستوں پر لمحہ بہ
لمحہ طوفان و باد و باران سے نبرد آزما اس
داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ۔۔۔

اس عورت کے بالوں کی رنگت قدرتی طور پر سنہری
تھی۔ وہ لمبے قدم اٹھاتی ہوئی میرے دفتر میں داخل ہوئی اور
بلا تکلف میری میز کے مقابل رہی ہوئی کرسی پر براجمان
ہو گئی۔ ”سوری، میں تمہارے بیچ میں۔۔۔۔۔ قفل ہوئی۔“ اس
نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا۔ اس کا لہجہ خلوص سے عاری تھا۔
میں نے منگل کی رات کے بچے ہوئے کھانے کی طرف
دیکھا۔ اس عورت نے بیچ مذبذب کا اظہار کیا تھا۔ اسے نہ تو بیچ
کہا جاسکتا تھا اور نہ ہی ڈنر۔ میں پیپر ٹیکن سے اپنا منہ پونچھنے
کے بعد بولا۔ ”میں تمہاری کیا دکر سکتا ہوں، مس۔۔۔۔۔؟“

زندہ لاش

سلیم انور

کبھی کبھی زندگی کچھ اس انداز میں انسان کو برتی ہے کہ وہ ایک زندہ
لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ ظاہر سائنسوں کی آمدورفت درحقیقت زیست
کے بقیہ لمحات کی الٹی گنتی بن جاتی ہے۔ وہ بھی انہی اعداد و شمار
میں الجھا حساب زیاں میں گم تھا کہ زندگی کا ایک قیمتی لمحہ
اس کے سامنے سو الیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا۔

تھکن زدہ ذہنوں کی غفلتوں کا عبرت اثر واقعہ



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بیکسٹر؟ میرا ذہن اسی نام کو گریڈ سے جا رہا تھا۔ ایک منٹ، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ مددگار نہیں آگئیں..... تمہارا کیلون بیکسٹر سے کوئی تعلق ہے؟ میں نے پوچھا۔

”براؤن مسٹر ڈیٹیلو۔“ اس نے مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرے ڈیڈی تھے۔“

کیلون بیکسٹر! وہ مٹی بارنارڈ میڈوف بننا چاہتا تھا۔ وہی برنارڈ میڈوف جس نے لوگوں کو منافع دینے کے بہانے بڑی بڑی رقیں بٹوری تھیں۔

کیلون بیکسٹر، ایک پرائیویٹ فرم کے متعدد پارٹنرز میں سے ایک تھا۔ یہ فرم دھوکا دے کر پیسے بٹورنے والی اسکیم چلا رہی تھی جس میں نئے سرمایہ کاروں کی رقم پرانے سرمایہ کاروں کو ان کی سرمایہ کاری پر ناقابل تصمین منافع دینے کے لیے استعمال کی جاتی تھی جبکہ حقیقت میں لوگوں کی رقم برائے نام ہی کہیں انویسٹ کی گئی ہوتی تھیں۔ بیشتر یہ رقم ایک جگہ سے دوسری جگہ گردش میں رہتی تھیں اور جہاں یہ رقم رک جاتی تھیں تو پتا چلتا تھا کہ وہ شخصیت کیلون بیکسٹر کی ہوتی تھی۔

اس فرم کے دیگر پارٹنرز میں سے ایک نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور وہ بے لفظوں میں اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں چوکی کے ساتھ اس بات کا پتا لگاؤں کہ وہ بیان کردہ کون سی کمپنیاں ہیں جہاں فرم نے سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔

جب میں نے تحقیقات کیں تو پتا چلا کہ ان میں سے بعض کمپنیوں کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ بعض وجود رکھتی ہیں لیکن انہوں نے اس فرم کا بھی نام ہی نہیں سنا تھا۔ بعض نے فرم کے حوالے سے رقم تو دیکھی تھی لیکن انہوں نے بھی اتنا بھاری منافع کسی فرم کو نہیں دیا تھا جتنا کہ فرم اپنے سرمایہ کاروں کو پورٹ کر رہی تھی۔

میں نے اپنے کلائنٹ کو مکمل تفصیل سے آگاہ کر دیا تو یہ معاملہ ڈسٹرکٹ انٹرنی کے سپرد کر دیا گیا۔ تب یہ پوری اسکیم زبردست مالی تباہی کا شکار ہو گئی اور کئی سو ملین ڈالر زکھاتے میں غیر موجود پائے گئے جن کا کہیں کوئی اتنا پتا نہیں تھا اور نیلی آنکھوں والا تیز طرار کیلون بیکسٹر کلہرے میں جا پہنچا۔ تمام انگلیاں اسی کی جانب اٹھ گئیں کہ وہی دھوکے بازی سے رقم بٹورنے والی اسکیم کا بانی تھا۔ اس نے پرجوش جذباتی انداز میں اپنے جرم کی صحت سے انکار کیا لیکن عدالت نے اسے مجرم قرار دے دیا اور اسے لگ بھگ ایک صدی کی قید کی سزا سنائی گئی۔

نے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا۔

”میں بے وقوف ہرگز نہیں ہوں، مس.....“ میں نے جواب دیا۔

اس بات پر اس کی بھوین تن گئی۔ ”میں اتفاق نہیں کرتی مسٹر پیٹر مین۔ اور میرا نام مارگریٹ ہے..... مارگریٹ بیکسٹر!“

بیکسٹر؟ یہ نام سن کر میرے کانوں میں جیسے دور کوئی گھنٹی سی بجی ہو لیکن تب بھی مجھے اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں آیا۔ اس کی شکل و صورت اور حلیہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ میں اسے بھلا سکتا۔ اس نے نفیس تراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بال بے عیب انداز اور مخصوص طرز سے سنوارے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگیں لمبی اور نہایت خوب صورت تھیں۔ اس نے پیروں میں قیمتی جوتے پہنے ہوئے تھے اور وہ متاثر کن انداز میں کرسی پر براجمان تھی۔

بیکسٹر؟ میرے ذہن میں وہ نام گونجا۔

وہ میرے رد عمل کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی مددگار نیلی آنکھیں میری میز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے تاثرات نے مجھے اپنی میز پر موجود سامان کے ڈھیر کے بارے میں احساس دلادیا۔ پرانے میگزین، نوٹ بکس، پرانے قلم جن میں سے چند شاید اب بھی کام کرتے ہوں، کینڈی کے دو یا تین ریپر۔

تب مجھے اچانک یاد آیا کہ یہ سب چیزیں قدرے گرد میں آئی ہوئی ہیں اور میں نے انہیں چند دنوں سے جھاڑا ہی نہیں ہے۔ انہیں جھاڑ پونچھ کر رکھنا ہوگا اگر میں یہاں موجود رہا تو، میں نے خود سے کہا۔

”وہ کیا ہے؟ کوئی یادگار؟“

اس کی نگاہ اس نیوز پیپر آرٹیکل پر مرکوز تھی جو ایک فریم میں دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چند دیگر تراشے بھی تھے۔ یہ میرے ان چند ابتدائی کیسز میں سے ایک کے بارے میں تھا جب میں نے پولیس فورس چھوڑی تھی اور اپنی پرائیویٹ ایجنسی کھول لی تھی۔

”ہاں، یہ ایک بناوٹی اغوا کا کیس تھا جس کو حل کرنے میں، میں نے مدد کی تھی۔ شاید تم نے اس کیس کے بارے میں سنا ہو۔“ انھم نامی ایک بینکر کے متعلق یہ گمان ہوا تھا کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے.....

”یہ میرے وقت سے پہلے کی بات ہوگی۔“

مارگریٹ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے اور پھر اس کے ہاتھ میں دے ہوئے ریوالت کی طرف دیکھا۔

یہ شاید تین یا چار سال پہلے کی بات تھی..... اور اب اس کی بیٹی ان ہی نیلی آنکھوں کے ساتھ میرے مقابل بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں ریو الور تھا جو اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی کانپا نہیں تھا۔ اس کا رخ بہ دستور میرے سینے کی جانب تھا۔

”میں تمہارے احساسات بخوبی سمجھ سکتا ہوں مس مارگریٹ۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارے ڈیڈی نے بے شمار لوگوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ مجھے مار ڈالنے سے انہیں قید سے رہائی نہیں ملے گی۔“ میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں پُر سکون لہجے میں کہا۔

”وہ مر چکے ہیں۔“

”مر چکے ہیں؟“

”دماغ کی طرف دوران خون رک جانے کے سبب ان پر جیل میں اچانک غشی طاری ہو گئی تھی جو ان کی موت کا باعث بن گئی۔“ مارگریٹ نے بتایا۔

”مجھے تمہارے ڈیڈی کی موت کا سن کر افسوس ہوا، مس مارگریٹ۔“ میں نے معمول کے مطابق تعزیت کرتے ہوئے کہا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مجھے مزید پسینا آنا شروع ہو گیا ہے۔ ”لیکن تمام شہادتیں تمہارے ڈیڈی کے خلاف تھیں.....“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”انہیں سازش کے ذریعے پھانسا گیا تھا۔“

میں نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ”نقصانات کے بارے میں متعدد ثبوت اور شہادتیں پیش کی گئی تھیں.....“

”اوہ مسٹر پیٹر مین، تم حقیقت میں بے وقوف ہو۔ وہ ثبوت اور شہادتیں فرم کے بانی پارٹنرز کی جانب سے تھیں جنہوں نے شہادتوں کے عوض معاملات طے کر لیے تھے۔ اس ڈیل کے نتیجے میں انہیں معمولی سزائیں ہو گئی تھیں اور اس سات سال سے زائد عرصے میں انہوں نے اپنی سزائیں بھگت لی تھیں۔ اب وہ سب کے سب کہاں ہیں؟“ میں یہ سن کر بھونچکا رہ گیا۔

”میں پوچھ رہی ہوں کہ وہ سب کے سب اب کہاں ہیں مسٹر پیٹر مین؟ اور وہ تمام رقوم کہاں ہیں جو کسی کھاتے میں موجود نہیں تھیں اور جن کا آج تک کچھ پتا نہیں چلا؟“ مارگریٹ نے کہا۔

مجھے اس کے ذہنی صدمے پر ہمدردی محسوس ہوئی لیکن..... اس نے یہ کیا کہا کہ اس بات کو سات سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے..... کیا واقعی اتنا عرصہ بیت چکا ہے؟

”وہ اسکیم بکھرا شروع ہو چکی تھی۔“ مارگریٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتایا گیا کہ معیشت کی رفتار قدرے سست پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے سرمایہ کاروں کی رقوم اتنی زیادہ نہیں آ رہی تھیں کہ جو کھاتوں کی بڑے منافعوں کی طلب کو پورا کر سکتیں۔ وہ تمام پرانے سرمایہ کاروں کا منافع طے شدہ ریٹ سے ادا کرنے سے قاصر تھے۔ اب ان کی یہ پوری اسکیم اس طرح ڈھیر ہو رہی تھی جیسے کاغذی مکان تیز ہوا کے جھونکوں سے بکھر جاتا ہے۔ انہیں اب ایک قربانی کا بکرا ڈھونڈنا ضروری ہو گیا تھا اور.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور شانے اچکاتے ہوئے غصے سے مجھے دیکھنے لگی۔

”مس مارگریٹ، تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ فرم کے دیگر ساتھیہ داروں نے تمہارے ڈیڈی کے خلاف سازش کی تھی لیکن جو شخص میرے پاس آیا تھا، بھلا سانا تمہارا اس کا..... آپ گارنٹیڈ! اسے جب میں نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ پیش کی تھی تو اسے حقیقت میں شاک پہنچا تھا اور وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”وہ جبرئیلی گارنٹیڈ ہوگا..... فرم کے بانی پارٹنرز میں سے ایک۔ اس نے عدالت میں جرم کا اقرار کیا، جیل کالٹے کی مختصر سزا ہوئی اور اب رہائی پانے کے بعد کوسٹاریکا میں عیش کی زندگی گزار رہا ہے۔ کیا کسی کو حیرانی ہے کہ اس نے یہ سب کیسے کیا؟ اس کے پاس عیش و عشرت کی موجودہ زندگی کے لیے سرمایہ کہاں سے آیا؟ اور کیا بھی اس نے یہ بات بتائی کہاں تحقیقات کے لیے اس نے تمہارا چناؤ کس طرح کیا تھا؟“

میں یہ سن کر قدرے چونک گیا۔ لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مارگریٹ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں

نہایت نازک اور پیچیدہ مالی معاملات کے بارے میں تحقیقات کرتا تھا؟ تمہارا تجربہ طلاق کے چند کیسوں، کم اجرت ملازمتوں کے رقوم چرانے کے کیسوں تک محدود تھا۔ کیا یہ تجربہ تمہیں اس نوعیت کے پیچیدہ مالی معاملات کے کیس کو حل کرنے کے لیے حقدار بناتا تھا؟ تمہارے ساتھ کھیل کھیلایا تھا، مسٹر پیٹر مین۔“

مارگریٹ نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے تمہاری تھوٹنی کے آگے ایک بڑی فیس پر مبنی نوٹوں کی گڈیاں لہرائیں اور تم ایک کتے کے ماتحت ہلاتے ہوئے ان کے اشاروں پر کام کرتے رہے اور.....“

اپنی مرضی کے مطابق تمہیں چلاتے رہے۔“ مجھے غصے میں آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے جھمی لہجے نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔ کیا میں یہ سب کچھ غلط سمجھتا تھا؟

نہیں، تمام ثبوت تو موجود تھے لیکن..... انہیں تلاش کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ بھاگ دوڑ تو بہت کرنی پڑی تھی۔ ہاں لیکن انہیں تلاش کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ کسی پزل کو حل کرنے کے لحاظ سے تمام ٹکڑے نمودار ہو کر بہ آسانی صحیح طور پر فٹ بھی ہو گئے تھے۔ شاید کثیر فیس کی بنا پر میں نے بہت زیادہ سوچ و بچار سے کام لیا ہوگا۔ ثبوت کا کھوج لگانے میں..... کیا میں نے کہیں غلطی کی تھی؟ کیا مجھے بھی اسی طرح بے وقوف بنایا گیا تھا جیسے کہ مارگریٹ کا کہنا تھا کہ اس کے باپ کو بے وقوف بنا گیا تھا؟

میرے ذہن میں ایک ظالم سا برہنہ تھا۔ نہیں، مجھے بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ میں ایک تجربہ کار انوسٹی گیشن تھا۔ میں نے ایک نگاہ اخبارات کے ان تراشوں پر ڈالی جو فریم شدہ حالت میں دیوار پر آویزاں تھے۔ یہ ان کیسز سے متعلق تھے جو میں نے حل کیے تھے اور اس لمحے میں نے پہلی بار یہ بات نوٹ کی کہ وہ تراشے وقت گزرنے کے ساتھ پہلے پڑ چکے تھے۔ ایسا کب ہو گیا تھا؟ کیا مجھ سے واقعی غلطی سرزد ہوئی تھی؟

مارگریٹ کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں لیکن منہ سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ میرے ذہن میں خیالات کی جنگ جاری تھی۔ مارگریٹ جاذبِ نظر اور بھرپور شخصیت کی مالک تھی۔ اس کی موجودگی نے میرے تنگ سی جگہ میں محدود آفس کی حالت زار کو شرمناک بنا دیا تھا۔ نہیں، نہیں..... میرے آفس کی شرمناک حالت زار اس کی موجودگی کی وجہ سے نہیں تھی۔ اس کی وجہ وہ تمام عرصہ تھا جو میری توجہ کے بغیر گزر چکا تھا۔ ایسا کیوں کر ہوا تھا؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پولیس میں بیس سال کا عرصہ گزارنے کے بعد جب میں ریٹائر ہوا تھا تو میں نے اپنے اس پیشے کا آغاز پُر اعتماد امیدوں اور بڑی اونچی توقعات کے ساتھ کیا تھا۔ اپنا ذاتی دفتر کھولنے وقت میرے حوصلے بڑے بلند تھے..... اور اچانک مجھے یہ یاد رکھنے میں دشواری پیش آنے لگی کہ اس بات کو کتنا عرصہ بیت چکا ہے؟ لیکن اس دوران میں نے چند بڑے کیس بھی نمٹائے تھے۔ میں نے ایک بار پھر ایک نگاہ اخبارات کے تراشوں پر ڈالی اور ان کا زردی مائل نیلا پن دیکھ کر تیزی سے نظریں ہٹا دیں۔ پھر اپنی میز پر کھلی ہوئی فائلوں پر نگاہ بٹادی..... ایک کیس کسی نو عمر ملازم کا تھا جس پر ایک ریڈیو ہٹ اسٹور سے کچھ سامان چوری کرنے کا الزام تھا..... ایک کیس کی بے وفائیوں سے متعلق تھا۔ وہ تمام کے تمام ایسے

ہی معمولی نوعیت کے کیسز تھے۔

میں پچھلے چند برسوں کے دوران حل کے جانے والے کیسز کے تعلق غور کرنے لگا۔ میں نمایاں قسم کا کوئی ایک کیس یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ایسا کوئی بھی کیس ذہن میں نہیں آیا۔ صرف ان کیسز کی ایک لمبی قطار تھی جو میاں بیوی کی بے وفائی اور بچوں کے معمولی جرائم سے متعلق تھے۔

میں نے اپنی گردن گھمائی اور کھڑکی سے باہر سڑک پار ہائی رائز آفس ٹاور کی عالی شان عمارت پر نظریں جمادیں۔ مجھے یاد تھا کہ جب اس نئی عمارت کی تعمیر ہو رہی تھی تو میں کس طرح اسے دیکھا کرتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ میں اس پرانی بلڈنگ کے چھوٹے خستہ حال دفاتر میں اپنے کام کا آغاز کر رہا ہوں اور پھر بالآخر سامنے نئی عمارت کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس نئے چمکدار ٹاور میں اپنے اسٹاف اور عمدہ فرسٹنگ کے ساتھ ایک فرسٹ کلاس انوسٹی گیشن کا بزنس تعمیر کر کے وہاں منتقل ہو جاؤں گا۔

لیکن آج بھی میں نے یہ دستور سڑک پار نہیں کی بلکہ اسی پرانے دفتر میں موجود تھا اور حسرت بھری نگاہوں سے اس عالی شان ہائی رائز ٹاور کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔

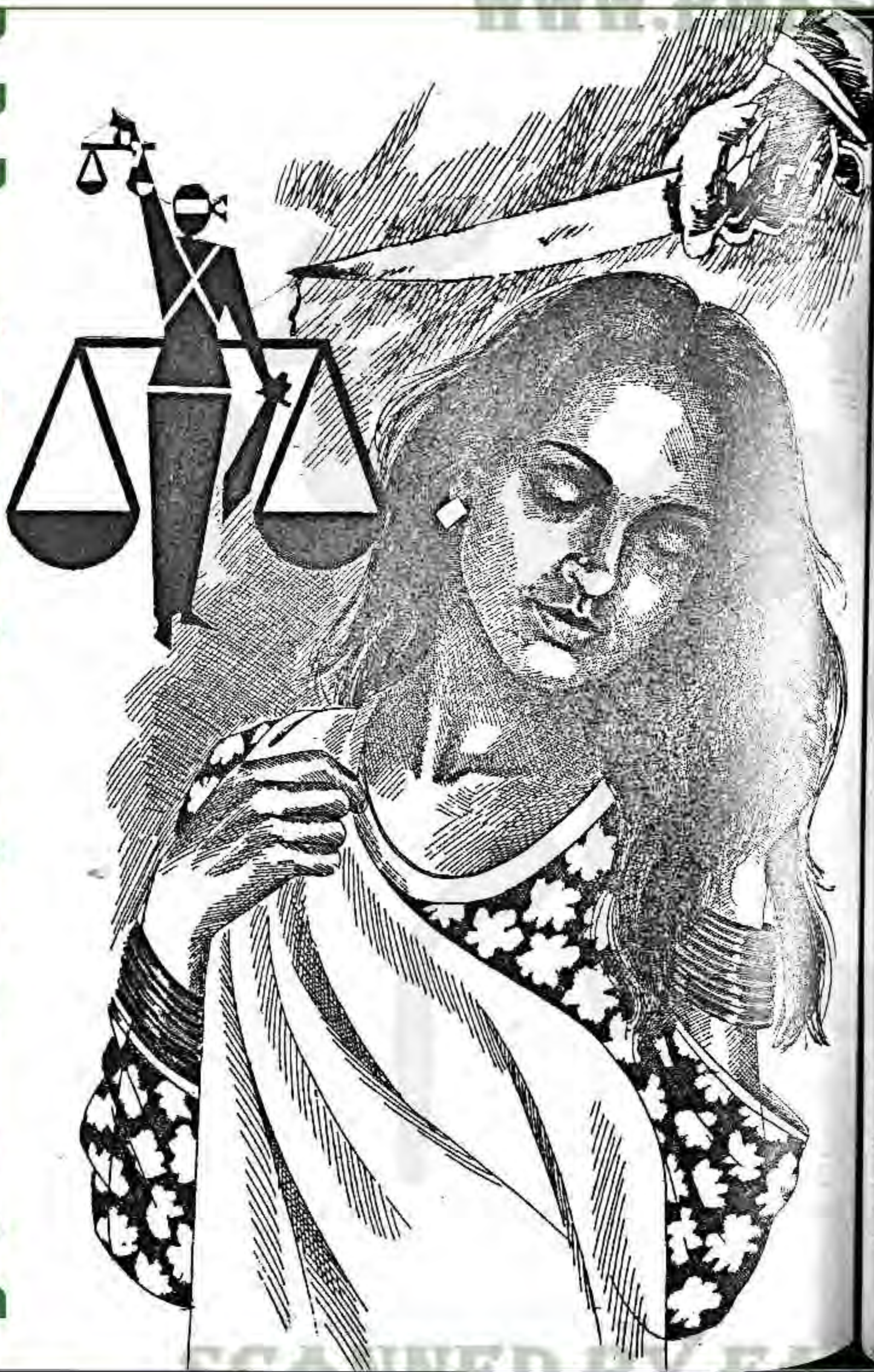
پھر میں چونک پڑا۔ میں مارگریٹ ہیکسٹر کو قطعی فراموش کیے ہوئے تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کھڑکی سے سڑک پار عالی شان عمارت کو کتنی دیر تک غفلتی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ میں نے گردن واپس گھماتے ہوئے اپنی نظریں مارگریٹ پر مرکوز کر دیں تو دیکھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے۔

مزید یہ کہ اب اس کے ہاتھ میں کوئی ریو الور بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرے دفتر پر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر دوبارہ مجھ پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”میں یہاں تمہیں مارنے کے لیے آئی تھی مسٹر پیٹر مین..... لیکن اب میں دیکھ رہی ہوں کہ تم تو پہلے ہی مرے ہوئے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ ہلٹی اور ڈگ بھرتے ہوئے میرے دفتر سے نکل گئی۔

کمرے میں اب اس کے پرفیوم کی مہک باقی رہ گئی۔ میں اپنی حالت زار، دفتر کی خستہ حالی اور اپنے خوابوں کے چکنا چور ہونے پر ایک زندہ لاش کے مانند اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔





انگن ٹیڑھا

سرزا محب بیگ

دور حاضر میں انسان ایمانداری کر کے گویا مشکلات کو دعوت دے لیتا ہے کیونکہ یہ تو گئے وقتوں کا قصہ ہے جب ایمانداری کے ساتھ ساتھ وفا شعاری بھی زمانے کا چلن تھی مگر چال ہوا چلن ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں... اس کی سادگی... اور پسند کی شادی... اس کے گلے کا طوق بنتی جارہی تھی اور رشتے پیروں کی زنجیر بنے اسے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے ایسے میں مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق اس نے وہ انتہائی قدم اٹھالیا جس کی اسے خود بھی توقع نہ تھی لیکن وقت کے آئینے میں اسے حالات کی جو صورت نظر آئی اسے دیکھ کر وہ گویا لرز گیا... اسی لیے کہتے ہیں کہ رشتوں کی لائٹھی زندگی کے سفر کو آسان کر دیتی ہے بشرطیہ خلوص اور محبت بھی ساتھ ساتھ چلے تو... ورنہ امتحان، آزمائش اور وہم و گمان کی تیز دھوپ زندگی کے تمام رنگوں کو پھیکا کر دیتی ہے۔

ایک ٹیڑھے انگن کی رو داد جس میں آفتوں نے ڈیرا بجالایا تھا

”عدالتی چکروں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے غوری صاحب۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ادھر برآمدے میں ایک کلاسٹ نے گھیر لیا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی پھر بھی وہ زبردستی مت کر کے مجھے کینٹین لے گیا اور جب تک میں نے اس کی جیب سے جائے کے ساتھ بسکٹ نہیں کھالیے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ ابھی اسے مطمئن کر کے بھیجا ہے۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

”غوری صاحب! آپ کا چہرہ اور آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آپ نے کسی وجہ سے مجھے روکا ہے۔“

”وہ بات دراصل یہ ہے بیگ صاحب!“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دینے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی چند منٹ پہلے ایک شخص آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ابھی تک عدالت میں موجود ہیں۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ بیگ صاحب تو جا چکے ہیں۔“

ایک روز میں عدالت سے نکل کر پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسٹیپ فروش کے اسٹال پر ایک شخص نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ ”بیگ صاحب! ایک منٹ!.....“

میں رک گیا اور مڑ کر پکارنے والے کو دیکھا۔ وہ ایک اسٹیپ فروش تھا۔ میں نے اسے اکثر اس اسٹال میں بیٹھے دیکھا تھا اور اس کا صورت آشنائی نہیں بلکہ نام شناس بھی تھا۔

”غوری صاحب!..... فرمائیے؟“ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

”کیا ابھی آپ عدالت کے کمرے سے نکلے ہیں؟“ غوری نے پوچھا۔

”ہاں!.....“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کوئی خاص بات؟“

اس نے رست و اج پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

”آپ تو روزانہ اس سے بہت پہلے رخصت ہو جاتے ہیں۔ آج کافی دیر نہیں ہو گئی؟“

”اس شخص نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟“ میں نے استفسار کیا۔
”علی مراد.....!“

میں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا لیکن فوری طور پر مجھے یاد نہ آ سکا کہ میں نے کسی علی مراد کو آج عدالت آنے کا کہا ہو۔ اس دوران میں غوری یک تک مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ابھمن زدہ لہجے میں کہا۔ ”یہ علی مراد مجھے کس سلسلے میں ڈھونڈ رہا تھا؟“

”آپ علی مراد کے حوالے سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔“ غوری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا اندازہ تو یہ کہتا ہے کہ وہ آپ کے لیے کوئی نیا کلاسٹ ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے آپ کے دفتر کا ایڈریس سمجھا دیا ہے۔ وہ آپ کو وہیں مل جائے گا۔ کافی ضرورت مند نظر آ رہا تھا۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی، غوری کا شکریہ ادا کیا اور تیز قدموں کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

میں نے اپنے پسندیدہ مخصوص ہوٹل سے ڈٹ کر کھانا کھایا اور آفس پہنچ گیا۔ میرا آفس، سٹی کورٹ کے نزدیک ہی ایک کثیر الطور عمارت میں واقع تھا اور مذکورہ ہوٹل میرے راستے میں پڑتا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا کہ عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہونے کے بعد میں ہوٹل میں بیٹھ کر تسلی سے کھانا کھاتا پھر آفس میں جا کر کلائنٹس سے ملاقات شروع کر دیتا تھا۔

اس روز میں حسب معمول جب اپنے آفس پہنچا تو وزیر زلائی خاصی آباؤ نظر آئی۔ میں نے وہاں موجود کلائنٹس پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور اپنے جیمبر کی جانب بڑھ گیا۔ یہی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک علی مراد میرے ذہن سے سلب ہو چکا تھا۔

لگ بھگ ایک گھنٹے بعد میری سیکریٹری نے انٹرکام پر بتایا۔ ”سرا! ایک صاحب کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے پاس اپائنٹمنٹ نہیں تھا اس لیے میں نے انہیں روک رکھا۔ ابھی میں انہیں بھیج رہی ہوں۔“

”کیا اپائنٹمنٹ والے تمام کلائنٹس نمٹ گئے؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں سر.....!“ سیکریٹری کی پُر اعتماد آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔
”ٹھیک ہے..... تم ان صاحب کو اندر بھیج دو۔“ میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک پستہ قامت، فرہ اور گول منول سا شخص میرے جیمبر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کرسی پہنچ کر بیٹھ گیا۔
”بیک صاحب! میرا نام علی مراد ہے۔ میں دن میں آپ کی تلاش میں سٹی کورٹ کی طرف بھی گیا تھا.....“

اسی لمحے غوری اسٹیمپ فروش کی بات میرے ذہن میں گھوم گئی۔ میں نے صورت حال کو سنبھالتے ہوئے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

”ہاں، مجھے پتا چل گیا تھا لیکن میں ایک ایسے معاملے میں الجھا ہوا تھا کہ دفتر پہنچنے میں مجھے دیر ہوئی خیر.....“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ”آپ بتائیں..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

بات ختم کرتے ہی میں نے رف پینڈ اور قلم سنبھال لیا۔ علی مراد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بیک صاحب! آپ کے پاس مجھے نفیس احمد نے بھیجا ہے اور نفیس دلا یا ہے کہ آپ تسلی بخش انداز میں میرا کام کر دیں گے۔“

”کون نفیس احمد؟“ میں پوچھنے پر تیار نہ رہ سکا۔
”نفیس الیکٹرونکس والے نفیس صاحب۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”صدر کی الیکٹرونکس مارکیٹ میں جن کی فرنیچر، فریزر اور وائر کولر کی دکان ہے۔“

”اوہ..... وہ نفیس صاحب!“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ ان کو کیسے جانتے ہیں؟“

نفیس احمد سے میری دیرینہ شناسائی تھی۔ مجھے یا میرے کسی بھی تعلق دار کو کبھی فرنیچر یا فریزر وغیرہ خریدنا ہوتا اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرتا تو میں اسے سیدھا ”نفیس الیکٹرونکس“ کی راہ دکھا دیا کرتا تھا اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ نفیس احمد نے بھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔

”الیکٹرونکس مارکیٹ ہی میں میری بیوی کی دکان ہے۔“ علی مراد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔
”نفیس صاحب سے میری اچھی دعا سلام ہے۔“

”بہت خوب.....!“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”اب آپ جلدی سے مجھے اپنے مسئلے کے بارے میں بتادیں تاکہ میں فیصلہ کر سکوں کہ اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”مسئلہ میرا نہیں، فرقان کا ہے۔“ علی مراد نے بتایا۔

آدھن ٹیڑھا

میں پیش کر کے اس کا ریمائنڈ لے لیا ہوگا اور اس وقت وہ پولیس کسٹڈی میں ہے؟“

”جی..... آپ کا اندازہ درست ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”وہ کون سے تھانے میں بند ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”علی مراد نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔“

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”علی مراد صاحب! ابھی تک آپ نے مجھے اپنے داماد کے بارے میں جو بھی معلومات فراہم کی ہیں وہ بہت ہی اچھی ہوئی اور ناممکن ہیں۔ اس صورت حال میں، میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے پوری تفصیل کے ساتھ یہ پتا ہونا چاہیے کہ آپ کے داماد اور قاضی وحید کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا رہی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس نازک موقع پر جبکہ فرقان قتل کے الزام میں، ریمائنڈ پر ہے تو اس کے گھر والے کہاں غائب ہیں..... ایسے حالات میں فرقان کے والدین کو تو سب سے آگے حرکت کرتے ہوئے نظر آنا چاہیے.....؟“

”آپ بجا فرما رہے ہیں بیک صاحب!“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”انہیں واقعی سب سے زیادہ متحرک نظر آنا چاہیے مگر..... اوہ لوگ فرقان سے سخت ناراض ہیں۔“ علی مراد نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”کچھ لیں کہ مرنا جیتا ختم کیا ہوا ہے انہوں نے.....!“

”اس بائیکاٹ کا کوئی خاص سبب؟“

”فرقان کی شادی.....!“

”اوہ.....!“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”یعنی وہ لوگ آپ کی بیٹی اور فرقان کی شادی کے خلاف تھے؟“

”سخت خلاف!“ وہ قطعیت سے بولا۔ ”تاہم اس شادی کے موقع پر کسی طرح منت خوشامد کر کے فرقان نے انہیں راضی کر لیا تھا۔ وہ لوگ نہ صرف بڑے بھرپور انداز میں اس شادی میں شریک بھی رہے بلکہ شادی کے بعد لگ بھگ تین ماہ تک عظیمی اپنی سسرال میں بھی رہی تھی پھر وہاں فتنہ فساد اس قدر بڑھ گیا کہ فرقان کو گھر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے بعد ہی وہ کرایے کے مکان میں گیا تھا۔“

”عظیمی آپ کی بیٹی کا نام ہے.....؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو عظیمی اور فرقان کی ”لو میرج“ ہے؟“

”آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔“

”یہ فرقان کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔
اس نے جواب دیا۔ ”فرقان میرا داماد ہے۔“

”اوہ.....!“ میں نے علی مراد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کا داماد کسی انداز میں آپ کی بیٹی کو بھگ کر رہا ہے۔“

”نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”فرقان تو اتنا اچھا انسان ہے کہ اس کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف پہنچ ہی نہیں سکتی اور شاید..... شاید اس کا یہی اچھا پن اس کے لیے مصیبت بن گیا ہے.....“

”کیسی مصیبت علی مراد صاحب؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”فرقان کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

”یہ کب کی بات ہے؟“

”دو روز پہلے کی۔“ اس نے بتایا۔

”فرقان پر کس کے قتل کا الزام ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”مسز نکیت کے قتل کا الزام.....!“

”یہ مسز نکیت کون ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔
”فرقان کے مالک مکان کی بیوی تھی وہ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”فرقان کے ساتھ بے درپے زیادتی ہوئی ہے بیک صاحب۔“ نرگس کے شوہر قاضی وحید نے پہلے اسے اپنے گھر میں ایک کرایے دار کی حیثیت سے رکھا۔ پھر گھر کی بالائی منزل پر شفٹ کر دیا اور آخر میں گھر فروخت کرنے کے بہانے اس کو بے دخل کر دیا۔ جب فرقان نے اس سے حساب مانگا تو ایک گہری سازش کے تحت اس قتل کے الزام میں بند کر دیا۔“

”اوہ..... دلچسپ اور افسوس ناک واقعہ ہے۔“ میں نے رف پینڈ پر قلم کھینچتے ہوئے کہا پھر نگاہ اٹھا کر علی مراد کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”آپ نے بتایا ہے کہ فرقان کو دو روز پہلے پولیس نے گرفتار کیا ہے۔ آج اتوارہ اکتوبر ہے۔ اس کا مطلب ہے، فرقان کی گرفتاری.....“

”پندرہ اکتوبر کی رات۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”فرقان کو پندرہ اکتوبر کی رات میرے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔“

”ہوں.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”گو یا پولیس نے سولہ اکتوبر کی صبح فرقان کو عدالت

میں لایا۔“

میں لایا۔“

محبت کی شادیوں میں عموماً سماجی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی لڑکی کو اور کبھی لڑکے کو اور بعض حالات میں دونوں کو۔ اسی کھینچا تانی اور کشمکش میں میاں بیوی ایسے معاشرتی جمہیلوں میں پھنس جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے پر توجہ دینے کی فرصت ہی میسر نہیں آتی۔ پیار محبت تو رہی دور کی بات، وہ ایک دوسرے سے ڈھنگ سے بات کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ لو میرج کرنے والوں کو ایک دوسرے سے سنگین شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے جتنی شدت کی محبت اور چاہت کی توقع کر رہے ہوتے ہیں، زمینی حقائق اس کی اجازت نہیں دیتے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے محبت کی شادیوں کی غالب تعداد ناکامیاب رہتی ہے۔ یا تو یہ بندھن قائم ہی نہیں رہتا اور یا پھر زہر کے گھونٹ پی پی کی زندگی گزارنا ہوتا ہے۔

”آپ نے فرقان کے والدین کو اس افسوسناک واقعے کی اطلاع دی؟“ میں نے علی مراد سے استفسار کیا۔ ”براہ راست تو نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن کسی تیسرے شخص کے توسط سے میں نے ان تک اس معاملے کی خبر پہنچا دی ہے۔“

”انہوں نے کیا رد عمل ظاہر کیا ہے؟“ ”وہ اپنی ضدیہ الفاظ دیکر اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں۔“ علی مراد نے دھکی لہجے میں جواب دیا۔ ”ان کا موقف بہت ہی سفاک اور غیر انسانی ہے۔ ان کے مطابق جب فرقان نے گھر چھوڑا تھا وہ ان کے لیے مر گیا تھا۔“ ”ہوں.....“ میں نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”یہ صورت حال خاصی گھبر اور افسوس ناک ہے۔ بہر حال.....“ لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”آپ مجھے فرقان اور قاضی وحید کے باہمی معاملے کے بارے میں بتا رہے تھے.....؟“ ”یہ معاملہ بھی خاصا الجھا ہوا اور پیچیدہ ہے۔“ وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو سمجھانے کے لیے تھوڑی تفصیل میں جانا ہوگا۔“

”میں سن رہا ہوں.....“ میں نے سنجیدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ روانی سے بولتے جائیں۔“ آئندہ آدمے گھٹنے میں علی مراد نے مجھے جو تفصیل فراہم کی، میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔

واضح رہے کہ ان میں سے بہت ساری باتیں مجھے بعد میں اپنی تحقیق کے دوران میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب اور تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے میں نے انہیں یہاں بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح چند باتیں میں فی الحال گول کر رہا ہوں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسی شام حلقہ قحانے جا کر میں نے ملزم فرقان سے بھی ایک تفصیلی ملاقات کر لی تھی۔ فرقان بھرے بھرے بدن کا مالک ایک مناسب قامت اور گندی رنگت والا جوان تھا۔ اس کی عمر ستائیس سال رہی ہوگی۔ مجھے وہ ایک تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا انسان لگا۔ اس نے میری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا تھا۔ علی مراد کی زبانی مجھے تک جو حالات پہنچے تھے، فرقان نے ان کی مکاحقہ تصدیق بھی کی تھی۔

☆☆☆

فرقان نے کچھ عرصہ پہلے یونیورسٹی سے کامرس میں ماسٹرز کرنے کے بعد بینکنگ لائن جو ان کر لی تھی۔ اس لیلڈ میں قدم جانے کے لیے اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کا باپ کفیل احمد ایک ریٹائرڈ ٹیکر تھا اور اس کی خواہش پر فرقان نے کامرس کا انتخاب کیا تھا۔ کفیل احمد ریٹائرمنٹ کے بعد ”شیراز“ کی دنیا کی طرف نکل گیا تھا۔ اسٹاک مارکیٹ پر اس کی گہری نظر تھی اور وہ مختلف طریقوں سے ماہانہ اتنا کماتا تھا کہ گھر میں کسی مالی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

کفیل احمد کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑا فرقان، اس سے چھوٹی انیلا جس کی شادی فرقان سے پہلے ہو گئی تھی۔ انیلا کا شوہر فرہاد بھی ایک پرائیویٹ بینک ہی میں ملازم تھا۔ انیلا اپنی سسرال میں خوش اور مطمئن تھی۔ انیلا سے چھوٹا ایک بھائی عرفان تھا جو ابھی محض تیرہ سال کا تھا اور ایک اسکول میں پڑھتا تھا۔ فرقان کی والدہ کلفتہ ناز ایک گھریلو خاتون تھی تاہم اسے گھومنے پھرنے اور ہونٹنگ وغیرہ کا بہت شوق تھا۔ شاپنگ بھی اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان کی رہائش بفرزون کے علاقے میں تھی۔

علی مراد کی بیوی سلٹی کا انتقال ہو چکا تھا۔ سلٹی طویل عرصے تک سرطان ایسے موذی مرض میں مبتلا رہنے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔ علی مراد کی دو بیٹیاں تھیں۔ عظمیٰ اور نادیہ۔ نادیہ، عظمیٰ سے چند سال بڑی تھی اور اس کی شادی بھی عظمیٰ سے دو سال پہلے ہو گئی تھی۔ نادیہ کی سسرال

آنکھ لٹیڑھا

حیدر آباد میں تھی۔ اس کا شوہر شاہد تنگ پرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا اور اس نے ادھر حیدر آباد ہی میں اپنا ایک شوروم بھی بنا رکھا تھا۔

جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے کہ علی مراد کی صدر کی ایکٹورس مارکیٹ میں بی وی کی دکان تھی۔ اس کی رہائش بہادر آباد کے علاقے میں تھی۔ اس کی دکان میں عموماً نئے بی وی فروخت کیے جاتے تھے تاہم وہ چلتے ہوئے پرانی بی وی کے بدلے میں مزید رقم لے کر نیا بی وی بھی دے دیا کرتا تھا۔ پرانے بی وی کو وہ دوسری مارکیٹ میں فروخت کر دیتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے بڑی ٹھیک ٹھاک سیٹنگ بنا رکھی تھی۔

عظمیٰ اور فرقان کی پہلی ملاقات عظمیٰ کے گھر ہی میں ہوئی تھی اور پہلی نظر ہی میں دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ دراصل فرقان اور نادیہ یونیورسٹی میں کلاس فیلو تھے لہذا نادیہ کی شادی میں فرقان بھی مدعو تھا۔ نادیہ کی مایوں اور ہندی میں بھی وہ گیا تھا اور جیسا اس کی عظمیٰ سے ملاقات ہوئی تھی۔

نادیہ تو بیاہ کر حیدر آباد چلی گئی لیکن عظمیٰ اور فرقان کی پہلی ملاقات آخری ثابت نہ ہوئی بلکہ اس کے بعد تو ان کے درمیان ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ نادیہ نے اس معاملے میں دونوں سے حتی الامکان تعاون کیا اور ان کی محبت شادی کے بندھن کی جانب بڑھنے لگی۔ نادیہ نے علی مراد کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دیا تھا۔ علی مراد کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ فرقان اس کا دیکھا بھالا تھا اور وہ بھی اس کو پسند کرتا تھا۔ فرقان کے مزاج اور اخلاقیات نے علی مراد کو متاثر کیا تھا۔ پھر وہ تعلیم یافتہ تھا اور اس کے سامنے روشن مستقبل بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک آئیڈیل داماد اور آئیڈیل شوہر کی تمام تر خوبیاں فرقان میں موجود تھیں لہذا علی مراد اس رشتے سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

انکار تو فرقان کے گھر کی طرف سے تھا۔ فرقان کی والدہ کلفتہ اپنی بہن کی بیٹی غزالہ سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ غزالہ میڈیکل کے فاسٹ ایئر میں تھی لیکن فرقان، غزالہ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر صورت اور ہر قیمت پر عظمیٰ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ تنازعہ اس قدر بڑھا کہ فرقان نے دو ٹوک انداز میں اپنے والدین سے کہہ دیا۔

”میں شادی کروں گا تو عظمیٰ سے ورنہ کسی سے بھی نہیں!“ ”اور میں تمہاری شادی کروں گی تو غزالہ سے.....“ کلفتہ نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ورنہ کسی اور سے بھی نہیں ہونے دوں گی۔“

”یہ تو سراسر زیادتی ہے امی!“ فرقان نے جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ”میں غزالہ میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ آپ خواہنا کیوں یہ شادی مجھ پر مسلط کرنا چاہتی ہیں.....؟“

”میں اپنی بہن کو اس رشتے کے لیے زبان دے چکی ہوں۔“ کلفتہ نے حتی لہجے میں کہا۔ ”جیسے ہی غزالہ کی تعلیم مکمل ہوگی، میں تمہاری شادی کی تاریخ بھی کر دوں گی۔“ ”ایسا کچھ نہیں ہونے والا امی!“ فرقان بھی ضدی لہجے میں بولا۔ ”آپ کو اپنی بہن کا بڑا خیال ہے، ہمارے جذبات کا کوئی احساس نہیں؟“

اس دوران میں کفیل احمد خاموش بیٹھا بڑی سنجیدگی سے ماں بیٹی کی باہمی تکرار کو سماعت کر رہا تھا۔ ابھی تک اس نے ایک بار بھی مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔ کلفتہ نے شپٹائے ہوئے انداز میں بیٹے سے سوال کیا۔

”فرقان اتم کس کے جذبات کی بات کر رہے ہو.....؟“ ”اپنے اور عظمیٰ کے.....“ فرقان نے کہا۔ ”اور کس کے جذبات.....!“

”اچھا..... تو وہ لڑکی جمعہ جمعہ آٹھ دن میں، تمہاری زندگی میں مجھ سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔“ کلفتہ نے عظمیٰ بھرے انداز میں کہا۔ ”اور میں نے جو تمہیں جنم دیا..... اور پال پوس کر اتنا بڑا کیا..... میرا تم پر کوئی حق ہی نہیں رہا.....؟“

”ایسی کوئی بات نہیں امی!“ فرقان نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کا حق اور اہمیت اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ آپ انٹی سیدھی باتوں کو ذہن میں جگہ نہ دیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ غزالہ مجھے پسند نہیں اس لیے میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”جب غزالہ مجھے پسند ہے تو تمہیں اسی سے شادی کرنا ہوگی۔“ کلفتہ کے فیصلے سے ہٹ دھرمی چھلکتی تھی۔

”فرقان!“ کفیل احمد نے لب کشائی کی۔ ”تمہاری ماں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ اس نے غزالہ کی ماں کو اس رشتے کے لیے زبان دے رکھی ہے اور پھر.....“ لگاتی توقف کر کے اس نے کبھیر انداز میں کہا۔ ”جہاں تم شادی کے لیے بہ ضد ہو وہ لوگ دوسری کیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا گھر اور خاندان ان سے بالکل الگ ہے۔“

”پھر، خاندان، کیونٹی.....“ فرقان نے بیزاراری سے کہا۔ ”آپ لوگ بھی پتا نہیں، کن فضول باتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں

شوخیان

ایک پارٹی میں بیوی اپنے شوہر سے بولی۔
”وہ آدمی دیکھو جو ڈانس کر رہا ہے۔“
شوہر۔ ”وہ کون ہے؟“
بیوی۔ ”10 سال پہلے اس نے مجھے شادی کی آخری گھڑی میں نے ریجیکٹ کر دیا تھا۔“
شوہر۔ ”اومانی گاؤ وہ ابھی تک خوشی میں ناچ رہا ہے؟“

پولیس راہ گیر سے۔ ”سلاشی دو میں اس علاقے کا S.P. ہوں۔
راہ گیر۔ ”اور میں اس علاقے کا M.P.W. ہوں۔“
پولیس مین۔ ”گھبرا کر غلطی ہو گئی سر۔ ویسے یہ M.P.W. کیا ہوتا ہے؟“
راہ گیر۔ ”موتگ بھلی والا۔“

پولیس نے دروازے پر دستک دی۔ ٹھک، ٹھک۔
سردار۔ ”کون؟“
پولیس۔ ”ہم پولیس والے ہیں دروازہ کھولو تم سے بات کرنی ہے۔“
سردار۔ ”تم لوگ کتنے ہو؟“
پولیس۔ ”3۔“
سردار۔ ”تو آپس میں باتیں کر لو ناں۔“

شوہر نے بیوی کو میسج کیا۔ ”میں رات کو لیٹ ہو جاؤں گا، میرے آنے سے پہلے میری فوریٹ ڈش بنا لینا۔“
پھر دوسرا میسج کیا۔ ”میری سلیری زیادہ ہو گئی ہے اگلے مہینے تمہیں سونے کی انگوٹھی لے کر دوں گا۔“
بیوی نے ریپلائی کیا۔ ”اومانی گاؤ، سچی؟“
شوہر۔ ”نہیں چیک کر رہا تھا تمہیں میرا پہلا میسج ملا یا نہیں۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈیٹ اورنگی ٹاؤن، کراچی

ماں کو زبردے کر مارنے کی کوشش کی ہے؟“
”ہرگز نہیں۔“ فرقان نے مطلع کی لہجہ میں کہا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“
”پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟“ کفیل احمد نے اٹھ کر ہوئے لہجہ میں استفسار کیا۔
”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امی نے عظمیٰ کو ذلیل کرنے کے لیے یہ ڈراما چاہا ہے۔“ فرقان نے بڑے مضبوط لہجہ میں کہا۔ ”زہر پلے کھانے میں عظمیٰ کا کوئی کردار نہیں ہے۔“
”تو تمہارے خیال میں گفتگو نے خود ہی کھانے میں زہر ملا کر یہ کھیل کھیلا ہے؟“ کفیل احمد نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ ”تم اپنی ماں پر شک کر رہے ہو.....؟“
فرقان ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولا۔ ”جی..... میرا یہ خیال ہے!“

”کیا اس بند کر دو.....“ کفیل احمد غصے کی شدت سے دھاڑا۔ ”اور جتنی جلدی ہو سکے، اپنی بیوی کو لے کر اس گھر سے دفع ہو جاؤ۔ میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہے ابو!“ فرقان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”جب آپ میں حق اور انصاف کا حوصلہ نہیں رہا اور ہر صورت میں آپ عظمیٰ ہی کو قصور وار سمجھ رہے ہیں تو ان حالات میں، میں خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہوں گا۔ میں بہت جلد اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کر لوں گا۔“

”بڑے شوق سے جاؤ اور میری ایک بات ذہن نشین کر لینا.....!“ کفیل احمد نے رکھائی سے کہا۔
فرقان نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا اب بھی کہنے کے لیے کچھ باقی رہ گیا ہے؟“
”ہاں..... ایک بات!“ کفیل احمد کی سنجیدگی میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔ ”بہت ہی اہم بات۔“

فرقان ابھن زدہ انداز میں اپنے باپ کو دیکھتا چلا گیا لیکن مزید کوئی سوال نہ کیا۔ لمحاتی توقف کے بعد کفیل احمد نے لہجہ میں کہا۔

”یہ ایک محسوس حقیقت ہے کہ تم میری اولاد ہو لیکن تم میرے لیے گفتگو سے زیادہ اہم نہیں ہو۔ بھی واپس آنے کا ارادہ ہو تو میری ایک شرط یاد رکھنا۔“
”کیسی شرط؟“ فرقان کی ابھن دو چند ہو گئی۔

”اس گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے..... صرف تمہارے لیے!“ کفیل احمد نے دونوں کے انداز میں کہا۔ ”جب دل چاہے، واپس آ جانا مگر تمہارے

مطابق اداکاری کی اور ان کی چال کا میاب رہی۔ فرقان کے والدین کو نہ صرف اس شادی میں شریک ہونا پڑا بلکہ عظمیٰ کی سیدھی اپنی سسرال بھی گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ تک ہی وہاں تک سکی۔

گفتگو نے عظمیٰ کے ہاتھوں اپنی شکست کو ایک لمبے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا تھا۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ عظمیٰ کو ذلیل کر کے رہے گی۔ پہلے ہی دن سے ساس اور بہو کی روایتی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ عظمیٰ چونکہ اس جنگ کی دار نہیں تھی۔ لہذا گفتگو کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے میدان خالی مل گیا۔ وہ ایسا کھل کر کھیل کر فرقان اور عظمیٰ کو گھر چھوڑتا پڑا۔ عظمیٰ پر ہر روز ایک نیا الزام آ جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر گفتگو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی کہ عظمیٰ نے اسے کھانے میں زہر دے کر مارنے کی کوشش کی ہے۔ گفتگو نے مذکورہ زہر پلے کھانے کے آگے ڈالا تو وہ بی تھوڑی ہی دیر میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ عظمیٰ نے گفتگو کی جان لینے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی لیکن اس ڈراما باز عورت نے بڑا جاندار ناک کیا تھا۔ اس ناک کا سب سے زیادہ اثر کفیل احمد پر ہوا۔ اسے عظمیٰ سے شدید ترین نفرت ہو گئی۔ ان تین ماہ میں فرقان قدم قدم پر عظمیٰ کی حمایت کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ اس معاملے میں جب اس نے اپنے باپ کے سامنے عظمیٰ کی پوزیشن بیان کرنے کی کوشش کی تو کفیل احمد نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ ”دیکھو فرقان! میں نے تمہاری خاطر گفتگو کی مخالفت لے کر تمہاری شادی میں شرکت کی تھی اور آج تمہاری بیوی نے میری بیوی کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔ جو کھانا ملی کے پیٹ میں گیا وہ اگر تمہاری ماں کھا لیتی تو سوچو.....!“

”ابو..... یہ عظمیٰ کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا ہے.....“ کفیل احمد نے درشت لہجہ میں بیٹے سے استفسار کرنا رہا۔
”اس میں شک کی گنجائش کہاں ہے۔“ فرقان دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں بولا۔ ”امی کی ناک میں ایسا کون سا اینٹینا لگا ہوا ہے کہ کھانے کو سونگھتی ہی نہیں پتا چل گیا کہ وہ زہر پلے ہے اور یہ کہ کھانے میں زہر عظمیٰ نے ملا یا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد اگر ایسا کوئی انکشاف ہوتا تو دوسری بات تھی.....!“

”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اگر تمہاری ماں وہ زہر پلے کھانا کھا لیتی اور اس کے بعد گفتگو کے ساتھ کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آتی تب تمہیں یقین آتا کہ عظمیٰ نے تمہاری

اور عظمیٰ کا تعلق بھی ایک مسلم فیملی سے ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ عظمیٰ کے گھر والوں کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ لوگ بھی معقولیت کا مظاہرہ کریں۔ میں کوئی غلط کام کرنے نہیں جا رہا، عظمیٰ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ میرا قانونی و شرعی حق ہے۔“
”تو اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ معقولیت کا مظاہرہ کس طرح کیا جاتا ہے۔“ کفیل احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”فرقان! میں ہر حال میں تمہاری ماں کا ساتھ دوں گا۔ اگر تمہیں ہماری عزت کا ذرا سا بھی خیال ہے تو تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں ہم چاہتے ہیں۔ اگر تم ہماری بات نہیں مانو گے تو پھر ہم تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔“
”ساتھ نہیں ہیں..... کیا مطلب؟“ فرقان نے حیرت بھری نظر سے اپنے باپ کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ.....“ گفتگو وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”ہم تمہاری شادی میں شرکت نہیں کریں گے۔“
”اور اس شادی سے پہلے تمہیں یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔“ کفیل احمد نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ ”ہم سے ہر رشتہ ناتا توڑنا ہوگا.....“
فرقان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے سسے والدین ہیں۔ درحقیقت کفیل احمد نے ایک نفسیاتی چال چلی تھی۔ وہ فرقان کو گھر سے نکالنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس دباؤ میں آ کر وہ عظمیٰ کا خیال اپنے دل سے نکال دے گا مگر فرقان پر بھی جیسے ضد سوار ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے.....!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں عظمیٰ سے شادی کی خاطر یہ گھر چھوڑ دوں گا۔“
کفیل اور گفتگو کو تو قیاس نہیں بھی کہ فرقان ایسا سنگین فیصلہ کرے گا۔ اگلے روز فرقان نے علی مراد کو صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔ علی مراد بیٹی کا باپ تھا۔ اسے بہت کچھ سوچنا تھا۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ فرقان کے والدین اس شادی کے لیے رضامند ہو جائیں۔ اگر وہ دل سے راضی نہیں بھی ہوتے تو کم از کم اس شادی میں بھرپور شرکت کریں اور عظمیٰ رخصت ہو کر اپنی سسرال ہی میں جائے۔ بعد میں جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔

علی مراد ایک سمجھ دار اور دور اندیش شخص تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ڈرامائی منصوبہ ترتیب دیا جس کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے فرقان کو اس کا ساتھ دینا تھا۔ یہ ایک جذباتی چال تھی جس میں ایک موقع پر فرقان کو اسپتال کی ایمر جیسی تک بھی جانا تھا۔ میں اس منصوبے کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قصہ مختصر، فرقان نے کفیل احمد کی ہدایت کے

ساتھ عقلی کو قطعاً برداشت نہیں کیا جائے گا۔ تم اسے اپنی زندگی سے نکالنے کے بعد ہی ادھر کا رخ کر سکتے ہو۔“

”میں عقلی کو اپنی زندگی سے نکال دوں.....“ فرقان نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”یہ کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔“

”بس تو پھر آج کے بعد تم ہمارے لیے اور ہم تمہارے لیے مر گئے۔“ کفیل احمد نے سفاکی سے کہا۔

”اب تم جانو اور تمہاری بیوی.....“

اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اس موقع پر گفتگو نے بہت واویلا مچایا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کو دہرائے جا رہی تھی کہ عقلی اور اس کے گھر والوں نے کسی سے گند اعلیٰ کر کے فرقان کا دل و دماغ اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔ وہ جو رد کا غلابن کر رہ گیا ہے۔ وہ والدین کی محبت، محنت اور قربانیوں کو بھول گیا ہے۔ میں بھی روز محشر اسے دودھ نہیں بخشوں گی وغیرہ وغیرہ.....!

آئندہ روز فرقان اپنی بیوی کو لے کر علی مراد کے پاس پہنچ گیا اور نہایت ہی جامع الفاظ میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔

”انکل! میں چند روز کے لیے عقلی کے ساتھ آپ کے گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔ بہت جلد میں کرایے کے گھر کا بندوبست کر لوں گا۔“

مکمل طور پر نہ سہی لیکن علی مراد بڑی حد تک فرقان اور عقلی کے حالات سے واقف تھا۔ اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

”چند دن کے لیے کیوں بیٹا۔ تم چاہو تو مستقل اس گھر میں رہائش اختیار کر سکتے ہو۔“

فرقان نے متذبذب انداز میں اپنے سر کو دیکھا۔

”میں یہ پیشکش رسماً نہیں کر رہا ہوں۔“ علی مراد نے یہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اللہ نے مجھے دو بیٹیاں دے کر زندگی کے ساتھی کو واپس اپنے پاس بلا لیا ہے۔ میری دونوں بیٹیاں اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میں اس گھر میں تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اگر تم لوگ مستقل یہاں آ کر رہنے لگو گے تو میری تنہائی دور ہو جائے گی اور تم لوگوں کی رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

”انکل! میں آپ کے خلوص اور محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔“ فرقان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ کی پیشکش سمجھیں ادھار رہی۔ فی الحال آپ ہمیں چند روز قیام کی اجازت دے دیں۔ اگر کبھی مستقل رہائش کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔“

”پیشکش ادھار رہی..... میں کچھ سمجھا نہیں رہا۔“

علی مراد نے سوالیہ نظر سے فرقان کی طرف دیکھا۔

جواب میں فرقان نے ان نکات کی وضاحت کر دی جن کی بنا پر وہ فی الحال اپنی سسرال میں مستقلاً ڈیرا ڈال کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ فرقان کے والدین حتیٰ کہ بہن بھائی کا بھی یہی خیال تھا کہ عقلی اور اس کے گھر والوں نے فرقان پر مسل کر رکھا ہے۔ وہ لوگ اسے اپنے والدین اور گھر کے دیگر افراد سے متفرک کر کے گھر داماد بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر فرقان عقلی کے ساتھ مستقل طور پر علی مراد کے گھر میں ٹھہر جاتا تو اس کے گھر والوں کے کہے کو سنبھل جاتی۔

علی مراد نے حالات کی نزاکت کو فوراً بھانپ لیا اور فرقان کو اس کے حالات کے مطابق نقل و حرکت کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر آزاد چھوڑ دیا۔ فرقان نے عقلی کو علی مراد کے گھر میں رکھا اور خود کرایے کے مکان کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا اور یہیں سے اس کی زندگی میں قاضی وحید کی اثری ہوئی تھی۔

قاضی وحید جو عرف عام میں محض ”قاضی“ کے نام سے مشہور تھا، بیٹے کے اعتبار سے وہ ایک پراپرٹی ڈیلر تھا۔ ناظم آباد کے علاقے میں اس کی ”قاضی اسٹیٹ“ کے نام سے ایک انجینیئرنگی۔ فرقان کی ڈیوٹی بینک کی جس برانچ میں تھی وہ حیدری کے علاقے میں واقع تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ کرایے کا گھر کسی ایسے علاقے میں ہونا چاہیے جہاں سے اس کی جاب زیادہ دور نہ ہو۔ وہ گھومتے پھرتے ہوئے قاضی وحید کی انجینیئرنگ پر پہنچ گیا۔

قاضی نے اس کی ضرورت کو توجہ سے سنا اور آخر میں پُر خلوص انداز میں کہا۔ ”فرقان صاحب! فی الحال میرے پاس کوئی چھوٹا قلیٹ کرایے پر اٹھانے والا تو ہے نہیں۔ سب تین یا چار بیڈروم والے ہیں۔“

”یہ تو ہماری ضرورت سے بہت بڑے ہیں۔“ فرقان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو کم از کم اور زیادہ سے زیادہ دو کمروں والا قلیٹ چاہیے۔ ایک میاں اور ایک بیوی کی ضرورت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔“

”ہوں.....!“ قاضی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور ٹٹولنے والی نظر سے فرقان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ اگر آپ چاہو جہاں تو آپ کا مسئلہ چکی بجاتے میں حل ہو سکتا ہے۔“

”ایسی کون سی تجویز ہے۔“ فرقان نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ذرا میں بھی تو سنوں.....؟“

”آپ کسی کے ساتھ شہر کر کے رہ لیں گے؟“

”مطلب یہ کہ کسی فیملی کے ساتھ مل کر۔“ قاضی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”سوگز کے ایک گھر میں، آپ ہی کی طرح کی ایک مختصر سی فیملی رہ رہی ہے۔ وہ گھرانہ کی ذاتی ملکیت ہے مگر ان کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ دو بیڈروم، ایک ڈرائنگ روم اور ایک کاسن روم..... یہ ہے اس گھر کی مکانات۔ اگر آپ تیار ہو جائیں تو اس میں دونوں کا بھلا ہے۔ ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ بن جائے گا اور آپ کو بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ آپ دن بھر بینک میں رہیں گے تو آپ کی وائف گھر میں پوریت محسوس نہیں کرے گی۔“

”آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔“ فرقان نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ تو پتا چلے وہ فیملی آخر ہے کون۔ اجنبی لوگوں پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ بھی کیا جاسکتا.....!“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں فرقان صاحب!“

قاضی نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن بھروسے اور سیکورٹی کے حوالے سے آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ وہ لوگ میرے دیکھے بھالے ہوئے..... بلکہ فرقان صاحب! آپ پہلی ہی ملاقات میں مجھے اتنے زیادہ پسند آ گئے ہیں کہ میں آپ سے صاف بات ہی کہہ دیتا ہوں۔“

اتنا بول کر قاضی رکاوٹ فرقان سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا کہ پتا نہیں، وہ کون سی ”صاف بات“ بتانے والا ہے۔

قاضی نے کھٹک کر گلا صاف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”وہ میری فیملی ہے یعنی..... میں اور میری بیوی نگہت!“

”اوہ.....!“ فرقان نے ایک گہری سانس خارج کی اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”قاضی صاحب! میرے اندازے کے مطابق آپ کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہے۔ کیا آپ نے لیٹ شادی کی ہے یا ابھی تک صاحب اولاد نہ ہونے کی کوئی اور وجوہات ہیں؟“ لحاتی توقف کر کے اس نے ندامت آمیز لہجے میں اضافہ کیا۔

”معاف کیجئے گا، میں نے آپ سے ایک انتہائی ذاتی نوعیت کا سوال کر دیا ہے.....!“

”معذرت کی ضرورت نہیں ہے فرقان صاحب!“

قاضی نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ جیسے صاف گو لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ آپ کے دل میں جو کچھ تھا وہ آپ نے زبان سے کہہ دیا۔ میں نے آپ کی بات کا قطعاً برا نہیں منایا.....“ اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے تھوڑا وقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جہاں تک میری عمر کا تعلق ہے تو میں آپ کے اندازے کی داد دیتا ہوں۔ میں پچاس کے قریب ہوں اور یہ کہ میری شادی لیٹ نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی کیونکہ نگہت بانجھ ہے۔“

”اوہ.....!“ فرقان نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

”آپ کے ذہن میں دوسری شادی کا خیال نہیں آیا..... اولاد کی خواہش تو سبھی کو ہوتی ہے نا؟“

”ہاں ہوتی ہے۔“ قاضی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”یہ خواہش میرے دل میں بھی تھی بلکہ ہم دونوں کے دل میں تھی۔ نگہت نے کئی بار مجھ سے کہا بھی کہ میں اولاد کے حصول کی خاطر دوسری شادی کر لوں لیکن میں ایسا کرنا تو دور کی بات ہے، اس کے بارے میں، میں سوچ بھی نہ سکا۔ نگہت کی محبت ہمیشہ اولاد کی خواہش پر غالب آ گئی۔ اس عورت نے میرے ساتھ ازدواجی زندگی کے پچیس سال گزار دیے ہیں۔ وہ میری دکھ سکھ کی ساتھی ہے۔ میں اس پر سوتن لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ بانجھ ہے تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے.....!“

فرقان، قاضی وحید کی کہانی سن کر بے حد متاثر ہوا تھا۔ قاضی نے اسے یہ بھی بتایا کہ نگہت آج کل بیمار رہنے لگی ہے۔ اس کی دور کی نظر بھی خاصی کمزور ہو چکی ہے۔ چشمے کے بغیر وہ گھر کے اندر بھی چل پھر نہیں سکتی۔ جواب میں فرقان نے بھی قاضی کو اپنے تازہ ترین حالات سے تفصیلاً آگاہ کر دیا، اس طویل مینٹنگ کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اگلے روز فرقان عقلی کے ساتھ قاضی کے گھر میں منتقل ہو گیا۔ قاضی کا مذکورہ گھر بورڈ آفس کے نزدیک واقع تھا۔

ایک بیڈروم فرقان اور عقلی کے حوالے کر دیا گیا۔ ایک بیڈروم قاضی اور اس کی بیوی نگہت کے پاس رہا۔ ڈرائنگ روم کو وہ لوگ مشترکہ طور پر استعمال کرنے لگے۔ کچن پوری طرح عقلی کے تصرف میں آ گیا۔ نگہت کی طبیعت اکثر خراب ہی رہتی تھی اور وہ بہت کم کچن کا رخ کرتی تھی۔ قاضی اپنے اور اس کے لیے ہوئے سے کھانا لایا کرتا تھا۔ عقلی کے آجانے سے قاضی اور اس کی بیوی کو کھانے کی سہولت ہو گئی تھی۔

تین ماہ میں وہ لوگ آپس میں اس قدر مکمل مل گئے کہ دیکھنے والا یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ دو الگ الگ فیملی ہیں۔ وہ ایک خاندان کی طرح رہ رہے تھے۔ ایک رات قاضی نے فرقان کو ایک اچھوتا اور عجیب و غریب مشورہ دیا۔

”فرقان صاحب! مجھے باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے

کہ غریب پر اپنی کی مارکیٹ بہت تیز ہونے والی ہے۔ اگر آنے والے تین ماہ میں کسی نے اپنا گھر بنالیا تو بنالیا ورنہ زندگی بھر نہیں بنا سکے گا۔

”ہاں قاضی صاحب! میں نے بھی لوگوں کو اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔“ فرقان نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”لیکن آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں.....؟“

”تمہارے تمام تر حالات سے میں پوری طرح آگاہ ہو چکا ہوں فرقان بیٹا۔“ قاضی نے اپنا ہاتھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنے گھر کی طرف واپس نہیں جاسکتے ہو کیونکہ آپ کے والدین نے واپسی کے لیے جو کڑی شرط رکھی ہے اسے پورا کرنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ آپ ایک سمجھ دار شوہر ہیں اور اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں۔ والدین کو جو ان کرنے کے لیے آپ عظمیٰ کو اپنی زندگی سے نکالنے کی حماقت بھی نہیں کر سکتے اور آپ کو کسی قیمت پر ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے۔“

قاضی سانس درست کرنے کے لیے تھما تو فرقان خاموش سوالیہ نظر سے اسے دیکھتا تھا۔ قاضی سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اور آپ سسرال کی جانب سے کسی قسم کا احسان لینے کے حق میں نہیں ہیں، یہ بات بھی میں اتنے دنوں میں اچھی طرح جان گیا ہوں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا فرقان میاں؟“

”نہیں قاضی صاحب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ فرقان نے گردن کو انتہائی جنبش دی۔ ”لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ اس وقت آپ نے یہ موضوع کیوں چھیڑا ہے؟“

”میری یہ خواہش ہے کہ آپ کا بھی اپنا ذاتی گھر ہو.....“ قاضی وحید نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہ خواہش تو خود میری بھی ہے۔“ فرقان نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس خواہش کی تکمیل اتنی آسان نہیں..... بلکہ میرے خیال میں یہ تقریباً ناممکن ہے۔“

”فرقان صاحب! اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔“ قاضی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”اگر انسان کا ارادہ مضبوط ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔“

”لیکن قاضی صاحب.....“ فرقان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ارادے کی مضبوطی اپنی جگہ مگر ذاتی گھر کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہاں سے آئے گی؟“

”آپ کے خیال میں ایک چھوٹا سا ذاتی گھر کتنے میں مل سکتا ہے؟“

”لگ بھگ دو لاکھ روپے میں.....!“ فرقان نے

جواب دیا۔

”اور اگر پچاس، ساٹھ ہزار روپے میں مل جائے تو.....؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قاضی صاحب!“

”سوال اور جواب کی پیدائش میں ذہن کو نہ تھکا میں فرقان صاحب!“ قاضی نے اپنے سوال کو دہراتے ہوئے کہا۔ ”اگر پچاس، ساٹھ ہزار روپے میں آپ کو چھوٹا سا ذاتی گھر مل جائے تو.....؟“

”کیا آپ قسطوں والے کسی گھر کی بات کر رہے ہیں؟“ ایک ممکنہ اندیشے نے فرقان کے سر میں انگڑائی لی۔

”نہیں..... قطعاً نہیں۔“ قاضی دو ٹوک لہجے میں بولا۔

”میرے لیے یہ ناقابل یقین ہو گا۔“ فرقان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے ایک معجزہ ہی سمجھوں گا۔“

”فرقان صاحب!“ قاضی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ پچاس، ساٹھ ہزار روپے خرچ کرنے کی پوزیشن میں ہیں تو آپ بھی دو کمرے کے ایک چھوٹے سے گھر کے مالک بن سکتے ہیں۔“

”اتنی رقم تو دو کمروں کی تعمیر پر ہی خرچ ہو جائے گی قاضی صاحب!“ فرقان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”آپ بھی کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”بس..... دو کمرے ہی تو ڈالنا ہیں.....“ قاضی نے سادگی سے کہا۔

یہ واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے اس لیے قیمتوں کے سلسلے میں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح مہنگائی نے آسمان کو نہیں چھو رکھا تھا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں قاضی صاحب.....؟“ فرقان نے الجھے بھرے انداز میں قاضی وحید کی جانب دیکھا۔ ”دو کمرے ڈالنا ہیں تو کہاں..... ہوا میں تو تعمیر نہیں ہو سکتی نا!“

”ہوا میں نہیں، تعمیر چھت پر ہوگی فرقان صاحب!“

قاضی نے معنی خیز نظر سے فرقان کو دیکھا۔

”چھت پر تعمیر.....“ فرقان کی ابھمن دو چند ہو گئی۔

”کیوں پٹیلیاں بھجوا رہے ہیں قاضی صاحب.....!“

”ارے، آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں فرقان صاحب!“ قاضی نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”آپ نے بات ہی ایسی کی ہے قاضی صاحب!“

فرقان ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”بھلا مجھے

انکس ٹیڈھا

”اب ذرا اس انگریمنٹ کی بھی وضاحت کریں۔“ قاضی کی بے لوثی کو دیکھتے ہوئے فرقان کی آواز بھی جذبات سے بوجھل ہو گئی تھی۔

”دیکھو فرقان میاں!“ قاضی نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ”آپ نے تین ماہ میں دیکھ ہی لیا کہ آپ کی، آنٹی نگہت کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور میں بھی مزید کتنا جی لوں گا.....“

”یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے قاضی صاحب!“

فرقان نے دزدیدہ نظر سے قاضی وحید کی جانب دیکھا۔

”اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔“

”انسان کی عمر کتنی بھی دراز کیوں نہ ہو جائے اسے ایک روز اس دنیا سے رخصت ہونا ہی پڑتا ہے۔“ قاضی نے کسی مفکر کی طرح، سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں جس انگریمنٹ کی بات کر رہا ہوں وہ ہماری زندگی سے متعلق ہے۔ اگر میں نگہت سے پہلے چل بسوں تو اس انگریمنٹ کی رو سے میرے بعد آپ لوگ نگہت کا بھرپور خیال رکھو گے اور اگر نگہت مجھے داغ مفارقت دے گی تو عظمیٰ کی یہ ڈیوٹی ہوگی کہ وہ صبح شام میرے لیے کھانے کا بندوبست کرے گی اور ہاں.....“ اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جب اوپر والے پورشن کی تعمیر مکمل ہو جائے گی اور آپ اوپر شفٹ ہو جائیں گے تو باقاعدہ کسی تجربہ کار وکیل کی مدد سے بالائی منزل کی ملکیت کے کاغذات آپ کے نام بنوائیں گے۔“

وہ بہت سے سوالات جو فرقان کے ذہن میں بالائی پورشن کی ملکیت کے حوالے سے ابھر رہے تھے ان کا جواب قاضی نے بنا پوچھے ہی دے دیا تھا لیکن پھر بھی اپنے اطمینان کی خاطر اس نے پوچھ لیا۔

”قاضی صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ بالائی منزل کی تعمیر پر میں اپنی جیب سے خرچ کروں گا لیکن بہر حال وہ چھت تو آپ ہی کے مکان کی ہوگی نا۔ آپ اس کی قیمت کیوں نہیں وصول کریں گے؟“

”فرقان صاحب! آپ کے اس سوال کے میرے پاس دو جواب ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ کو جو بھی جواب پسند آئے وہ منتخب کر لیں۔“

”اور وہ دو جواب کون سے ہیں؟“ فرقان ہمدردی سے گوش ہو گیا۔

”جواب نمبر ایک.....“ قاضی نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کو اپنے بیٹے کی جگہ اور عظمیٰ کو بیوی کی جگہ بھتا ہوں تو پھر آپ لوگوں سے کسی نوعیت کی وصولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ لوگوں کو میرا بیٹا اور بیوی بننا گوارا نہیں تو پھر ہم آپس میں ایک انگریمنٹ کر لیتے ہیں اور یہ انگریمنٹ میرا دوسرا جواب ہو گا۔“

”قاضی نے ڈرامائی انداز میں کہا۔“

”میں آپ کی تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ فرقان نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”مگر.....!“

”مگر کیا؟“ فرقان نے جملہ ادھورا چھوڑا تو قاضی نے تشویش ناک انداز میں استفسار کیا۔

”میں آپ کی تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ فرقان نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”مگر کیا؟“ فرقان نے جملہ ادھورا چھوڑا تو قاضی نے تشویش ناک انداز میں استفسار کیا۔

”میں فوری طور پر پچاس، ساٹھ ہزار روپے کا بندوبست نہیں کر سکوں گا۔“ فرقان نے اپنی مشکل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”فرقان صاحب! آپ بینک میں ملازم ہیں۔“ قاضی نے کجھیر انداز میں کہا۔ ”آپ کو تو بڑی آسانی سے قرض مل جائے گا۔ آپ کا بینک مشکل وقت میں کام نہیں آئے گا تو اس کا چار ڈالنا ہے کیا.....؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں قاضی صاحب! بینک سے قرضہ لینے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔“ فرقان نے اپنی الجھن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ کام ایک ماہ کے بعد ممکن ہو سکے گا۔“ ”اس کا کوئی خاص سبب؟“ قاضی وحید نے پوچھا۔ ”میں نے کچھ عرصہ پہلے موٹر سائیکل کی خریداری کے لیے بینک سے قرض لیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس قرض کی ایک قسط باقی ہے جو اگلے ماہ جائے گی۔ وہ قرض کلیئر ہو جائے تو میں نئے قرض کے لیے درخواست دے سکوں گا۔“

”ہوں.....!“ قاضی نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ”قرض کی درخواست کے کتنے عرصے بعد رقم آپ کے اکاؤنٹ میں آجائے گی؟“

”قرض کی منظوری کا پراسس مکمل ہونے میں زیادہ سے زیادہ ایک ماہ لگ جائے گا۔“ فرقان نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے، قرض کی رقم آپ کے استعمال میں آنے میں دو ماہ لگ جائیں گے۔“

”جی اتنا عرصہ تو لگ ہی جائے گا۔“ فرقان نے کہا۔ ”مگر دو ماہ کے اندر تو بلڈنگ میٹرل کے نرخ بہت

اوپر چلے جائیں گے۔“ قاضی نے شکرانہ انداز میں کہا۔ ”میں اسٹیٹ کا بزنس کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے، آنے والے دو ماہ میں سریا، سینٹ، ریت، بلاکس اور دیگر سامان تعمیرات کی قیمت دینی نہیں تو ڈیڑھ گنا ضرور ہو جائے گی۔ جو کام آج پچاس، ساٹھ ہزار میں ہو رہا ہے وہ پچھتر، اسی ہزار میں جا کر بیٹھے گا۔“

”یہ تو ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“ فرقان نے سرسری انداز میں کہا۔ ”نہ تو میں دو ماہ سے پہلے قرض لے سکتا ہوں اور نہ ہی ہم بلڈنگ میٹرل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔“

”کر سکتے ہیں.....“ قاضی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم بلڈنگ میٹرل کی قیمتوں کو کنٹرول

کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ فرقان نے چوٹے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”میری دو تین بلڈنگ میٹرل اسٹور والوں سے اچھی جان بچان ہے۔“ قاضی اپنے منصوبے کی تفصیل بیان کرنے لگا۔ ”ہم ان سے ابھی کے مارکیٹ ریٹ پر اپنی ضرورت کا سامان خرید لیتے ہیں۔ ادائی دو ماہ کے بعد کر دیں گے۔“

”کیا وہ دو ماہ کے کریڈٹ پر ہمیں بلڈنگ میٹرل فراہم کرنے پر راضی ہو جائیں گے؟“ فرقان نے پوچھا۔

”سامان تو ہم اسی وقت اٹھائیں گے جب ادائی کریں گے۔“ قاضی نے کہا۔ ”ابھی تو صرف زبانی بتائی ہوگی۔“

”بینک ابھی ہوگی اور وہ بھی ایک روپیہ ادا کیے بغیر.....“ فرقان نے تصدیق طلب نظر سے قاضی کی طرف دیکھا۔ ”مگر اپنی ضرورت کا سامان ہم دو ماہ کے بعد اٹھائیں گے اور وہ بھی آج کے ریٹ کے حساب سے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“

”بالکل ٹھیک۔“ قاضی نے حتیٰ لہجے میں کہا۔ ”میں اتنی دیر سے آپ کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”قاضی صاحب!“ فرقان ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ کے تعلقات کی بنا پر یہ سہولت حاصل ہو سکتی ہے تو میری طرف سے آپ ”ڈن“ سمجھیں۔ میں دو ماہ کے بعد رقم کا بندوبست کر دوں گا۔“

اس کے بعد تمام مراحل آسانی سے طے ہو گئے۔ ان دونوں کے بیچ یہ میٹنگ مارچ کے مہینے میں ہوئی تھی۔ اپریل میں فرقان کا موٹر سائیکل والا قرض کلیئر ہوا۔ مئی میں اس نے بینک سے ایک لاکھ کالون منظور کرا لیا۔ پچیس مئی کو ایک لاکھ کی رقم فرقان کے اکاؤنٹ میں جمع ہو چکی تھی۔ جون کے پہلے ہفتے میں بالائی منزل کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ دس جولائی کو یہ کام مکمل ہوا اور فرقان عظمیٰ کے ساتھ بالائی پورشن میں منتقل ہو گیا۔ اس نے بینک سے جو ایک لاکھ روپے قرض اٹھایا تھا ان میں سے دل کھول کر پچھتر ہزار بالائی منزل کی تعمیر پر خرچ ہوئے تھے اور بچیں ہزار اس نے زیریں منزل کی منتخب میٹھی نہیں پر لگا دیے تھے۔ یہ قاضی کے لیے فرقان کی محبت کا اظہار تھا۔ گویا ایک لاکھ کی رقم اسی گھر کے اندر ”غائب“ ہو گئی تھی۔

فرقان اور عظمیٰ نے اس گھر کے بالائی پورشن پر جولائی، اگست بڑے امن و سکون سے گزارے تھے۔ تجرباً

آئین لکھنا

مہینا اپنے اختتام پر شکر کی شکل اختیار کر گیا۔ ان کی زندگی میں وہ ٹوکٹ آج جس کا وہ بھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ لوگ اچانک بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں گھر گئے تھے۔

قاضی وحید جو پچھلے آٹھ نو ماہ سے ایک فرشتہ صفت انسان کے روپ میں ان کے دل و دماغ میں جگہ بنا چکا تھا، جب اس کا اصلی چہرہ ان پر عیاں ہوا تو ان کے چودہ طبق گل ہو گئے۔ قاضی کی عیاری اور مکاری کا شکار ہو کر پہلے انہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا اور پھر فرقان قتل کے الزام میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

ریمائڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے فرقان کے وکیل کی حیثیت سے اپنا وکالت نامہ اور اپنے موکل کی درخواست ضمانت دائر کر دی۔ جج کرسی انصاف پر آکر بیٹھا تو میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک شریف النفس اور امن پسند شہری ہے۔ اس کا ماضی بے داغ ہے۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت قتل کے اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا سا ہے کہ اس نے اپنی سادگی کی وجہ سے مقتولہ کے شوہر اسٹیٹ ایجنٹ قاضی وحید پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر لیا تھا۔“

”پورا آڑا“ وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے فاضل دوست ملزم کو معصوم اور سادہ لوح ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالعکس ہے۔ جس شخص نے کامرس میں ماسٹرز کر رکھا ہو اور ایک پرائیویٹ بینک میں ملازمت کرتا ہو۔ دن رات مالیاتی فیکٹر سے اس کا واسطہ پڑتا ہو وہ اتنا

سادہ اور بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ چپ چاپ آنکھیں بند کر کے کسی کی پر اپری میں ایک لاکھ روپے کی انویسٹمنٹ کر دے۔“

”محبت اور اخلاص کو اگر منہ حق انداز میں استعمال کیا جائے تو یہ میٹھی چھری اور زہر ہلال کی طرح کام کرتے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”ملزم اسی لیے فریب کھا گیا کہ اس کے مالک مکان قاضی وحید نے اسے اخلاق اور جذبات کی ماری تھی۔ ملزم کی جگہ کوئی اور شخص بھی ہوتا تو وہ وہی کرتا جو ملزم نے کیا۔“

”ملزم نہایت ہی عیار اور مکار شخص ہے۔“ وکیل استغاثہ نے اکیوڑ ہاؤس میں خاموش کھڑے فرقان کی

جانب اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس نے اپنے مسائل کا رونا رور کر پہلے مقتولہ کے شوہر قاضی وحید کے دل میں جگہ بنا کی پھر ایک کراپے دار کی حیثیت سے اپنی بیوی سمیت ان کے گھر میں داخل ہو گیا۔ مقتولہ ایک بیمار اور نرم دل خاتون تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے محبت کا نائیک رچا کر مقتولہ اور اس کے شوہر کے دل جیت لیے۔ تین ماہ کے بعد قاضی وحید نے ان کی الگ رہائش کے لیے اپنے گھر کی چھت پر دو کمرے کا ایک پورشن تعمیر کرا دیا۔ یہ لوگ بالائی منزل پر شفٹ ہو گئے اور پھر دو ماہ بعد ہی انہوں نے اپنے منصوبے کے مطابق قاضی وحید سے مطالبہ کر دیا کہ وہ اس کے گھر میں نہیں رہنا چاہتے لہذا قاضی صاحب انہیں ڈیڑھ لاکھ روپے ادا کر دے۔ ایک لاکھ وہ جو ملزم نے بالائی منزل کی تعمیر پر خرچ کیا تھا اور پچاس ہزار روپے وہ جو پچھلے چھ ماہ میں قاضی وحید مختلف مد میں ملزم سے لیتا رہا تھا۔ جب مقتولہ کے شوہر نے ملزم کے مطالبے کو باطل قرار دیتے ہوئے اس پر واضح کیا کہ اس کے گھر کی تعمیر میں ملزم کا ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوا اور نہ ہی اس نے ملزم سے بھی کسی مد میں کوئی رقم لی تو یہ سن کر ملزم پھر گیا۔ ان دونوں کے بیچ شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا اور ملزم نے قاضی وحید کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے شرافت سے ملزم کو ڈیڑھ لاکھ روپے ادا نہ کیے تو پھر اسے خطرناک نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“ وہ سانس ہوار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”پھر پندرہ اکتوبر کی شام ملزم نے اپنی سنگین دھمکی پر عمل کر دکھایا۔ وہ موقع پا کر ایسے وقت مقتولہ کے گھر میں گھسا جب اس کا شوہر وہاں موجود نہ ہو۔ ملزم نے مقتولہ کے گھر سے ایک لاکھ روپے چوری کیے اور مقتولہ کی مزاحمت پر اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا۔ اس کی بد قسمتی کہ جب وہ مقتولہ کے گھر سے نکل رہا تھا تو قاضی وحید وہاں پہنچ گیا۔ ملزم قاضی کو نہیں دیکھ سکا تھا تاہم قاضی وحید اسے افراتفری کے عالم میں وہاں سے جاتے دیکھ کر چوٹ اٹھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنے گھر میں داخل ہوا پھر حقیقت کسی بم کے مانند اس کے سر پر بجھی۔ اس کی بیوی بیڈ روم میں مردہ پڑی تھی۔ مقتولہ کے لباس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی مزاحمت کے نتیجے میں ملزم نے گلا گھونٹ کر اس کی جان لے لی تھی۔ بیڈ روم میں موجود وہ الماری بھی کھلی پڑی تھی جس کے ایک خفیہ خانے میں قاضی وحید نے ایک لاکھ روپے رکھے ہوئے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، تارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تھے۔ مذکورہ رقم کو غائب یا گرفتاری وحید کا دماغ گھوم گیا۔
 ملزم نے من و عن اپنی خطرناک و مہلکی پر عمل کر ڈالا تھا۔
 ”جناب عالی!“ وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر
 میں نے ملزم کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔
 ”وکیل سرکار حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ میرا
 موکل نہ تو قاتل ہے اور نہ ہی اس نے مقتول کے گھر سے
 ایک روپیہ بھی چرایا ہے۔ مقتول کے شوہر نے ہوشیار رہی اور
 چال بازی سے ملزم کے ایک لاکھ روپے اپنے گھر کی بالائی
 منزل کی تعمیر پر خرچ کرائے۔ یہ رقم ملزم نے اپنے بینک
 سے قرض لی تھی۔ جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو اس نے
 ایک خوب صورت سازش کے تحت پہلے ملزم کو گھر چھوڑنے پر
 راضی کیا پھر اس سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کی غرض
 سے اسے اپنی بیوی کے قتل میں ملوث کر کے یہ خطرناک
 ڈراما رچایا ہے لہذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ
 میرے موکل کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اس
 کی رہائی کے احکام صادر فرمائے جائیں۔“
 ”ملزم کی ضمانت پر رہائی انصاف کے اصولوں کے
 منافی ہوگی جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے ضمانت رکوانے کی
 کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ملزم نے قتل اور ڈکیتی جیسے
 سنگین جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کا ٹرائل لازمی ہے۔“
 ”جناب عالی! آج عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا
 ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ کیس اتنا
 سیدھا اور سادا نہیں جیسا کہ استغاثہ کی رپورٹ اور چالان
 میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے اندر بہت سے پیچیدہ اور نازک
 موڑ ہیں۔ میں مناسب وقت آنے پر ثابت کردوں گا کہ
 میرے موکل کو ایک گھناؤنی سازش کے تحت اس کیس میں
 پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔“
 ”یور آئر.....!“ وکیل استغاثہ نے جج کی جانب
 دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اپنے فاضل
 دوست کی ”مناسب وقت“ والی بات سے اتفاق کرتے
 ہوئے معزز عدالت سے گزارش کرتا ہوں کہ فی الحال ملزم کی
 درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جیوڈیشل ریمانڈ
 پر جیل کھڑی میں بھیج دیا جائے۔ جب مناسب وقت آئے
 گا اور میرے فاضل دوست اپنے موکل کی بے گناہی ثابت
 کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو معزز عدالت انصاف
 کے تقاضے پورے کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔“
 ہمارے درمیان مزید پندرہ بیس منٹ تک ضمانت
 کے حق اور مخالفت میں دلائل کا سلسلہ جاری رہا پھر جج نے

گھر یہاں ایک اور "لیکن" بھی کھڑا ہے.....
 علی مراد میری بات کی تک پہنچے ہوئے بولا۔ "اب اس "لیکن" کی بھی وضاحت کر دیں بیگ صاحب؟"
 "لیکن اس سلسلے میں مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 "میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔"

وہ پرجوش انداز میں بولا۔
 "ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ فرقان نے گھت کو قتل کیا ہے اور نہ ہی اس نے قاضی کے گھر سے ایک جگہ بھی چرایا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ میری بات سے اتفاق کرتے ہیں؟"
 "بالکل اتفاق کرتا ہوں جناب!" وہ زور دے کر بولا۔ "میں فرقان کو سو فیصد بے گناہ سمجھتا ہوں۔"
 "لیکن اس وقت وہ قتل اور ڈکیتی کے کیس میں پھنسا ہوا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور اس معاملے سے اسے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک وہ بالائی منزل والی تعمیر والے ایٹومیں سچا اور قاضی وحید جھوٹا ثابت نہ ہو جائے۔"

"یہ کام تو آپ ہی کریں گے بیگ صاحب۔" وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
 "یقیناً میں ہی کروں گا مگر آپ کے تعاون سے۔"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
 "اس سلسلے میں، میں نے جو منصوبہ بنایا ہے اسے کامیاب کرنے کے لیے مجھے چند لوگوں کے بارے میں معلومات درکار ہوں گی اور یہ معلومات مجھے آپ فراہم کریں گے۔"

"ضرور کروں گا بیگ صاحب!" وہ سرکواٹھائی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آپ راہنمائی فرمائیں گے تو میں یہ کام بہ آسانی انجام دے لوں گا۔"

"ٹھیک ہے، آپ کل شام میں میرے آفس آجائیں۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کو بریف کر دوں گا۔"
 اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں اس سے مصافحہ کر کے دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

اگلے روز وہ حسب وعدہ مجھ سے ملنے دفتر آیا۔ ہمارے درمیان لگ بھگ آدھا گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ میں نے اسے ان افراد کی فہرست فراہم کر دی جن کے بارے میں مجھے معلومات درکار تھیں۔ ان میں سرفہرست مقتولہ گھت اور اس کے شوہر قاضی وحید کا نام تھا۔ میں ان کے ماضی کے

بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ چند ایسے افراد تھے جو قاضی وحید کو روزانہ یا اکثر دیکھا کرتے تھے اور چند ایسے افراد جو طرم فرقان کے گھر سے شاسا تھے۔ میں نے استفسار کے دو دو کو بچھاڑنے کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ معلومات مختلف داؤج کی حیثیت رکھتی تھیں۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ طرم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد طرم فرقان کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ طرم کا بیان مکمل ہوا تو وکیل استفسار نے اسے گھیر لیا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے تک وہ اسے جرح کی چکی میں پیتا رہا۔ فرقان نے میری ہدایت کے عین مطابق نہایت ہی عمل اور برداشت کے ساتھ وکیل مخالف کے سوالات کے جوابات دیے۔ اپنی باری پر میں جج کی اجازت سے اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچا اور جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ درست ہے کہ تم جنوری سے مارچ تین ماہ تک مقتولہ کے گھر میں کرایے دار کی حیثیت سے اسی طرح رہے تھے کہ مقتولہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ اسی گھر میں رہائش پذیر تھی؟"

"جی ہاں، آپ درست فرما رہے ہیں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "ہم چاروں افراد ایک ہی گھر میں، ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔"

"پھر مارچ کے بعد کیا ہوا تھا؟"
 "مارچ کے مہینے میں مقتولہ کے شوہر نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں کچھ رقم خرچ کر کے چھت پر دو کمرے ڈال کر ایک چھوٹا سا گھر بنوا لوں تو آسانی سے بالائی منزل پر شفٹ ہو سکتا ہوں۔" طرم نے جواب دیا۔

"اور قاضی وحید کی یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی؟"
 "بچھلے تین ماہ میں ہمارے درمیان محبت اور اخلاق کا جو رشتہ استوار ہو چکا تھا اس کے پیش نظر مقتولہ کے شوہر کا یہ مشورہ مجھے بھلا لگا۔" طرم فرقان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اور میں نے بینک سے لون لے کر اس مشورے پر عمل کر ڈالا۔"

"تم نے اس مقصد کے لیے اپنے بینک سے کتنا قرض لیا تھا؟"
 "ایک لاکھ روپے۔" اس نے بتایا۔

انکس ٹیڈھا

"کیا یہ ایک لاکھ روپے گھر کی بالائی منزل کی تعمیر پر خرچ ہو گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔
 "نہیں جناب۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ "بالائی منزل کی تعمیر پر تو کم و بیش پچھتر ہزار خرچ ہوئے تھے۔ باقی کے پچیس ہزار زیریں منزل پر مختلف نوعیت کے مرمت کے کاموں پر خرچ ہوئے تھے۔"

"گویا آپ نے بینک سے جو ایک لاکھ کا قرض لیا تھا وہ تمام کا تمام قاضی وحید کی پراپرٹی کی توسیع، تزئین و آرائش کی نذر ہو گیا.....؟" میں نے جیسے انداز میں کہا۔
 "جی یہی حقیقت ہے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔
 "تم نے کامرس پڑھی ہے اور ایک ٹیکر ہو۔" میں نے خشکی آمیز انداز میں کہا۔ "کسی دوسرے کی پراپرٹی پر بغیر کسی نکتہ پڑھت کے تم نے ایک لاکھ روپے خرچ کر دیے۔"

اس موقع پر تمہاری عقل کیا گھاس چرنے لگی تھی؟"
 "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!" وہ عداوت بھرے لہجے میں بولا۔ "میری عقل پر واقعی پردہ پڑ گیا تھا۔ قاضی وحید نے مجھے محبت اور اخلاق کی چھری سے اس طرح ذبح کر ڈالا کہ آخری لمحے تک مجھے اس فراڈ کا احساس نہ ہو سکا۔"

اس کے بعد میں نے فرقان کی زبانی مختلف سوال و جواب کے ذریعے قاضی کی چال بازیوں کی تفصیل اگلا کر عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ کر دی اور آخر میں فرقان سے پوچھا۔
 "تمہیں پہلی مرتبہ اس فراڈ کا احساس کب ہوا تھا؟"
 میں نے پوچھا۔
 "جب قاضی نے مجھ سے کہا کہ وہ مکان کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"
 "ستمبر کے آخر۔" میں اس نے مجھ سے یہ سب کہا تھا۔ "طرم نے جواب دیا۔ "طرم نے مجھے بتایا کہ اس مکان کی ایک پارٹی لگ گئی ہے۔ چھ لاکھ دینے کو تیار ہے۔ بھلے زمانے میں اس نے گھر پر دو لاکھ خرچ کیے تھے۔ بالائی منزل کی تعمیر میں کم و بیش ایک لاکھ میرے لگے تھے۔ اس نے میرے سامنے آفر رکھی کہ اگر وہ مکان چھ لاکھ میں نکل جاتا ہے تو چار لاکھ وہ رکھ لے گا اور دو لاکھ مجھے دے دے گا۔ دونوں کو لگائی ہوئی رقم پر سو فیصد منافع مل جائے گا۔"

"تو کیا تم نے قاضی وحید کی تجویز پر رضامندی ظاہر کر دی تھی؟"
 میں چنیدہ اور سستے ہوئے سوالات کے ذریعے قاضی

وحید کی عیاری عدالت پر عیاں کر رہا تھا۔ جب تک قاضی کا فراڈ عدالت کے ریکارڈ پر رجسٹر نہ ہوتا، میں اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ فرقان نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔
 "میرے پاس رضامندی ظاہر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" میں نے چونک کر پوچھا۔
 "بالائی منزل کے مالکانہ حقوق تمہارے پاس تھے۔ پھر کسی مجبوری۔ وہ تمہاری مرضی کے بغیر پورے گھر کو فروخت کرنے کے اختیارات نہیں رکھتا تھا۔"

"نہیں جناب! حقیقت اس سے قطعی مختلف تھی.....!" اس نے بتایا۔
 "عدالت حقیقت جاننا چاہتی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 میں نے دیکھا، جج پوری توجہ اور دلچسپی سے میرے اور طرم کے درمیان جاری سوال و جواب کو سماعت کر رہا تھا۔ یہ میرے لیے ایک خوش آئند بات تھی۔

"حقیقت یہ ہے جناب.....!" طرم نے معتدل انداز میں بتانا شروع کیا۔ "بالائی منزل کی ملکیت کے حوالے سے قاضی نے مجھ سے جتنی بھی باتیں کی تھیں وہ زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھ سکی تھیں۔ ابھی بالائی منزل کی ملکیت کے کاغذات تیار نہیں ہوئے تھے کہ قاضی نے مکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے روکنے کے لیے میرے پاس اختیارات نہیں تھے۔"

"اختیارات اس لیے نہیں تھے کہ تم نے اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قاضی کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔" میں نے خشکی آمیز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "قاضی کی مکان فروخت کرنے کی اسکیم کے جواب میں تم نے کیا کہا تھا؟"
 "میں نے قاضی سے کہا تھا کہ اگر وہ مکان فروخت کر دے گا تو انہیں فوری طور پر گھر خالی کرنا ہوگا۔ پھر میں اپنی بیوی کو لے کر کہاں جاؤں گا؟"
 "اس نے کیا جواب دیا تھا؟"
 "وہ بولا۔ تم چند دن کے لیے اپنی سسرال چلے جانا اور میں اپنے کسی رشتے دار کے پاس چلا جاؤں گا۔" طرم نے جواب دیا۔ "پھر جب مکان کی فروخت کا پراسس مکمل ہو جائے گا تو وہ دو لاکھ مجھے دے دے گا۔ اس کے بعد میں آزاد ہوں گا کہ کہیں بھی رہوں۔ اس کے ساتھ ہی قاضی نے مجھے ایک تجویز بھی دی تھی۔"

”کیسی تجویز؟“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
 ”آجیکشن پور آزا“ وکیل استغاثہ جو کافی دیر سے خاموش کھڑا، میرے اور ملزم کے بیچ ہونے والی گفتگو کو ختم سے سن رہا تھا، اچانک پھٹ پڑا۔
 تمام حاضرین عدالت نے چونک کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ جج نے اس سے استفسار کیا۔
 ”وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“
 ”جناب عالی!“ وہ جج کے سوال کے جواب میں بولا۔ ”اس وقت عدالت میں گھٹ مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور ڈیفنس کو ملزم کو کسی اور موضوع میں الجھا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں غیر متعلقہ باتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“
 ”جناب عالی!“ وکیل استغاثہ کے حملے کے جواب میں، میں نے کہا۔ ”میں نے اب تک اپنے موکل سے ایک بھی غیر متعلقہ اور غیر ضروری سوال نہیں کیا۔ میرے موکل کے ساتھ ایک لاکھ روپے کا فراڈ کیا گیا ہے۔ جب تک اس فراڈ کی تفصیلات معزز عدالت کے ریکارڈ پر نہیں آجاتیں، قتل کے محرکات کو نہیں جانا جاسکتا۔ میں آگے چل کر یہ ثابت کر دوں گا کہ میرا موکل بے گناہ ہے اور ایک سوچتی بھی سازش کے تحت اسے اس قتل کے کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔“
 ”پور آزا! میرے فاضل دوست جتنی ست روپی سے ملزم پر جرح کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ملزم پر جرح مکمل کرنے میں انہیں مزید دو تین پیشیوں کی ضرورت ہوگی۔“ وکیل استغاثہ نے برا سامنہ بنا کر مجھ پر چوٹ کی۔ ”استغاثہ کے گواہوں کو بھی عدالت میں پیش کرنا ہے۔ اس طرح تو یہ کیس لٹکا چلا جائے گا۔“
 وکیل استغاثہ نے میری سمت جوائنٹ بھیگی تھی اس کے جواب میں ایک پتھر لڑھکانا مجھ پر واجب ہو گیا تھا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے گھبراہٹ میں کہا۔
 ”جناب عالی! جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میرے موکل کے ساتھ ہونے والے جائیداد فراڈ کو بے نقاب کیے بغیر گھٹ مرڈر کیس کو حل کرنا ممکن نہیں لہذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے ملزم پر اپنی جرح مکمل کرنے کے لیے قہور اٹانم دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی وکیل سرکار کو بھی اس امر کا پابند بنایا جائے کہ وہ میری جرح کے دوران میں کسی بھی قسم کی مداخلت کا خیال دل سے نکال دیں اور جہاں تک استغاثہ کے گواہوں کا تعلق ہے۔“
 میں نے جملہ ناممل چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی پھر

ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”اگر مجھے کل کر بولنے کا موقع دیا گیا اور مجھے توجہ سے سننے کی کوشش کی گئی تو میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ استغاثہ کے گواہوں کو زحمت دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔“
 وکیل استغاثہ نے میرے انکشاف پر حیرت بھری نظر سے پہلے مجھے اور پھر جج کو دیکھا جسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہوتا ہم اس نے ”آجیکشن پور آزا“ کا فقرہ لگانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔
 جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے حکمانہ انداز میں کہا۔ ”جرح جاری رکھی جائے۔“
 ”میں ایک مرتبہ ملزم کی طرف متوجہ ہو گیا اور جرح کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو پھر سے جوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم قاضی وحید کی کسی تجویز کے بارے میں بتا رہے تھے؟“
 ”قاضی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں چاہوں گا تو دوبارہ بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔“ ملزم فرقان نے بتایا۔
 ”چھ لاکھ میں کوئی بڑا گھر خرید لیا جائے گا۔“
 ”پھر تم نے قاضی کو کیا جواب دیا تھا؟“
 ”میں نے کہا تھا، بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔“
 میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا تھا؟“
 ”پھر..... قاضی کے مشورے پر میں عظمیٰ کے ساتھ اپنی سسرال میں شفٹ ہو گیا۔“ ملزم ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”قاضی نے کہا تھا کہ وہ بھی اپنے کسی رشتے دار کے یہاں چلا جائے گا مگر جب ایسا نہیں ہوا اور قاضی اپنی بیوی گھٹ کے ساتھ یہ دستور ایسی گھر میں بھا رہا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے ”قاضی اسٹیٹ“ جا کر اس سے بات کی۔ اس نے ٹال مٹول کی راہ اپنائی اور ”آج کل، آج کل“ کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔“
 ”لیکن یہ سمجھتے ہیں بہت دیر میں آئی۔“ اس نے لہجائی توقف کیا تو میں نے حکیمے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا بہر حال..... یہ بتاؤ، تم نے قاضی وحید کا گھر کب چھوڑا تھا؟“
 ”مکان کی فروخت کا معاملہ تجربہ کے آخری دنوں میں سامنے آیا تھا۔“ وہ پُر اعتماد انداز میں بولا۔ ”اور ہم نے اکتوبر کی ابتدائی تاریخوں میں..... بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، تین اکتوبر کو شفٹنگ کی گئی۔“
 ”آپ لوگوں نے تین اکتوبر کو قاضی کے گھر کو خیر باد

کہہ دیا اور پھر پندرہ اکتوبر کو تمہیں قاضی کی بیوی گھٹ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔“ ملزم نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”تین سے پندرہ اکتوبر کے درمیان کیا ہوتا رہا؟“
 ”جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہم نے قاضی کے ایما پر شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا گھر چھوڑ دیا تھا۔ تین اکتوبر سے چودہ اکتوبر تک میں ہر دوسرے تیسرے دن قاضی کی انجینی کے چکر کاٹا رہا تاکہ اس سے دو لاکھ کی رقم وصول کر سکوں لیکن ہر مرتبہ وہ کوئی نیا بہانہ بنا کر کل پر ٹال دیتا تھا۔ چودہ اکتوبر کی شام میں نے اس کے ساتھ اچھی خاصی تلخ کلامی کر ڈالی حالانکہ یہ میرا مزاج نہیں ہے۔“
 ”عدالت جانتا چاہتی ہے کہ چودہ اکتوبر کی شام یعنی وقوع سے لگ بھگ چوبیس گھنٹے پہلے تمہاری اور قاضی وحید کی کس بات پر گرما گرمی ہوئی تھی؟“ میں نے اس کیس کے ملزم اور اپنے موکل فرقان سے سوال کیا۔
 ”بات کوئی نئی نہیں گئی۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”میں اس شام بھی دو لاکھ کی رقم لینے ہی اس کی انجینی پر پہنچا تھا۔“
 ”پھر وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“
 ”میرے ہر روز کے تقاضے پر قاضی چڑ گیا تھا۔“ ملزم نے بتایا۔ ”اس نے خامسے غصے سے پوچھا کہ کیا مجھے اس پر بھروسہ نہیں ہے.....؟“
 میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا۔ ”قاضی صاحب! پچھلے پندرہ میں دن میں آپ نے جتنے بیانات بدلے ہیں ان کی روشنی میں مجھے آپ پر واقعی بالکل بھروسہ نہیں ہے۔“
 ”کتنے افسوس کی بات ہے۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”فرقان صاحب! میں آپ کو اپنا بیٹا سمجھ رہا ہوں اور ہر موقع پر آپ کی خوشی اور فائدے کا خیال رکھا اور نہ آج کل کے غدار زمانے میں کون کسی کو چھت پر..... اپنے مکان کی چھت پر تعمیرات کی اجازت دیتا ہے۔ یہ میرا ہی جگر اور ظرف تھا کہ میں نے چاہا کہ آپ کا بھی اپنا ذاتی گھر ہو جائے لیکن آپ نے بھی دل سے میرے ایما اور محبت کو محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں تو اب بھی آپ ہی کے فائدے کے لیے کوشاں ہوں۔ آپ نے میرے گھر میں ایک لاکھ روپے لگائے اور میں آپ کو دو لاکھ دلوانا چاہتا ہوں لیکن اگر پارٹی کی طرف سے کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے.....!“

”قاضی صاحب!“ میں نے اس کی جذباتی تقریر کے جواب میں سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے آج تک مجھ پر جتنے احسانات کیے ان کے لیے میں تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ اب میں آپ کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا۔ آپ دو لاکھ کی کہانی کو ختم کر دیں۔ مجھے میرے ایک لاکھ ہی لوٹا دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“
 ”یعنی آپ ایک لاکھ کے منافع کو پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑا رہے ہیں؟“ اس نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ایسا ہی سمجھ لیں قاضی صاحب!“ میں نے بیزارگی سے کہا۔ ”میں نا سمجھ اور کم عقل ہوں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں آلو کا پٹھا ہوں جو جانتے بوجھتے اپنا ایک لاکھ روپے کا نقصان کر رہا ہوں۔ آپ میرے ایک لاکھ واپس کر دیں۔ میں منافع والے ایک لاکھ کو حسین خواب سمجھ کر بھول جاؤں گا۔“
 ”اوہ.....!“ قاضی نے میرے اس کلیئر کرٹ جواب پر بڑے افسوسناک انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”جب آپ نے حتیٰ فیصلہ کر لیا ہے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔“
 ”آپ یہ کر سکتے ہیں کہ میرے ایک لاکھ روپے واپس کر دیں۔“ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے لیے آپ کو ایک دن انتظار کرنا ہوگا۔“ وہ پُر خیال انداز میں بولا۔ ”آپ کل شام میں میرے گھر آ جائیں اور اپنے ایک لاکھ روپے مجھ سے لے جائیں۔“
 ”جب دینا ہی ہیں تو کل شام کیوں۔“ میں نے اس کی نیت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ ابھی ادا ہو چکے ہیں اس باب کو بند کر دیں۔“
 ”اگر اس وقت رقم میرے پاس موجود ہوتی تو میں ابھی نکال کر آپ کو دے دیتا۔“ وہ کھلی آمیز انداز میں بولا۔ ”کل دن میں کسی وقت پارٹی مجھے ایک لاکھ روپے ادا کرے گی اور مکان کا سیل انگریمنٹ بنے گا۔ آپ کل شام میں میرے گھر آ کر ایک لاکھ روپے لے جائیں۔“
 قاضی نے مکان کے سیل انگریمنٹ کا ذکر کر کے ایک بار پھر مجھے لالچ میں لانے کی کوشش کی تھی لیکن میں اب اس کے کسی فریب میں آنے والا نہیں تھا لہذا میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور مضبوط لہجے میں پوچھا۔
 ”قاضی صاحب! میں کل شام میں کتنے بچے آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں؟“
 ”ٹھیک آٹھ بجے!“ وہ قطعی لہجے میں بولا۔

خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ وہ خاصا دنگ آدمی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”وکیل صاحب! فرقان کو ہر قیمت پر باعزت بری ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے جتنا بھی پیسہ خرچ ہو، پروا نہیں ہے۔“

”خان صاحب! آپ بالکل مطمئن رہیں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ کا ہم زلف انشا اللہ! بہت جلد آزاد فضا میں سانس لے رہا ہوگا۔“

”وکالت آپ کا شعبہ ہے.....!“ وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ کام آپ کریں۔ دوسرا کام میں خود کر لوں گا۔“

”دوسرا کام.....!“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کون سا دوسرا کام خان صاحب؟“

”قاضی سے اپنی رقم کی وصولی کا کام۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں اس سے ایک نہیں، پورے دو لاکھ نکلاؤں گا اور..... وہ بھی اپنے طریقے سے وکیل صاحب!“

وہ خاصے خطرناک عزائم کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھ لیا۔ ”خان صاحب! آپ کا اپنا طریقہ کون سا ہے؟“

شاہد ٹنک، فرقان کی بہ نسبت خاصا تیز طرار، پرجوش اور چلتا پڑھتا قسم کا شخص ثابت ہو رہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بڑے غر سے بتایا۔

”وکیل صاحب! میرے جاننے والوں میں بڑے کام کے لوگ ہیں۔ قاضی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور میرے آدمی اسے علاقہ غیر میں پہنچا دیں گے۔ دو لاکھ کیا، یہ چار لاکھ دے کر اور قدموں میں گر کر جان چھڑائے گا۔“

”اتنی زیادہ مہم جوئی اور تکلیف کی ضرورت نہیں ہے خان صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اس کیس کو کچھ ایسے انداز میں لے کر چل رہا ہوں کہ فرقان کی بے گناہی ثابت ہونے کے ساتھ ہی قاضی کا فراڈ بھی کھل کر سامنے آجائے تاکہ باعزت رہائی کے ساتھ ہی اس کی ایک لاکھ کی رقم بھی واپس مل جائے۔“

”تب تو ٹھیک ہے۔“ وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ اس معاملے کو عدالت میں نمٹا سکتے ہیں تو بڑی اچھی بات ہے ورنہ آپ مجھے اشارہ کر دیجیے گا۔ میں سنبھال لوں گا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک

ہو جائے گا۔“ میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ”آپ کو کسی قسم کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی اور.....“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور جب تک میں آپ کو کسی قسم کا اشارہ نہ دوں، آپ کوئی بھی اچھایا برا قدم نہیں اٹھائیں گے۔ یہ بات میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کی کوئی بھی حرکت اس کیس کو خراب کر دے گی۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ کا جو حکم ہوگا، میں ویسا ہی کروں گا۔ میں کوئی پاگل تو نہیں کہ آپ کا کیس خراب کر دوں.....“

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”شاہد ٹنک! تمہارے عزائم تو پاگلوں والے ہی ہیں.....“ پھر زبان سے کہا۔

”بہت شکر یہ خان صاحب۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹھنوں میں اس کیس کا مدعی یعنی قاضی وحید استغاثہ کے سب سے اہم گواہ کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو بھی دے چکا تھا۔ استغاثہ کی عمارت اسی بیان کے مندرجات پر کھڑی تھی۔

کر میری مایوسی اور گہری ہو گئی تھی۔ راستے بھر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ دونوں میاں بیوی اچانک کہاں غائب ہو گئے ہیں لیکن میرا ذہن اس سوال کا جواب تلاش نہ کر سکا۔ میں نے گھر پہنچ کر غصے کی صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد انکل علی مراد گھر آئے تو یہ معاملہ میں نے سن و سن ان کے بھی گوش گزار کر دیا۔ انہوں نے پوری توجہ اور سنجیدگی سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا..... مجھے قاضی کے خلاف کبھی فرصت میں تھانے جا کر فراڈ کی رپورٹ درج کرادینا چاہیے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ صبح میرے ساتھ تھانے جائیں گے مگر صبح سے پہلے ہی یعنی پندرہ اکتوبر کی رات گیارہ بجے مجھے گھٹ کے قتل اور ایک لاکھ روپے کی چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔“

میں نے طرم کو فارغ کیا اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی.....!“ اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!“

☆☆☆

آئندہ دو ماہ میں تین پیشیاں ہوئیں اور ان میں استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہوں کو عدالت میں پیش کیا گیا جن کا تعلق اسی علاقے سے تھا جہاں قاضی وحید کا گھر واقع تھا۔ ان گواہوں پر میں نے خاطر خواہ جرح نہیں کی اور ان کے بیانات میں بھی ایسی کوئی خاص بات موجود نہیں تھی کہ جس کے لیے سپین ڈائجسٹ کے قیمتی صفحات کو قربان کیا جائے۔ مختصراً آپ اتنا جان لیں کہ استغاثہ نے ان گواہوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انہوں نے وقوعہ کی شام طرم کو قاضی کے گھر کے آس پاس دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جس سے میرا موکل بھی انکاری نہیں تھا۔

آئندہ پیشی سے پہلے طرم کے سر علی مراد نے مجھ سے دو ملاقاتیں کیں۔ اس سے قبل بھی وہ گاے گاے بگاے مجھ سے ملتا رہتا تھا۔ میں نے اس کے ذمے جو کام لگایا تھا وہ اس نے مرحلہ وار مکمل کر دیا تھا جس کی بنا پر، زیر سماعت کیس پر میری گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔

اسی دوران میں ایک بار علی مراد اپنے حیدر آباد والے داماد کے ساتھ بھی میرے دفتر آیا تھا۔ نادہ کا شوہر اور علی مراد کا بڑا داماد شاہد ٹنک حیدر آباد میں کاروں کی

”لیکن یہ تو آپ کا ابجینسی کا وقت ہے۔“ میں نے حذب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ کل شام آٹھ بجے مجھے اپنے گھر پر مل سکیں گے؟“

”جب کہہ دیا ملوں گا تو ملوں گا۔“ وہ رکھائی سے بولا۔

”آپ خواہ مخواہ وکیلوں کی طرح مجھ سے جرح نہ کریں۔“ میں اس کی ابجینسی سے اٹھا اور اپنی سسرال چلا گیا۔

طرم نے دکھ بھری مگر دلچسپ کہانی کو ایک کنارے تک پہنچایا تو میں نے جیتے جیتے لہجے میں پوچھا۔ ”پھر پندرہ اکتوبر کی شام ٹھیک آٹھ بجے جب تم قاضی وحید کے گھر پہنچے تو کیا اس نے تمہیں ایک لاکھ روپے ادا کر دیے تھے؟“

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میرے تو اس وقت ملتے جب قاضی ہاتھ لگتا.....!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے خاصی تیز آواز میں استفسار کیا۔

”جناب! پندرہ اکتوبر کی شام جب میں ٹھیک آٹھ بجے قاضی کے گھر پہنچا تو وہ مجھے ملا نہیں۔“ طرم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”میں نے تین چار مرتبہ اطلاعی ٹھکنی بجا کی لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ میں نے دروازے پر دستک بھی دی اور دو چار بار قاضی کو پکارا بھی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر اندرونی نقل و حرکت کو محسوس کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اندر کی خاموشی اور سناٹا یہی بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں۔ مایوس ہو کر میں وہاں سے واپس آ گیا۔“

”جب تم قاضی کے گھر کی ٹھکنی بجا رہے تھے یا دروازے پر دستک دے رہے تھے یا جب تم نے قاضی کو پکار کر دروازے تک لانے کی کوشش کی تو کسی نے تمہیں یہ کام کرتے ہوئے دیکھا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”یا واپسی پر تمہاری کسی سے بات ہوئی تھی؟“

”نہیں جناب! میری کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور جہاں تک کسی کے دیکھنے کا تعلق ہے تو یہ ممکن نہیں۔ قاضی کے گھر کا دروازہ ایسے زاویے پر پڑتا ہے کہ گلی میں گزرنے والوں کی نظر سے محفوظ رہتا ہے۔ سمجھیں کہ ایک اوٹ سی بنی ہوئی ہے۔“

”اوکے.....“ میں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”قاضی کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد تم اپنی سسرال چلے گئے تھے؟“

”سسرال تو چلا گیا تھا مگر قاضی کی ابجینسی کو ٹیج کرنے کے بعد“ اس نے جواب دیا۔ ”ابجینسی پر تالا پڑا دیکھ

سردار باری میں گیا اور لڑکی سے کہا۔ ”آپ ڈانس کریں گی؟“

لڑکی کھڑی ہو کر۔ ”جی ہاں۔“

سردار۔ ”تو باجی پھر یہ کرسی میں لے لوں؟“

بیوی۔ ”کیا کر رہے ہو؟“

شوہر۔ ”کھیاں مار رہا ہوں۔“

بیوی۔ ”کتنی ماری؟“

شوہر۔ ”3 مادہ، 2 نر۔“

بیوی۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا میل اور فیمیل کا؟“

شوہر۔ ”3 شیشے کے سامنے بیٹھی تھیں اور 2 گولڈ لیف کے ٹیکٹ پہ۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کرپڑوی اور مکی ٹاؤن، کراچی

ہو جائے گا۔“ میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ”آپ کو کسی قسم کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی اور.....“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور جب تک میں آپ کو کسی قسم کا اشارہ نہ دوں، آپ کوئی بھی اچھایا برا قدم نہیں اٹھائیں گے۔ یہ بات میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کی کوئی بھی حرکت اس کیس کو خراب کر دے گی۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ کا جو حکم ہوگا، میں ویسا ہی کروں گا۔ میں کوئی پاگل تو نہیں کہ آپ کا کیس خراب کر دوں.....“

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”شاہد ٹنک! تمہارے عزائم تو پاگلوں والے ہی ہیں.....“ پھر زبان سے کہا۔

”بہت شکر یہ خان صاحب۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹھنوں میں اس کیس کا مدعی یعنی قاضی وحید استغاثہ کے سب سے اہم گواہ کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو بھی دے چکا تھا۔ استغاثہ کی عمارت اسی بیان کے مندرجات پر کھڑی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹنج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹنج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

میرے پاس بڑا موٹر قسم کا تریاق موجود تھا۔
وکیل استغاثہ نے اپنی فائلوں میں سے چند کاغذات نکالے اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پور آئز! قاضی وحید نے اپنے گھر کے بالائی حصے کی تعمیر کا کام مارچ کے مہینے میں شروع کر دیا تھا تاہم یہ کام جون کے مہینے میں جا کر مکمل ہوا۔ اس سلسلے میں قاضی وحید نے سریا، سینٹ، ریت، بلاکس اور دیگر تعمیراتی سامان مارچ ہی میں خرید لیا تھا۔ یہ ساری رسیدیں بلڈنگ میٹریل کی خریداری کے حوالے سے ہیں اور قاضی وحید کے نام پر کافی کٹی ہیں۔“
لجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
”پور آئز! انہی کاغذات میں ملزم کے بینک ریکارڈ کے حوالے سے بھی چند اہم دستاویزات کی نقول شامل ہیں جو ایک لاکھ بینک لون سے متعلق ہیں۔ مذکورہ بینک نے ان امور کی باقاعدہ تصدیق بھی کی ہے۔“ اتنا کہہ کر وکیل استغاثہ نے وہ تمام کاغذات جج کی جانب بڑھا دیے۔
جج نے مذکورہ کاغذات کو اپنے سامنے میز پر بچھلا کر چند لمحات تک ان کا باریک بینی سے جائزہ لیا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔
وکیل استغاثہ اپنے دلائل کو دراز کرتے ہوئے بولا۔
”جناب عالی! ملزم چارمی کو ایک لاکھ کے بینک لون کے لیے اپلائی کرتا ہے۔ یہ لون اپروو ہونے میں کم و بیش دو مہینے لگ جاتے ہیں۔ بینک ریکارڈ کے مطابق لون کی رقم یعنی ایک لاکھ روپے پچیس مئی کو ملزم کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پچیس مئی سے پہلے ملزم لون کی رقم کا ایک روپیہ بھی کسی قسم کے تعمیراتی کام پر خرچ کرنے کا مجاز نہیں تھا جبکہ قاضی وحید تعمیر کے حوالے سے تمام تر خریداری مارچ اور اپریل میں مکمل کر چکا تھا۔ تمام رسیدیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔“ وہ ایک مرتبہ پھر تھما پھر ڈرامائی انداز میں اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

”ملزم نے ایک لاکھ روپے کہاں خرچ کیے ہوں گے یہ بات خدا کو معلوم ہے یا پھر ملزم خود جانتا ہوگا مگر تمام تر حالات و احوالات اور ثبوتوں کی روشنی میں یہ واضح ہو چکا تھا کہ ملزم نے قاضی وحید کے گھر پر ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا لہذا اس کا دعویٰ جھوٹا اور مبنی بر سازش ہے۔“ ویش آل پور آئز۔“
میں زیر لب مسکراتے ہوئے بڑی توجہ اور دلچسپی سے وکیل استغاثہ کی کارکردگی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ جج نے وکیل

بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ اپنا فرض نبھانے کے لیے ویش باکس کے قریب چلا گیا۔ اس نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔
”قاضی صاحب! آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہیں گے؟“ بات ختم کرتے ہی اس نے اکیوڑ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔
”خود غرض، احسان فراموش، تم طرف.....“ قاضی نے نفرت انگیز نگاہ سے ملزم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
”اور خونی..... میری بیوی کا قاتل!“

”قاضی صاحب!“ وکیل استغاثہ نے بڑی جالاکا سے جرح کو ایک خاص ڈگر پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”ملزم کا بیان بلکہ دعویٰ ہے کہ اس نے آپ کے گھر کی بالائی منزل کی تعمیر پر لگ بھگ ایک لاکھ روپے خرچ کیے جو اس نے اپنے بینک سے قرض لیے تھے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟“
”یہ بات درست ہے کہ ملزم نے اپنے بینک سے ایک لاکھ کا لون لیا تھا۔“ وہ ناپسندیدہ نظر سے فرقان کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”مگر اس نے اس رقم میں سے ایک روپیہ بھی میرے گھر کی تعمیر پر خرچ نہیں کیا۔ گھر کی بالائی منزل اور دیگر چھوٹی موٹی مرمت کا کام میں نے اپنی جیب سے کرایا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے، اس حوالے سے ملزم نے صریحاً غلط بیانی سے کام لیا ہے؟“ وکیل استغاثہ کے استفسار میں ایک خاص نوعیت کی کاٹ پائی جاتی تھی۔
”یہ شخص ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔“ قاضی نے بہ آواز بلند کہا۔

”کیا آپ ملزم کے جھوٹ کو ثابت کر سکتے ہیں؟“
”میرے پاس جو بھی ثبوت تھے وہ میں آپ کو فراہم کر چکا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ میری بیوی کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اس عیس کی بیروی کر رہے ہیں۔ ان ثبوتوں کو کس طرح کام میں لانا ہے، یہ تو آپ ہی کو پتا ہوگا۔“

قاضی وحید نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ ہال کو وکیل استغاثہ کی کورٹ میں پھینک دیا تھا اور میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ یہ ان دونوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ وکیل استغاثہ نے دانستہ ایسے زاویے سے جرح کا آغاز کیا تھا کہ جس پر ملزم کو بڑی سہولت کے ساتھ چت کیا جاسکتا تھا لیکن مجھے وکیل استغاثہ یا قاضی وحید کے طریقہ واردات سے قطعاً کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ان کے زہر کا توڑ کرنے کے لیے

سرگزشت

ماہنامہ

کی ایک اور قابل تحسین کش

خطانمبر

انسان خطا کا پتلا ہے غلطی ہماری سرشت میں داخل ہے
بڑے لوگوں کی چھوٹی اور چھوٹے آدمیوں کی ایسی بڑی غلطیاں
جنہوں نے تاریخ، وقت، زندگی اور حالات کا دھارا بدل دیا
دلوں کو چھو لینے والی سچ بیاباں، دلچسپ قصے اور انوکھی
وارداتیں ہر تحریر آپ کو حیرت زدہ کر دے گی

یہ ایک ایسا خاص شمارہ ہے جسے آپ مجلد کر کے محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

بہت جلد آپ تک پہنچ رہا ہے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرالیں

لگتا ہے۔ کیر واری نے یہ مکان اپنی بہن مقتولہ نگہت کو
رہنے کے لیے دیا تھا۔ پھر چانک کیر واری کی موت واقع
ہوئی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

قاضی کے غبارے کی ہوا بڑی حد تک نکل چکی تھی۔
میرے انکشاف نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ تمام تر
معلومات علی مراد کی کاوشوں کے نتیجے میں مجھ تک پہنچی تھیں۔
قاضی کی تیزی سے بدلتی ہوئی حالت جج اور عدالت میں
موجود کسی بھی شخص سے پوشیدہ نہیں تھی تاہم آخری لمحات میں
اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”واری نے اپنی موت سے قبل مکان اپنی بہن یعنی
میری بیوی نگہت کے نام کر دیا تھا۔“

”اور آپ کی کوشش تھی کہ نگہت اپنی موت سے قبل وہ
مکان آپ کے نام کر دے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”جب بیوی کو رام کرنے کی آپ کی ساری کاوشیں
ناکامیاب ہوئیں تو آپ نے میرے موکل کو قربانی کا بکرا بنا
کر بیوی کا پتہ صاف کر دیا۔“

”جیکھن پور آؤ!“ وکیل استغاثہ نے صدامے
احتجاج بلند کی۔ ”ڈیفنس کونسلر استغاثہ کے معزز گواہ پر الزام
لگا کر سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔“

جج جو بڑی توجہ اور انہماک سے میری جرح سماعت
کر رہا تھا، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”بیگ صاحب! آپ استغاثہ کے اعتراض پر کیا
کہیں گے؟“

”جناب عالی! فی الحال تو میں یہی کہوں گا کہ میں نے
استغاثہ کے معزز گواہ قاضی وحید پر جو سنگین الزام تراشی کی ہے
اسے عدالت کے دروبرداشت بھی کر کے دکھا سکتا ہوں۔“

”اوہ.....!“ جج نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”گویا
آپ یہ ثابت کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ قاضی وحید نے
اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟“

”آف کورس پور آؤ!“ میں نے اعتماد کی بلند یوں کو
چھوٹے ہوئے یہ آواز بلند کیا۔

جج نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پریشن
گرامیڈ.....!“

”جناب عالی!“ میں نے جج سے مخاطب ہوتے
ہوئے کہا۔ ”میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سنجیدہ
سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ
کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر

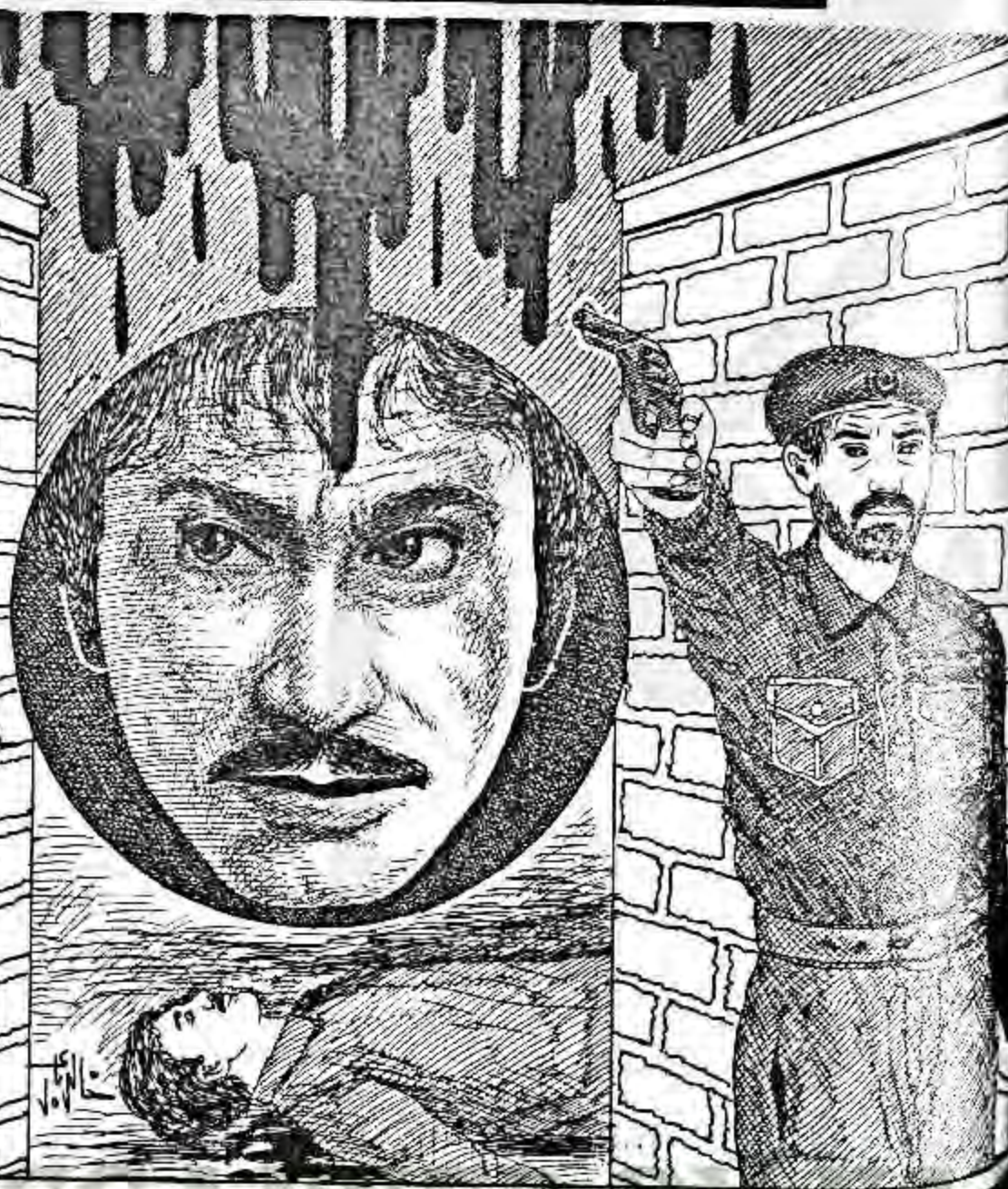
صبح چار اور پانچ کے درمیان باقر بھائی کو کراچی سینٹرل جیل میں پھانسی دی گئی اور صبح گیارہ بجے ان کی لاش مہر پہنچادی گئی۔ ان کی گرفتاری سے مقدمہ تک، فیصلے سے اپیلوں تک اور پھانسی سے لاش گھر پہنچی تو پہلی دفعہ مجھے ایسا لگا جیسے ای نے ہے کہ میں نے ای کی آنکھوں کو کبھی خشک دیکھا ہو۔ آنسو جھرنے کی طرح بہتے رہے تھے، باقر بھائی کی تدفین کے چھ دن کے اندر اندر ای کا بھی انتقال ہو گیا۔ جب لاش گھر پہنچی تو پہلی دفعہ مجھے ایسا لگا جیسے ای نے

کوکہ کادکھ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

دنیا میں محبت کا سب سے خوب صورت روپ ممٹا کا ہے اور سب سے مضبوط احساس بھی یہی ہے۔ لیکن ممٹا اگر دکھ بن جائے تو اس سے بڑا غم بھی کوئی نہیں۔ ممٹا کی ماری وہ بھی ایک ان دیکھا عذاب جھیل رہی تھی کیونکہ اس کے لخت جگر نے بھی ایک غار میں قید اتنے اذیت ناک لمحات گزارے تھے کہ وہ بے بس ماں تمام عمر بلبکتی رہی۔

ایک خوب صورت احساس کی اذیتوں کا بے مثال قصہ



ہو۔ یہ میرے اس کاری دار کا اثر تھا جو میں نے انگوٹھیاں کی شہادتوں کے حوالے سے اس پر کیا تھا۔ اگلے ہی لمحہ وہ جیہ کر کٹھنرے کے فرش پر دھڑام سے گرا۔

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر میرے کڑے سوالات کے نتیجے میں قاضی وحید کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس نے قاضی کا عزم ہونا ثابت کر دیا تھا۔ جب عدالت کے حکم پر اسے پولیس کے حوالے کیا گیا تو اس نے اقبال جرم ہی میں عافیت چاہی۔ قاضی کی بیوی یعنی مقتولہ گھت دل کی بہت اچھی عورت تھی۔ قاضی نے فرقان کے ساتھ جو ایک لاکھ کا فریاد کیا تھا وہ اس پر سخت برہم تھی اور اس نے قاضی کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے فرقان کی رقم واپس نہ کی تو وہ اس کے خلاف اور فرقان کے حق میں گواہ بن جائے گی۔ قاضی پہلے ہی اپنی بیوی کی بیماری سے نالاں تھا اور اسے ٹھکانے لگانے کی ترکیبیں ڈھونڈتا رہتا تھا تاکہ مکان پر اس کا بلا شرکت غیرے قبضہ ہو جائے۔ گھت بڑی حد تک قاضی کی نیت کو سمجھ گئی اور اپنی زندگی میں تو وہ کسی بھی قیمت پر مکان اس کے نام کرنے کو تیار نہ ہوتی لہذا قاضی نے فرقان کو قربانی کا بکرا بنا کر ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر اسے اس منصوبے پر عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے پندرہ اکتوبر کی شام آٹھ بجے فرقان کو اپنے گھر بلایا تاکہ جائے وقوعہ پر اس کی آمد رجسٹر ہو جائے۔ وہ فرقان کے آنے سے پہلے اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور گھر کے اندر چھپا بیٹھا تھا۔ مگر کو اس نے لاک کر دیا تھا تاکہ فرقان کو یہی تاثر ملے کہ گھر کے اندر کوئی موجود نہیں اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا جائے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قاضی کے اقرار جرم کے بعد عدالت نے میرے موکل فرقان کو باعزت بری کر دیا تھا۔ موچی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تے گانٹنے کا کام کرتا ہو اور دوسرا وہ جس کے دماغ میں موج آجائے۔ دماغ کی موج والے موچی کو دنیا کی ہر شے میز می نظر آتی ہے۔ چاہے وہ اس کے اپنے گھر کا آئین کیوں نہ ہو۔ جن لوگوں کو ناچنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو وہ بھی آئین کو ٹیڑھا کہہ کر اپنی ساری نالائقیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قاضی وحید نے بھی ایک ایسی ہی بے ڈھنگی اور میز می کوشش کی تھی اس لیے وہ بے آواز لاشی کی دھواں دھواں ضرب سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا اور عبرت ناک انجام سے دو چار ہوا۔

(تحریر: ضام بٹ)

کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ میں نے بہ دستور انگوٹھیاں آفسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آئی او صاحب! وقوعہ کی رات لگ بھگ گیارہ بجے جب آپ نے ملزم فرقان کو اس کی سسرال واقعہ بہادر آباد سے گرفتار کیا تو کیا اس کے دائیں ہاتھ کی رینگ ٹنگ اور ٹل ٹنگر میں آپ کو انگوٹھیاں نظر آئی تھیں؟“

”نو.....!“ اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

میں ایک جھٹکے سے استغاثہ کے معزز گواہ قاضی وحید کی جانب مڑا اور قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ”قاضی وحید! تمہاری انگوٹھیاں کہاں ہیں؟“

”مم..... میری انگوٹھیاں.....“ اس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو بھی انگوٹھیاں پہنی ہی نہیں..... آپ..... کن انگوٹھیاں کا..... ذکر کر رہے ہیں.....؟“

”وہ انگوٹھیاں جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے قتل تمہارے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں موجود تھیں۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اور اس وقت بھی انگلیوں میں موجود تھیں جب تم نے اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا.....؟“

”آپ..... جھوٹ بول رہے ہیں.....“ وہ بے حد بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”بکواس کر رہے ہیں.....“

”قاضی! میں تمہارے جاننے والوں میں سے کم از کم دس ایسے افراد کو گواہی کے لیے عدالت میں لاسکتا ہوں جنہوں نے وقوعہ سے پہلے سال ہا سال تک تمہاری انگلیوں میں چاندی کی دو بیوی انگوٹھیاں دیکھی ہوں جن میں سے ایک انگوٹھی میں پندرہ قیراط کا حسینی فیروزہ اور دوسری انگوٹھی میں دس قیراط کا حسینی جڑا ہوا تھا۔“ میں اپنی ہی روانی میں بولتا چلا گیا۔ ”اور دس ایسے افراد کو عدالت تک لانا بھی میرے لیے چنداں مشکل نہیں جو سال ہا سال سے ملزم کے قریب رہے ہوں لیکن انہوں نے کبھی اس کی کسی انگلی میں کوئی بھی انگوٹھی نہ دیکھی ہو اور.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا اور قاضی کے حوصلے کے تابوت میں آخری میخ بھی ٹھونک دی۔

”اور ان ملے جلے گواہی بردار افراد میں سے آٹھ دس تو اس وقت بھی باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے ہیں.....“ ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر قاضی وحید نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو قہام لیا۔ اس کے بدن کی مخصوص جنبش سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے شدید نوعیت کا چکر آگیا

رونا بند کر دیا ہے۔ آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ ایدھی کی ایمبولنس سے باقر بھیا کی لاش کو آہستہ آہستہ باہر نکالا گیا، چار پانچ مردوں نے اسٹرچر کو پکڑ کر اٹھایا اور اندر گھر میں پہلے سے تیار کیے ہوئے کمرے میں لاش کو تخت کے اوپر رکھ دیا گیا تھا۔

امی اپنے مڑے مڑے ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں آئی تھیں اور کہا کہ غسل دینے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے سب لوگ کمر خالی کر دیں۔ میری ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ باقر بھیا کو پھانسی لگ جائے گی۔

انہوں نے آہستہ سے بھیا کے چہرے سے چادر ہٹائی، بھیا کے چہرے پر ایک بڑا سا پیدائشی نشان تھا، سرخ سا، جو دائیں گال کے اوپر سے شروع ہو کر کھنٹی تک پہنچتا تھا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اس پر ہاتھ پھیرا، ان کی پیشانی پر آنکھوں کا بوسہ دیا اور اس پیدائشی نشان کو تھوڑی دیر تک چومتی رہیں۔ بھیا نے امی کی سی ہوئی سفید قمیص پہنی ہوئی تھی۔ امی نے آہستہ سے قمیص کے بٹن کھولے، بالکل دیباہی نشان بھیا کی دائیں چھاتی پر تھا۔ گول سا پھیلا ہوا سرخ سا۔ امی نے آہستہ آہستہ اس پیدائشی نشان کو بھی چوما، آنکھوں سے لگایا، گالوں سے دبایا اور دوبارہ قمیص کے بٹن لگا کر چادر بھیا کے منہ پر ڈال دی۔

”غسل کو بلا لو بیٹا، باقر کے جانے کا وقت ہے۔“ میں پھر ایک بار پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی مگر امی کے چہرے پر ایک دیران سا اطمینان تھا۔

میں نے کمر اکھولا اور امی کے ساتھ باہر آ کر بیٹھ گئی۔ ظہر کی نماز سے پہلے جنازہ تیار ہو گیا۔ ساجد بھائی بھی ایک بچے پہلے سعودی عرب سے کراچی آ چکے تھے، وہ اور عامر دونوں گھر میں ہر قسم کے کاموں کو نمٹا رہے تھے، میں امی کے ساتھ بیٹھی ہوئی بچوں کو سپارے پڑھتی ہوئی، دانوں پر ورد کرتے ہوئے دیکھتی رہی، روتی رہی۔ امی کی آنکھیں خشک تھیں، دیران جیسے کوئی صحرا بیابان۔ ٹھیک ایک بجے گھر کے مرد گھر شہادت پڑھتے ہوئے باقر بھیا کے جنازے کو گھر سے نکال کر قبرستان چلے گئے تھے۔

باقر بھیا سب سے بڑے تھے، ان کے بعد دو بھائی ساجد اور عامر اور پھر میں سب سے چھوٹی تھی گھر میں۔ باقر بھائی مجھ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ میں چھ ماہ کی تھی کہ ابو کا انتقال ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بس کے ایکسٹنٹ میں مر

گئے تھے۔ تیزی سے جاتی ہوئی، ریس کرتی ہوئی بس فٹ پاتھ سے ٹکرائی تھی، اس حادثے میں سات آدمی جاں بحق ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک میرے ابو بھی تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ امی نے کبھی ابو کے بارے میں مجھ سے کوئی بات کی ہو، وہ ابو کے ذکر پر ہمیشہ خاموش ہو جاتی تھیں۔ ساری باتیں تو مجھے خالہ جانی اور ماموؤں سے معلوم ہوتی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ابو کے مرنے کے فوراً بعد کرائے کا گھر خالی کرنا پڑ گیا تھا اور امی ہم چار بچوں کے ساتھ خالہ جانی کے گھر آ گئی تھیں۔ خالو اچھے آدمی تھے، مالدار تھے۔ انہوں نے خالہ جانی سے خود ہی کہا کہ وہ کفالت کریں گے ہم سب کی اور بہت ضد کر کے ہمیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ہم سب کو لکھا پڑھا کر اس قابل کر دیں گے کہ زندگی کی دوڑ میں کامیاب ہو سکیں۔ امی اور ان کے گھر والوں نے روایت کے مطابق چار بچوں کے ساتھ دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

پھر یہ ہوا کہ باقر بھیا کی شرارتوں سے خالہ خالو اور خالو کے گھر والے پریشان ہو کر رہ گئے۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ باقر بھیا کی شرارتوں سے زیادہ امی کی ان کے بارے میں غیر ضروری جانبداری تھی جس سے خالو پریشان ہو گئے تھے۔ وہ گھر کی چیزیں توڑ دیں، اسکول سے بھاگ آئیں، خالو کے پیسے چرائیں، خالہ کے زیور بیچ دیں، بچوں کو تنگ کریں۔ بڑوں سے بدتمیزی کریں مگر امی کا مطالبہ تھا کہ انہیں کچھ نہ کہا جائے، وہ لاڈ لے تھے ان کے۔ میں نے امی کو ہمیشہ انہیں پروڈیکٹ کرتے ہوئے، ہمیشہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ان کی جائز ناجائز ہر بات کی حمایت کرتے ہوئے دیکھا۔ انہیں ان میں کوئی برائی، کوئی خرابی نظر ہی نہیں آتی تھی۔ انہوں نے جیسے اپنے دل و دماغ میں طے کر لیا تھا کہ باقر بھائی کبھی کچھ برا کر ہی نہیں سکتے تھے، ان کے لیے دنیا میں وہی سب کچھ تھے۔

ایک سال کے اندر ہی خالو نے گھر کے بڑوں کی میننگ بلالی اور پھر یہی فیصلہ ہوا کہ ہم سب خالو کے گھر سے ماموں جان کے گھر منتقل ہو جائیں۔

ماموں جان کو جوان بیوہ بہن کا بڑا درد تھا۔ وہ تو شروع دن سے ہی چاہتے تھے کہ ہم سب ان کے ساتھ رہیں مگر ابو کے انتقال کے فوراً بعد معاملات کچھ اس طرح سے ہوئے اور خالو جان نے کچھ اتنی بڑھ کر کر جو جوشی دکھائی کہ وہ اس وقت کچھ کہہ نہیں سکے۔ پھر خالو جان زیادہ ذی حیثیت تھے اور خالہ جان کے بہت بڑے کا دباؤ بھی تھا کہ امی

نے ان کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ماموں جان کے گھر میں حالات ذرا مختلف تھے، انہوں نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقر بھیا کو کچھ نہیں کہیں گے۔ اپنی بہن کی فطرت کا انہیں اندازہ تھا۔ وہ باقر بھیا کے سلسلے میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھیں۔ ماموں جان کی ساری توجہ اپنے بچوں، میرے دو بھائیوں اور مجھ پر رہی۔ ہم سب اسی ڈسکان کے پابند کرائے گئے جو ان کے بچوں کے لیے بھی تھا۔ وقت پر کھانا، وقت پر سونا، وقت پر اسکول جانا اور وقت پر ٹیوشن پڑھنا۔ ماموں جان کے گھر میں کبھی احساس نہیں ہوا کہ ہم ان کے حقیقی بچے نہیں ہیں۔ ان کی ہی مدد، رہنمائی اور مستقل نظریں جس کی بدولت ساجد نے کمپیوٹر میں ڈگری لی۔ عامر انجینئرنگ کالج سے انجینئر بن کر نکلا اور میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد کالج میں پڑھا رہی تھی۔ ساجد بھائی کی سعودی عرب میں نوکری کے بعد ماموں جان کے گھر کے نزدیک ہی ہم لوگوں نے اپنا ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا، زندگی بہ ظاہر پر سکون ہو گئی تھی۔ باقر بھیا نے بڑی مشکل سے دسویں کا امتحان نہ جانے کتنی دفعہ نفل ہونے کے بعد پاس کیا۔ اس کے بعد وہ کسی پریس میں ملازمت کرنے لگے۔ پریس کی نوکری چھوٹی تو وہ کسی اخبار میں کام کرتے رہے۔ ان ہی دنوں پتا لگا کہ امی نے اپنے زیورات بیچ کر باقر بھیا کو کچھ پیسے دیے ہیں کہ وہ پریس کریں گے۔ پریس بھی ان کا نام ہو گیا پھر وہ سول کورٹ میں ملازمت کرنے لگے تھے۔ باقر بھیا کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں ہیں، کب آتے ہیں، کب جاتے ہیں، کیا کرتے ہیں، کتنا کماتے ہیں اور کہاں خرچ کرتے ہیں، ان کی دنیا اور امی اور ہم لوگوں کی دنیا اور۔

ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کا سامنا ماموں جان سے کبھی نہ ہو اور اگر ہوتا بھی تھا تو وہ مرجھائے ان کی باتیں سننے تھے، نہ ہاں نہ ناں اور پھر کئی دنوں کے لیے غائب ہو جاتے تھے۔ امی ہمیشہ ان کا ساتھ دیتی تھیں۔ مجھے بھی ایسا نہیں لگا کہ امی نے مجھے، ساجد کو، عامر کو ہمارے حصے کا پیار نہیں دیا ہو۔ وہ ہمیں بھی چاہتی تھیں، ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ ہر وہ کام کیا انہوں نے جو مامیں کرتی ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر ہمیں ناشتا دینا، ہمارے لیے راتوں کو پریشان ہونا، راتوں کو اٹھ کر ہمیں سردیوں میں چادر کھیل اڑھانا، ہمارے ساتھ بیٹھ کر ہمارا ہوم ورک کرانا، ہمارے کمرے در پر معمولی بخار پر، چھوٹی سی چوٹ پر تڑپ تڑپ جانا۔ رات سونے سے پہلے وہ خاموشی سے ہمارے کمرے

میں آتیں اور دھیرے دھیرے دعا میں پڑھ کر ہمارے اوپر پھونکتی تھیں۔ میں کبھی بھی امی کے پیار کا شمار نہیں کر سکتی گی۔ ماما کی کوئی کی نہیں تھی ان میں۔ لیکن کبھی کبھی احساس سا ہوتا تھا کہ انہیں باقر بھائی ہم سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ ان کا کوئی خاص مقام تھا ان کے پاس، ان کے لیے ہمیں ڈانٹ بھی پڑتی، برا بھلا بھی کہا جاتا مگر مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے امی کو کبھی بھی باقر بھیا کے لیے کچھ بھی برا کہتے ہوئے سنا ہو یا خود بھی انہیں کچھ کہا ہو، وہ ہمیشہ ان کی تعریف و توصیف ہی کرتی رہتی تھیں۔

مجھے یاد ہے ایک دن تو مجھے میں، میں نے انہیں کہہ بھی دیا تھا، جب انہوں نے مجھے شام کو یونیورسٹی کے ایک فنکشن میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ ”ساری پابندیاں میرے لیے ہیں، میرے لیے، اور وہ جو آپ کے بیٹے ہیں باقر کب آئیں، کب جائیں، کچھ کریں، کچھ نہیں کریں کچھ نہیں کہتی ہیں انہیں آپ۔“ ان کے لیے سب جائز ہے، ان کے لیے سب صحیح ہے۔

کچھ نہیں کہا تھا انہوں نے۔ دیکھتی رہیں مجھے کھڑے کھڑے اور آنسوؤں سے ان کا چہرہ بھر گیا تھا، زار و قطار روتی رہیں اور اسی وقت نہ جانے کہاں سے باقر بھیا آ گئے۔ انہوں نے سن لیا تھا یا پتا نہیں کیا بات تھی، اس دن پہلی دفعہ ان کے ساتھ میں باہر نکلی تھی۔ ٹیکسی کر کے مجھے وہ یونیورسٹی چھوڑ گئے اور جس وقت میں نے کہا تھا اسی وقت ٹیکسی پر آ کر مجھے واپس بھی لے گئے تھے۔ اس دن یونیورسٹی کے فنکشن کا مزہ آ گیا تھا اور ایک نئے باقر بھائی لگا ایک میری زندگی میں داخل ہو گئے، بغیر کسی دستک کے، کسی کواڑ کو کھولے بنا۔

مجھے امی کا وہ روہانسا چہرہ یاد ہے۔ دوسرے دن گلے لگ کر میں رو دی تھی۔ ان کی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں کو پکڑ کر، ان کے جھکے ہوئے بائیں شانے سے لگ کر میں کچھ کہہ نہیں سکی، پر وہ سمجھ گئی تھیں۔ مامیں سمجھ جاتی ہیں۔ میرے وجود کے ایک ایک انگ نے ان سے معافی مانگی تھی، میں نے پھر بھی ان سے باقر بھیا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

باقر بھیا بہت مہربان ہو گئے تھے مجھ پر۔ جب بھی آتے، کچھ نہ کچھ لے کر آتے میرے لیے، جتنے دن گھر میں رہتے مجھ سے باتیں کرتے میری سنتے، میری بنائی ہوئی چائے، میرا پکایا ہوا ناشتا، میرے ہاتھ کے بنے ہوئے پکوڑے، میری بنائی ہوئی فروٹ چاٹ، سب کچھ

پسند تھا ان کو۔ میرا خیال اس طرح سے کرتے جیسے میں کوئی شہزادی ہوں۔ مذاق میں بھی منہ سے جو نکل جاتا اسے پورا کرنے کے ہر جتن کر ڈالتے تھے وہ۔ شاید چھوٹی بہن اور ایک ہی بہن ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں میرے لیے خاص جگہ تھی۔ مجھے تو لگتا تھا صرف پیاری پیار بھرا ہوا ہے ان کے دل میں۔

دور پار کے رشتہ دار، محلے والے عجیب عجیب باتیں کرتے تھے ان کے بارے میں، کسی اسمگلر کے لیے کام کرتے ہیں وہ، پولیس انفارمر ہیں، کسی ایجنسی کے لیے کام کرتے ہیں۔ فوجیوں سے رابطے ہیں ان کے۔ اغوا اور تادان کے دھندے میں ہیں غرضیکہ جتنی منہ اتنی باتیں مگر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ امی کے سامنے ان کے خلاف کوئی بات کریں۔ بچپن سے جوانی تک امی نے انہیں صرف پروٹیکٹ کیا تھا، کبھی انہیں ڈانٹا نہیں، کبھی انہیں مارا نہیں، اتنی عجیب و غریب محبت تھی انہیں ان سے۔ گھر میں، خاندان میں، پاس پڑوس محلے میں ہر ایک آگاہ تھا اس بات سے۔

ساجد کی باقر بھیا سے بالکل نہیں بنتی تھی، شروع شروع میں تو دونوں لڑتے ہی رہتے تھے۔ امی ہمیشہ باقر بھیا کی طرف داری کر کے لڑائی ختم کراتی تھیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ ساجد بھائی کو باقر بھیا سے نفرت تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ ساجد بھائی باقر بھیا کو بالکل بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ساجد بھائی نے کوشش کر کے ڈگری ملنے ہی ملک چھوڑ دیا، پیسے کمانے لگے، پیسے کما کر واپس آئے اور گھر لیا اور ہم سب ماموں جان کی مدد سے اپنی چھت کے نیچے رہنے لگے۔ یہ گھر انہوں نے امی کے نام سے لیا تھا۔

عامر کا رویہ کوئی خاص نہیں تھا۔ وہ باقر بھیا سے بھی خوب کھل مل جاتا اور ساجد بھائی سے بھی اس کی دوستی بھائی کے رشتے سے آگے تھی۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ کبھی بھی امی سے باقر بھیا کے بارے میں بات نہیں کرتا تھا۔

پھر ایک دن یہ سب کچھ ہو گیا۔ باقر بھیا گھر پر ہی سو رہے تھے کہ رات تین بجے یکا یک گھر میں پولیس مہم آئی اور دس پندرہ منٹوں کے اندر باقر بھیا کو جھکڑیاں بھی لگ گئیں اور آٹا فانا وہ غائب بھی ہو گئے تھے۔

پھر سب کچھ بہت جلدی جلدی ہوا۔ اخباروں سے پتا لگا کہ اس رات دو اور لوگوں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔ باقر بھیا

سمیت ان تینوں پر قتل کا الزام تھا۔ خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا جہاں سزائے موت سنائی گئی، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ اور صدر پاکستان سے اپیل۔ بائیس مہینے قیامت کی طرح گزر گئے۔ امی کے آنسو بھی رکے ہوئے نہیں دیکھے میں نے۔ ساجد بھائی نے روپے بیچنے میں بھی دیر نہیں کی۔ جو بڑا وکیل ہو سکتا تھا کیا گیا۔ جس در پر کھٹکھٹانے کو کہا گیا امی اپنا دامن پھیلا کر کھڑی ہو گئیں، مگر کچھ نہیں ہو سکا۔

اس منحوس صبح میں باقر بھیا کو پھانسی دے دی گئی۔ آخری ملاقات میں امی کا چہرہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ باقر بھیا کے چہرے پر بڑی تلخ مسکراہٹ تھی، وہ خاموش بیٹھے رہے اور امی بنا پلک جھپکائے سارا وقت ساکت چٹکوں کے ساتھ انہیں دیکھتی رہیں۔ ملاقات کا وقت ختم ہونے پر ان کی پیشانی کو چومنا، ان کے چہرے کے پیدائشی داغ کو پلوں سے چھوا، اپنے مڑے مڑے ہاتھ ان کے چہرے پر پھیرتی رہیں پھر روٹی ہوئی، کانپتی ہوئی، سسکتی ہوئی گھبرا گئیں۔

باقر بھیا کو دفنانے کے بعد امی نے کچھ کھایا نہیں۔ روکھیں نہیں، سوئیں نہیں۔ شروع میں خند کر کے میں نے انہیں کچھ پانی پلایا تو اٹنی ہو گئی، دوسرے دن ہی انہیں اسپتال میں داخل کرنا پڑ گیا۔ پانی اور طاقت کی شدید کمی تھی ان میں۔ اسپتال پہنچتے ہی انہیں گلوکوز اور نہ جانے کیا کیا چڑھایا گیا، دو دن تیزی سے گزر گئے۔ وہ ایک لاش کی طرح بستر پر پڑی ہوئی نہ جانے دور تک کیا دیکھنے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔ کسی سوچ میں کم، کسی امید کے بغیر انہوں نے زندگی سے ناتا شاید توڑ لیا تھا۔

اس دن میں ان کے سر ہانے بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی، دیر دیر سے، دھیمے دھیمے انہوں نے بہت آہستہ سے کہا تھا کہ بہت درد ہے پٹا، بہت درد ہے۔ کہاں کہاں دباؤ کی۔ سر کو، کاندھوں کو، ہاتھوں کو، انگوٹھوں کو، پیروں کو ہر طرف درد ہے پٹا ہر طرف درد ہے۔ جسم میں، بدن میں، ذہن میں، روح میں، روح کے اندر نہ جانے کہاں کہاں۔

”امی جہاں پولیس وہاں دباؤں کی مگر خدا کے لیے کچھ کھا تو لیں، پی تو لیں، ایسے کیسے ہوگا، امی ایسے کیسے ہوگا۔“ میں نے ان سے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

”نہیں بیٹے اب میں جاؤں گی یہ درد اب ختم نہیں ہوگا، درد سب سے والا چلا گیا تو میرا اب کیا کام ہے۔“ انہوں نے پھر دیر دیر سے کہا تھا۔

میں ان کی گردن اور ٹیڑھے سے دائیں کاغذ سے کو آہستہ آہستہ سہلاتی رہی، مگر درد ان کے چہرے پر بادل کی

لرح چھایا ہوا تھا۔ پھر اجانک آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اٹھا کر انہوں نے میرے ہاتھ پکڑ لیے، زور سے دبا دیا پھر کہنے لگی تھیں۔ ”بیٹی ایسے ہی خوبصورت ہاتھ تھے میرے، ایسے ہی نرم، لانی، گداز، نرم نرم انگلیاں تھیں میری۔ میں یہ ٹیڑھے میڑھے مڑے مڑے ہاتھ اور انگلیاں لے کر نہیں آئی تھی دنیا میں۔ میرا یہ ٹوٹا ہوا کاندھا نہیں تھا۔ میں پوری مٹی سالم سر سے پیر تک۔ بابت انگلیوں اور انگلیوں کے پوروں سے لے کر جسم کی ہر ہڈی تک۔ میرا سر سالم تھا میرے کاندھے شانے سالم تھے۔ بیٹے میں تمہاری طرح مٹی مکمل، خوبصورت اور خالص۔“ جیسے انہوں نے سرگوشی کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولنا شروع کر دیا۔

”بیٹا شادی کے پہلے بیٹے سے مجھے ستایا گیا بات بات پر امارا گیا ہر جگہ پر، ہر جگہ درد ہے پٹا ہر جگہ درد، کہاں کہاں دباؤ کی، کدھر کدھر سہلاؤ گی۔“ میں نے محسوس کیا کہ ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

”باقر میرا پہلا بچہ تھا۔ تم نے پوچھا تھا ناں ایک دن میں کیوں اس کی طرف داری کرتی ہوں، اسے کچھ نہیں کہتی ہوں۔ سب کہتے ہیں میں جانبدار ہوں اس کی۔ اس کا کچھ برا نہیں لگتا مجھے۔ کیسے لگتا، کیسے لگتا۔ وہ میرا باقر پھولوں جیسا۔ اس کی حفاظت نہیں کی میں نے۔ ساجد کو بچایا، عامر کو بچایا، جہیں بچایا اپنے شانوں پر چوٹ کھائی، اپنے بازوؤں کو سامنے کر دیا، اپنے ہاتھوں کو ڈھال بنا دیا، اپنی انگلیاں توڑا ڈالیں، اپنے شانے چھلوا دیے، نہ جانے کیا کیا ٹوٹا پیرا، میں کسی ڈاکٹر کے علاج کے بغیر تم تینوں کو بچاتی رہی لیکن اس نے تو مار کھائی پیدا ہونے سے پہلے میری کوکھ کے اندر، میرے جسم کے اندر، میں اسے بچا نہیں سکی۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی تھیں۔ میں نے زور سے ان کے مڑے مڑے ہاتھوں کو دبایا، بھیجا اور آہستہ آہستہ انہیں کبھی چومتی رہی، کبھی سہلاتی رہی۔ اتنی بے قرار انگلیاں پہلی دفعہ محسوس کی میں نے۔

”بیٹا یہ جو باقر تھا میری کوکھ میں تو میرے شوہر نے گرنٹ کے بلے سے میرے پیٹ پر مارا تھا بالکل وہاں ہاتھوں اس کا چہرہ تھا، چھاتی تھی، سر تھا، گردن تھی وہ پیدائشی نشان مستقل درد دیتے ہوں گے میرے بچے کو۔ بچے مارے حمل کے دوران میں بیٹتی رہی۔ لاتوں سے، گولوں سے۔ کبھی پٹنگ پر لٹا کر کبھی زمین پر گر کر۔ نہ جانے کیوں حمل کی خبر کے بعد سے انہوں نے، میرے

شوہر نے میری زندگی کو لہو لہان کر کے رکھ دیا تھا۔ میں جوان تھی بالکل کسی کوٹیل کی طرح سادہ، تمہاری طرح معصوم، کچھ کر نہ سکی، کچھ کہ نہ سکی۔ وہ مجھے مارتا رہا اور ساتھ ساتھ میری کوکھ کے اندر باقر بھی پٹتا رہا، چوٹ کھاتا رہا، شاید روتا بھی ہوگا مگر میں ناکام ہو گئی اسے بچانے میں۔ اپنی کوکھ میں حفاظت نہیں کر سکی اس کی۔ وہ درد لیے لیے گھومتا رہا کبھی گھر میں، کبھی گھر کے باہر، یہاں تک کہ بھانسی پر چڑھ گیا میرا گل۔ اس کے بعد پھر میں بیوی نہیں تھی رکھیل تھی، میری پامالی ہوتی رہی۔ پر میں نے سب کچھ اپنے پر سہا، تم تینوں کو بچاتی رہی اس سے۔ کوکھ سے گود تک اور گود سے گھر تک اپنے ہاتھوں کو ڈھال بنا کر، اپنے جسم کو پامال کر کے، رو رو کر اس کے مرنے کی دعا میں کرتی رہی اور میرا باقر درد کے داغ لیے درد اٹھاتا رہا۔ درد سہتا رہا، اپنے زخمی جسم کے ایک ایک انگ سے اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو جھیلتا رہا۔ اب وہ نہیں ہے، صرف درد ہے، پٹا بہت درد ہے۔“

میں اپنا سر ان کی چھاتیوں پر رکھ کر بے قرار ہو کر رو دی۔ مجھے پہلی دفعہ پتا لگا کہ میری ماں کی انگلیاں ٹیڑھی کیوں ہیں۔ ان کے کاندھے ڈھلے ہوئے ہیں، کیونکہ انہیں میرے باپ نے تشدد کر کے توڑا تھا پھر وہ صحیح طریقے سے جڑے ہی نہیں، ہماری پھول جیسی ماں کو کپلا گیا، توڑا گیا، مروڑا گیا، میرے باپ کا ہر ظلم وہ سہتی رہیں، اپنے جسم کو قربان کر کے ہمیں بچاتی رہیں۔ حفاظت کی ہماری۔ کوکھ کے اندر بھی کوکھ سے باہر بھی۔ وہ محسوس جو ہمارا باپ تھا وہ میری ماں پر جسمانی تشدد کرتا رہا۔ انہوں نے ڈھال بن کر ہمیں بچایا اور اپنا سب کچھ توڑ بیٹھیں۔ اگلے تین دن میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور ایک صبح وہ خاموشی سے ہمیں چھوڑ گئیں، باقر بھیا کا، ہمارا اپنا درد لیے، ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔

اب امی کو گھٹے ہوئے سال ہونے کو آ گیا ہے، ابھی بھی کبھی کبھی رات گئے خواب میں وہ مجھے نظر آتی ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے لگی ہوئی اپنے ہاتھوں، بازوؤں، شانوں پر ڈنڈے کھاتی ہوئی اپنی انگوٹھوں، پٹیلیوں سے انہیں روکتی ہوئی، اپنی کوکھ میں موجود مجھے بچاتی ہوئی، ڈھال بن کر شانے تڑا کر، انگلیاں بکھری ہوئی، خون میں نہائی ہوئی۔ میں جاگ جاتی ہوں، ماں، میری ماں کہنے دکھ اٹھائے تو نے!

مہفل شہر و سخن

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
کوئی ہنر، کوئی روش، کوئی طریقہ تو بتاؤ
کہ دل بھی نہ ٹوٹے، وہ بھی نہ ملے اور چین آجائے
✽ زوہیب احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
بے جواب کیا کرتے راز دل بتاتے کیا
کہانی مختصر سی تھی سناتے کیا چھپاتے کیا
بستی جل کے راکھ ہوئی کچھ تدبیر نہ کی ہم نے
دود کے سوا کیا تھا جلاتے کیا بچاتے کیا
✽ محمد اشفاق سیال..... شور کوٹ سی
جو بے نیاز ہیں خود اپنے حسن سے حسن
کہاں وہ مجھ سے میرا انتخاب پوچھتے ہیں



✽ ڈاکٹر زاہد شیخ..... سرگودھا
کیسی لذت تھی تیری چاہت میں
روگ دل کو لگا لیا میں نے
اتنی قسمت خراب تھی اپنی
اپنا سب کچھ لٹا لیا میں نے

✽ اعظم حسین بھار..... ہزاروی، جتوئی
مخصوص دلوں پر عشق کے الہام ہوتے ہیں
محبت مجزہ ہے مجزے کب عام ہوتے ہیں
✽ محمد اسلم..... تحصیل ضلع خانوال
لوگ بھوکے ہوں تو عقدہ کھلے
کون کتنا صاحب کردار ہے
✽ محمد جاوید عباسی..... نیو سینٹرل جیل ملتان
شب بھر تنہائی میں قیامت سی ٹوٹتی ہے مجھ پر
اپنی یاد سے کہہ دو قسم مجھے آکے ستایا نہ کرے
✽ محمد صہبہ معاویہ..... خانوال
ہمارے بس میں اگر ہوتا
تو کب کے گھروں کو لوٹ گئے ہوتے
کوئی تو چراغ جلتا ہمارے نام پر
کسی زباں پر ہمارے بھی تذکرے ہوتے



✽ محمد امجد ریاض..... اقبال نگر تحصیل چچہ وطنی
موتم روز مجھ سے لوگ چاہے جو بھی مطلب میں
یہاں محفوظ تہمت سے نہ مریم ہے نہ یوسف ہے
✽ محمد زمان..... محکمہ فٹریز پیر ووال
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیر کے دیکھا تو اک قطرہ خوں کھلا
✽ ایم فیصل ربانی..... سرگودھا
اب نہ مجھ پہ تیری الفت کا چلے گا جاو
میں تیرے پیار کے انداز کو اب جان گیا ہوں
اب تیرے جال میں میاں میں آؤں کیسے
میں تیرے دام زمیں رنگ کو پہچان گیا ہوں
✽ محمد عقیل چٹھہ..... حافظ آباد
میں تہی دست نہ تھا حشر کے میدان میں قتل
چند انگوٹوں کا میرے پاس اثاثہ بھی تھا

✽ اور لیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
آدی آدی سے کسی سے ملتا ہے
دل آدی سے کسی سے ملتا ہے
✽ تبسم فاطمہ..... راولپنڈی
میرا دلت اور بہتا دریا لوٹ کے پھر نہ آئے گا
نقش پاکیوں نکلتے ہو یہ ہوا چلی مٹ جائے گا
کچھ رنگ سے کب تک اپنے دل پہ لکھو گے پیار کے گیت
دھوپ پڑے گی جب کاغذ پر تو سادہ رہ جائے گا
✽ غالب حسین طلحہ..... نیو سینٹرل جیل ملتان
ہم اپنے رزم دکھاتے کسے زمانے میں
کسی نے قصہ غم شوق سے سنا ہی نہیں
ملے جو اشک تو ہم بی گئے خاموشی سے
ہمارا درد نمایاں کبھی ہوا ہی نہیں
✽ ایم رشید سیال..... روہڑی ضلع سکس
چشم پریم خرید سکتا ہوں زلف پریم خرید سکتا ہوں
میری خوشیاں گر بک جائیں تیرے سامنے غم خرید سکتا ہوں
✽ راجہ ابرار خان..... نیو سینٹرل جیل ملتان
چو میں گئے رن دار کو ہم مات کریں گے
ہم ہادی دوراں ہیں عجب بات کریں گے
دیکھو گے مقتل کی طرف تم ہر روز پلٹ کر
ہم جانب منزل ہیں فتوحات کریں گے
✽ محمد ممتاز..... سرگودھا
ملے ہیں رزم زمانے میں اس قدر ہم کو
اداس اتنے ہوئے مرہوں کو بھول گئے
بہت قریب سے گزرے ہیں دشت کے جھونکے
ہوائے صبح کی ہم لذتوں کو بھول گئے
✽ متین سلطان..... کراچی
اسے یہ کون بتائے، اسے یہ کون سمجھائے
بہت خاموش رہنے سے تعلق ٹوٹ جاتے ہیں
✽ رضوان تنولی کریڑوی..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
مجھ کو معلوم نہیں انسان کی تعریف مگر
میری نظروں میں وہی اچھا ہے جو آپ جیسا ہو
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
پھولوں کی طرح چاکر گریباں ہی رہے ہم
میں نہ ہم پہ کبھی پیار کی شبینہ

✽ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... نئی مٹھی سکھیکی
بے حس ہیں یہاں لوگ بھلا سوچ کے کرنا
اس دور میں لوگوں سے وفا سوچ کے کرنا
اک بار جو روٹھے تو منا تم نہ سکو گے
ہم جیسے وقاداروں کو تھا سوچ کے کرنا
✽ اعجاز احمد راحیل..... مایا، ساہیوال
بڑے درختوں کی شاخوں کا کیا جھڑ سکتا تھا
ہوا کا زور تو چڑیوں کے آشیاں تک تھا
مجھے زمین کے مسافر کیا فکرت دیتے
مرا خمیر بلندی میں آسمان تک تھا
✽ تفسیر عباس بابر..... اوکاڑہ
نیند پوری نہ ہوئی خواب مکمل نہ ہوا
ادھورا ہی رہا وصل کا باب مکمل نہ ہوا
ہر شب یہ تھے رنگ سے مجھ پر ٹوٹا
تا عمر تیرے غم کا عذاب مکمل نہ ہوا
✽ ظفر عباس زیدی..... بھوآنہ
دل نے اک اینٹ سے تعمیر کیا تاج محل
تو نے ایک بات کہی لاکھ فسانے کھلے
✽ امتیاز شاہ..... جیل سرگودھا
کتنا سادہ ہے وہ آداب سمجھتا ہی نہیں
مجھ سے ملنے کو گھر پہ بھی آجاتا ہے
✽ افتخار احمد ملک..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کسی پہ ترک تعلق کا بھید مکمل نہ سکا
تیری نگاہ سے ہم یوں اتر گئے چپ چاپ
✽ حنا عروج..... کورنگی، کراچی
تمہارے حسن کے جلوے نئے رنگوں میں ڈھالیں گے
ہمیں کچھ ہوش تو آئے تمہیں تصویر کرنے تک
ذرا میں بھی تو یہ دیکھوں، کہاں تک جاؤ گے آخر
بہت ہیں پستیاں حائل مری حقیر کرنے تک
✽ مناظر علی گوندل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہزاروں اسباب راحت ہوں اسیری پھر اسیری ہے
فقس میں آہی جاتا ہے خیال آشیاں اکثر
✽ گڑیا..... سرگودھا
اتنا تھا نازک دل میرا، تو نے ستم کیا کر دیا
خوشیاں تمام چھین لیں جی بھر کے درد بھر دیا

مغربی دنیا میں جرائم کے نرالے انداز اور بچاؤ کی دلچسپ کہانی

بعض کانٹے دل میں اتنی خاموشی سے اتر جاتے ہیں کہ زخم تا عمر رستے رہتے ہیں لیکن ان کا کوئی سراپا نہ نہیں لگتا۔ وہ بھی نگاہوں میں خار بن کر رہ گیا تھا لہذا انکے اوجھل، پہاڑا و جھل والا معاملہ اس کے حق میں مفید تھا۔ اگر اس پر عمل کرنے میں لمحے بھر کی تاخیر کرتا تو تمام عمر تحقیر میں بسر کرتا۔

فرار

تئو ریاض



اطلاع نہ دے سکے اور انہیں اس واقعہ کا علم تب ہوا جب وہ معمول کے مطابق ہفتہ کے روز خریداری کے لیے گئے۔ کیونکہ میرے دادا، دادی اتنے ضعیف ہو چکے تھے کہ وہ گھر سے باہر نہیں جاتے تھے بلکہ ان کی ضرورت کا سارا سامان

دادا کا کہنا تھا کہ بدھ کی شب جب وہ باہر کے ہالٹ میں گئے تو انہیں عقی محسن میں ایک لاش نظر آئی جو باڑھ کے ساتھ مرغیوں کے ڈربے کے پاس پڑی ہوئی تھی کیونکہ دادا کے پاس ٹیلی فون کی سہولت نہ تھی۔ اس لیے وہ ڈیڑی کو

مہرین ناز ڈوگر..... حیدرآباد

کاتب تقدیر سے کیا شکوہ اے دل تاباں
جب ہر شے نے مٹ جانا ہے تو پھر یہ خواہش کیسی
محمد لطیف ساحل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

مدت ہوئی ترستے نہ دیکھا کچھ پیاروں کا
یا الٹی کب ہوگا یہ مقدر ہم گناہ گاروں کا

عون عباس باہر..... اوکاڑہ

تیری باتیں تیرے سوال کرتے ہیں
لوگ بھی ناں..... کمال کرتے ہیں

رابعہ افتخار علی افقی..... چوآسدن شاہ

اس سے کہو کہ میری مہزا کو کچھ کم کر دے
میں عادی مجرم نہیں ہوں غلطی سے عشق ہوا تھا

فرحان بیخ..... پاک کالونی کراچی

کیا خوب تھا اس کا اندازِ نقل بھی.....
زہر دیا مجھ کو وہ بھی ہونٹوں پہ لگا کر

ماہا ایمان..... حافظ آباد

اب یہ عالم ہے کہ تنہائی سے تنگ آکر
خود ہی دروازے کی زنجیر ہلا دیتے ہیں

زاہد چودھری..... چھوڑ کینٹ

بھلا ہو ان خوابوں کا اے دوست
ہم تمہیں دیکھ تو لیتے ہیں.....

ملک محمد رمضان ساہل..... پشاور

روایت کے تقدس کا یہ پہلو ذہن میں رکھنا
کہ تحفہ چاہے ارزاں ہو لوٹایا نہیں کرتے

محمد اکرام صدیقی..... انک شہ

یہ انتہا ہے کرب کی میرے کہ اے عدم
اس کا وجود ہو کے بھی اس سے جدا ہوں میں

عبدالغفور خان ساغری خٹک..... چمب ضلع انک

شکایت تو بس بدلتے ہوئے لہجوں سے ہے
ہوا چنے، موسم تو دل نہیں توڑا کرتے

رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

اب خاک اڑ رہی ہے گلابوں کے شہر میں
وہ ٹو چلی ہے اب کے سے پتھر مجلس گئے

اشوک کمار..... میرپور خاص

اچھے ہوتے ہیں یہ بُرے لوگ
اچھا ہونے کا دکھاوا تو نہیں کرتے

عاصم اقبال جہاں..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

اس کی محبت بھی کراہے کے گھر کی طرح ہے
جتنا بھی سجایا تنہا میرا نہ ہوا

عرفان احمد عاجز..... آڑہ، چوآسدن شاہ

یہ آنسوؤں کی زکوٰۃ مجھ پہ ہی فرض کیوں؟
کچھ تو وہ بھی ادا کرے محبت اے بھی بھی

محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خاندوال

پہلے عشق پھر اس میں شرک پھر مجھ سے بیزاری
بڑی ترتیب سے اک شخص نے توڑا ہے مجھے

سلیم کامریہ..... کھاناں

کتاب ماضی کبھی جو کھولو تو بتانا
کیا یاد کرنے کے دعوے صرف میرے ہی تھے؟

امتیاز علی اللہ..... سرگودھا

بھول جانے کی ایک حد ہوتی ہے نا!
اس حد کو چھو رہے ہو تم

محمد اشرف تبسم..... بحریہ ٹاؤن، پنڈی

ہزاروں عیب دیکھتے ہیں دوسروں کی ذات میں
اپنے کردار میں ہم فرشتے ہوں جیسے

النبی..... کراچی

خوشبو جیسے لوگ ہیں ہم
بکھرے بکھرے رہتے ہیں

سوهاجی..... لاہور

جب کبھی تم ٹوٹ کر بکھرو تو بتانا ہم کو
ہم نہیں ریت کے ذروں سے بھی چن سکتے ہیں

محفل شعرو سخن

کوین
برائے
شمارہ
اگست
2014

نام: _____
پتا: _____

ڈیڈی کو ہی پہنچانا ہوتا تھا۔

گوکہ اس واقعہ کو چالیس برس گزر چکے ہیں لیکن مجھے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب ہم ڈیڈی کے ساتھ ان کے سالے کی گاڑی میں دادا کے گھر کی طرف جا رہے تھے جو ویسٹ ہم گراؤنڈ کے بالمقابل رہائش پذیر تھے۔ ہم نے اپنے گھر کے قریبی اسٹور سے ہفتہ بھر کا سامان خریدا اور راستے میں ایک دکان پر رک کر گیس لیپ میں استعمال ہونے والی جالیاں بھی خرید لیں کیونکہ دادا کے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ اس لیے گیس لیپ سے ہی گزارہ ہو رہا تھا۔

راستے میں گاڑی خراب ہوئی اور ہمیں سارا سامان اٹھا کر بچہ راستہ پیدل طے کرنا پڑا۔ دروازے پر پہنچ کر ڈیڈی نے دروازے پر دستک دی اور پوری قوت سے آواز لگائی۔ ”مائیکل!“

دادا نے پورا مکان کر ایہ پر نہیں لے رکھا تھا بلکہ وہ غلی منزل پر رہتے تھے جبکہ اوپر کی منزل پر مائیکل کی رہائش تھی جس کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی لیکن باہر کے سارے کام وہی کرتا تھا اور کسی ملاقاتی کے آنے پر دروازہ بھی وہی کھولتا تھا۔ دادا کو اس سے بڑی ڈھارس تھی لیکن اسے اپنے کی عادت تھی اور اکثر وہ ضرورت سے زیادہ پینے کے بعد مدھوش ہو جاتا تو توڑ پھوڑ کرنے لگتا۔ ایسی حالت میں اکثر اس کا کسی نہ کسی سے جھگڑا بھی ہو جاتا۔ بہر حال وہ لڑکھڑاتا ہوا بچہ آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

دادا ہاتھ میں بیلچے لیے ہوئے کھڑے تھے۔ کونکے کی پوری سیزیموں کے نیچے رکھی ہوئی تھی اور وہ اس بیلچے کی مدد سے آتش دان میں کونکے ڈال رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی بولے۔ ”باہر بہت سردی ہے؟“

ڈیڈی نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”راستے میں کار خراب ہو گئی تھی۔ ہم دونوں ہارڈویئر کی دکان سے پیدل آرہے ہیں۔“

دادا نے بیلچے کی مدد سے آتش دان میں کونکے ڈالنا شروع کر دیا۔ مائیکل نے دروازہ میں جھانکا اور بولا۔ ”جارج، انہیں قتل کے بارے میں بتا دو۔“

”قتل؟“ ڈیڈی کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ دادا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے لیکن ان کی توجہ کہیں اور تھی۔

”کوئی اجنبی شخص تھا۔“ مائیکل نے بتایا۔ ”تمہارے باپ کو اس کی لاش عقیقہ میں ملی تھی۔“

ڈیڈی نے ایک بار پھر دادا کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔

”تمہاری بہنیں چاہتی تھیں کہ تمہیں پریشان کیا جائے۔“

”مجھے کیا پریشانی ہو سکتی تھی۔“ ڈیڈی نے منہ پٹاتے ہوئے کہا اور دادی سے ملنے چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ دادی کچن میں برتن دھو رہی تھیں۔ مجھے بچہ ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی تھی کیونکہ یہاں باہر سے آنے والی آوازوں کا شور نہیں سنائی دیتا تھا اور ایک عجیب سی پرامن خاموشی چھائی رہتی، البتہ آتش دان میں کونکوں کے جھنجھکیاں گیس لیپ کی شوشوں ضرور سنائی دیتی۔

دادی نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ ان کی عمر ستر سے زیادہ اور آتی سے کمرنگی جبکہ اب میری ماں کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی ہے لیکن وہ کی شرٹ اور جینز پہننا پسند کرتی ہے۔ دادی کے بال بہت لمبے اور پیروں تک آتے تھے۔ جنہیں وہ بنوں سے باندھ کر رکھتی تھیں۔ وہ ڈیڈی سے دیکھ کر ناراض لہجہ میں کچھ کہہ رہی تھیں۔

میں میٹل پیس پر لگی اپنے آباؤ اجداد کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت دادا بھی وہاں آگئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک تصویر نیچے زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دادا سے پوچھا۔

”یہ تصویر نیچے کیوں پڑی ہوئی ہے؟“ دادا نے دیوار کی طرف دیکھا اور ان کی تہوری پر مل پڑ گئے۔ انہوں نے آتش دان میں مزید کونکے ڈالا اور بولے۔ ”تمہاری دادی نے اس جگہ کی صفائی کی ہوگی یہی تصویر نیچے گر گئی۔“

یہ کہہ کر انہوں نے وہ تصویر اٹھالی۔ میں اسے بچاتا تھا۔ یہ دادا کے بھائی ہیرالڈ کی تصویر تھی جو عرصہ ہوا لڑائی میں مارا گیا تھا۔ وہ دادا کا اکلوتا بھائی تھا جو ملک کی خاطر لڑتے ہوئے جوانی میں ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

میں وہیں بیٹھ کر چائے اور ڈبل روٹی کا انتھار کرنے لگا جس سے دادی ہمیشہ ہماری خاطر تواضع کیا کرتی تھیں۔

دادا نے چائے کی کیتلی چولہے پر رکھ دی۔ میں ان سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ مائیکل کچن سے ملنے والی لاش کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا لیکن میری ہمت نہیں ہوئی، وہ بہت غصے والے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ دیا کرتے تھے لیکن میرے ذہن میں مائیکل کی کہی ہوئی بات جم کر رہ گئی تھی۔

دادی اور ڈیڈی معمول کے خلاف کچن میں تھے، شاید انہیں کوئی ضروری بات کرنا ہوگی جو وہ دادا کی موجودگی میں نہیں کر سکتے تھے۔ دادا مسکرا کر رہ گئے۔ میں نے ان

سے پوچھا کہ کیا میں اپنے کھلونوں سے کھیل سکتا ہوں۔ اس پاس میں بہت سارے کھلونے تھے جن سے میرے علاوہ دادا کے کئی نواسے تو اسیاں پوتے اور پوتیاں بھی کھیلا کرتے تھے۔ ان میں لکڑی کے بنے ہوئے اونٹ، مٹی کی بلیاں، پرانے زیورات کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے، گڑیاں اور تصویروں کی دو البم شامل تھیں۔ سچ پوچھیں تو مجھے یہ البم سب سے زیادہ پسند تھیں۔ ان میں بہت ساری بلیک اینڈ وائٹ تصاویر تھیں جن میں سے بیشتر پر انیسویں صدی کی تاریخیں درج تھیں۔ ان تصویروں میں خاندان کے بزرگوں نے عجیب و غریب لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے وہ کاسٹیم بہت اچھے لگتے۔ ان البم میں کچھ ایسے نادر مقامات کی تصویریں بھی تھیں جہاں جانے کی ہم حسرت ہی کر سکتے تھے۔

میں ان کھلونوں میں اتنا گم ہوا کہ مجھے کسی اور بات کا پتا ہی نہ چلا البتہ جب ہم گھر واپس آئے تو می نے ڈیڈی سے پوچھا۔ ”کیا پولیس اس شخص کے بارے میں جانتی ہے جس کی لاش تمہارے باپ کو کچن میں ملی تھی؟“

”معلوم نہیں۔“ ڈیڈی نے جواب دیا۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہے ہوں۔

☆☆☆

اگلے ہفتے میں اور ڈیڈی معمول کے مطابق پھر، دادا۔ دادی سے ملنے گئے۔ اس بار ہم نے کار سے سفر نہیں کیا کیونکہ پولیس اسے سڑک سے اٹھا کر لے گئی تھی اور اگلے برائے ہی اسے واپس لاسکتے تھے۔ نومبر کا مہینا تھا اور سہ پہر سے ہی اندھیرا پھیلنا شروع ہو جاتا تھا۔ ہم جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے۔ گیس لیپ روشن ہو گیا۔ میں نے دادا کی طرف مسکرا کر دیکھا جو معمول کے مطابق آتش دان کے پاس کرسی ڈالے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ ڈائنگ ٹیبل کے آخری سرے پر کھڑکی کے پاس ایک پولیس والا براجمان تھا۔ وہ ڈیڈی کی ہی عمر کا ہوگا۔ اس نے یونیفارم پہن رکھی تھی۔ دادی نے اس سے پوچھا۔

”تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس کے خاندان کا کوئی فرد یہاں موجود نہیں ہے اور کوئی بھی اس کی لاش لینے نہیں آیا۔“ میں نے بے اختیار بول پڑا۔ ”کیا یہ اس شخص کی بات ہو رہی ہے جسے عقیقہ میں قتل کر دیا گیا تھا۔“

وہ سب میری طرف دیکھنے لگے، کچھ دیر خاموشی رہی پھر پولیس والا مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”یہ کچھ نہیں جانتا۔“ دادی نے ناگواری سے کہا۔ ”دراصل مائیکل نے اس کے سامنے قتل کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اسے اپنا ہوش نہیں۔ ہر وقت نشے میں رہتا ہے اور معمولی بات کو بھی ڈرامائی انداز میں بیان کرتا ہے۔“

”اوہ..... اچھا میں اسے جانتا ہوں۔“ پولیس والے نے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کچن میں جس شخص کی لاش ملی تھی وہ طبی موت مرا تھا۔ اسے کسی نے قتل نہیں کیا۔“

”اس کا وقت آ گیا تھا۔ اس لیے خدا نے اسے بلا لیا۔“ دادی نے کہا۔

میں ان کی باتوں سے اتنا ہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے کھلونوں کا باکس اٹھا کر کھینچے بیٹھے گیا۔ میں نے تمام چیزیں میز پر پھیلا دیں اور البم دیکھنے لگا۔ میرے ایک جانب ڈیڈی اور دوسری جانب دادی بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ پولیس والا میرے بالمقابل میز کی دوسری جانب براجمان تھا۔ دادی غور سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے بھی انہیں مسکرا کر دیکھا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا پھر اچانک ہی دادی نے وہ دونوں البم مجھ سے چھین کر ایک تھیلے میں رکھ دیے۔ میں نے رونا چاہا لیکن دادی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنے آنسو روکنا پڑ گئے۔ وہ کافی غصے میں دکھائی دے رہی تھیں۔

کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ان سے اس بارے میں پوچھتا لیکن ڈیڈی کچھ ناراض دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے تھیلے میں سے البم نکالیں اور ان میں لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگے کیونکہ وہ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے انہیں معلوم تھا کہ جب دادی نے البم میرے ہاتھ سے لی تو میں کون سی تصویر دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس والا بھی جاننے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سب بھی اسے گڈ ہائی کہنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس کے جانے کے بعد دادا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے اور اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔

مجھے یاد ہے کہ پولیس والے کے جانے کے بعد وہ البم مجھے واپس مل گئی تھی لیکن میں کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا جس کی وجہ سمجھ میں نہیں آ سکی لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ پولیس والے کے جانے کے بعد ڈیڈی اور دادی میں سچ کلامی ہوئی تھی اور وہ کافی دیر تک سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے الجھتے رہے تھے۔

☆☆☆

دادا کا انتقال 1970ء میں تراسی برس کی عمر میں ہوا تھا۔ اس کے پانچ سال بعد دادی بھی 85 سال کی عمر میں چل بسیں۔ ان کا ساز و سامان ڈیڑی اور ان کے بھائیوں میں تقسیم ہو گیا۔ وہ دونوں الہور بھی ڈیڑی کے حصہ میں آئیں۔ میں تیس سال کی عمر کو پہنچے تک بھی وہ خاندانی تصاویر اور الہور دیکھا کرتا تھا۔ پھر 1985ء میں یارک شائر چلا گیا تو وہ تصاویر بلکہ دادا، دادی بھی آہستہ آہستہ ذہن سے محو ہوتے چلے گئے۔ جب بھی ڈیڑی اور ان کے بھائی اکٹھے ہو کر بیتی یادیں تازہ کرتے اور میں بھی اس وقت وہاں موجود ہوتا تو میں بھی ان یادوں میں کھو جاتا۔

ڈیڑی اور ان کے بھائی ہمیشہ دادا کے مکان کو ناظم مشین سے تشبیہ دیا کرتے تھے، اس گھر میں لگا ہوا وال کلاک 1929ء سے بند تھا جب ڈیڑی کی پیدائش ہوئی تھی، دونوں چچاؤں کا کہنا تھا کہ دادی بھی ملکہ میری کی طرح اسکرٹ پہنتیں اور بالوں کو پنوں سے باندھ کر رکھتیں۔ بدلتے وقت کے باوجود ان کی وضع قطع اور طرز زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گھر میں بجلی بھی نہیں لگوائی۔ وہ وقت کے ساتھ چلنے کے بجائے پرانے دور میں زندہ تھے۔

صرف بجلی ہی نہیں اور بھی کئی معاملات میں انہوں نے جدید سہولتوں سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی، اس گھر میں کوئی ہاتھ روم نہیں تھا بلکہ وہ کچن میں لگے ہوئے ٹل سے نہاتے تھے۔ گرم پانی کی ضرورت ہوتی تو جو لہے پر کیتلی چڑھا دیتے۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اس گھر میں واشنگ مشین، ٹیلی وژن یا ریڈیو نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کے بستر بھی پرانے زمانے کے تھے جو شاید اب کسی عجائب گھر میں بھی نظر نہ آتے۔

ہمارے کبھی رشتے دار سمجھتے تھے کہ ان کے اس طرز زندگی کا جنگ عظیم اول سے گہرا تعلق تھا۔ دادا کا خاندان متوسط طبقہ میں شمار ہوتا تھا جنہیں نئی ایجادات سے خاطر خواہ لگاؤ تھا لیکن دادا نے جنگ کی وجہ سے زیادہ وقت خدقوں میں گزارا اور زخمی ہو کر لندن چلے آئے۔ دادی ایک سیدھی سادی عورت تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ شوہر کے کہنے پر عمل کیا۔ میرے دونوں چچاؤں کی پیدائش بھی زمانہ جنگ میں ہوئی۔

ان لوگوں کی باتیں سن کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ دادا کے اس طرز زندگی کا اصل سبب ان کے بھائی ہیرالڈ کی موت تھی جو صرف سترہ سال

کی عمر میں جنگ میں مارا گیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی پائپ میں تھے اور دادا نے ہمیشہ یہی کہا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بھائی کو مرتے ہوئے دیکھا۔ کچھ دور پہلے وہ ان کے شانہ بشانہ لڑ رہا تھا پھر اچانک ہی آگ، دھوئیں اور بارود کے بادل میں غائب ہو گیا اور اس کے جسم کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملا جسے دفنایا جاسکتا۔ دادا کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ اسی لیے اتنے عجیب اور پراسرار ہو گئے تھے۔

وقت تیزی سے آگے بڑھتا رہا اور وہ خاندانی تصاویر بھی نوادرات کی طرح صندوقوں میں بند ہو گئیں، اس وقت تک میں دو بچوں کا باپ بن چکا تھا اور اسی طرح میرے دوسرے کزنز کی بھی کئی اولادیں تھیں۔ ہم سے پہلے والی نسل ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہی تھی۔ میرے دونوں چچا 1980ء میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد ان کی بیویاں بھی یکے بعد دیگرے دنیا سے چلی گئیں۔ میرے بیٹے اے لیول میں پڑھ رہے تھے کہ ایک روز می کا فون آیا۔ وہ مجھے لندن بلا رہی تھیں۔

”تمہارے ڈیڑی کی طبیعت گزشتہ دو روز سے خراب ہے، وہ اسپتال میں داخل ہیں اور ڈاکٹروں نے انہیں پیچھے پھڑوں کا کینسر بتایا ہے۔“

چار گھنٹے کا سفر طے کر کے لندن پہنچا تو میں نے می کو صدمے کی کیفیت میں پایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور پولیس۔ ”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہو گیا، وہ ہمیں چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں۔“

میں جانتا تھا کہ یہ کیسے ہوا۔ ڈیڑی نے ساری زندگی بے تحاشا سگریٹ نوشی کی تھی۔ وہ جین سموکر تھے۔ ایک سگریٹ ختم نہیں ہوتی کہ دوسری سلکا لیتے تھے۔ اس کا یہی نتیجہ نکلتا تھا لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں لوگ روم میں بیٹھے رہے۔ اب ہمارے پاس سوچنے اور افسوس کرنے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔

☆☆☆

ڈیڑی کو دیکھنے اسپتال پہنچا تو وہ ہوش میں تھے، البتہ ان کا پورا جسم مشینوں میں جکڑا ہوا تھا اور انہیں ڈرپ گئی ہوئی تھی۔ وہ مجھے بہت دہلے اور زرد نظر آئے۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔ اس لیے مجھے ان کے پاس جانے کے لیے پلاسٹک کا ایبرن اور دستا نے پہننا پڑا۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے رونا آ گیا۔ بھی ڈیڑی نے چونک کر مجھے

دیکھا اور مسکراتے ہوئے۔۔۔ نجیف آواز میں بولے۔ ”کیا ہوا کڈو۔ تم بھی ہمت ہار بیٹھے۔“

وہ بچپن میں مجھے اسی نام سے پکارا کرتے تھے لیکن عرصہ ہوا میرے کان یہ نام سننے کو ترس چکے تھے۔

اس کے ساتھ ہی میرا ذہن بچپن کی یادوں میں کھو گیا۔ مجھے انکل برائن اور ان کی کار یا آگئی جس میں بیٹھ کر ہم دادا کے گھر جا رہے تھے کہ وہ راستے میں خراب ہو گئی اور ہم دونوں کو سارا سامان اٹھا کر پیدل ہی دادا کے گھر تک جانا پڑا تھا۔ مجھے دادا، دادی یاد آئے اور اس گھر کا تصور کرتے ہی میرے ذہن میں ناظم مشین گھومنے لگی۔ واقعی وہ گھر کسی ناظم مشین کے مانند ہی تھا جہاں وقت ایک جگہ رک گیا تھا پھر میں فوراً ہی ماضی سے حال کی طرف لوٹ آیا۔ یوں لگا جیسے ڈیڑی مجھے کچھ بتانا چاہ رہے تھے۔ کوئی ایسی بات جس کا جاننا میرے لیے بہت ضروری تھا۔

میں نے جھک کر ان کے ماتھے کا بوسہ لیا اور ان کے بستر کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ وہ بولے۔ ”ڈاکٹر زکا کہتا ہے کہ اب میں نہیں بچوں گا۔“

میں نے ان کی بات کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے والد ہمیشہ سے ہی حقیقت پسند واقع ہوئے تھے۔ ان سے یہ کہنا کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایک طرح سے ان کی بے عزتی کرنے کے مترادف تھا۔

”اس لیے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ تم کو وہ سب کچھ بتا دوں جس کا جاننا تمہارے لیے ضروری ہے۔“

مجھے ایسا لگا جیسے انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ بعد میں ممانے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق پیچھے پھڑے کے کینسر کے مریضوں کو آخر وقت تک سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

”تمہیں وہ دن یاد ہے جب تمہارے دادا کو عقیقی محن میں ایک لاش ملی تھی؟“ ڈیڑی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ لاش مرغیوں کے ڈر بے کے پاس پڑی ہوئی تھی اور مائیکل کا کہنا تھا کہ اسے کسی نے قتل کیا ہے جبکہ پولیس نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور نہ ہی لاش کی شناخت ہو سکی تھی۔ کیا بعد میں اسے پہچان لیا گیا تھا؟“

مجھے یاد تھا کہ اس کے بعد بھی پولیس والے دادا کے گھر آتے رہے اور اتفاق یہ ہوا کہ ایسے موقع پر میں اور

لطائف

ایک پینڈو نے فائیو اسٹار ہوٹل میں چائے کا آرڈر دیا۔ ویٹر نے چھوٹے سے کپ میں چائے دی۔

پینڈو ایک سانس میں چائے پی کے بولا۔ ”میٹھا ٹھیک اے ہن چاہ لے آ۔“

ایک شوہر اپنی ساس سے۔ ”آپ کی بیٹی میں ہزاروں خامیاں ہیں۔“

ساس۔ ”ہاں بیٹا اسی وجہ سے تو اسے اچھا لڑکا نہیں ملا۔“

ایک لڑکا پارک میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ بیٹھا تھا۔

ضعیف آدمی۔ ”بیٹا کیا یہ ہماری تہذیب ہے؟“

لڑکا۔ ”نہیں انکل یہ ملی پور والی تہذیب تسلیم ہے۔“

سردار رات کو چمچردانی لگا کے سو رہا تھا، اچانک چمچردانی کے نزدیک اسے ایک جگنو اڑتا ہوا نظر آیا۔

سردار نے دیکھا اور بولا۔ ”یا خدا ہم کو بچا یہ ظالم چمچر آج تو ہم کو تاراج لے کر ڈھونڈ رہا ہے۔“

سردار نے دیکھا اور بولا۔ ”یا خدا ہم کو بچا یہ ظالم چمچر آج تو ہم کو تاراج لے کر ڈھونڈ رہا ہے۔“

میاں اور بیوی مارکیٹ گئے تو ایک لڑکی نے ہیلو کہا۔

بیوی۔ ”وہ کون تھی؟“

شوہر۔ ”تم دماغ خراب مت کرو، ابھی اس کو بھی بتانا ہے کہ تم کون ہو؟“

مرسلہ: رضوان تنولی کرپڑوی اورنگی ٹاؤن، کراچی

ڈیڑی ہمیشہ وہاں موجود ہوتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس والے جان بوجھ کر ہفتے کے دن آتے ہوں تاکہ ڈیڑی کی موجودگی میں تفتیش کر سکیں کیونکہ دادا سے انہیں کسی قسم کے تعاون کی امید نہیں تھی پھر آخری بار انہوں نے بتایا کہ اس نامعلوم لاش کا کوئی وارث بھی نہیں آیا۔ اس لیے اسے دفن دیا گیا ہے۔

ڈیڑی نے میرا سوال سن کر آہستہ سے کہا۔ ”نہیں، اس لاش کی شناخت نہیں ہو سکی۔“
”اگر موجودہ دور میں یہ واقعہ پیش آتا تو لاش کی شناخت ہو سکتی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اب تو ڈی این اے اور دیگر سہولتیں دستیاب ہیں۔“
”ہاں یہ ممکن ہے۔“ ڈیڑی نے کہا پھر میرا ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ”لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھا؟“

”آپ؟ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“
”تمہاری دادی نے بتایا تھا۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”یہ بہت بعد کی بات ہے، تمہارے دادا کا انتقال ہو چکا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ جانتی ہیں۔ البتہ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنے سالوں تک کیوں خاموش رہیں۔“

انہیں کھانسی کا ہلکا سا دورہ پڑا پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولے۔ ”تمہیں یاد ہے کہ جب وہ پولیس والا اس لاش کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا اور دادی نے تم سے وہ پرانی الیمو جین لی تھیں۔“
وہ واقعہ میرے ذہن میں ابھی طرح نقش تھا کیونکہ دادی نے اس سے پہلے یا بعد میں کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اس واقعہ کے بعد ڈیڑی اور دادی کے درمیان کئی ختم ہو گئی تھی اور ڈیڑی خاصی حد تک پرسکون ہو گئے تھے۔

”انہوں نے لیا اس لیے کیا کہ تم وہ منہ کھولے بیٹھے ہوئے تھے جس پر اس شخص کی تصویر چسپاں تھی جس کی لاش صحن میں ملی تھی۔ وہ ایک پرانی تصویر تھی لیکن تمہاری دادی کو ڈر تھا کہ پولیس والے کی نظر اس تصویر پر چلی گئی تو وہ لاش کو شناخت کر لے گا اور طرح طرح کے سوالات شروع کر دے گا۔“

مجھے ڈیڑی کی یہ کیفیت دیکھ کر صدمہ ہوا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی انہیں اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے

کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی سے ڈیڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔

”اس وقت میں پوری بات نہ سمجھ سکا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہاری دادی نے ایسا کیوں کیا تھا لیکن مجھے ان کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی اور میرے دل میں شک بیٹھ گیا اور میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ اس لاش کا اہم کی تصویروں سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے اور تمہاری دادی اس بارے میں جانتی ہیں۔ میں کسی مناسب موقع پر ان سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ ایک دن وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں تو میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ انہوں نے تم سے وہ اہم کیوں چھینی تھی۔ انہوں نے کہا وہ مجھے سب کچھ بتانے کو تیار ہیں بشرطیکہ میں جیف اور ایرک سے کچھ نہ کہوں اور نہ ہی پولیس کو اس بارے میں کچھ بتاؤں۔“

ڈیڑی ایک بار پھر مسکرا دیے۔ ان کے نحیف چہرے پر یہ مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ بولے۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم چاہو تو پولیس کو سب کچھ بتا سکتے ہو کیونکہ اس کہانی کے سب کردار دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور میں بھی چند دنوں یا مہینوں کا مہمان ہوں۔“
میں نے رونا شروع کر دیا۔ ان کی زبان سے مرنے کی بات سن کر میرا دل بھر آیا اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ مین اسی وقت مہمانوں میں داخل ہوئی تو میں سنبھل گیا۔ ڈیڑی بھی نارمل ہو گئے۔ مہمان رہی میں کہ ڈیڑی کی غیر موجودگی میں ان کے باغ کی دیکھ بھال پوری توجہ سے کی جا رہی ہے لہذا وہ اس سلسلے میں بالکل پریشان نہ ہوں اور نہ ہی کسی اور معاملے میں اپنے ذہن پر زور دیں۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے اور جب وہ صحت یاب ہو کر آئیں گے تو دیکھ لیں گے کہ ان کی غیر موجودگی میں معمولات زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔

میں چند منٹ بیٹھ کر چلی گئیں۔ وہ ڈیڑی کی صحت کے بارے میں پوری طرح باخبر تھیں اور جانتی تھیں کہ جمونی تسلیوں سے ان کی زندگی کے دن جیسے بڑھائے جاسکتے۔ ان کے جانے کے بعد ڈیڑی نے کہانی دوبارہ بیان کرنا شروع کر دی۔

”جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو تمہارے دادا فوج میں بھرتی ہو چکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ تم جانتے ہو کہ ان کی کئی بہنیں اور ایک بھائی بھی تھے جن کی عمریں ... بہت کم تھیں۔“

”انگل ہیرالڈ“ میں بے ساختہ بول اٹھا۔

اس وقت ہیرالڈ سترہ سال کا تھا۔ بے حد پیارا، خاندان کے سبھی افراد اس سے محبت کرتے تھے۔ تمہارے دادا کا خیال تھا کہ جنگ بہت عرصہ تک جاری رہے گی اور اس میں بہت خون خرابہ ہوگا۔ انہوں نے ہیرالڈ کو بھرتی کرنے والے افسروں سے دور رہنے کی ہدایت کی کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہیرالڈ بھی فوج میں جائے لیکن اس نے تمہارے دادا کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ اس پر تو دوسرے نوجوانوں کی طرح حب الوطنی کا بھوت سوار تھا چنانچہ وہ بھی دوستوں کے بہکائے میں آ کر فوج میں بھرتی ہونے چلا گیا۔ اتفاق سے اُسے بھی وہی رجنٹ ملی جس میں تمہارے دادا تھے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان واقعات کا لاش سے کیا تعلق؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی سب کچھ واضح ہو جائے گا۔“ ڈیڑی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ایک نرس دوڑی ہوئی آئی۔ اس نے انہیں پانی پلایا اور پیٹھ سہلانے لگی پھر انہیں ایک گولی دی تو وہ کچھ پرسکون ہو گئے۔ نرس نے مجھ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاؤں اور انہیں تنہا چھوڑ دوں کیونکہ مسلسل بولنا ان کے لیے ٹھیک نہیں۔ میں اٹھنے لگا تو ڈیڑی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کی پوری بات سنے بغیر وہاں سے اٹھ جاؤں۔ شاید وہ جان گئے تھے کہ اس کے بعد یہ موقع نہیں ملے گا۔

کچھ دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئے تو انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ”23 اگست 1914ء کو تمہارے دادا کی رجنٹ جنگ کے لیے روانہ ہوئی۔ انہیں مونس کے میدان میں بھیجا گیا تھا۔ اس لڑائی میں ان کے کئی ساتھی مارے گئے اور تمہارے دادا کی ٹانگ بھی زخمی ہو گئی لہذا انہیں علاج کے لیے گھر واپس بھیج دیا گیا۔ سب لوگوں نے ان سے اظہار ہمدردی کیا کیونکہ وہ ملک کی خاطر لڑتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے بلکہ ان کا بھائی ہیرالڈ بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ کم از کم اس وقت لوگ کبھی سمجھ رہے تھے۔“

میری تجویز پر بل پڑ گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈیڑی کیا کہہ رہے تھے۔ انگل ہیرالڈ کی بہادری اور بے وقت موت ہمارے خاندان کے لیے باعث فخر تھی جس کا تذکرہ ہمارے سبھی جاننے والے بڑے احترام سے کیا کرتے

تھے۔ میں نے ڈیڑی کی طرف دیکھا جیسے ان کی بات کا مطلب سمجھتا چاہ رہا ہوں۔

”انگل ہیرالڈ میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے۔“ ڈیڑی نے آہستہ سے کہا۔

میں یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ ان کے بارے میں ایسی بات سوچتی بھی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ بھی میری یادوں کا حصہ نہیں رہے لیکن ان کی دلیرانہ موت کے بارے میں سن کر میرے دل میں ان کے لیے عقیدت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے اور میں نے انہیں ایک ہیرالڈ کا درجہ دے رکھا تھا لہذا ان کے بارے میں ایسی بات سن کر میرا چونک جانا فطری امر تھا۔

”تمہاری طرح مجھے بھی یہ سن کر حیرت ہوئی تھی۔“ ڈیڑی نے کہا اور دوبارہ میرا ہاتھ تھام لیا۔

”کیا وہ فرار کی کوشش کے دوران فوجیوں کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے؟“ میں نے ان کی موت کی وجہ جاننا چاہی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بہت سے فوجی محاذ سے بھاگنے کی کوشش کے دوران مارے گئے تھے اور ان میں سے کچھ زیادہ دور نہ جاسکے۔ اس لیے واپس آ گئے لیکن ان کا بھی انجام بہت برا ہوا۔ دادا بتایا کرتے تھے کہ ایسے بھگوڑے فوجیوں کو برہنہ کر کے جیٹی دھوپ میں کھلے ٹرکوں میں لٹا کر باندھ دیا جاتا تھا اور وہ پسینے میں شرابور ہو کر نیم پاگل ہو جاتے تھے۔

ڈیڑی نے نفی میں سر ہلایا اور بولے۔ ”نہیں۔ ہیرالڈ فوج نکلنے میں کامیاب ہو گیا حالانکہ اس وقت وہ ایک نادان اور کم عمر نوجوان تھا لیکن تمہارے دادا نے ایسا بندوبست کر دیا کہ ہیرالڈ بخیر و عافیت وہاں سے نکلے میں کامیاب ہو جائے۔ وہ اس کے مقابلے میں کافی سمجھ دار تھے۔“

”کیسے؟“ مجھے یقین نہ آیا حالانکہ اتنا تو مجھے بھی پتا تھا کہ میدان جنگ میں افراد فوجی کا عالم ہوتا ہے اور وہاں کسی کو ایک دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔ سارے سپاہیوں اور افسروں کی توجہ اپنا دفاع کرنے اور دشمن کو نقصان پہنچانے پر ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں محاذ سے کھسک جانا زیادہ مشکل نہیں لیکن میں نے ایسے کئی قصے سن رکھے تھے کہ ایسے زیادہ تر بھگوڑے اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور انہیں فوجی افسروں نے گولی مار دی تھی۔ ڈیڑی کی زبانی انگل ہیرالڈ کے فرار کی کہانی سن کر میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا کہ وہ اپنی اس جدوجہد میں کیسے کامیاب

”جہیں وہ شخص مائیکل یاد ہے جو ڈیڑی کے گھر میں

اوپر کی منزل پر رہا کرتا تھا؟“

”ہاں“ میں نے کہا۔ وہ بعض اوقات بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرتا تھا اور ہر وقت متحرک رہتا تھا۔

”اس رات مائیکل شراب خانے گیا تو سامنے کا

دروازہ کھلا چھوڑ گیا۔ تمہاری دادی برتن دھو رہی تھیں جب

ایک نامعلوم شخص بیٹھک میں داخل ہوا۔ پہلے تو وہ اسے

پہچان نہ سکیں کیونکہ کم روشنی میں اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہاں بالکل خاموشی تھی۔ تمہارے دادا کی زبان سے ایک

لفظ بھی نہیں نکلا اور نہ ہی وہ شخص کچھ بولا۔ تمہاری دادی کے

کہنے کے مطابق جب وہ بیٹھک میں گئیں تو وہ آمنے سامنے

کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہیرالڈ کا چہرہ

دوسری جانب تھا لیکن دادی تمہارے دادا کے چہرے کے

تاثرات دیکھ سکتی تھیں۔ وہ سخت غصہ کے عالم میں تھیں۔

تمہاری دادی گھوم کر اس شخص کے سامنے آئیں اور اس کے

چہرے پر نظر پڑتے ہی حیرت زدہ رہ گئیں۔

”کیا واقعی انہوں نے انکل ہیرالڈ کو پہچان لیا؟“

میرے لیے یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ انہوں نے

انکل کو پچاس سال پہلے اس وقت دیکھا ہوگا جب وہ لڑکپن

سے نوجوانی کی حد میں داخل ہو رہے تھے۔

ڈیڑی میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے

بولے۔ ”تمہارے دادا غصہ سے پاگل ہو رہے تھے۔ ان کا

کہنا تھا کہ ہیرالڈ نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔

انہوں نے اس سے کہا کہ وہ جہاں سے آیا ہے وہیں چلا

جائے اور دوبارہ لوٹ کر نہ آئے جبکہ ہیرالڈ یہی کہتا رہا کہ وہ

تہا ہے اور مزید اس طرح نہیں رہ سکتا لہذا وہ اپنے خاندان

والوں کے ساتھ زندگی کے بقیہ دن پورے کرنا چاہتا ہے۔

یہ سن کر تمہارے دادا اور بھی مشتعل ہو گئے۔ انہوں

نے کونسل والا بلایا اور اپنے بھائی کے سر پر وار کیا۔ صبح

اسی وقت مائیکل بیٹھک میں داخل ہوا۔ وہ پوری طرح نشے

میں تھا۔“

میرے پیٹ میں مروڑ سے اٹھنے لگے۔ میں نے بے

مبری سے پوچھا۔ ”کیا دادا نے انہیں مار ڈالا؟“

”ان کا یہ مقصد نہیں تھا۔ البتہ وہ غصے میں آ گئے

تھے۔“

”اور مائیکل نے انہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا؟“

مجھے یاد آیا کہ مائیکل نے اس رات کے واقعہ کے

بارے میں کل کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس وقت میں نہیں جانتا

ہوئے۔

”انکل ہیرالڈ جنگ پر چلے تو مجھے لیکن وہ بہت

خوفزدہ تھے اور اکثر بیمار رہنے لگے۔ تمہارے دادا نے ان

کی بہت دیکھ بھال کی تاکہ وہ جنگ ختم ہونے پر بخیر و عافیت

گھر واپس جاسکیں لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا لہذا وہ

چاہتے تھے کہ کسی طرح انکل ہیرالڈ کو وہاں سے نکال دیا

جائے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک منصوبہ تیار کیا جو بہت

آسان اور سادہ تھا لیکن ناکام ہو گیا۔ شاید تمہارے دادا

بھی سمجھتے تھے۔ جب ہیرالڈ کو گولی لگی تو وہ زمین پر گر پڑا۔

جنگ میں کسی کو اتنا ہوش نہیں ہوتا کہ مرنے یا زخمی ہونے

والے سپاہی کی فکر کرے چنانچہ دوسرے سپاہی ان کے پاس

سے گزرتے رہے اور تمہارے دادا نے بھی یہی ظاہر کیا جیسے

ہیرالڈ کی موت واقع ہو چکی ہے۔ جب شام ہوئی تو ہیرالڈ کا

کہنیں پتا نہیں تھا۔“

”اگر وہ وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے

تھے تو کہاں چلے گئے؟ وہ اپنے گھر کیوں نہیں آئے؟ دادا

نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی“

”وہ ان سے کیسے رابطہ کر سکتے تھے۔“ ڈیڑی نے

مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ ان کا کام نہیں تھا بلکہ ان کی تو ہمیشہ

یہی کوشش رہی کہ کسی کو بھی حقیقت کا علم نہ ہو سکے۔ جہیں یاد

ہوگا کڈو کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران محاذ سے بھاگ کر

آنے والے فوجیوں کو ان کے گھر والے بھی اچھی نظر سے

نہیں دیکھتے تھے۔ تمہارے دادا اپنے بھائی کی جان بچانا

چاہتے تھے لیکن وہ یہ بات کسی کو نہیں بتا سکتے تھے۔ ان

دولوں میں یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ اگر ہیرالڈ پکڑا گیا تو جارج

یعنی تمہارے دادا، اس کے فرار کے بارے میں لاطینی ظاہر

کریں گے اور اگر محفوظ رہا تو ہمیشہ غائب رہے گا۔ کیونکہ دنیا

والوں کی نظروں میں وہ مر چکا تھا اور اس کی کہانی ختم ہو چکی

تھی۔ کئی سال گزر جانے کے بعد بھی اگر تمہارے دادا

خاندان والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے تو ان کے

لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ ہیرالڈ کو مردہ قرار دیا جا چکا تھا۔

اسے بعد از مرگ تحفوں اور اعزازات سے نوازا گیا اور غالباً

کسی جنگی قبرستان میں اس کی قبر بھی موجود ہوگی۔ وہ مر چکا تھا

اور نومبر 1967ء کی اس رات کو وہ مردہ ہی تھا۔“

ہیرالڈ انکل واپس آ گئے تھے، یہ سنتے ہی میرے

بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنے بازوؤں کو

سہلانا شروع کر دیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈیڑی کو دیکھنے

لگا جن کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ دادا کا

عمل جائز تھا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ان کے پاس اپنے غصہ

کے اظہار کا یہی راستہ تھا۔“ ڈیڑی بولے۔

ڈیڑی نہیں جانتے تھے کہ پہلی جنگ عظیم ختم ہونے

کے بعد ہیرالڈ اتنا غصہ کہاں رہا اور کیا کرتا رہا شاید اس

نے شادی کر لی ہو اور اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی یا

مر چکی ہو۔ اسی لیے وہ تنہا محسوس کر رہا تھا اور نومبر کی

اس اداس شام وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور دادا سے

ملنے چلا آیا۔

دو دن بعد ڈیڑی کو ما میں چلے گئے اور ان کا انتقال

ہو گیا۔ خاندان کے لوگ اور دوست ان کی آخری رسومات

میں شرکت کے لیے آئے۔ میں بھی اکثر و بیشتر مشرقی لندن

کے قبرستان میں ان کی قبر پر جاتا رہتا ہوں لیکن میں نے

ہیرالڈ کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ خاندان

میں جو پرانے لوگ باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں پریشان کرنے

سے کیا فائدہ۔ آج بھی لوگ پہلی جنگ عظیم کے بارے میں

گہرے جذبات رکھتے ہیں۔ سب کو یہی معلوم ہے کہ انکل

ہیرالڈ نے سترہ سال کی عمر میں وطن کی خاطر اپنی جان

قربان کر دی۔ انہیں خاندان اور علاقے کے لوگ ایک

ہیرو کا درجہ دیتے ہیں اور ان کی اسی قربانی کی وجہ سے

ہمارے خاندان کو عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

جب میں ان سب باتوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے دادا کا عمل

جائز نظر آتا ہے۔ اگر وہ ہیرالڈ کو اپنے پاس رہنے کی

اجازت دے دیتے تو ان کی عزت دو کوڑی کی رہ جاتی۔

لوگ دادا کو جھوٹا اور ہیرالڈ کو بھگڑا سمجھ کر ان سے نفرت

کرنے لگتے۔ ممکن ہے کہ دادا پر دروغ گوئی کے الزام

میں مقدمہ چلا اور انہیں سزا ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ہی دادا

کو وہ تمام اعزازات اور تحفے واپس کرنا پڑتے جو ہیرالڈ

کی شجاعت اور بہادری کے صلے میں ملے تھے۔ یقیناً یہ

انکل ہیرالڈ کی جذباتی لغزش تھی کہ وہ پچاس سال روپوش

رہنے کے بعد دادا سے ملنے چلے آئے۔ انہوں نے یہ بھی

نہیں سوچا کہ اس کے کتنے بھائی بھانجے برآمد ہوں گے،

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ دادا نے ٹھیک ہی کیا۔ خاندان کی

عزت و آبرو کی خاطر ہیرالڈ کو واپس چلے جانا چاہیے تھا۔

ایک بھگڑے کو پناہ دے کر دادا گلے میں ہمیشہ کے لیے

رسوائی کا طوق تو نہیں ڈال سکتے تھے۔

تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا اور نہ ہی میں نے اس بارے

میں اس سے کوئی سوال کیا۔ ویسے بھی وہ ہر وقت نشے میں

دھت رہا کرتا تھا۔ اس لیے اس کی بات پر لوگ یقین نہیں

کرتے تھے۔ اس پولیس والے نے بھی مائیکل کی بات کو

اہمیت نہیں دی اور ہیرالڈ کی موت کو طبی قرار دے دیا لیکن

اب پوری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ مائیکل اس دنیا میں

نہیں تھا۔ وہ دادا کے انتقال سے پہلے 1969ء میں شراب

پیتے ہوئے مر چکا تھا۔

”مائیکل نے اس لاش کو محض تک محسٹ کر لے جانے

میں تمہارے دادا کی مدد کی تھی۔“ ڈیڑی نے انکشاف کیا۔

”اس نے یہ بات پولیس کو کیوں نہیں بتائی؟“

”تم جانتے ہو کہ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا

اور بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل جاتی تھیں۔ اس

نے نادانستی میں ہمیں تو بتا دیا لیکن پولیس سے کبھی کچھ نہ

کہا۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی وقوعہ کے بارے میں یقین

سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، دوسری بات یہ کہ وہ مکان میرے

والدین نے کرایہ پر لے رکھا تھا اگر انہیں وہاں سے جانا

پڑتا تو مالک مکان مائیکل کو بھی نکال دیتا اور اس کی اتنی

تنبہ ناکش نہیں تھی کہ وہ اپنے لیے کسی دوسرے مکان کا

بندوبست کر سکتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس عمر میں دادا جیل کی

ہوا کھائیں لہذا اس نے اپنی زبان بند رکھی۔“

”دادا نے ہیرالڈ کو کھل کیا تھا؟“ میں نے ایک بار پھر

پوچھا۔ نہ جانے مجھے اس پر یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔

”میں جہیں بتا چکا ہوں کہ ان کا یہ مقصد ہرگز نہیں

تھا۔“

”لیکن انہوں نے ایسا کیا؟“

”میرے بیٹے بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ڈیڑی

بولے۔ ”وہ اسے دیکھ کر غصہ میں آ گئے تھے اور اس کی آمد

ان کے لیے کسی خدمت سے کم نہیں تھی۔ پولیس کے مطابق

اس نامعلوم شخص کی موت دل کا دورہ پڑنے سے واقع

ہوئی۔ وہ پہلے سے دل کا مریض تھا۔ پولیس والوں کا یہی کہنا

ہے۔“

”لیکن اس کی موت پہلے کتنے سے واقع ہوئی تھی۔“

میں نے کہا۔

”اس کی موت دل کا دورہ پڑنے سے واقع ہوئی۔

پہلے کی ضرب اتنی مہلک نہیں ہوتی جس سے انسان

مر جائے۔“

”مان لیا کہ وہ دل کا مریض تھا۔“ میں نے جرح



محی الدین نواب

آٹھویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرائی ویرانی ہو یا پُر جوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذباتوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ گئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی حنائیوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل رہا سلسلہ



یہ داستان ہے دورِ جدی کی ماروی اور اس کے عاشقِ مراد کی کہانی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمداد اور چاچا مٹی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ گاؤں کا وزیرِ احشت جلالی ایک بدینت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار روپے کے عوض مانگ لیا تھا۔ چونکہ ماروی مراد کی تنگ جی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گدھا گاڑی پر مارو کو جو کہ قانونی تعلیم یافتہ تھا وزیرِ احشت کی مٹی گیری کرتا تھا۔ وزیرِ احشت جلالی اور اس کے بیٹے رواجی ذہینت کے مالک تھے اور انہوں نے جامعہ اسلامیہ کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ تھی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا سامہی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے قاصد ہو گیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک مٹی ہار بھی تحفہ دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مصفا قاتی ملائے میں ٹوٹ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچا مٹی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چاچا سے ہوئی جو کہ میرا سلی اور بڑے نا ٹیکنوں، لیکن ہونہر اور کامیاب تھے۔ اس دوران میں مراد کا قریبی دوست مراد کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چاچا نے اپنے ہم فعل کو دیکھ کر حیران ہوا مگر اسے یاد آیا کہ شہتِ جلالی جو کہ خود بھی میرا سلی تھا اس کا زکرائی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وزیرِ احشت اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کر لی۔ ناکامی پر انہوں نے بے مروتی سے بیچنے کے لیے ایک ٹوکرائی جو کہ زلیخا کے ہی قتل کا شہ کی تھی برادر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے سجا کر اسے اپنی بیٹی کا چہرہ کر کے اڑا کر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔ ماراد اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف مٹی تھے جو اس کے کاہن باری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کوسیکسٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جنگ و جدوجہد کو محبوب اس پر دل و جان سے مرنے لگا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور زلیخا کے ساتھ زلیخا کا وہ ہار بھی لے گئے لیکن بکڑے گئے یوں مراد کی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو ختم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران جیل میں لیکن وزیرِ احشت اور اس کے بیٹوں کو خبر نہیں کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں راجہ جاتی تھی لیکن مراد سے ملا لائی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قاتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چاچا یو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وزیرِ احشت سے دشمنی ہو گئی۔ بات بات پر زلیخا کے لیکر تنگ مٹی کی بیٹی چاچا چاچا مٹی سے ملنے لگا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے خواہ کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی کھلی کی شادی میں شرکت کے لیے ٹوٹ گئی، تاہم محبوب چاچا نے اسے بھالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکریٹ ایجنٹ برادر کوورہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرین جو کہ خلیج کی بیٹی ہے مگر دوسرا سچی بہرام اور دادا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ مرین مراد کو ایک غزوہ دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی اسے دھمکا کر ماروی سے دور کر رہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کر لے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلتا تھا لیکن محبوب ایک مٹی سے ان کا دھوکا دے گا اور اس کی کب جب ماروی محبوب کے احسانات سے بیچنے کے لیے جان بوجھ کر قاصد ہو گئی جس میں میرا بھر پور مدد کر رہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آجائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلیرا دشت ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لائحہ دے کر مراد کو سیرینڈ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد سیرینڈ کی نیت بھانپ کر اسے بھانسا دیتے ہوئے اس کے قہقہے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سیر اور مٹی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ایک موقع پر مرین مراد کا چچا کرتے ہوئے راستے میں ماروی تک پہنچی مٹی اور محبوب سے ٹوٹ پڑے۔ سیر اپنے باپ کے بندے راجہ کرانہ کو اس خبر سے محبوب میں مٹی زندگی دو گئی۔ مرین اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر میرا ن کی جو سیرینڈ کے ہاتھوں سے لگ گیا تھا، اتفاق سے راستے میں ماروی چاچا اور چاچا کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مرین ماروی کو کام تھا تو کے چورہ کی کے پاس لے جا رہی ہے لہذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگ سے آزاد کر لیتا ہے لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت مٹی جاتی ہے اور یہ صورت حال محبوب اور مراد دونوں کے لیے پریشان کن ہوتی ہے۔ مراد بھی مٹی کی جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے راز داری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود ملاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے مگر یہ بات جیلر یا مرین کی کوکان دکان پتا نہیں ہوتی۔ البتہ مٹی صاحب اور سیر کے علم میں یہ بات آ جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

انسان بدل جاتا ہے۔ نیت بدل جاتی ہے اور پتا نہیں چلتا۔ پھر وہاں کسی کو کیا معلوم ہوتا کہ وہ دونوں بند دروازے کے پیچھے جاتے ہی ادھر سے ادھر ہو گئے ہیں۔ جو اصل قیدی تھا۔ وہ اپنی جگہ واپس آ گیا تھا۔ جیلر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے سیل میں پہنچا دیا جائے۔ سپاہی اسے وہاں سے لے گئے۔ معروف نے جیلر سے مصافحہ کرتے ہوئے قیدی سے ملانے کا شکر یہ ادا کیا پھر محبوب کے ساتھ جیل کی عمارت سے باہر احاطے میں آ گیا۔ معروف آگے آگے تھا۔ محبوب سر جھکائے مراد کے انداز میں پیچھے چل رہا تھا۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنی کار کے پاس آئے۔ معروف نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ کر دروازہ کھولنا چاہا تو

محبوب نے کہا۔ "Please let me drive it..." معروف حیرت سے اچھل پڑا۔ اس کی طرف پلٹ کر دیکھتے وقت لڑکھڑا گیا۔ پھر اسے دیکھ کر حیرانی سے بولا۔ "محبوب... اتم...؟"

وہ شدید حیرانی اور بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ محبوب نے مسکرا کر کہا۔ "مراد اگر بڑی نہیں بولتا۔" معروف نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ اس نے کہا۔ "آپ مجھے بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔ جیلر کے سامنے بے اختیار جہد پاتی ہو کر بولنے لگے تھے۔"

"کیا کروں؟ باپ کی جگہ سمجھتے ہو اور اپنے پیچھے پاگل بنا کر دوڑاتے رہتے ہو۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا میں وعدہ کرتا ہوں۔ آج کے بعد آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔"

"اس لیے نہیں کرو گے کہ ماروی آگنی ہے۔ اب کہیں نہیں جاؤ گے لیکن..."

وہ محبوب سے الگ ہو کر بولا۔ "تم باہر نہ آتے تو اچھا ہوتا۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ میرے جیل میں رہنے سے خوش تھے؟"

"ہاں آج کل میں ماروی کی یادداشت واپس آجائے گی۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ تم مراد کی جگہ اب تک قیدی بنے ہوئے تھے اور وہ قیدی بڑی بڑی بے بسی اور خود غرضی سے آزاد ہو رہا ہے۔ وہ ماروی کی نظروں سے گر جاتا اور تم اس کے سر میں سما جاتے۔ وہ تم پر فخر کرتی۔ آپ ہی آپ بازی پلٹ جاتی۔"

"پلیز معروف صاحب! ایسا نہ سوچیں۔ وہ بے حس اور خود غرض نہیں ہے اور خدا نہ کرے کہ میں بھی اس کے خلاف کوئی سازشی لفظ زبان سے نکالوں۔"

"میں بھی جو کہہ رہا ہوں۔ وہ سازش نہیں ہوگی۔ صرف پانچ دلوں کی بات تھی۔ کوئی کام کرو تو پورا کرو۔ جب اس کی جگہ جیل گئے تھے اور ماروی کی خاطر گئے تھے تو عدالتی فیصلے کے بعد ہی باہر آتے۔ جو قربانی دے رہے تھے اسے آخر تک نباہنا چاہیے تھا۔"

"ایک سیدھی سی بات ہے۔ میں مراد کو اس کی ماروی کی نظروں سے گرانا نہیں چاہتا تھا۔"

"جب اسے مراد کی ماروی کہتے ہو تو پھر اس کے پیار میں کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو؟"

"ضروری نہیں ہے کہ جسے ہم چاہیں وہ حاصل

ہو جائے اور وہ حاصل نہ ہو تو اسے چاہنا اور اس کی قدر کرنا چھوڑ دیں۔ میں آپ کو کیا سمجھاؤں؟ آپ نہیں سمجھیں گے معروف صاحب! آگنی نہیں چلیں۔"

معروف دوسری طرف سے محوم کر اگلی سیٹ پر آ گیا۔ محبوب نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی۔ اسے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں اس کی یادداشت کب واپس آئے گی؟ جب تک نہیں آئے گی تب تک ہم اس کے کوئی نہیں ہیں۔"

ہم نہیں جانتے کہ اس کے دل کے کورے کاغذ پر اب کس کی تصویر پہلے چھپے گی؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "عشق کی یہ داستان پھر سے شروع ہونے والی ہے۔"

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پچھلے عشق کی تمام تیز رفتاری دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

☆☆☆

موت سے پہلے شامت آتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مارتی ہے۔ منہ کے ٹل گراتی ہے پھر بستر پر چاروں شانے چت کر دیتی ہے۔ اس کا سلیو پوائزن خود اسے ہی مار رہا تھا۔ علاج کے لیے کئی ڈاکٹر تبدیل ہو چکے تھے۔ بار بار لیبارٹری کی رپورٹ کے باوجود کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اعصابی کمزوری کا سبب کیا ہے۔ اب وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آنے تک ٹھک جاتا تھا۔ کمزوری کے باعث زیادہ بولتا نہیں تھا۔

وہ ہانپتا کانپتا رہتا تھا۔ دشمنوں کو لٹکانے کے لیے پہلے جیسا دم خم نہیں رہا تھا۔ مقدمہ ختم کرانے کے سلسلے میں وکیل نے جتنے کاغذات تیار کئے تھے ان پر دستخط کر چکا تھا۔ آخری فیصلہ کن سماعت کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی اور اعصابی کمزوریاں دھمکی دے رہی تھیں کہ اس تاریخ سے پہلے زندگی کی آخری تاریخ بھی مقرر ہو چکی ہے۔

کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ وہ بیڈ پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ راجہ نے کمرے میں آ کر اسے دیکھا۔ پھر بیڈ کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ "کیا لگ رہا ہے؟"

وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں کیسی کمزوری ہے۔ چلتا پھرتا نہیں ہوں۔ پھر بھی ہانپنے لگتا ہوں۔"

"یہ خیال تو آتا ہی ہوگا کہ موت کا جو وقت مقرر ہے وہ شاید آ گیا ہے؟"

"تم جب بھی آتی ہو میری موت کی بات کرنے لگتی ہو۔"

"کیوں نہ کروں؟ کیا مرنا نہیں ہے؟ کیا اب بھی یہ

خوش فہمی ہے کہ رہتی دنیا تک رہنے آئے ہو؟“ وہ بڑی فکارت سے بولا۔ ”مرتا تو سب کو ہے لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔“

”آج تک پتا نہیں کتنے ہاریوں اور کھیت مزدوروں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔ وہ بھی تمہاری طرح مرنا نہیں چاہتے تھے۔“

”کیوں دشمنوں کی طرح بولنے لگی ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”خالموں کو اپنی موت کے وقت بھی اپنے مظالم کیوں یاد نہیں آتے؟ یاد دلاؤ تب بھی نہ بچھڑاتے ہیں نہ تو بہ کرتے ہیں۔ بلکہ طیش میں آ جاتے ہیں۔“

”میری بیماری اور کمزوریوں سے خوش ہو رہی ہو۔ دیکھ رہا ہوں خوب مزے لے رہی ہو۔“

”ابھی میں تمہاری جگہ پڑی رہتی اور تم میری جگہ یہاں کھڑے رہتے تو میری طرح مزے لیتے رہتے۔ ہم ایک ہی عمر تک ایک دوسرے کے شریک حیات رہے اور ایک دوسرے کی حیات کے دشمن بھی رہے۔ اس تمنا میں جیتے رہے کہ کوئی مرجائے۔ اب میری تمنا پوری ہو رہی ہے تو کیا میں مزے نہ لوں؟“

دونوں بیٹے دروازہ کھول کر اندر آئے وہ کمزوری سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”بیٹے! یہاں آؤ۔ اس عورت کو یہاں سے لے جاؤ۔ یہ مجھے جیتے نہیں دے گی۔ اپنی باتوں سے مار ڈالے گی۔“

برکت نے کہا۔ ”ابا! ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو رہا ہے؟ پہلے اماں بیمار تھیں۔ ہم سمجھ رہے تھے۔ یہ جانے والی ہیں لیکن یہ تو چلتے پھرتے ہیں تم جارہے ہو۔“

رحمت نے کہا۔ ”اماں کی بیماری کو ڈاکٹر نہ سمجھ سکے یہ خود ہی اچھی ہو گئیں۔ انسان کو اچھا ہونا چاہیے۔ تم بھی اچھے ہو جاؤ۔ یا جلدی چلے جاؤ۔ خواہو اور انتظار کر رہے ہو۔“

وہ غصہ سے کانپنے لگا۔ بیٹے بھی اپنی ماں کی طرح مزے لے رہے تھے۔ جب ماں بیمار تھی تب بھی تمام زمینیں ان کے نام ہو سکتی تھیں۔ اب باپ کی زمینیں ملنے کی سو فیصد امید تھی۔

اکثر دولت مند گھرانوں میں بوڑھے والدین کی الوداعی ہو تو جوان اولاد کی عید ہو جاتی ہے۔ یہ عجیب گھرانے ہوتے ہیں۔ کوئی رشتہ نہیں بچتا۔ زندہ رشتوں کی فصل کاٹنے رہتوں ان کے کمیت سونا لگتے رہتے ہیں۔

حشمت جلالی نے غصہ سے بیٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک دن تمہاری اولادیں بھی جوان ہوں گی۔ تم

موت کے بستر پر پڑے رہو گے پھر وہ بھی تم سے ایسی ہی باتیں کریں گی۔ اس دن سے ڈرو۔ تو بہ کرو۔“

”کیا تم نے ہمارے بیمار دادا کے سر ہانے کھڑے ہو کر تو بہ کی تھی یا ہماری طرح زمینوں کا حساب کر رہے تھے۔ تم بھی دادا کی موت کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔“

راجہ نے کہا۔ ”پیارے مال و دولت والے مرتے وقت بہت ہی مجبور ہوتے ہیں۔ اپنی ناخلف اولاد کو سب کچھ دے کر جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”اولاد جتنی بھی ذلالت دکھائے اسے کنکال نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہی خاندان کا نام آگے بڑھاتی رہتی ہے۔“

ان کی پوری ہسٹری دیکھی جائے تو ڈرے اور سرمایہ دار مال و دولت کے ساتھ اپنی خاندانی کمیٹکی اور ذلالت بھی ورثے میں چھوڑ جاتے ہیں۔

بیڈ کے سر ہانے حشمت جلالی کا وہ چھوٹا سا بیگ پڑا تھا جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ راجہ نے اسے اٹھا کر بڑے متنی خیر انداز میں دیکھا۔ انہیں بھی دکھایا پھر اسے کھولا۔

وہ باپ بیٹے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس بیگ میں حشمت کی اہم چیزیں تھیں اور وہ اہم سیلو پوائزن کی شیشی بھی تھی۔

اس نے وہ شیشی نکالی تو باپ بیٹوں نے ایک ذرا پریشان ہو کر پھر ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا۔ وہ تینوں اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ شیشی زہریلی ہے۔ جبکہ شیشی وہی تھی راجہ نے اس کا زہر نکال دیا تھا۔

اس نے اسے روشنی کی طرف اٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کئی دنوں سے تمہارے بیگ میں دیکھ رہی ہوں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس شیشی میں کیا ہے؟“

حشمت نے کہا۔ ”دوا ہے۔ اسے رکھ دو۔ کیوں میرے بیگ کی تلاشی لے رہی ہو؟“

”یونہی خیال آیا کہ اور کوئی دوا ساتھ نہیں رکھتے اسے بیگ میں ایسے رکھتے ہیں جیسے کیچے سے لگا رکھا ہو۔“

اس نے تینوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ضرور اس میں کوئی خاص دوا ہے یا کوئی مزے کی چیز ہے۔“

برکت نے کہا۔ ”تم دیکھ رہی ہو۔ یہ کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں طاقت کی ٹانک دی ہے۔“

وہ بولی۔ ”ٹانک تو کوئی بھی طاقت کے لیے پی سکتا ہے۔ میں بھی پی سکتی ہوں۔ تم بھی پی سکتے ہو۔“

اس نے شیشی کھول کر اسے سونگھتے ہوئے کہا۔ ”ہائے کتنی اچھی خوشبو ہے۔“

اس نے برکت کے پاس آ کر اس کی ٹانگ کی طرف فیشی بڑھا کر کہا۔ ”سو گھڑ کرو نکمو۔“

وہ منہ پھیر کر کتراتے ہوئے بولا۔ ”دوا کو کیا سو گھڑا۔ یہ کوئی شربت نہیں ہے۔“

وہ رحمت کی طرف گھوم کر بولی۔ ”ٹانک تو شربت ہی ہوتی ہے۔ رحمت... الودود قطرے پی کر بولو۔ شربت جیسی ہے یا نہیں؟“

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”میں کیا پاگل ہوں کہ ابا کی دوا پینے کی حاشاک کروں گا۔“

وہ برکت کی طرف گھوم کر بولی۔ ”تم بیٹو۔“

وہ دور ہو کر بولا۔ ”کیوں ہمارے پیچھے پڑ گئی ہو؟ تمہیں خوشبو اچھی لگ رہی ہے۔ تم ہی بیٹو۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”تم لوگ تو ایسے بھاگ رہے ہو جیسے یہ زہر ہے۔ واہ کیا اولاد ہے۔ کیا تمہارا باپ پاگل ہے کہ اپنے بیگ میں زہر رکھے گا۔“

وہ شیشی کو حشمت کی طرف لاتے ہوئے بولی۔ ”لو جی...! تم بیٹو۔ ان گدھوں کو دکھاؤ کہ یہ زہر نہیں ہے۔ امرت دھار رہے۔“

وہ گھبرا گیا۔ لیٹے ہی لیٹے دور ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا پاگل ہو گئی ہو؟ کیوں ہمیں ٹانک پلا رہی ہو۔ پینے کا جو وقت ہے یہ اسی وقت پی جائے گی۔“

وہ کلکلا کر ہنسنے لگی۔ اسے تماشا کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ اس نے پھر شیشی کو بڑے بیٹے کی طرف بڑھایا۔ وہ پھر دور ہو گیا۔ وہ مزے سے ہنسی ہوئی رحمت کی طرف آئی۔ وہ

بیڈ کے ایک طرف سے دوسری طرف چلا گیا۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس کا شیشی والا ہاتھ فضا میں بلند تھا۔ وہ تینوں اسے دیکھ رہے تھے۔ فضا میں جیسے شراب کا جام بلند تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں تک آیا۔ اس کا منہ کھلا اور شیشی کا عرق قطرہ قطرہ اس کے حلق میں جانے لگا۔

حشمت کمزوری کے باوجود ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جسے ختم کر دینا چاہتا تھا وہ خود اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی۔

دونوں بیٹے ایک ایک قدم بڑھتے ہوئے ماں کے قریب آنے لگے کہ لاش گرے گی تو اسے سنبھال لیں گے۔ آخر ماں کا دودھ پیا تھا۔ کیا ایسے وقت بھی نہ سنبھالے؟

وہ نہیں گری۔ ذرا لڑکھائی جیسے نشے میں ڈوگ لگ گئی ہو۔ پھر ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ”بچو! مجھے معاف کرو۔ میں نشے میں ہوں۔ قسمت کی ہے خیرانی۔“

.... سانپوں کو زہر پلایا ہے میں نشے میں ہوں۔“ وہ مستی میں جھومتی ہوئی، گھومتی ہوئی حشمت کے پاس آئی اس نے منہ اٹھا کر پھر چند قطرے حلق میں پٹکائے۔

ان سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے پیچھے وقت ہنگی لی۔ جیسے آخری ہنگی ہو۔ پھر ایک جھٹکا کھا کر پیچھے گئی۔ پھر ہنسنے لگی۔

وہ پریشان تھے۔ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ زہر کے قطرے حلق سے اتر چکے تھے اور وہ بیروں پر کھڑی تھی۔

ادھر سے ادھر ڈنگا رہی تھی۔ موت نشہ بن گئی تھی۔ مار نہیں رہی تھی۔ مستی میں لا رہی تھی۔

وہ قریب آ کر اس پر جھک کر بولی۔ ”میرے پیارے شوہر...! یہ بتاؤ کیوں مجازی خدا کہلاتے ہو...؟“

کیوں خدا کا نام اپنے ساتھ لگاتے ہو...؟“ وہ شیشی کو اس کے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”اے...! اے میرے مجازی خدا...“

حیرے اندر ایک ذرا سی بھی خدائی خاصیت ہے تو یہ مجید معلوم کرو... کہ یہ میرے لیے امرت دھار کیسے بن گئی؟“

وہ سیدھی ہو کر تن کر بولی۔ ”اور... اور ذرا سوچ کر تو بستر مرگ پر کیوں ہے...؟“

پیتے پیتے بھی یہی یہ جام بدل جاتے ہیں۔ حیات و موت کے پیغام بدل جاتے ہیں۔“

وہ منہ پھیر کر قاتحانہ انداز میں چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ دونوں بیٹے حیرانی سے قریب آ کر اس شیشی کو دیکھنے لگے۔ جو باپ کے سینے پر رکھی ہوئی تھی اور وہ بھی جیسے کتنے کی حالت میں اسے پکڑے ہوئے چاروں شانے چت پڑا تھا۔

☆☆☆

وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں ہیڈ لائٹس کی روشنی تھی اور ونڈ اسکرین کے پار ماروی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ابھی کوٹھی میں پہنچ کر جیسے صدیوں کے بعد اسے رو برو دیکھنے والا تھا۔ اور وہ اسے دیکھ کر بھی جیسے نہ دیکھتی۔ جب اسے پہچان نہ پاتی تو دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہوتا۔

معروف ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہم نے ماروی کو سی ویو والی کوٹھی میں پہنچایا ہے۔ آئندہ اس کی مستقل رہائش کہاں ہوگی؟“

”اسی کوٹھی میں اپنی چاہتی اور چاہا کے ساتھ رہے گی۔“

”آج سے پانچویں دن مراد رہائی پا کر آئے گا۔ وہ

ماروی کے قریب رہتا چاہے گا۔
 ”دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ دن رات اس کے قریب رہوں۔ میں بھی مراد بھی دونوں ہی دل سے مجبور ہوں گے۔“
 معروف نے کہا۔ ”یہ اچھا موقع ہے۔ خدا کرے مراد کے آنے تک ماروی کی یادداشت واپس آجائے۔ تم دونوں اس کے سامنے رہو اور وہ فیصلہ سنا دے کہ کس کے نکاح میں آئے گی۔“
 وہ محبوب کی طرف گھوم کر بولا۔ ”یہ عشق تم سب کے لیے عذاب بن رہا ہے۔ تمہارے بزنس کے لیے۔ ماروی کے تحفظ اور سلامتی کے لیے۔ اس کی عزت اور نیک نامی کے لیے۔ وہ کسی ایک کی مشکوٰۃ بنے گی۔ جب ہی اس کی نیک نامی بحال ہوگی۔“
 وہ وٹن اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور تم مراد کی بھی بہتری چاہتے ہو کیونکہ وہ ماروی کا پیار ہے مگر شاید تم نہیں جانتے۔۔۔“
 محبوب نے سرگھما کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”اس کا من حراج اس کے توجہ بدل گئے ہیں۔ اس کی سادگی بارود بن گئی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں گن آگئی ہے۔“
 محبوب نے کار کو دوسری سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔ ”جب میں جیل میں تھا تو جیلر دلا اور جان نے سکھر سے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ مراد نے اس کی بیٹی کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس وقت جیلر اسے گالیاں دے رہا تھا۔ قسمیں کھا رہا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“
 ”وہ غصہ میں بتا رہا تھا کہ مراد نے کھنڈر میں اور کئی لاشیں مگرائی ہیں۔ اس نے خضدار کے ایک خطرناک ویران علاقہ میں تنہا سات ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“
 محبوب نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”حالات نے اس غریب اور شریف آدمی کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔“
 معروف نے کہا۔ ”یہ سوچو کباب اس کا مستقبل کیا ہوگا؟“
 ”معروف صاحب! اس کے تعلق قلعہ رائے قائم نہ کریں۔ اگر اس نے اپنی سلامتی کے لیے گن پکڑی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ غصہ بد معاش بن گیا ہے۔“
 ”جب ہاتھ میں گن آجائے تو ارادے اور طور طریقے رُوئے اور راستے سب بدل جاتے ہیں۔“
 ”میں نے بھی ماروی کے لیے گن اٹھائی تھی۔ گولیاں چلائی تھیں۔ دوسروں کو زخمی کیا تھا۔ خود زخمی ہوا تھا۔ کیا میرے ارادے اور طور طریقے بدل گئے ہیں؟“

وہ منہ پھیر کر بولا۔ ”میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ پتا نہیں کیا عشق ہے تمہارا؟ کئی مواقع ایسے آئے کہ تم ماروی کو تحفظ دینے کی خاطر اسے اپنی مشکوٰۃ بنا سکتے تھے۔“
 وہ اپنی سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”کئی ایسے مواقع آئے کہ بدنامی سے بچانے کے لیے اسے اپنی دلہن بنا سکتے تھے لیکن تمہیں کون سمجھائے؟ تمہارے دماغ میں یہ دیانتداری سما کی رہی کہ وہ مراد کی امانت ہے۔“
 محبوب نے کہا۔ ”وہ بے شک مراد کی امانت ہے۔ حقیقت میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ خود اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں اس کے دل پر بھی جبر نہیں کروں گا۔“
 ”اب تو اس کی مرضی کا اور اس کے دل و جان سے چاہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اب مراد اس کے دل و دماغ میں نہیں ہے۔ ماروی اب کسی کی نہیں ہے۔ وہ کسی کو جانتی پیچانتی نہیں ہے۔ خود اسے کسی سے لگاؤ نہیں ہے۔ جس سے اس کا رشتہ کیا جائے گا اسی سے راضی ہو جائے گی۔“
 ”ہاں۔ یہ تو ہے۔ اب وہ ایک عام سی لڑکی ہے۔ ہماری محبوبہ معشوقہ اور مطلوبہ ہوتے ہوئے بھی غیر جانبدار ہے۔ نہ میری ہے نہ اس کی ہے۔ ابھی اس کا نکاح مجھ سے پڑھایا جائے گا تو شاید وہ قبول کر لے گی۔“
 ”یہی میں کہتا ہوں۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ میں علاقہ کے قاضی صاحب کو فون کرتا ہوں۔ وہ ابھی آجائیں گے۔“
 ”نہیں۔ ایسی۔۔۔ بھی۔۔۔ جلدی۔۔۔ نہ۔۔۔ کریں معروف صاحب۔ ایہ مراد سے بے ایمانی ہوگی۔“
 وہ غصہ سے سیٹ پر اچھل پڑا۔ ”فضول باتیں نہ کرو۔ تم کوئی بے ایمانی نہیں کرو گے۔ یہ سب ہی دیکھیں گے کہ ایک لڑکی جیتی جاگتی آنکھوں سے تمہیں دیکھ کر پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں قبول کرے گی۔“
 ”پلیز تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں۔ وہ بہ ظاہر ہوش و حواس میں رہے گی لیکن یادداشت کی تاریکیوں میں نہ دیکھتے ہوئے نہ سمجھتے ہوئے مجھے قبول کر لے گی اور جب۔۔۔“
 اور جب اس کی یادداشت واپس آئے گی تو وہ مراد کو ڈھونڈے گی اور پوچھے گی کہ میں نے اس کی یادداشت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے اندھیرے میں رکھ کر اپنی زوجہ کیوں بنالیا؟“
 وہ ناراض ہو کر کھڑکی کی طرف منہ کر کے بولا۔ ”میں تم سے نہیں بولوں گا۔“
 کار کی محدود فضا میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر محبوب نے کہا۔ ”جب اس کی یادداشت کم نہیں ہوئی تھی اور

میں جیل میں تھا تب اس نے فون پر مجھ سے مکمل کر محبت کا اظہار کیا تھا۔ میں اسے جیت چکا ہوں معروف صاحب۔۔۔!“
 معروف نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”ایک مدت کے بعد جیسے صدیاں گزرنے کے بعد اس کے منہ سے میرے لیے عقیدت اور محبت بھرے الفاظ ادا ہوئے تھے۔“
 معروف نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے۔ کیا وہ تم سے راضی ہو گئی ہے؟“
 ”اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ہار گئی ہے۔ اب میں اس کے دل میں دھڑکنے لگا ہوں۔ یہ نہیں کہا ہے کہ مراد کو چھوڑ کر میری دلہن بن جائے گی۔ فی الحال میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس کے دل میں بیٹھ گیا ہوں۔“
 ”تم اسے اس حد تک جیت چکے ہو تو موجودہ حالات میں نکاح قبول کر سکتے ہو۔“
 ”ایمان کی بات یہ ہے کہ جس ذہن سے اس نے میری محبت کو قبول کیا تھا وہ ذہن اب اس کے پاس نہیں ہے۔ مجھے اس کی یادداشت کے بحال ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ سب کچھ یاد کرنے کے بعد مراد کے سامنے مجھے قبول کرے گی تو وہی حقیقت ایمانداری سے قبولیت ہوگی۔“
 معروف پھر ناگواری سے منہ پھیر کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ وہ بولا ”معروف صاحب۔۔۔! صرف پانچ دنوں کی بات ہے۔ انتظار کر لیتے ہیں۔ جب مراد آجائے گا۔ تب آپ ہم دونوں کا رشتہ ماروی کے پاس لے جائیں۔“
 ”تم دونوں ہم شکل ہو۔ وہ مال و دولت کی لالچی نہیں ہے۔ اگر وہ مراد کو تم پر ترجیح دے گی۔ اسے بھول جانے کے باوجود اسی کے نکاح میں آنا چاہے گی تو یہ اچھا نہیں ہو گا۔ بہت غلط ہوگا۔“
 ”غلط ہوگا تو ہمیں صبر تحمل سے پہلے اس کا علاج کرانا ہوگا۔ جب یادداشت واپس آجائے گی تو وہ خود ہی اپنی قسمت کا فیصلہ سنا دے گی۔“
 وہ ناگواری سے منہ بنا کر بولا۔ ”خواہناوہ کی بحث ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اس کا فیصلہ کیا ہوگا۔“
 ”ہم اور آپ تقدیر سے نہیں لڑ سکیں گے اور تقدیر تو سب کی دوست ہوتی ہے۔ سب کی دشمن ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے میری دوست بن جائے۔“
 حالات اچانک بدلتے ہیں۔ اچانک کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ واقعی تقدیر دشمن سے دوست ہو سکتی تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ ڈرائیو کرتا رہا سوچتا رہا پھر اس

نے کہا۔ ”مراد کی رہائش کا کہیں بندوبست کیا جائے۔ ہم دونوں ماروی سے دور رہیں گے۔ حسب ضرورت اس سے ملتے رہیں گے۔ اس کا علاج ہوتا رہے گا۔ وہ ہم سے ملتی رہے گی۔ یہ ہم سب دیکھیں گے کہ وہ رفتہ رفتہ کس سے متاثر ہوگی اور لائف پارٹنر کے لیے کسے قبول کرے گی۔“
 کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی۔ تمام راستے محبوب کے دل میں یہ خوشیاں چل رہی تھیں کہ ایک طویل عرصہ کے بعد ابھی ماروی کو رو برو دیکھے گا۔
 آدھی رات ہو چکی تھی۔ وہ اسی وقت اسے نہ دیکھ سکا۔ سب ہی سکھر سے طویل فاصلہ طے کر کے شام کو وہاں آئے تھے۔ ماروی سو گئی تھی۔ سمیرا بھی دوسرے بیڈروم میں تھی۔ چاچا ڈرائنگ روم کے صوفے پر پڑا تھا۔ چابی مراد کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ محبوب کو دیکھ کر بولی۔ ”سامیں سے ملاقات ہو گئی؟“
 معروف نے کہا۔ ”یہ سامیں ہیں۔“
 مٹی نے چونک کر اسے دیکھا پھر پیشانی پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تمام کر بولا۔ ”آپ میری اتنی جیسی ہیں۔ آپ کی پیشانی کو میں سلام کرتا ہوں۔“ اس نے السلام علیکم کہتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ وہ خوش ہو کر دعا میں دینے لگی۔
 اس نے پوچھا۔ ”ماروی کہاں ہے؟“
 ”کمرے میں ہے۔ شاید سو رہی ہے۔ کوئی بات نہیں جاگ جائے گی، آؤ اس سے ملو۔“
 وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ”اگر سو رہی ہوگی تو اسے نہ جگانا۔ آپ سب لے سر کے تھکے ہوئے ہیں۔“
 پھر اس نے معروف سے کہا۔ ”پلیز آپ بھی جا میں اور آرام کریں۔ صبح ملاقات ہوگی۔“
 معروف اس کے شانے کو تھپک کر چلا گیا۔ وہ سب اسی کوٹھی میں رات گزارنے والے تھے۔ مٹی نے دروازے کے پاس آ کر اسے آہستگی سے کھولا۔ ماروی بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ اپنے آپ کو بھی بھولنے کے بعد پتا نہیں خواب میں کیا دیکھ رہی ہوگی؟
 مٹی آگے بڑھ کر اس کے بدن پر چادر درست کرنے لگی۔ محبوب سحر زدہ سا ہو کر خوابیدہ حسن کو دیکھنے لگا۔ بہت دنوں کے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحات یاد آرہے تھے جب اسے اپنے شانے پر لا کر گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرتا کیا تھا۔ کھن سے بدن کی ملاحت اسے اپنے شانے پر سینے پر محسوس ہو رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں پوچھ رہی تھیں۔ کیا

کھلکھلاہٹیں

ایک شخص کی دو بیویاں تھیں۔ ایک دن آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ ایک کہہ رہی تھی۔ ”آج بدھ ہے“ دوسری نے کہا۔ ”آج جمعرات ہے۔“ اسنے میں شوہر گھر میں آیا۔ جب اس نے یہ باتیں سنیں تو اس نے کہا۔ ”کیا میں ہی بے وقوف ہوں جو جمعہ کی نماز پڑھ کر آ رہا ہوں۔“

☆☆☆

ایک نوبیا بتا دہن نے اپنے ہاتھوں سے پکایا ہوا کھانا شوہر کو کھلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر میں آپ کو اسی طرح کھانا کھلاتی رہی تو مجھے کیا انعام ملے گا؟“

”میری انشورنس کے پچاس ہزار روپے۔“ شوہر نے جواب دیا۔

☆☆☆

پھاڑی علاقے سے تعلق رکھنے والا ایک شخص، گھروالوں کے ساتھ موٹروں پر گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ میں سیٹ بیلٹ بھی باندھے ہوئے تھا۔

موٹروں پولیس کے آفیسر نے دیکھا تو حیران ہوا اور خوش بھی۔ اسے روکا۔ داد دی اور بطور انعام کچھ رقم دی۔ پھر کہا ”آپ کیا کریں گے؟“

اس آدمی نے کہا۔ ”گاڑی کا لائسنس بنائوں گا۔“

پاس بیٹھے باپ نے غلٹ میں کہا۔ ”جہیں کہا تھا ٹیٹے کی حالت میں گاڑی مت چلاؤ۔“

پچھلی سیٹ پر بیٹھی والدہ بولی۔ ”میں نے بھی کہا تھا۔ چوری کی گاڑی میں مت لے جاؤ۔ پکڑے گئے ناں۔“

ٹریفک آفیسر ہکا بکا رہ گیا۔

چند ثانیے بعد ڈکی سے بھائی کی آواز بلند ہوئی۔

”گاڑی سرحد پار کر گئی ہے یا نہیں؟“

مرسلہ: سید اکبر شاہ، اوکی، مانسہرہ

مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ ”ایک منٹ جانی! سرکا نمبر بدل گیا ہے۔ دوسرا نمبر لوٹ کرو۔“

اس نے محبوب کا نمبر لوٹ کر لیا۔ جانی نے اس نمبر پر رابطہ کیا۔ اس وقت محبوب سمیرا کے ساتھ کچن میں تھا۔ اس نے کانگ فون سن کر غصی سی اسکرین پر نمبر پڑھے پھر بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں جانی...! بولو؟“

اس نے کہا۔ ”میں یہاں اپنے مسخ آدمیوں کے ساتھ ہوں۔ آپ کے حکم کے مطابق مرینہ پر نظر رکھتا رہا۔ دو دن پہلے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ہم اسے تلاش کرتے رہے۔ آج پتا چلا کہ وہ گولیاں کھا کر بڑی طرح زخمی ہو کر اسپتال میں پڑی ہے۔ شہر کے باہر ایک تاریکی کھنڈر میں کسی سے کاؤنٹر فائرنگ ہوئی تھی۔“

محبوب نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں۔ وہ ہمیں نقصان پہنچانے والی تھی۔ میں نے جہیں اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ وہ میرے ہم شکل مراد کے ہاتھوں زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئی ہے۔“

”اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”اب بھی اسے اپنی نظروں میں رکھو۔ اس کا باپ کراچی واپس آ رہا ہے۔ پتا نہیں بیمار بیٹی کو چھوڑ کر واپس کیوں آ رہا ہے۔ کل صبح یہاں پہنچے گا۔ جیل میں میرے ہم شکل سے ملے گا تو شاید باپ بیٹی کے متعلق معلوم ہو سکے گا کہ وہ کراچی سے کھربنگ پھر کھربنگ سے کراچی تک کیا کرتے پھر رہے ہیں۔“

محبوب نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کچھ کر رہے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ کیا کر رہے ہیں؟

یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اب سے تیس گھنٹے بعد برنارڈ ان کی مدد سے فرار ہونے والا تھا۔ مرینہ کو چھ ماہ کے لیے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اس کی ملازمت کو بحال کرنے کی خاطر اس کا باپ برنارڈ کو جیل سے فرار کرانے کے لیے دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ کراچی آ رہا تھا۔

مرینہ اسپتال میں تھا تھی۔ باپ اپنے دو مسلح ماتحتوں کو اس کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر گیا تھا۔ نکلوا جانی اپنی محدود معلومات کے مطابق یہ دیکھ رہا تھا کہ اس شہر کے پولیس افسران نے مرینہ کے لیے سیکورٹی فراہم کی ہے۔ اگر کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ اب وہ لندن کی میٹ آفیسر نہیں رہی ہے تو وہ نکلوا اس اسپتال میں ہی اس کا جینا حرام کر دیتا۔

جیلر صبح آٹھ بجے کراچی پہنچ گیا۔ جیل میں آتے ہی سید حا قیدی نمبر سات سو سات سے ملے آیا۔ وہ غصہ میں

سے بچا سکتی ہو۔“

سمیرا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”اگر آپ کو شرمندگی سے بچا سکتی ہوں تو ضرور بچاؤں گی؟“

”شادی کر لو۔ اپنا گھر بسالو۔“

اس نے نظریں جھکائیں پھر نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”آپ ماروی کو بھول سکتے ہیں؟ میں جواب جانتی ہوں۔ اسی طرح آپ کو بھی میرا جواب معلوم ہونا چاہیے۔“

”جہیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ماروی میرے لیے کیا ہے... لا حاصل ہے۔ لیکن ایک آس ہے۔ ایک امید ہے۔“

”آپ بھی میرے لیے کیا ہیں... لا حاصل ہیں لیکن ایک آس ہیں۔ ایک امید ہیں۔“

پھر وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”آئیں۔ آرام سے بیٹھیں۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔“

”بھوک نہیں ہے۔ رہنے دو۔“

”آپ کسی فانیو اسٹار ہوئیں سے نہیں۔ جیل سے آئے ہیں۔ زیادہ نہیں کچھ تو کھا کر سونا چاہیے۔“

وہ اس کے ساتھ کچن میں آ گیا۔ یوں ذرا ساتھ رہ کر اس کا دل رکھنا چاہتا تھا۔ دل سے اس کی قدر کرتا تھا۔ وہ واقعی فرض شناس اور وفا شعار تھی۔ اس لیے قابل قدر تھی۔

☆☆☆

مراد پھر اسی لباس میں اسی کٹھری میں آہنی سلاخوں کے پیچھے آ گیا تھا۔ محبوب نے اسے اپنا سیل فون دے کر سمجھایا تھا کہ اس نمبر پر جیلر اور مرینہ کال کر سکتے ہیں۔ نکلوا جانی بھی ضرورت کے وقت کال کرے گا۔

جب تک جیلر اور مرینہ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ قیدی پھر بدل گیا ہے اور اب محبوب نہیں مراد ہے تب تک وہ باپ بیٹی اسے محبوب سمجھ کر اس کے دباؤ میں رہیں گے۔

جیلر تو اب سہا ہوا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی محبوب اس کی مخالفت کرے گا جیل میں جیج پکار کرے گا کہ وہ مراد نہیں محبوب ہے تو اس کی ملازمت بھی جائے گی اور سزا بھی ہوگی۔ مراد کو وہاں پانچ دنوں تک بہت محتاط رہ کر محبوب بن کر رہتا تھا۔ اسے ہاتھ جوڑ کر بات کرنے اور جیلر کو سامنے کہنے کی عادت سے باز رہنا تھا۔

رات کے ایک بجے اس کے فون سے کانگ فون ابھرنے لگی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”سر! میں جانی بول رہا ہوں۔ آپ کے حکم کے مطابق یہاں کھربنگ میں...“

بدن کا وہی لطیف لمس پھر نہیں ملے گا؟

وہ فوراً ہی سر جھکا کر کمرے سے باہر آ گیا۔ کیونکہ دل بے ایمان ہو رہا تھا۔

مختی نے باہر آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کھانا گرم کروں؟“

”نہیں۔ بھوک نہیں ہے۔ آپ آرام کریں۔“

معروف نے سمیرا کے دروازے پر آ کر دستک دی تھی۔ وہ سو رہی تھی۔ اس کے دل کا معاملہ محبوب کے ساتھ تھا۔ مراد کے اور معروف جیج کے انتظار میں جاگتا ضروری نہیں تھا۔

وہ دستک کی آواز پر آنکھیں ملتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ معروف نے اس کے چہرے پر پتیلی دیکھی پھر مسکرا کر کہا۔ ”ابھی تمہاری نیند اڑ جائے گی... محبوب آیا ہے۔“

وہ ایکدم سے چونک گئی۔ آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ خوش ہو کر بولی۔ ”جج...! اور وہ مراد...؟“

”اپنی جگہ پہنچ گیا ہے۔“

”کہاں ہیں وہ؟“

وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف جانے لگی جہاں وہ ماروی کو چھوڑ کر آئی تھی۔ یہ کچھ گئی تھی کہ دیوانہ ادھر گیا ہوگا۔ اور واقعی وہ اسی کمرے کے سامنے مختی سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ بڑی توجہ سے اسے دیکھنے لگی۔

”وہ مسکرا کر بولا۔ ”اے وہاٹھن بین بیز کم بیک۔“ وہ ایکدم سے تڑپ کر اس کے بازو سے آ کر لگ گئی۔ خوشی کے مارے رونے لگی۔ ان کے درمیان ایک دوسرے کو چھو لینے کی بے تکلفی نہیں تھی۔ ویسے تو وہ ریز رو رہتی تھی لیکن اس وقت دل بے قابو ہو گیا تھا۔ ایسی تڑپا دینے والی جذبات کو بے لگام کر دیتی ہے۔ وہ پھر بھی ایک حد تک منجمل ہوئی تھی۔

محبوب نے کہا۔ ”تم بہت اچھی ہو سمیرا! بہت وقادار ہو۔ میرے تمام معاملات میں بہت ذمہ دار ہو۔ میری کتنی ہی مشکلیں آسان کرتی رہتی ہو۔“ وہ اس کے دونوں شانوں کو تھام کر بولا۔ ”اور میں کیا کرتا ہوں۔ تمہیں دکھ پہنچاتا رہتا ہوں۔“

”آپ ایسا نہ کہیں۔ آپ کی طرف سے ملنے والا دکھ بھی بہت پیارا لگتا ہے۔“

”میں کیا کروں۔ ابھی سوری بولوں گا پھر جنون میں کہیں نکل جاؤں گا۔ پھر کبھی تمہارا خیال آئے گا تو پھر تمہاری وفا میں شرمندہ کریں گی۔ تم چاہو تو مجھے شرمندگی

بھرا ہوا تھا۔ مراد نے سوچ لیا تھا کہ اس سے سامنا ہوگا تو کم سے کم بولے گا تا کہ باتوں سے پکڑا نہ جائے۔

اس نے آہنی سلاخوں کے پاس آکر اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بھی اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ محبوب نے سمجھا دیا تھا کہ اپنا پلڑا بھاری ہے جیلر کے دباؤ میں بھی نہ آتا۔

وہ غصہ سے بولا۔ ”تمہارے اس ہم شکل کتے نے میری بیٹی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

جسے زندہ نہ چھوڑنے کی بات کہہ رہا تھا۔ وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اسے پکڑو گے تب مارو گے۔ یہاں میرے سامنے کیوں اچھل رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”ماروی یہاں کراچی آگئی ہے۔ اس کے پاس مراد کا فون نمبر ہے۔ معروف سٹی کے پاس بھی ہو سکتا ہے۔ تم ابھی ان سے نمبر لو اور مجھے دو۔“

”کیا گھاس کھا کر آئے ہو؟ میں اپنے ہی آدمی کے پیچھے تمہیں لگا دوں گا۔ یہ کس دماغ سے سوچ رہے ہو؟“

وہ پاؤں پٹختا ہوا سلاخوں سے ڈر اور گیا پھر پلٹ کر آتے ہوئے بولا۔ ”میں نے غصہ میں کہا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری بیٹی اس کی موت نہیں چاہتی ہے۔ اس کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ کر بھی اسی کے ساتھ جینا مرنا چاہتی ہے۔“ اس نے ایک ذرا التجا سے کہا۔ ”مجھے اس کا نمبر دو۔ اس سے بات کرنے دو۔ میں اپنی بیٹی سے اس کی صلح کراؤں گا۔“

”نہ وہ احمق ہے نہ ہم نادان ہیں۔ نہ وہ صلح کرے گا۔ نہ ہم کرنے دیں گے۔ دوسری بات کرو۔“

وہ مٹھیاں پیچ کر بولا۔ ”تم مجھے غصہ دلا رہے ہو۔“

”ہاں اتنی دیر سے یہی کر رہا ہوں۔ چاہتا ہوں غصہ سے پاؤں پٹختے ہوئے یہاں سے چلے جاؤ۔“

وہ ہونٹوں کو سختی سے پیچ کر ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ”محبوب! یہ نہ سمجھو کہ مراد کی جگہ تمہیں یہاں لاکر پھنس گیا ہوں۔ اگر میری بیٹی چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوتی تو میں خود ہی عدالت میں بیان دوں گا کہ میں مراد کو فرار کرانے کا مجرم ہوں اور تم نے مفروضہ مجرم کی جگہ آنے کا سنگین جرم کیا ہے۔“

وہ مراد کو گھونسا دکھاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں لمبی سزا ہوگی۔ ارب بیٹی محبوب علی چانڈی کی عزت اور شہرت خاک میں مل جائے گی۔ مجھے اپنے خلاف کچھ کرنے پر مجبور نہ کرو۔“

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جتنی جلدی ہو سکے یہی کرو اور یوں یہ ڈراما کب کرو گے؟“

اس نے غصہ سے گالی دی۔ مراد نے چیخ کر کہا۔ ”میں محبوب علی چانڈی ہوں۔“

دلدار جان کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یکبارگی سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ جس جیل کا جیلر تھا وہاں خود کو قیدی کے روم میں دیکھنے لگا۔ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”چپ ہو جا۔ میں غصہ میں تھا۔ اب کچھ نہیں بولوں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”تو نے مجھے گالی دی ہے۔ ابھی جو گالی دی ہے۔ ایسی ہی دس گالیاں اپنے آپ کو دے۔ دیر کرے گا تو اپنے نام کا ڈنکا پٹینے لگوں گا۔“

وہ جلدی جلدی ایک ایک انگلی کھینچتے ہوئے خود کو گالیاں دینے لگا۔ مراد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”بس اب جا یہاں سے۔۔۔“

وہ فوراً ہی پلٹ کر وہاں سے تیزی سے چلتا ہوا جیل کے دوسرے حصے میں آیا پھر تنہائی میں مراد کو جی بھر کے گالیاں دینے لگا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے رہائشی کمرے کی طرف جانے لگا۔ یہ بات دماغ پر چھوڑے کی طرح لگ رہی تھی کہ بیٹی مراد کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ کر ذلیل ہوئی ہے اور وہ محبوب کے ہاتھوں ذلیل ہو کر اپنے آپ کو گالیاں دیتا رہا ہے۔ بیٹی کی شکست اور اپنی ذلت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اسے محبوب سمجھ کر سوچ رہا تھا کہ مراد کبھی ہاتھ آئے نہ آئے۔ محبوب ہاتھ میں ہے اس سے انتقام لینا چاہیے۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا ایک موقع ہاتھ آنے والا تھا۔ اب سے بائیس گھنٹے بعد برنارڈ جیل سے فرار ہونے والا تھا۔ گولیاں چلنے والی تھیں۔ دھماکے ہونے والے تھے۔ ایسے ہنگامے میں ایک گولی قیدی نمبر سات سو سات کو آکر لگ سکتی تھی۔ اس کا قصہ تمام کر سکتی تھی۔

وہ سوچتا ہوا دفتری کمرے میں آیا۔ وہاں قائم مقام جیلر اس کی کرسی چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں جیل کے جوائنم معاملات درپیش ہوئے ان کا ذکر کرنے لگا۔ پھر ایک فائل اٹھا کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ مراد علی منگی قیدی نمبر سات سو سات کی فائل ہے عدالت سے نوٹس آیا ہے۔ آج سے چوتھے دن آخری پیشی ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ کی صلح صفائی کو اور سمجھوتے کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس روز مراد کو رہائی مل جائے گی۔“

یہ ایک نئی اطلاع تھی اور جیلر کو اس کی رہائی منظور نہیں

تھی۔ اگرچہ یہ اس کے حق میں بہتر تھا۔ چار دنوں کے بعد اس اندیشے سے نجات مل جاتی کہ وہ کبھی قیدیوں کو تبدیل کرنے کے الزام میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

وہ آرام سے بیٹھ کر سوچنے لگا۔ اگر رہائی سے پہلے محبوب بائیس گھنٹے بعد مارا جائے تو باپ بیٹی کا کیجا ٹھنڈا ہو جائے۔

ایک اور آئیڈیا ذہن میں آیا کہ اسے ہلاک نہ کرایا جائے۔ برنارڈ کے ساتھ فرار کرایا جائے تو جیل توڑنے اور فرار ہونے کے جرم میں چار دنوں بعد ملنے والی رہائی کٹاکی میں پڑ جائے گی۔ محبوب کو پھر نئے سرے سے سزا ملے گی اس بار وہ قیدی بن کر رہے گا تو جیلر کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ نہیں ہوگی تب وہ اس قیدی سے گن گن کر بدلے لے سکے گا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ برنارڈ کے سیل کی طرف جانے لگا۔ وہاں دارا اکبر اور بہرام تھے۔ برنارڈ کی خدمت کرنے اور فرار کی پلاننگ کو ہر پہلو سے مستحکم بنانے کے لیے آتے رہتے تھے۔ اس روز تو وہ جیلر کے ساتھ سکھرے ایک گاڑی میں آئے تھے اور برنارڈ کے سیل میں بیٹھے بائیس کر رہے تھے۔

برنارڈ نے جیلر کو دیکھ کر معافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کم آن مسٹر جان! اب میری الوداعی کے لیے اٹھارہ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ کیا آپ ہماری پلاننگ سے مطمئن ہیں۔“

”بالکل مطمئن ہوں۔ پلاننگ ایسی ہے کہ جیل توڑنے اور فرار ہونے کا الزام مجھ پر نہیں آئے گا۔“

”آپ اور کوئی تجویز دینا چاہتے ہیں؟“

اس نے دارا اکبر اور بہرام کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے پرسل معاملے میں کچھ کہنے آیا ہوں۔ قیدی نمبر سات سو سات کو بھی یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔“

ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اس سے پوچھا۔ ”اسے ہم کہاں لے جائیں گے؟“

اس نے کہا۔ ”پریشانی کی بات نہیں ہے۔ اپنے سر پر بوجھ نہ لو۔ اسے صرف باہر تک لے جاؤ۔ راستے میں جہاں مناسب سمجھو اسے زخمی کر کے پھینک دو تا کہ وہ پھر گرفتار ہو کر یہاں میرے پاس واپس آئے۔“

برنارڈ نے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ ہمیں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہیے۔“

”کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا تم لوگوں نے سات خطرناک قیدیوں کو اپنی پلاننگ میں شامل کیا ہے۔ ان کے

بغیر تم یہاں سے نکل نہیں سکو گے جہاں وہ سات ہوں گے وہاں میرا ایک آٹھواں قیدی بھی ہوگا۔“

دارا نے کہا۔ ”وہ ساتوں قیدی اپنی اپنی راہ نکل جائیں گے۔ وہ تمہارا قیدی ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔“

”پیچھے نہیں لگے گا۔ بلکہ یہاں سے بھاگنا بھی نہیں چاہے گا۔ تم اسے جبراً کسی بھی طرح لے جاؤ گے۔“

”وہ کوئی معصوم بچہ نہیں ہے کہ اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔ مرینہ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ اس نے تھما سات ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور مرینہ کو بھی اسپتال پہنچایا ہے۔“

دلدار جان نے کہا۔ ”یہ وہ قیدی نہیں ہے۔ وہ تو آزاد گھوم رہا ہے۔ یہاں اس کا ہم شکل ہے۔ میں ایسی پلاننگ سے انتقام لینا چاہتا ہوں کہ وہ جو آزاد گھوم رہا ہے اور جو میری بیٹی کا دشمن ہے وہ ہمارے قہقہے میں آجائے۔“

”تم اس قیدی کو یہاں سے فرار کرانے کے بعد گرفتار کراؤ گے تو وہ دوسرا تمہارے قہقہے میں کیسے آئے گا۔“

اس نے ان تینوں کو دیکھا پھر کہا۔ ”اس جیل میں ایسا کھیل کھیلا جا چکا ہے۔ جسے کوئی نہیں جانتا۔ یہاں آج جو قیدی نمبر سات سو سات ہے اس کا نام محبوب ہے لیکن اصلی مجرم اصلی قیدی اس کا ہم شکل مراد تھا۔ میں نے انہیں بدل دیا تھا۔ مراد کو باہر نکال کر محبوب کو اندر لے آیا تھا۔“

وہ تینوں اسے حیرانی سے اور تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بہرام نے کہا۔ ”تم نے دو ہم شکل سے ایسا کھیل کھیلا ہے کہ کوئی یہاں شبہ بھی نہیں کرتا ہوگا کہ قیدی بدل گئے ہیں۔“

”کسی کا باپ بھی شبہ نہیں کرے گا۔ اب میں چاہتا ہوں میری بیٹی کا دشمن مراد یہاں اپنی جگہ واپس آجائے۔ آج سے چوتھے دن مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا اور محبوب کو یہاں سے رہائی مل جائے گی۔ یہ ابھی ہوئی بات سمجھو کہ حقیقتاً مراد مجرم اور قیدی ہے اسے رہائی مل جائے گی۔ ہم چاہیں تو اس کی رہائی قید با مشقت میں تبدیل ہو جائے گی۔ تم لوگ محبوب کو جبراً یہاں سے لے جاؤ گے۔ باہر لے جا کر کہیں بھی زخمی کر کے پھینک دو گے۔“

”تمہاری اس پلاننگ سے محبوب یہاں واپس آئے گا۔ تمہاری بیٹی کا دشمن مراد تو نہیں آئے گا۔“

”آئے گا۔ مراد اس طرح آئے گا کہ محبوب کا احسان مند ہے۔ اپنی جگہ سزا کٹنے والے کو یہاں سے نکالنے کے لیے پھر یہاں آئے گا۔ میں خوب سوچ سمجھ کر بول رہا ہوں۔ محبوب کو یہاں سے نکال کر مراد کو اندر لے

ان تینوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر انکار میں سر ہلایا۔ برنارڈ نے کہا۔ ”سوری۔ ابھی ہماری پلاننگ میں کوئی غامی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ تم کمزوری پیدا نہ کرو۔ یہ ایک انٹریکٹل کرمل ہے۔ اس میں اپنا پرسنل معاملہ شامل نہ کرو۔ اپنا پرسنل ٹیم پھر کسی وقت کھیلو۔“

دلدار جان نے تن کر کہا۔ ”کھیلنا تو ابھی ہے۔ تمہارے ساتھ اسے باہر نکالنا ہے۔ اس نے میری بیٹی کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا ہے۔ اس کی ملازمت چھین لی ہے۔ اس کی سبھی یہاں لاکر ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دوں گا۔“

دارانے کہا۔ ”ہم برنارڈ کو یہاں سے نکالنے کے بعد تمہارے کام آئیں گے۔ مرینہ ہماری سینئر آفسر ہے۔ ہم مراد سے اس کا انتظام لیں گے۔ اسے کتے کی طرح دوڑاتے ہوئے تمہارے قدموں میں لائیں گے۔“

جیلر نے کہا۔ ”کے سمجھا رہے ہو؟ کیا تمہاری تمام پلاننگ مجھے معلوم نہیں ہے۔ تم تینوں میرے سامنے پلان کرتے رہے ہو اپنے سینئر افسران سے فون پر بولتے رہے ہو۔ بائیس تاریخ کی رات یعنی اب سے اٹھارہ گھنٹے بعد انٹرویو کے ایک پرائیویٹ رن وے پر ایک طیارہ پرواز کے لیے تیار رہے گا۔ تم تینوں یہاں سے نکل کر سیدھے وہاں جاؤ گے۔“

وہ تینوں اسے گھورتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جیلر کہہ رہا تھا۔ ”برنارڈ کوئل کے مقدمے سے اور سزائے موت سے بچانے کے لیے صرف مجھ جیسا ایک جیلر ہی اپنے ملک سے دشمنی نہیں کر رہا ہے اور بھی بڑے بڑے لوگ اسے یہاں سے اڑا لے جانے کے انتظامات کر چکے ہیں۔“

برنارڈ نے غصہ سے کہا۔ ”اور تم اتنے بڑے کرائم آپریشن کو نام بنادینا چاہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ناکامی تو اس وقت ہوگی جب میرا کام نہیں ہوگا پھر میں بھی تمہارے کام نہیں آؤں گا۔“

بہرام نے کہا۔ ”جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا، تمہاری برسوں کی ملازمت چلی جائے گی۔“

”میری بیٹی کی ملازمت چلی گئی ہے۔ میری بھی چلی جائے گی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”اوپر والوں کی طرف سے تم پر جو عذاب نازل ہوگا اس کا اندازہ نہیں ہے؟“

”میں تیار بیٹھا ہوں۔ فوراً ہی پلٹا کھاؤں گا۔ میرا

سروس ریکارڈ بے داغ ہے۔ میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعہ بیان دوں گا کہ میں نامعلوم افراد کے دباؤ میں نہیں آیا۔ میں نے رشوت کے لاکھوں ڈالر کو ٹھکرا دیا۔ میں محب وطن ہوں۔ میں نے برنارڈ کے فرار ہونے کے مشن کو نام بنایا ہے۔“

وہ تینوں اسے پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔ وہ بول رہا تھا۔ ”ذرا سوچو پھر تو میرے نام کے ڈکے بچے لگیں گے۔ میں اپنے ملک کا ایک ہیرو ایک دیانتدار افسر کہلاؤں گا۔“

وہ بڑے ہی فیصلہ کن انداز میں بول رہا تھا جو بول رہا تھا وہی کرنے والا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے مشورے کرنے لگے۔ ویسے کرنا تو وہی تھا جو وہ کہہ رہا تھا۔ وہی جیل کا حکمران تھا۔

آخر وہ تینوں راضی ہو گئے۔

☆☆☆

وہ سمیرا کے ساتھ کچھ وقت مچن میں گزار کر دو چار لقمے کھانے کے بعد ایک کمرے میں سونے کے لیے آگیا تھا۔ سمیرا نے ابھی اپنی موجودگی سے کسی حد تک اسے بہلا دیا تھا۔ تہا ہوتے ہی پھر اس کے حواس پروہی چھا گئی۔

اس نے سوچ آف کر کے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ ”وہ گہری نیند میں ہوگی۔“ اس نے اپنے بند دروازے کو دیکھا۔ ”نہیں... شاید کسی وجہ سے آٹکھ کل گئی ہوگی۔“ اس نے پھر کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔ ”شاید میری طرح کروٹیں بدل رہی ہوگی۔ وہ کمرے میں اکیلی ہے۔ یہ نئی جگہ ہے۔ وہ پچھلی باتیں بھول چکی ہے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ کیا کرے گی؟“

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ دماغ شور مچا رہا تھا کہ وہ دروازہ کھول کر باہر آئی ہے۔

وہ فوراً ہی بیڈ سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے کے تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ وہ سامنے والے کمرے میں سو رہی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ بند دروازے کو یوں ہلکا رہا جیسے وہ تقدیر کی طرح کھلنے والا ہو۔ خوش فہمی اسے چھاری تھی۔ پھر عقل نے سمجھا یا۔ ”یہ تیری نادانی ہے اور دنیا کی نظروں میں دیوانگی ہے۔ کل صبح اسے دیکھ لیتا۔ جاسو جا۔“

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ اسے بھی سونا ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔

وہ دماغی کمزوریوں کا شکار ہونے والی بھی سو رہی تھی۔ نیند سکون سے آئے تو خواب ضرور آتے ہیں۔ کیا وہ خواب دیکھ رہی ہوگی؟

جو پچھلی باتیں یاد ہوتی ہیں۔ انہی کے حوالے سے ہم متاثر ہو کر جذباتی ہو کر خواب دیکھتے ہیں۔ اسے تو نہ کچھ یاد تھا نہ کسی سے متاثر تھی اور نہ ہی کسی کے لیے اس کے جذبات تھے پھر وہ خواب میں کے دیکھ رہی ہوگی؟

اچانک اس کی آنکھ کل گئی۔ اس نے کچھ دیکھا تھا۔ وہ ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگی کیا دیکھا تھا؟

وہ بے چمن ہو گئی۔ لیٹے ہی لیٹے کسمانے کی خواب کی اسکرین پر جو نظر آیا تھا۔ وہ جھجھکیا تھا۔ دماغ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ حافظہ میں کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دیکھا ہوا خواب بھول گئی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ادھر سے ادھر تک کمرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”میں کہاں ہوں؟ پہلے کسی دوسرے شہر میں تھی۔ یہ لوگ مجھے یہاں لے آئے۔ پتا نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ سب ہی پیار اور اپنائیت دے رہے ہیں۔“

اس نے تصور میں مٹی کو دیکھا پھر سوچا۔ ”مجھے چاہی بہت اچھی لگتی ہیں۔ کیا میری کوئی ماں ہوگی تو ایسی ہی ہوگی؟“

وہ بیڈ سے اتر کر دروازے تک آئی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں محبوب تھا۔ اب کوئی نہیں تھا۔ تمام دروازے بند تھے۔ اس نے سوچا۔ ”کیا میں پہلے بھی اس کوٹھی میں آچکی ہوں۔ اگر یہ لوگ میرے رشتے دار ہیں تو میں یہاں ضرور آکر رہ چکی ہوں۔“

اس نے آگے بڑھ کر ایک دروازے کو آہستگی سے کھولا۔ وہ پوری طرح کھلا چلا گیا سامنے بیڈ پر چاچی مٹی سو رہی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب آکر اسے دیکھنے لگی۔

مٹی نے اسپتال میں اس سے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں۔ اسے بچپن کی اور جوانی کی بہت سی باتیں یاد دلانے کی کوششیں کرتی رہی تھی۔ اسے کچھ یاد تو نہیں آیا لیکن دل نے کہا۔ ”یہ چاچی کج کہہ رہی ہے۔ بھلا جھوٹ کیوں کہے گی؟“

وہ بڑے جذبے سے آگے کو جھک کر اس کے سفید بالوں پر ہاتھ رکھ کر دل ہی دل میں بولی۔ ”تم اچھی لگتی ہو۔ تمہیں تو اپنا سمجھتا ہوگا۔ اور کون ہے میرا...؟ میں کہاں جاؤں گی...؟“

یا خدا اتنی بڑی دنیا میں کسی اکیلی ہوں۔ یوں لگتا ہے آسمان سے آگری ہوں زمین پر میرا کوئی نہیں ہے۔“

مٹی نیند میں ذرا کسمانی۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اگلے

قدموں چلتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

پتا نہیں کتنی رات گزر چکی تھی۔ ایسی گہری خاموشی تھی جیسے اتنی بڑی کوٹھی میں کوئی رہتا نہ ہو۔ اس نے سر جھکا کر دوسرے دروازے کو دیکھا اور سوچا۔ ”کیا وہاں ایسی چیز ہوگی جسے دیکھ کر مجھے بھولی ہوئی کوئی بات یاد آجائے؟“

وہ دروازے پر آگئی۔ اس کے بیڈ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ پوری طرح کھلا چلا گیا۔ ایک بیڈ پر سمیرا سو رہی تھی۔ اس سے اچھی طرح شناسائی ہو چکی تھی۔ وہ سکھرے اس کے ساتھ ہی آئی تھی۔

اس نے سمیرا کے متعلق سوچا۔ ”یہ بھی اچھی ہے۔ مجھ سے زیادہ باتیں تو نہیں کہیں لیکن بہت بڑی لکھی ہے۔ مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتی رہتی ہے۔“

وہ کمرے کے اندر نہیں گئی۔ دروازے سے دور تک اندر دیکھتی رہی۔ شاید کوئی چیز اس کی یادوں کو پکارے۔ لیکن نہیں کسی چیز نے یادداشت کے بند دروازے پر دستک نہیں دی۔

اس نے وہاں سے پلٹ کر تیسرے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک ایک قدم چلتی ہوئی وہاں آگئی۔ کوئی تو ایسا دروازہ کھلا کہ وہ کسی اپنے تک پہنچ جاتی۔ سب ہی اٹھانے اور اجنبی دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے دروازے کو آہستگی سے کھول کر چھوڑ دیا۔ وہ بھی دھیرے دھیرے پوری طرح کھل گیا۔ سامنے وہ قد آور گہروں بیڈ پر

سورہ تھا۔ وہ ایسا ہی چہرہ اسپتال میں دیکھ چکی تھی۔ چاچی نے بتایا تھا کہ اس کا نام مراد ہے۔

اس کی نظریں محبوب کے نیچے بازو پر آکر ٹھہر گئیں۔ وہاں ایک بڑے سے زخم کا نشان تھا۔ پکبارگی اس کے کانوں میں تڑا تڑ۔ تڑا تڑا فائرنگ کی آواز کوٹھی پھر

تھم گئی۔

وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”کہیں گولیاں نہیں چل رہی تھیں۔ کہیں سے آواز نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں کیوں ایسا لگا کہ گولیاں چلی ہیں۔“

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے بازو کے منڈل ہونے والے زخم کے نشان کو دیکھ رہی تھی۔ حافظہ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں انہی بازوؤں میں رہ کر اس کے سینے سے لگ کر سفر کرتی رہی تھی۔ پھر کار کے اندر فرسٹ ایڈ کس کی دواؤں کے ذریعہ

اتاڑی پن سے اس کی مرہم پٹی کرتی رہی تھی۔ اس نے اس کے زخمی بازو کو تھامنا تھا۔ اس سے لگ کر روئی بھی تھی۔
آہ... کہاں ہو گزرے ہوئے لحو... اپنی ایک ذرا سی جھلک تو دکھا دو۔

وہ گم غم سی کھڑی محبوب کو تنگ رہی تھی۔ کوئی ایک بات کوئی گزرا ہوا ایک لمحہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ جانے کیسے قازنگ کی آواز گونجتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ایک ذرا سی شائستگی نہیں تھی کہ کبھی اس شخص کو دور سے بھی دیکھا ہو۔

وہ باہر آگئی، ممکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر دروازے کو بند کر کے بستر پر گر پڑی۔ آخر وہ رات گزر گئی۔ دن نکل آیا۔ سب ہی تھکے ماندے غفلت کی نیند میں تھے۔ پھر محبوب کی آنکھ پہلے کھلی۔ وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھا۔ یہ سوچ کر سو یا تھا کہ صبح ماروی سے پہلے بیدار ہوگا پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس بدل کر اس کے سامنے جائے گا۔

اس نے گھڑی دیکھی دن کے آٹھ بجے تھے۔ وہ بیڈ سے اتر کر باتھ روم کی طرف جانے لگا۔ پھر رک گیا۔ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ "اے تو سونے سے پہلے بند کیا تھا۔ اگر چہ چٹی نہیں لگائی تھی۔ تاہم یہ آپ ہی آپ نہیں کھل سکتا تھا۔ مگر یہ تو پوری طرح کھلا ہوا ہے۔"

یہ معاً فوراً ہی محل ہونے والا نہیں تھا۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ سمیرا کی آنکھ کھلی تو وہ بھی دروازے کو کھلا دیکھ کر حیران ہوئی۔ چاچی مٹی نے آکر پوچھا۔ "اے بیٹی! کیا تم میرے کمرے میں آئی تھیں؟"

"نہیں۔ کیا بات ہے؟"

"اے بیٹی...! کیا بتاؤں۔ میں نے رات کو دروازہ بند کیا تھا۔ ابھی دیکھا تو کھلا ہوا ہے۔"

وہ چونک کر بولی۔ "میرا دروازہ بھی دیکھیں کھلا ہوا ہے۔"

چاچی نے کہا۔ "پھر تو ماروی آئی ہوگی۔"

وہ دونوں ماروی کے دروازے پر آئیں۔ اسے کھول کر دیکھا۔ وہ اپنے بیڈ پر سو رہی تھی۔ آہٹ سن کر آنکھ کھل گئی۔ چاچی نے پوچھا۔ "بیٹی! تم ہمارے کمرے میں آئی تھیں؟"

اس کا ذہن نیند سے بوجھل تھا۔ یادداشت ماشا اللہ تھی۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں..."

سمیرا نے حیرانی سے کہا۔ "تجربہ ہے۔ دروازے

آپ ہی آپ کیسے کھل جائیں گے؟"

چاچی نے سمیرا کے ساتھ جاتے ہوئے کہا۔ "میں آرام کرو۔ ناشا آئے گا تو تمہیں جگاؤں گی۔"

آنکھ تو کھل ہی گئی تھی۔ اب کیا آرام کرتی اور سوتی۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ سمیرا اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ہوم ڈیلیوری سردس کو ناشا لانے کے لیے فون کر رہی تھی اور محبوب کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دھیان تو اسی کی طرف لگا رہتا تھا۔

ایسے وقت وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ شیو کرنے کے بعد نہادھو کر لباس بدل کر کھڑ گیا تھا۔ وہ بولی۔ "لوگوارا آپ تو بالکل فریش ہو گئے ہیں اور میں ایسی کی ایسی ہی ہوں۔ جسٹ اے منٹ ابھی پہنچ ہو کر آئی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "جسٹ اے منٹ کہہ رہی ہو پھر دنیا کی کوئی لڑکی ایک گھنٹے میں بھی فریش نہیں ہو سکتی۔"

وہ جاتے ہوئے بولی۔ "پھر بھی کوشش کروں گی۔"

وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر جانا چاہتی تھی۔ محبوب نے آواز دی۔ "سمیرا...!"

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ محبوب کا آواز دینا اچھا لگا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم میرے کمرے میں آئی تھیں؟"

"نہیں...؟" اس نے تعجب سے کہا۔ "نہیں تو... یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"وہ بات یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے میں نے دروازہ بند کیا تھا۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو یہ کھلا ہوا تھا۔"

سمیرا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

محبوب نے پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے کہا۔ "میرے اور چاچی کے کمرے کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔ یہ آپ ہی آپ کیسے کھل گئے؟"

محبوب کی نظریں سیدھی ماروی کے کمرے کی طرف گئیں۔ سمیرا نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے ماروی سے پوچھا ہے۔ وہ تو گہری نیند میں تھی۔ اس نے دروازے نہیں کھولے۔"

محبوب نے کہا۔ "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جادو سے کھل گئے ہوں گے یا کسی جن یا بھوت نے آکر کھول دیا ہوگا اور معروف صاحب تو کبھی ایسی حرکت کریں گے نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ اسکرین پر ایک میسج کی اطلاع تھی۔ اس نے جین کو دبا یا تو معروف کی بجلی کی طرف سے میسج تھا۔ "میں گھر جا رہا ہوں پھر دفتر

جاؤں گا۔ صبح دس بجے سے پہلے بیدار ہو جاؤ۔ دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر حق آنے والے ہیں۔ جب جاگ جاؤ تو مجھے کال کرو۔"

سمیرا نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بھی میسج دیا ہوگا۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔ ناشا آنے والا ہے۔ ابھی تیار ہو کر آ جاؤں گی۔"

اس نے کمرے میں جا کر دروازے کو بند کر لیا۔ وہ ماروی کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ اس سے ملنے کے لیے جیسے صدیوں سے ترس رہا تھا۔ دروازے نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے ہولے سے دسک دی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی اور دل دھڑکتا رہا پھر وہ ذرا کھل گیا۔ پھر اسے دیکھ کر دروازے کو کھولتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔

محبوب نے پوچھا۔ "کون...؟"

"وہ جو تمہارا ہم شکل ہے؟"

اس نے پوچھا۔ "کیا وہ تمہیں یاد آ رہا ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں تمہیں دیکھ کر وہ یاد آ رہا ہے۔ ایک ہی جیسے ہو۔" وہ ہنسی ہوئی بولی۔ "جب تم نہیں رہو گے وہ رہے گا تو اسے دیکھ کر تم یاد آؤ گے۔" پھر وہ سنجیدگی سے بولی۔ "ایک بات تو مجھ میں آگئی ہے۔ میری یادداشت جتنی بھی خراب ہو۔ میں تم دونوں کو نہیں بھلا سکوں گی۔ تمہیں دیکھوں گی تو وہ یاد آ جائے گا۔ اسے دیکھوں گی تو تم فوراً دماغ میں آ جاؤ گے۔ یہ بہت اچھا ہے۔ بھولنے کی یاد کرنے کی بجائے ہی ختم ہوگئی۔"

مٹی نے آکر کہا۔ "چلو بیٹی...! ناشا آ گیا ہے آ جاؤ۔ میں میز پر لگا رہی ہوں۔"

سمیرا نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر کہا۔ "محبوب صاحب! کہاں ہیں؟"

محبوب، ماروی کے کمرے میں تھا۔ یہ سمیرا کو مڑھما دینے والی بات تھی۔ جبکہ وہ آئینے کے سامنے اسی کے لیے کھڑ رہی تھی۔ وہ اس کمرے سے نکل کر بولا۔ "ہاں

اس نے کہا۔ "ڈاکٹر حق نے ابھی فون کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے ابھی آرہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ محبوب سمجھ گیا کہ وہ آئینے کے سامنے ہے۔ یہی کہتی رہے گی کہ بس ابھی آئی۔

اس نے چاچی سے کہا۔ "چاچی...! آپ ماروی کے پاس جائیں۔ اسے شاور دیں۔ لباس تبدیل کرائیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے ابھی آدھے گھنٹے میں آ رہا ہے۔"

ایسے وقت گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے میڈم روزی آگئی تھی۔ سب ہی اپنے اپنے طور پر مصروف ہو گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اندر ڈاکٹر آ گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چاچی اور محبوب سے ماروی کی ہسٹری سننے لگا۔

پھر سمیرا نے ایک قائل لا کر ڈاکٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ سکھر کے ڈاکٹروں کی میڈیکل رپورٹس ہیں۔"

"وہ قائل کو کھول کر توجہ سے پڑھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "مریض کو یہاں لائیں۔"

چاچی مٹی اسے لانے چلی گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ AMNESIA کا کیس ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کسی بیماری کی شدت سے یا نفسیاتی جذباتی صدمے سے

ہاں۔ ایسا ہی کوئی نام بتایا تھا۔"

مٹی نے کمرے میں آکر کہا۔ "بیٹی! یہی نام ہے اور تم انہیں تم نہیں، آپ کہو۔ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ انسان نہیں فرشتے ہیں۔"

ماروی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ انسان نہیں ہیں؟"

"میرا مطلب ہے یہ انسان ہیں مگر فرشتے ہیں۔"

محبوب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پلیز چاچی! انہ میں فرشتے ہوں نہ بڑا آدمی ہوں۔ آپ جائیں۔"

پھر اس نے ماروی سے کہا۔ "تم مجھے تم ہی کہو گی اور مائیں محبوب نہیں، محبوب صاحب نہیں صرف محبوب کہو گی۔"

وہ سر ہلا کر بولی۔ "اچھا میں نہ تو کچھ جانتی ہوں۔ نہ کسی کو پہچانتی ہوں۔ جو کہو گے وہ کہوں گی۔ وہ وہ کہاں ہے؟"

محبوب نے پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے کہا۔ "میرے اور چاچی کے کمرے کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔ یہ آپ ہی آپ کیسے کھل گئے؟"

محبوب کی نظریں سیدھی ماروی کے کمرے کی طرف گئیں۔ سمیرا نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے ماروی سے پوچھا ہے۔ وہ تو گہری نیند میں تھی۔ اس نے دروازے نہیں کھولے۔"

محبوب نے کہا۔ "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جادو سے کھل گئے ہوں گے یا کسی جن یا بھوت نے آکر کھول دیا ہوگا اور معروف صاحب تو کبھی ایسی حرکت کریں گے نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ اسکرین پر ایک میسج کی اطلاع تھی۔ اس نے جین کو دبا یا تو معروف کی بجلی کی طرف سے میسج تھا۔ "میں گھر جا رہا ہوں پھر دفتر

جاؤں گا۔ صبح دس بجے سے پہلے بیدار ہو جاؤ۔ دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر حق آنے والے ہیں۔ جب جاگ جاؤ تو مجھے کال کرو۔"

سمیرا نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بھی میسج دیا ہوگا۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔ ناشا آنے والا ہے۔ ابھی تیار ہو کر آ جاؤں گی۔"

اس نے کمرے میں جا کر دروازے کو بند کر لیا۔ وہ ماروی کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ اس سے ملنے کے لیے جیسے صدیوں سے ترس رہا تھا۔ دروازے نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے ہولے سے دسک دی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی اور دل دھڑکتا رہا پھر وہ ذرا کھل گیا۔ پھر اسے دیکھ کر دروازے کو کھولتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔

اس نے کہا۔ "مریض کو یہاں لائیں۔"

چاچی مٹی اسے لانے چلی گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ AMNESIA کا کیس ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کسی بیماری کی شدت سے یا نفسیاتی جذباتی صدمے سے

ہاں۔ ایسا ہی کوئی نام بتایا تھا۔"

مٹی نے کمرے میں آکر کہا۔ "بیٹی! یہی نام ہے اور تم انہیں تم نہیں، آپ کہو۔ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ انسان نہیں فرشتے ہیں۔"

ماروی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ انسان نہیں ہیں؟"

"میرا مطلب ہے یہ انسان ہیں مگر فرشتے ہیں۔"

محبوب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پلیز چاچی! انہ میں فرشتے ہوں نہ بڑا آدمی ہوں۔ آپ جائیں۔"

پھر اس نے ماروی سے کہا۔ "تم مجھے تم ہی کہو گی اور مائیں محبوب نہیں، محبوب صاحب نہیں صرف محبوب کہو گی۔"

وہ سر ہلا کر بولی۔ "اچھا میں نہ تو کچھ جانتی ہوں۔ نہ کسی کو پہچانتی ہوں۔ جو کہو گے وہ کہوں گی۔ وہ وہ کہاں ہے؟"

یا... دماغ کو چوٹ پہنچنے سے یادداشت کم ہو جاتی ہے۔
وہ فائل کا ایک ورق الٹ کر پڑھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”نفسیاتی معالج کی بھی یہی رپورٹ ہے۔ مریض پچھلی تمام باتیں یا تو مکمل طور پر بھول چکی ہے یا آئندہ اسے کبھی کبھار یاد آتا رہے گا۔ اور کبھی کبھار بھولتی رہے گی۔“
وہ قائل بند کر کے بولا۔ ”کیا آپ لوگوں نے اس کی اسٹڈی کی ہے؟ اسے پچھلی کوئی بات یاد آتی ہے؟“
سمیرا نے اور چاچا نے باری باری کہا کہ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ ایسے وقت مٹی اسے لے آئی۔
وہ ایک سادے سے لباس میں بہت ہی اجلی اور کھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی محبوب کی آنکھیں خواب خواب سی ہونے لگیں۔ ڈاکٹر نے ایک صوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آؤ۔ یہاں بیٹھو۔“
وہ بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“
اس نے کہا۔ ”ماروی۔“
وہ مسکرا کر بولا۔ ”ارے واہ! تمہیں تو اپنا نام معلوم ہے۔“
وہ خوش ہو کر بولی۔ ”میں سب کے نام جانتی ہوں۔ یہ چاہتی تھی۔ یہ چاہا تھا۔ یہ سمیرا بہت اچھی ہیں اور یہ...“
اس نے محبوب کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ۔ محبوبا ہیں۔“
”محبوراد...؟“ سب نے تعجب سے ماروی کو دیکھا۔ وہ خود نام بتانے کے بعد پریشان سی ہو کر سوچ رہی تھی اور محبوب کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
محبوب نے کہا۔ ”ڈاکٹر! میرا ایک ہم شکل ہے۔ اس میں اور مجھ میں ایک ذرا سا فرق نہیں ہے۔ اس کا نام مراد ہے۔“
وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ماروی نے اسے بھی دیکھا ہے۔ مجھے بھی دیکھا ہے۔ دونوں کے نام جانتی ہے۔ ان لمحات میں بھول گئی ہے۔“
وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے ڈاکٹر... اس کی زبان پر محبوب اور مراد کے نام گڑبڑ ہو گئے ہیں۔ یہ مجھے مجبوراً دکھ رہی ہیں۔“
ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ”Here is the perplexity of memory due to amnesia (یہ ایسیسیا کے باعث یادداشت کی الجھنیں ہیں)۔“
ماروی یکبارگی چونک گئی۔ صوفہ پر سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”یاد آ گیا۔ ان کا نام مراد ہے۔“
اسے اچانک ہی مراد کا نام یاد آیا تھا۔ محبوب نے

ایک ذرا دکھ سے کہا۔ ”میرا نام محبوب ہے۔“
ماروی کا خوشی سے کھلا ہوا چہرہ مجھ سا گیا۔ وہ کھجاتی ہوئی بولی۔ ”ہاں۔ تم نے بتایا تھا۔ اتنی جلدی کیوں بھول گئی؟“
ڈاکٹر نے اس کے شانے کو چھپ کر کہا۔ ”ڈاکٹر وری۔ ایسا ہو گا۔“
پھر اس نے محبوب سے کہا۔ ”رفتہ رفتہ ذہنی طور پر تبدیلیاں آئیں گی۔ یادداشت کے متعلق انکشافات ہوتے رہیں گے۔ ان حالات میں ان کی دن رات اسٹڈی کرنی لازمی ہے۔ میں نے معروف صاحب سے کہا تھا کہ انہیں راولپنڈی وکلاک آبزورویٹن میں رکھنا ہو گا۔ لیکن وہ انہیں اسپتال میں رکھنا نہیں چاہتے۔“
محبوب نے کہا۔ ”میں ڈاکٹر! ہم چاہتے ہیں ماروی کو گھر کا ماحول ملتا رہے اور یہیں علاج ہوتا رہے۔“
”تو پھر ایسے سائیکاٹرسٹ کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی جو کم از کم آٹھ دس گھنٹے ان کے قریب رہ کر ان کا مشاہدہ کرتا رہے اور ضروری ٹریٹمنٹ دیتا رہے۔“
”پتا نہیں کب تک اس کی یادداشت واپس آئے گی اور کب تک ٹریٹمنٹ چلتا رہے گا۔ ہم کسی لیڈی سائیکاٹرسٹ کی خدمات چاہیں گے۔ اس سلسلے میں آپ اس کے لیے کسی بہترین ماہر نفسیات کا انتخاب کریں۔“
”کل جب معروف صاحب نے کہا تھا تب ہی میرے ذہن میں ڈاکٹر عدیلہ رحمان کا نام آیا تھا۔ یوں تو عدیلہ ابھی ایک اسٹوڈنٹ ہیں لیکن نا تجربہ کار نہیں ہیں۔ وہ کلیکل سائیکولوجسٹ کی ڈپلومہ ہولڈر ہیں۔ انٹرن شپ کے ذریعہ experience حاصل کرنا چاہتی ہیں۔“
”آپ بہتر سمجھتے ہیں تو ان سے ملاقات کرا لیں۔“
”وہ پرسوں لندن سے آرہی ہیں۔ میں عدیلہ سے بات کر کے ملاقات کا وقت مقرر کر لوں گا۔“
اس نے صوفہ سے اٹھ کر ماروی سے کہا۔ ”بالکل ایزی رہو۔ یہ نہ سمجھو کہ یادداشت کی کمزوری سے سب تم ہو گئے ہیں۔ نہیں سب تمہارے آس پاس موجود ہیں۔“
وہ اپنے طور پر اسے اچھی طرح سمجھا رہا تھا۔ ”یہ کبھی نہ سوچو کہ سب نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ دیکھ رہی ہو سب ہی دن رات تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ دل سے سوچو کہ تم اکیلی نہیں ہو۔ یہ سب تمہارے اپنے ہیں۔ علاج جاری رہے گا۔ دو اگلی گئی رہو گی تو یہ رشتے دار جلد ہی تمہارے حافظہ میں واپس آ جائیں گے۔“

وہ محبوب سے اور چاچا سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔
☆☆☆
وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ نیم ماروی کو دیکھتے ہوئے اس سے باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔ اس دنو از محبوب نے خواب میں آ کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب اسے رہائی ملے گی اور وہ اس کے سامنے آئے گا تو وہ ساری دنیا کو بھول جانے کے باوجود اسے پہچان لے گی۔
اور مراد نے کہا تھا۔ ”جب مجھے پہچان لو گی تو میری آنکھوں سے دنیا کو دیکھو گی اور پچھان لو گی۔ صرف میرے ہی ذریعہ سب کو جاننے اور پہچاننے لگو گی۔“
وہ ایسے ہی دل بہلانے والے خواب میں مگن تھا۔ آدمی رات سے زیادہ گزر چکی تھی اور وہ اپنے آپ سے بے خبر پڑا ہوا تھا۔ تب سبیل کے قریب راہداری کے موڑ پر لائٹ بجھ گئی۔ ہر سو گہری تاریکی چھا گئی۔ اندھیرا ہونا تھا۔ پورے خیال کی بجلی کاٹ دی گئی تھی، مراد کی چھٹی جس نے اسے جگا دیا۔ آنکھ کھلی تو تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سامنے راہداری کا سبب بجھا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
بھی ایسا ہوتا تھا۔ لائٹ چلی جاتی تھی تو جزیئر کے ذریعہ روشنی بحال کی جاتی تھی۔ وہ جزیئر کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ دس منٹ، پندرہ منٹ گزر گئے۔ پتا نہیں کیا بات تھی؟ نہ جزیئر چل رہا تھا۔ نہ روشنی ہو رہی تھی۔ پھر اس نے راہداری میں دیکھی سی محدود روشنی دیکھی۔ موبائل فون کی تاریخ کی روشنی میں کچھ سائے نظر آرہے تھے۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والے سلاخوں کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا وہ تین تھے۔
آگے جیلر تھا۔ وہ آہنی سلاخوں والے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”چلو خوش ہو جاؤ۔ بنجرے کا دروازہ کھل رہا ہے۔ تمہاری چھٹی ہونے والی ہے۔“
مراد نے حیرانی سے پیچھے ہٹ کر پوچھا۔ ”چھٹی...؟“
وہ تینوں دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ مراد نے اپنے فون کی روشنی میں دیکھا جیلر کے ساتھ دو گن مین تھے اور وہ قیدیوں کے لباس میں تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو برٹارڈ کو خیل سے نکال کر لے جانے والے تھے۔ جیلر نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہا۔ ”اب یہ فون تمہارے کسی کام کا نہیں رہا۔ اسے چھینکو۔“
یہ کہتے ہی اس نے مراد کے ہاتھ پر ایک زور کی لات ماری۔ فون اس کی گرفت سے نکل کر اندھیرے میں چلا گیا۔

ادبی چٹکلہ

ایک شعر کو ایک بار بہت تیز بخار چڑھا جس کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئے، جب ہوش آیا تو پوچھا۔ ”میں کہاں ہوں؟ کیا میں جنت میں ہوں؟“
سامنے کھڑی بیوی نے فوراً کہا۔ ”اللہ نہ کرے، کیا ہو گیا آپ کو، دیکھتے نہیں میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔“

☆ میت کا منہ دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ”سبحان اللہ! یوں لگتا ہے جیسے ابھی، ابھی سویا ہو۔ کیا مبارک دن ملا، کیا مہینا، کیا نور برس رہا ہے، بہتا خون، پرسکون چہرہ، نرم بدن۔ ساری علامتیں شہیدوں کی ہیں، کون ہے یہ؟ کیا ہوا تھا؟“
ہجوم سے آواز آئی۔ ”ڈاکو ہے، پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔“
(عطا الحق قاسمی کے کالم سے اقتباس)

کلیب جلالی نے محض 32 سال کی عمر میں سرگودھا اسٹیشن کے پاس چلتی گاڑی کے سامنے کود کر خودکشی کر لی، مرنے کے بعد ان کی جیب سے کاغذ کا ٹکڑا ملا جس پر ان کا اپنا ہی ایک شعر لکھا ہوا تھا۔
تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ
جبکہ بعض کا خیال ہے کہ وہ شعر یہ تھا۔
آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا چٹان پر
مرسلہ: رضوان تنولی کریم ڈوی
اورنگی ٹاؤن، کراچی

محکمی کلیاں

☆ بعض اوقات جدائی دوستی میں رس گھول دیتی ہے اور اسے مزید مٹھاتا دیتی ہے۔

☆ دوستی ایک پانی کی طرح ہے، جودل اور دماغ کو سراب کرتی ہے۔

☆ دوسروں کے عیب کا تعاقب کرنے سے بہتر ہے کہ اپنے عیب پر نظر ثانی کرو۔

☆ اپنی زبان سے اتنے میٹھے الفاظ بولیں کہ اگر کبھی واپس بھی لینے پڑیں تو کڑوے نہ لگیں۔

☆ اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو کیونکہ توقع کا پچالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔

☆ سرسلہ، محمد عثمان انصاری، نیو سینٹرل جیل ملتان

☆ اللہ کا خوف ہی سب سے بڑی دانائی ہے۔

☆ حرص سے روزی میں اضافہ نہیں ہوتا مگر آدمی کی قدر میں کمی ہو جاتی ہے۔

☆ عقل مند وہ ہے جو ہر کام میں میانہ روی اختیار کرے۔

☆ ہنر انسان کا بہترین دوست ہے۔

☆ تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے ہم نشین ہیں۔

☆ سرسلہ، عارف نواز شاہین۔ اڈالروٹی

انہوں نے پیچھے گھوم کر بیک اسکرین سے دیکھا۔ رات کی نیم تاریکی میں ایک موٹر سائیکل سوار دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا۔ حد نظر تک اور کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

بہرام نے کہا۔ ”میں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ ہم جہاں بھی مڑتے ہیں وہاں یہ بھی مڑتا ہے ہم جس سڑک پر جاتے ہیں۔ یہ بھی اسی سڑک پر آ جاتا ہے۔“

برنارڈ نے کہا۔ ”اگر یہ تعاقب کر رہا ہے تو رفتار بڑھا کر قریب کیوں نہیں آ رہا ہے؟“

دارا نے کہا۔ ”اس کی گاڑی میں کوئی خرابی ہوگی۔“

بہرام نے کہا۔ ”میں اور رفتار بڑھاتا ہوں۔“

دیکھ کر کار کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ آندھی کی رفتار سے جانے لگے۔ دارا فون پر کسی سے بولنے لگا۔ ”ہم آ رہے ہیں۔“

ایئر پورٹ کے پچھلے ویران راستے سے آئیں گے۔ ہاں۔ ہاں مسٹر برنارڈ ہمارے ساتھ خیریت سے

دارا کی اینٹ آ کر گئی۔ وہ گرا تو دوسرا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ مراد نے ایک دم سے جھک کر اسے اپنے اوپر لا دیا۔ دوسری طرف پھینک دیا۔ اس نے خالی پستول کو پھینک دیا۔ پھر اس کی گتھن اٹھا کر دوسرے بھاگنے والوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔

اب وہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ جیلر کوئی نئی دشمنی شروع کر دیتا۔ اس وقت برنارڈ کچھ دور بھاگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مراد کو اب اس کی پروا نہیں تھی کہ اس کا اپنا انجام کیا ہونے والا ہے؟ دماغ نے سمجھایا کیوں نہ مرنے مرنے وطن کی زمین کو مارے یا اسے فرار ہونے سے باز رکھے۔

مراد ان سب سے پیچھے تھا۔ آگے بھاگنے والوں پر مگلیاں چلا رہا تھا۔ ان میں سے ایک گر کر مر گیا تھا۔ دوسرا زخمی ہو کر بھاگنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

برنارڈ بہت آگے نکل چکا تھا۔ ٹوٹے ہوئے گیٹ سے گزر کر وکیلن کار میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ دو قیدی ایک گاڑی اشارت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی بد نصیبی سے کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

اور ایک قیدی فرار ہونے کے لیے موٹر سائیکل اشارت کر رہا تھا۔ مراد نے قریب پہنچ کر اسے گولی مار دی۔ اسے صرف زخمی کر کے نیچے گرا دیا پھر اس گاڑی پر بیٹھ کر اسے اشارت کر کے برنارڈ کے پیچھے جانے لگا۔

بہرام تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ برنارڈ اس کے برابر والی سیٹ پر تھا۔ دارا اکبر نے پچھلی سیٹ سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا وہ ساتوں قیدی نکل آئے ہیں؟“

بہرام نے بیزارگی سے کہا۔ ”ساتوں نہیں آئیں۔ مراد کو کیوں بھول رہے ہو۔“

دارا نے برنارڈ سے پوچھا۔ ”ہاں مراد کا کیا بنا؟ کیا وہ بھی ساتوں قیدیوں کے ساتھ تھا؟“

برنارڈ نے اسے گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہمارے لیے مصیبت بن رہا تھا۔ اگر میں بھاگنے میں پیچھے رہ جاتا وہ مجھے پھر گرفتار کر دیتا۔ میں اس کے جیلر کے خلاف رپورٹ لکھوں گا۔“

دارا نے کہا۔ ”ختمہ تھوک دو۔ مراد کو جہنم میں جانے دو۔ تم تو نکل آئے ہو۔ ہم اپنے دشمن میں کامیاب رہے ہیں۔“

رات کا پچھلا پھر تھا۔ راستے سنان تھے۔ بھی ایک آدھ گاڑی گزرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ بہرام نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں یہ کون ہے؟ بڑی دیر سے ایک موٹر سائیکل ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔“

بہرام نے کہا۔ ”میں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ ہم جہاں بھی مڑتے ہیں وہاں یہ بھی مڑتا ہے ہم جس سڑک پر جاتے ہیں۔ یہ بھی اسی سڑک پر آ جاتا ہے۔“

برنارڈ نے کہا۔ ”اگر یہ تعاقب کر رہا ہے تو رفتار بڑھا کر قریب کیوں نہیں آ رہا ہے؟“

دارا نے کہا۔ ”اس کی گاڑی میں کوئی خرابی ہوگی۔“

بہرام نے کہا۔ ”میں اور رفتار بڑھاتا ہوں۔“

دیکھ کر کار کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ آندھی کی رفتار سے جانے لگے۔ دارا فون پر کسی سے بولنے لگا۔ ”ہم آ رہے ہیں۔“

ایئر پورٹ کے پچھلے ویران راستے سے آئیں گے۔ ہاں۔ ہاں مسٹر برنارڈ ہمارے ساتھ خیریت سے

ہیں۔ سیدھی طرح نہیں چلے گا تو یہاں سے تیری لاش نکال کر لے جائیں گے۔ یہ ثابت کر دیں گے کہ تو بھی نکل توڑ کے نکلتا تھا۔“

وہ مار کھا کر اوندھے منہ گرتے گرتے منجھل گیا۔ اس نے زمین پر پڑے ہوئے پستول کو اٹھا کر اسے دونوں ہاتھوں سے تمام کیا۔ پھر برنارڈ کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”خبردار! کوئی بھی میرے قریب آئے گا تو میں اس انگریز کو گولی مار دوں گا۔“

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ برنارڈ بھی ہنس رہا تھا۔ ایک قیدی نے کہا۔ ”ابے اوگدھے کی اولاد۔۔۔ نام کیا پاگل کے بچے ہیں کہ تجھے بھرا ہوا پستول دیں گے؟ تجھے اس لیے خالی کر کے دیا ہے کہ فرار ہونے والے کے پاس کچھ تو ہونا چاہیے۔“

دوسرے قیدی نے کہا۔ ”ارے یہ جیلر نے کسی پر بھروسے کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔“

تیسرے نے کہا۔ ”یہ ہمارے لیے مصیبت بن رہا ہے۔ ہم بھاگنے سے پہلے پکڑے جائیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”اسے کسی طرح یہاں سے لے چلو۔ باہر دارا اور بہرام اسے سنبھال لیں گے۔“

برنارڈ گھڑی دیکھ رہا تھا۔ فون پر کسی سے بول رہا تھا۔ پھر اس نے چیخ کر ساتوں قیدیوں سے کہا۔ ”ہوشیار! بھاگو۔ دھماکا ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان سب کو اس کمرے سے نکل کر جیلر کے آفس کی طرف سے مین گیٹ کی طرف بھاگنا تھا۔ گیٹ کے باہر دارا اکبر اور بہرام ایک دیکھ کر اسے پاس برنارڈ کے منظر کھڑے تھے۔ ان کے علاوہ اور دو گاڑیاں اور ایک موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔ ایک قیدی نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے جس طرح سب سے باہر لائے ہو۔ اسی طرح جیل سے باہر دارا کے پاس پہنچا دو۔“

دو قیدی پھر اس کے دائیں بائیں آگئے۔ اس کی بظلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ ایسے ہی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔ چار دیواریاں لرز گئیں۔ انہوں نے مین گیٹ کو کم سے اڑا دیا تھا۔ جیلر وہ گیٹ ان کے لیے کھول سکتا تھا لیکن یہ دکھاتا تھا کہ برنارڈ جیل توڑ کر فرار ہوا ہے۔ دھماکا ہوتے ہی وہ سب اس کمرے سے نکل کر گیٹ کی طرف بھاگنے لگے۔ کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ گئے تھے۔ ایک طرف کی دیوار گر رہی تھی۔ جو قیدی مراد کو جکڑ کر لے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے سر پر ٹوٹی ہوئی

جیلر کے چور اس کا انداز اور قیدیوں کے ہاتھوں میں اسلحہ بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی خطرناک کھیل کھیلا جانے والا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ یہاں سے چلو اور ہاں اگر یہاں چیخ چیخ کر محبوب علی چاند پوہونے کا اعلان کرنا چاہتے ہو تو میں اجازت دیتا ہوں۔ چلو شروع ہو جاؤ۔“

مراد نے سوچا۔ ”یہ بڑی بے باکی سے کہہ رہا ہے۔ یہ اب خوفزدہ نہیں ہے کہ بھید کھل جائے گا۔“

اس نے پوچھا۔ ”مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

جیلر نے قیدیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اس کے اطراف آ کر اس کی ایک ایک بظلوں میں ہاتھ ڈال کر جکڑ لیا۔ اپنی اپنی گتھن اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ ایک نے بڑے بد معاشوں کے انداز میں بڑی سفاکی سے کہا۔ ”چپ چاپ چلو۔ منہ سے آواز نکالو گے تو یہیں ٹھونک بجا کر چلے جائیں گے۔“

وہ نادان نہیں تھا۔ چپ چاپ ان کے ساتھ سب سے باہر آ کر رہداری سے گزرتے ہوئے جانے لگا۔ اتنی تو عقل تھی کہ جیلر جان کا دشمن نہیں بن سکے گا۔ وہاں کے تمام قیدیوں کو زندہ سلامت رکھنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اگر جیل کی چار دیواری میں کوئی بھی قیدی مر جائے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ اس لیے مراد کو اطمینان تھا کہ اسے جانی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

یہ مجبوری بھی تھی کہ جیلر سے اور ان کے اسلحہ برداروں سے ہاتھ پائی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دونوں اس کی بظلوں میں ہاتھ ڈالے اسے دوڑاتے لیے جا رہے تھے۔ وہ جہاں سے گزر رہے تھے وہاں سناٹا اور ویرانی تھی انہیں روکنے والا ایک سپاہی بھی نہیں تھا۔ ایسے وقت جیلر بھی کسی دوسری سمت چلا گیا تھا۔

وہ مراد کو دوڑاتے ہوئے جیلر کے آفس کے قریب ایک بڑے سے کمرے میں آگئے۔ وہاں اس نے برنارڈ کو دیکھا۔ اسی جیل میں پہلے بھی اسے دور سے دوبارہ دیکھ چکا تھا۔ وہاں برنارڈ کے ساتھ اور پانچ قیدی تھے۔ وہ سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ایک نے مراد کے ہاتھ میں ایک پستول رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلتا ہے۔“

مراد نے پستول کو پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نہیں نکلوں گا۔ مجھے رہائی ملنے والی ہے۔“

ایک نے کلاشکوف کے ہتھے سے اس کی پشت پر ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تجھے رہائی دلا رہے

ہیں۔ سیدھی طرح نہیں چلے گا تو یہاں سے تیری لاش نکال کر لے جائیں گے۔ یہ ثابت کر دیں گے کہ تو بھی نکل توڑ کے نکلتا تھا۔“

وہ مار کھا کر اوندھے منہ گرتے گرتے منجھل گیا۔ اس نے زمین پر پڑے ہوئے پستول کو اٹھا کر اسے دونوں ہاتھوں سے تمام کیا۔ پھر برنارڈ کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”خبردار! کوئی بھی میرے قریب آئے گا تو میں اس انگریز کو گولی مار دوں گا۔“

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ برنارڈ بھی ہنس رہا تھا۔ ایک قیدی نے کہا۔ ”ابے اوگدھے کی اولاد۔۔۔ نام کیا پاگل کے بچے ہیں کہ تجھے بھرا ہوا پستول دیں گے؟ تجھے اس لیے خالی کر کے دیا ہے کہ فرار ہونے والے کے پاس کچھ تو ہونا چاہیے۔“

دوسرے قیدی نے کہا۔ ”ارے یہ جیلر نے کسی پر بھروسے کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔“

تیسرے نے کہا۔ ”یہ ہمارے لیے مصیبت بن رہا ہے۔ ہم بھاگنے سے پہلے پکڑے جائیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”اسے کسی طرح یہاں سے لے چلو۔ باہر دارا اور بہرام اسے سنبھال لیں گے۔“

برنارڈ گھڑی دیکھ رہا تھا۔ فون پر کسی سے بول رہا تھا۔ پھر اس نے چیخ کر ساتوں قیدیوں سے کہا۔ ”ہوشیار! بھاگو۔ دھماکا ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان سب کو اس کمرے سے نکل کر جیلر کے آفس کی طرف سے مین گیٹ کی طرف بھاگنا تھا۔ گیٹ کے باہر دارا اکبر اور بہرام ایک دیکھ کر اسے پاس برنارڈ کے منظر کھڑے تھے۔ ان کے علاوہ اور دو گاڑیاں اور ایک موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔ ایک قیدی نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے جس طرح سب سے باہر لائے ہو۔ اسی طرح جیل سے باہر دارا کے پاس پہنچا دو۔“

دو قیدی پھر اس کے دائیں بائیں آگئے۔ اس کی بظلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ ایسے ہی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔ چار دیواریاں لرز گئیں۔ انہوں نے مین گیٹ کو کم سے اڑا دیا تھا۔ جیلر وہ گیٹ ان کے لیے کھول سکتا تھا لیکن یہ دکھاتا تھا کہ برنارڈ جیل توڑ کر فرار ہوا ہے۔ دھماکا ہوتے ہی وہ سب اس کمرے سے نکل کر گیٹ کی طرف بھاگنے لگے۔ کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ گئے تھے۔ ایک طرف کی دیوار گر رہی تھی۔ جو قیدی مراد کو جکڑ کر لے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے سر پر ٹوٹی ہوئی

جیلر کے چور اس کا انداز اور قیدیوں کے ہاتھوں میں اسلحہ بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی خطرناک کھیل کھیلا جانے والا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ یہاں سے چلو اور ہاں اگر یہاں چیخ چیخ کر محبوب علی چاند پوہونے کا اعلان کرنا چاہتے ہو تو میں اجازت دیتا ہوں۔ چلو شروع ہو جاؤ۔“

مراد نے سوچا۔ ”یہ بڑی بے باکی سے کہہ رہا ہے۔ یہ اب خوفزدہ نہیں ہے کہ بھید کھل جائے گا۔“

اس نے پوچھا۔ ”مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

جیلر نے قیدیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اس کے اطراف آ کر اس کی ایک ایک بظلوں میں ہاتھ ڈال کر جکڑ لیا۔ اپنی اپنی گتھن اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ ایک نے بڑے بد معاشوں کے انداز میں بڑی سفاکی سے کہا۔ ”چپ چاپ چلو۔ منہ سے آواز نکالو گے تو یہیں ٹھونک بجا کر چلے جائیں گے۔“

وہ نادان نہیں تھا۔ چپ چاپ ان کے ساتھ سب سے باہر آ کر رہداری سے گزرتے ہوئے جانے لگا۔ اتنی تو عقل تھی کہ جیلر جان کا دشمن نہیں بن سکے گا۔ وہاں کے تمام قیدیوں کو زندہ سلامت رکھنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اگر جیل کی چار دیواری میں کوئی بھی قیدی مر جائے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ اس لیے مراد کو اطمینان تھا کہ اسے جانی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

یہ مجبوری بھی تھی کہ جیلر سے اور ان کے اسلحہ برداروں سے ہاتھ پائی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دونوں اس کی بظلوں میں ہاتھ ڈالے اسے دوڑاتے لیے جا رہے تھے۔ وہ جہاں سے گزر رہے تھے وہاں سناٹا اور ویرانی تھی انہیں روکنے والا ایک سپاہی بھی نہیں تھا۔ ایسے وقت جیلر بھی کسی دوسری سمت چلا گیا تھا۔

وہ مراد کو دوڑاتے ہوئے جیلر کے آفس کے قریب ایک بڑے سے کمرے میں آگئے۔ وہاں اس نے برنارڈ کو دیکھا۔ اسی جیل میں پہلے بھی اسے دور سے دوبارہ دیکھ چکا تھا۔ وہاں برنارڈ کے ساتھ اور پانچ قیدی تھے۔ وہ سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ایک نے مراد کے ہاتھ میں ایک پستول رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلتا ہے۔“

مراد نے پستول کو پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نہیں نکلوں گا۔ مجھے رہائی ملنے والی ہے۔“

ایک نے کلاشکوف کے ہتھے سے اس کی پشت پر ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تجھے رہائی دلا رہے

ہیں۔ ہاں۔ کیا کہا...؟ پر ابلم...؟“
اس نے پیچھے آنے والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ ایک پر ابلم ہے۔ کوئی موٹر سائیکل پر ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ اکیلا ہے۔ اس لیے قریب نہیں آ رہا ہے۔“
دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اس سے دور نہ بھاگو۔ اسے قریب آنے دو۔ وہ اکیلا ہے اسے گولی سے اڑا دو۔“

یہی مناسب تھا۔ اس تعاقب کرنے والے کی اپنی مجبوری ہوگی۔ وہ اکیلا ہونے کے باعث تعاقب بھی کر رہا تھا اور ان سے کتر بھی رہا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ پولیس یا انٹیلیجنس کا بند ہے۔ شاید دور ہی دور سے دیکھتے ہوئے پیغام بھیج رہا ہوگا کہ وہ فرار ہونے والا غیر ملکی سیکریٹ ایجنٹ کہاں جا رہا ہے؟ بہرام نے گاڑی کی رفتار دہشتی کر دی۔ دارا پچھلی سیٹ کی کھڑکی سے اور برنارڈ اگلی سیٹ کی کھڑکی سے اپنی اپنی کنٹینر نکال کر آنے والے کو دیکھنے لگے۔ انتظار کرنے لگے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قریب شوٹنگ رینج میں آجائے۔ برنارڈ نے کہا۔ ”اس دشمن سے کوئی سوال نہ کرنا۔ رینج میں آتے ہی فائرنگ شروع کر دینا۔“

ایک کی گن گاڑی کے دائیں طرف والی کھڑکی کے باہر تھی۔ دوسرے کی گن بائیں طرف والی کھڑکی کے باہر مراد کی منتظر تھی۔ وہ کسی طرف سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ شوٹنگ رینج پر آ رہا تھا۔ ٹریگرز پر انگلیاں تیار تھیں۔ موت کا کھیل تھا۔ سچویشن کہہ رہی تھی کہ آنے والے کی موت لازمی ہے۔ لیکن یہ ایک اہل حقیقت ہے کہ بندوق کی گولی سے زیادہ ذہانت اپنی تیز رفتاری دکھائی ہے۔ اس نے ذہانت دکھائی تو گولیاں بندوق میں ہی رہ گئیں۔ وہ اچانک ہی پختہ سڑک سے اتر کر کھیتوں کی طرف جانے لگا۔ انہوں نے گاڑی روک دی۔ بڑی پھرتی سے اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر باہر آ گئے۔ موٹر سائیکل کھڑی فصل کی طرف جا رہی تھی۔ وہ تینوں دوڑتے ہوئے قاتل کرتے ہوئے ادھر جانے لگے۔ پھر رک گئے۔

وہ رات کی تاریکی سے قائمہ اٹھارہا تھا۔ گولیوں کی بو چھاڑ سے بچنے کے لیے لہلہاتی فصل کے پیچھے جا کر گم ہو گیا۔ اس کی گاڑی کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ اسے دھمکیاں دینے اور اپنے سے دور بھاگنے کے لیے اندازے سے ادھر قاتل کرنے لگے جہاں وہ جا کر چھپ گیا تھا۔ برنارڈ نے غصے سے کہا۔ ”دیر ہو رہی ہے۔ میں پکڑا

جاؤں گا۔ یہ خبر پھیل چکی ہوگی کہ جیل توڑ کر نکل گیا ہوں۔ اسے جہنم میں جانے دو۔ آگے چلو۔“
اس کی بات ختم ہوتے ہی تراتر گولیاں چلتی ہوئی آئیں۔ برنارڈ کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ اچھل کر زمین پر گرا۔ اس نے تاریکی میں بولنے کی غلطی کی تھی۔ مراد نے آواز کی سمت تین گولیاں چلائی تھیں۔ ایک گولی کمر کی ہڈی کو توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ زندہ تھا لیکن کمر کی ہڈی کو نقصان پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ نہ وہ سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ صرف لیٹا ہی رہ سکتا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ ”مجھے اٹھاؤ۔ یہاں سے فوراً لے چلو۔ ہم کسی وقت بھی پکڑے جائیں گے۔“

دارا اور بہرام بھی زمین پر لیٹ گئے تھے۔ یہ اندیشہ تھا کہ کھیت کی طرف سے آنے والی کوئی گولی انہیں لگ سکتی ہے۔ انہوں نے لیٹے ہی لیٹے ادھر کی گولیاں چلائی۔

برنارڈ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”یہاں کیوں پڑے ہو؟ کیا گرفتاری کا انتظار کر رہے ہو؟“
دارا نے جھنجھلا کر کہا۔ ”صبر کرو برنارڈ! ہم تمہیں یہاں سے لے جانے کے لیے آئیں گے تو وہ پھر گولیاں چلائے گا۔ کیا ہم بھی تمہاری طرح زخمی اور بے بس ہو جائیں؟“

مراد ادھر نہیں تھا۔ انہیں اندیشوں میں جکڑ کر فصلوں کے درمیان جھلکا ہوا چھپتا ہوا آگے وہاں پہنچ گیا تھا جہاں سڑک پر ویگن کار کھڑی ہوئی تھی۔ میدان جنگ میں قاتلنگ اچانک بند ہو جائے اور دشمن کی آہٹ بھی نہ سنائی دے تو اندیشے دہلاتے ہیں۔ موت چاروں طرف سے آتی دکھائی دیتی ہے۔ انہیں بھی ایسا ہی لگ رہا تھا کہ مراد اچانک گولیاں چلاتا ہوا ان کے سروں پر پہنچ جائے گا۔

بہرام نے پریشان ہو کر کہا۔ ”کئی منٹ ہو گئے۔ وہ چپ ہے۔ گولی نہیں چلا رہا ہے۔“
دارا نے کہا۔ ”ہمارے یہاں سے اٹھنے کا انتظار کر رہا ہے۔“

گولی کا زخم برنارڈ کو تڑپا رہا تھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ”باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے لیٹے ہی لیٹے یہاں سے کھینچے ہوئے لے چلو۔ کسی طرح نکلویں۔“
یہی ایک طریقہ تھا۔ وہ دونوں خود کو بچاتے ہوئے لیٹے ہی لیٹے اسے گاڑی تک کھینچ کر لے جاسکتے تھے۔ بہت وقت گزر رہا تھا۔ ان کی گرفتاری یقینی ہو رہی تھی۔

ان دونوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا پھر خود پیچھے گھٹکتے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس طرح وہ

پاکستانی ذہانت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جاپان میں ایک صاحب بنانے والی ٹیکسٹری میں غلطی سے ایک بیکٹ بغیر صاحب کے پیک ہو گیا۔

انہوں نے اس مسئلے کا حل یہ سوچا کہ لاکھوں ڈالر لگا کے ایک ایکسرے مشین خرید لی جو یہ چیک کرتی تھی کہ بیکٹ کے اندر صاحب موجود ہے یا نہیں؟

یہی مسئلہ پاکستان میں ہوا تو انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے اسبلی لائن کے پیچھے ایک پٹکھا لگا دیا خالی بیکٹ خود بخود اڑ کر دور جا گرتے۔

”پاکستان زندہ باد“

مرسلہ: رضوان تنولی کریمزوی اور کی ٹاؤن، کراچی

سے غداری کرتا ہے۔ مجھے مرنے کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہے۔“

اسے گولی لگی۔ وہ لڑھکتے لڑھکتے قہم گیا۔ ایک ذرا تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ دارا نے ایک دم سے چیخ کر کہا۔ ”برنارڈ...! پاگل کے بچے...! یہ تو نے کیا کیا؟“

اس نے کہا۔ ”وہ ایگریمینٹ کے خلاف مجھے چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ کیا نہیں جانتے کہ MET نے ہمارے ملک سے معاہدہ کیا ہے۔ تم لوگ مجھے پاکستانی قانون کے شکنجے سے نکال کر لے جانے آئے ہو۔ ایسے چھوڑ کر بھاگو گے تو کیا میں جانے دوں گا؟“

”تو نان سنس...! تم نے میرے دوست کو گولی کیوں ماری؟ ابھی ہم بالکل ہی بے بس نہیں ہوئے ہیں۔ ہم کسی بھی طرح تمہیں نکال کر لے جاتے۔“

کیا اس طرح نکالتے ہیں؟ مرینہ پہلے ہی ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ بہرام بھی بھاگ رہا تھا۔ اب تم رہ گئے ہو۔“
دارا اکبر نے کہا۔ ”میں تو رہ جاؤں گا۔ تم نہیں رہو گے۔ تم جہنم میں جاؤ۔ میں اپنا راستہ بنا لوں گا۔“

اس سے پہلے کے برنارڈ اپنی گن سیدی مارتا دارا نے اسے گولی ماری۔ قانون کے مطابق ایک قاتل کو اور ملک دشمن سیکریٹ ایجنٹ کو سزائے موت ملنی تھی۔ غیر قانونی طور پر مل گئی۔

دارا نے سراٹھا کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ ادھر مراد نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ ”اے! تم کہاں

گاڑی تک پہنچ سکتے تھے لیکن وہ دوسری بار اسے کھینچ رہے تھے۔ رات کے ستارے میں اچانک ہی زوردار دھماکے نے انہیں لرزادیا۔

انہوں نے چاروں شانے چت ہو کر سراٹھا کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ تاریکی میں اس کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گاڑی کے پیچھے چھپتے ہوئے بولا۔ ”وہ انگریز کتا تھا۔ اسے لے جائیں سکو گے... گاڑی کا پتہ کیا۔ اسے چلائیں سکو گے... میں فرار کے تمام راستے بند کر چکا ہوں۔ اپنے ہتھیار میری طرف پھینک دو۔“

بہرام نے تڑپ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہ تو ہم بڑی طرح پھنس گئے ہیں۔ نہ برنارڈ کو لے جاسکیں گے۔ نہ خود جاسکیں گے۔ ہمیں یہاں سے بیروں پر بھاگنا ہوگا۔“
برنارڈ نے کہا۔ ”نو شٹ اپ۔ کیا مجھے چھوڑ کر بھاگو گے؟“

”اور کیا تمہارے ساتھ مر جائیں؟ ہمارے فاضل ہتھیار اور تمہارے موجودہ مشن کے تمام ڈو کو منٹس گاڑی میں ہیں اور گاڑی اس کے قبضے میں ہے۔“

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”اس سے بار کیننگ کرو۔ اس کو بڑی آفر دو۔“

دارا نے مراد کو مخاطب کیا۔ ”اے! تم کون ہو؟ ہم سے سمجھوتا کرو۔ ہمیں جانے دو، ہم تمہیں منہ مانگی رقم دیں گے۔ ہائی گاڈ بھی کیش دیں گے۔“

جواب میں دو گولیاں شور مچاتی ہوئی آئیں۔ ان کے قریب کولار کی سڑک کو چھوتی ہوئی چنگاریاں اڑاتی ہوئی دیوالی مناتی ہوئی دوسری طرف نکل گئیں۔

تینوں نے چند لمحوں تک دم سادھ لیے۔ بہرام نے کہا۔ ”میں اتنی جلدی مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا ہوں۔ وہ جان نہیں چھوڑے گا۔ گولیوں کی زبان سے بولتا رہے گا۔ مجھے نہ مرنے ہے نہ گرفتار ہونا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“

دارا نے پوچھا۔ ”کیسے جاؤ گے۔ یہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہو گے تو گولی لگے گی۔“

وہ بولا۔ ”میں سڑک کے دوسرے کنارے تک لڑھکتا ہوا جاؤں گا۔ ادھر کھیتوں کی طرف ڈھلان میں لڑھک جاؤں گا پھر فصلوں کے درمیان چھپتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

یہ کہتے ہی وہ لڑھکتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے کی سمت جانے لگا۔ برنارڈ نے فوراً ہی اپنی گن سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے گولی چلاتے ہوئے کہا۔ ”یو باسٹرڈ! مجھے

ہو؟“ اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر پکارا۔ ”کہاں ہو؟“ دیکھ رہے ہو۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔“ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”یہ دیکھو میں اپنی گن پھینک رہا ہوں۔“

اس نے دور گاڑی کی طرف اپنی گن پھینک دی۔ مراد گاڑی کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے اور دارا کے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تم چاہو تو مجھے گولی مار سکتے ہو اور چاہو تو ان واقعات کا چشم دید گواہ بنانے کے لیے زندگی دے سکتے ہو۔“

وہ اور ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے گواہ بنا کر احسان کرو گے۔ میری سزا کم ہو جائے گی۔ مجھے موت نہیں ملے گی۔ عمر قید کی سزا ہوگی۔“

مراد نے سخت لہجے میں کہا۔ ”رک جاؤ۔ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنا۔ جہاں ہو وہیں بیٹھ جاؤ۔“

وہ رک گیا۔ وہیں سڑک پر بیٹھ گیا۔ اس کے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ مراد نے اسے گولی نہیں ماری تھی۔

وہ گاڑی کے اندر دیکھ چکا تھا۔ پچھلی سیٹ پر برنارڈ کا موبائل فون پڑا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اسے اٹھایا۔ پھر باہر گاڑی سے ٹپک لگا کر ماروی کے نمبر پر کال کرتی اب ماروی نہ کسی کو جانتی تھی نہ کسی کو کال کرتی تھی۔ چاہتی تھی اس کا فون اپنے پاس رکھتی تھی۔ اس فون سے کالنگ ٹون ابھری تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو۔ کون ہے بھائی؟ اتنی رات کو...“

مراد نے چیخنے کے انداز میں کہا۔ ”چاچی! میں ہوں مراد۔ کیا وہاں سائیکس محبوب یا معروف صاحب ہیں؟“

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں سائیکس اپنے کمرے میں سو رہے ہیں۔“

”فورا انہیں جگائیں مجھ سے بات کرائیں۔“

”ابھی بات کراتی ہوں۔“

وہ بیڈ سے اتر کر دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر چلی گئی۔ مراد گاڑی سے ٹپک لگائے فون کو کان سے لگائے دور سڑک پر بیٹھے ہوئے دارا کو دیکھ رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچھل کر بھاگتے ہوئے سڑک کے کنارے کھیتوں میں جا کر چھپ سکتا ہے۔ اس نے حکم دیا۔ ”اے! اٹھو نہیں۔ لیٹ جاؤ۔“

اس نے زندہ رہنے کے لیے حکم کی تعمیل کی۔ فوراً سڑک پر لیٹ گیا۔ ایسے ہی وقت محبوب کی آواز

سنائی دی۔ ”ہیلو مراد! کیا بات ہے؟ خیریت سے ہو؟“ وہ بولا۔ ”میں بہت مشکل میں ہوں۔ برنارڈ جیل توڑ کر فرار ہوا تھا۔ جیلر نے میرے لیے بھی ایسے حالات پیدا کیے کہ مجھے ان مجرموں کے ساتھ فرار ہونا پڑا لیکن میں نے ان مجرموں کے فرار کی کوشش ناکام بنا دی ہے۔ انہیں پھانسی کے پچھلے حصے کی سڑک پر برنارڈ اور اس کے ایک ساتھی کی لاش پڑی ہیں۔ ایک زندہ ساتھی میرے نشانے پر سڑک پر پڑا ہے۔ میں جیل توڑنے اور فرار ہونے کے جرم میں پھنس سکتا ہوں جبکہ میں نے بہت بڑے مجرم کو فرار ہونے نہیں دیا ہے۔ آپ مجھے بتائیں کیا کرنا ہے؟“

”تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میرے شیر...! میرے دلیر...! حوصلہ رکھو انتظار کرو۔ ابھی انٹیلی جنس والے وہاں پہنچ جائیں گے۔ میں بھی آ رہا ہوں۔“

اس نے رابطہ ختم کر کے سراخساں حماد صدیقی کے نمبر پر کال کی۔ پھر اس سے رابطہ ہونے پر پوچھا۔ ”کیا یہ جانتے ہو برنارڈ جیل توڑ کر فرار ہوا ہے؟“

حماد نے کہا۔ ”ہاں۔ میں اپنے سینئر افسر کے ساتھ یہاں ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوں۔ ابھی خبروں کا وقت نہیں ہوا ہے۔ بریکنگ نیوز میں یہ اطلاع دی جا رہی ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”دوڑو مراد چال قیامت کی چل گیا۔ فوراً اٹھو۔ میرے ہم شکل مراد نے برنارڈ کو مار گرایا ہے۔ ایئر پورٹ کے پچھلے راستے پر پوری فورس لے کر جاؤ۔ مراد کو سیکورٹی دو۔“

یہ ایسی اطلاع تھی کہ اٹلیجنس کے تمام افسران ہسٹر چھوڑ کر اٹھ بیٹھے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ سڑک اور وہاں کا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ جب سائیکس اس سڑک پر پہنچے تو انہیں برنارڈ اور دارا کی لاشیں ملیں۔ انہوں نے ٹی

الحال مراد کو بھی دارا کے ساتھ حراست میں لے لیا۔ محبوب وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے اور حماد صدیقی نے مراد کو تسلی دی کہ وہ مجرم ٹھہرایا نہیں جائے گا۔ اسے اس کی حب الوطنی کا انعام ضرور ملے گا۔

برنارڈ کو فرار کرانے کا سب سے اہم مجرم جیلر دلاور جان تھا۔ اسے فرار کرانے کے بعد وہ سکون سے نہیں تھا۔ دارا اکبر اور بہرام نے وعدہ کیا تھا کہ پرائیویٹ طیارے سے پرواز کرنے تک اس سے فون پر رابطہ رکھیں گے اور اپنی خیریت سے آگاہ کرتے رہیں گے لیکن جیل سے نکلے ہی انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

اسے مراد کے سلسلے میں زیادہ تشویش تھی۔ وہ یہ خبر سنا

ہاتھ تھا کہ وہ لوگ اسے جیل کے باہر لے گئے ہیں اور اسے ایک مفروضہ جرم کی حیثیت سے گرفتار کر لیں گے۔ یا دارا دلاور جان فرار ہوتے وقت اسے گولی مار چکے ہوں گے۔ ایسی خوش کرنے والی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں مل رہی تھی۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا والے پہنچ گئے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔

وہ ان سے جان چھڑا کر کارڈ میں بیٹھ کر اپنی رہائش گاہ میں آ گیا تھا۔ وہاں اس نے ٹی وی کو آن کیا تو خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ وہ ٹھکے ہوئے انداز میں دھپ سے صوفے پر بیٹھ کر سننے لگا۔

نیوز ریڈر کہہ رہا تھا کہ فرار ہونے والا مجرم برنارڈ اپنے ایک ساتھی سمیت مارا گیا ہے۔ اس کا دوسرا ساتھی زندہ ہے۔ اسی جیل کے ایک قیدی نمبر سات سو سات نے ان کے فرار ہونے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا ہے۔

دلاور جان حیرت سے دم سادھے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول کر خبریں یوں سن رہا تھا جیسے آنکھوں سے نہیں منہ سے دیکھ رہا ہو اور منہ سے سن رہا ہو۔ وہ ٹھپیاں پھینچ کر دانت پیس کر غصہ سے کہہ رہا تھا۔ ”کون کہتا ہے کہ یہ گدھا گاڑی والا ہے؟ اس کتنے ذلیل کیبنے برنارڈ جیسے ہیرونی ملک کے خطرناک سیکرٹ ایجنٹ کو ایک پھونک میں آڑا دیا ہے۔“

وہ صوفہ کے جیسے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”اس حرام زادے نے میری بیٹی کو توڑ پھوڑ کر اسپتال پہنچا دیا ہے۔ میں دن رات مجرموں سے ٹھٹھا رہتا ہوں۔ ان کی لقیات کو بچھنے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ اس نے میرے تیس برس کے تجربات کو جھٹلادیا ہے۔“

وہ بہت ہی مضطرب تھا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے اہل خانہ نے آئے لگا۔ وہ بے اختیار بڑبڑا رہا تھا۔ ”اس نے میری بیٹی کی زبردست نوکری کھائی۔ اب مجھے بھی برسوں کی ملازمت سے اکھاڑنے والا ہے۔ میں جس جیل کا بادشاہ ہوں اس جیل میں مجھے قیدی بنانے والا ہے۔“

نیوز کے دوران برنارڈ اور بہرام کی لاشیں دکھائی جا رہی تھیں۔ وہ فکر و پریشانی اور شدید ہرجان میں مبتلا تھا۔ اور ٹی وی پر بھی نظریں نہیں۔ وہاں اسکرین پر دکھایا جا رہا تھا۔ دارا اور مراد کو بھی پولیس کسٹڈی میں لیا جا رہا تھا۔

مراد کی زندگی اس کی موت تھی۔ یقیناً وہ جیلر کے خلاف بیان دینے والا تھا۔ دارا بھی اپنی سزا کم سے کم کرنے کے لیے اسی کے خلاف بیان دیتا کہ وہ جیلر برنارڈ کے فرار ہونے کے منصوبے میں کس طرح ان کی مدد کرتا رہا ہے۔ اس

کے اندر جیسے بجلی بھرمی۔ وہ بھانگم بھاگ اپنے سفری بیگ میں ضروری سامان رکھتے لگا۔ جرائم کی دنیا میں رہنے والے کو معلوم تھا کہ فوری طور پر کہاں چھپنا ہے پھر کن راستوں سے گزرتے ہوئے علاقہ غیر میں جا کر پناہ لینی ہے۔

☆☆☆

محبوب کی اس کوٹھی میں سب ہی کی زندگیاں ہنگاموں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ مراد نے وہ کارنامہ انجام دیا تھا جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس نے سب ہی کے اندر حیرت، مسرت، تجسس اور خیریت جذبات بھر دیے تھے۔

دوسرے دن اخبارات کی سرخیاں اور ٹی وی کے تمام چینلز اس کی حمایت میں کہہ رہے تھے کہ ایک محب وطن قیدی نمبر سات سو سات مراد علی سنگی نے ایک بڑے ملک کے سیکرٹ ایجنٹ کو پاکستان سے دشمنی کی سزا دی ہے۔ وہ قاتل ستائش ہے اور بہت بڑے اعزاز اور انعام کا حقدار ہے۔

خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ بدنام زمانہ سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ ہانٹ یہاں فوجی راز چھانے آیا تھا۔ اسے اسلام آباد کے دو اہم افراد کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں پاکستانی عدالت سزائے موت دینے والی تھی۔ برنارڈ ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق پچھلی رات جیل توڑ کر فرار ہو رہا تھا۔ ایسے وقت اسی جیل کا قیدی نمبر سات سو سات اس کی موت بن گیا تھا۔ مزید اہم معلومات یہ فراہم کی جا رہی تھیں کہ برنارڈ کو فرار کرانے کے ناپاک منصوبے میں جیلر دلاور جان اور اس کی بیٹی مرینہ دلاور پیش پیش رہے ہیں۔

یہ بتایا جا رہا تھا کہ مرینہ لندن کی MET آفسر ہے۔ وہ اپنے دو معاون دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ ایک زبردست مجرمانہ منصوبے پر عمل کرنے آئی تھی۔ بہرام برنارڈ کے ساتھ حرام موت مر چکا ہے۔ دارا اکبر نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے۔ مرینہ سکھر کے ایک اسپتال میں پڑی ہے۔ اسے پولیس کسٹڈی میں لے لیا گیا ہے۔ جیلر دلاور جان فرار ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔

مراد کے متعلق یہ عام رائے قائم کی جا رہی تھی کہ ایسا دلیر اور محب وطن کسی زلیخا کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس پر جموٹے قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ محبوب نے سراخساں حماد صدیقی نے اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران نے عدالت سے سفارش کی تھی کہ مقررہ تاریخ میں اس مقدمہ کو ختم کر دیا جائے۔ اسے طول نہ دیا جائے۔ مراد کو یہ عزت طور پر بری کر دیا جائے اور ان سب کو پوری امید تھی کہ وہ رہائی پا کر

یہ بتایا جا رہا تھا کہ مرینہ لندن کی MET آفسر ہے۔ وہ اپنے دو معاون دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ ایک زبردست مجرمانہ منصوبے پر عمل کرنے آئی تھی۔ بہرام برنارڈ کے ساتھ حرام موت مر چکا ہے۔ دارا اکبر نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے۔ مرینہ سکھر کے ایک اسپتال میں پڑی ہے۔ اسے پولیس کسٹڈی میں لے لیا گیا ہے۔ جیلر دلاور جان فرار ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔

مراد کے متعلق یہ عام رائے قائم کی جا رہی تھی کہ ایسا دلیر اور محب وطن کسی زلیخا کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس پر جموٹے قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ محبوب نے سراخساں حماد صدیقی نے اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران نے عدالت سے سفارش کی تھی کہ مقررہ تاریخ میں اس مقدمہ کو ختم کر دیا جائے۔ اسے طول نہ دیا جائے۔ مراد کو یہ عزت طور پر بری کر دیا جائے اور ان سب کو پوری امید تھی کہ وہ رہائی پا کر

یہ بتایا جا رہا تھا کہ مرینہ لندن کی MET آفسر ہے۔ وہ اپنے دو معاون دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ ایک زبردست مجرمانہ منصوبے پر عمل کرنے آئی تھی۔ بہرام برنارڈ کے ساتھ حرام موت مر چکا ہے۔ دارا اکبر نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے۔ مرینہ سکھر کے ایک اسپتال میں پڑی ہے۔ اسے پولیس کسٹڈی میں لے لیا گیا ہے۔ جیلر دلاور جان فرار ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔

مراد کے متعلق یہ عام رائے قائم کی جا رہی تھی کہ ایسا دلیر اور محب وطن کسی زلیخا کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس پر جموٹے قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ محبوب نے سراخساں حماد صدیقی نے اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران نے عدالت سے سفارش کی تھی کہ مقررہ تاریخ میں اس مقدمہ کو ختم کر دیا جائے۔ اسے طول نہ دیا جائے۔ مراد کو یہ عزت طور پر بری کر دیا جائے اور ان سب کو پوری امید تھی کہ وہ رہائی پا کر

یہ بتایا جا رہا تھا کہ مرینہ لندن کی MET آفسر ہے۔ وہ اپنے دو معاون دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ ایک زبردست مجرمانہ منصوبے پر عمل کرنے آئی تھی۔ بہرام برنارڈ کے ساتھ حرام موت مر چکا ہے۔ دارا اکبر نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے۔ مرینہ سکھر کے ایک اسپتال میں پڑی ہے۔ اسے پولیس کسٹڈی میں لے لیا گیا ہے۔ جیلر دلاور جان فرار ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔

مراد کے متعلق یہ عام رائے قائم کی جا رہی تھی کہ ایسا دلیر اور محب وطن کسی زلیخا کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس پر جموٹے قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ محبوب نے سراخساں حماد صدیقی نے اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران نے عدالت سے سفارش کی تھی کہ مقررہ تاریخ میں اس مقدمہ کو ختم کر دیا جائے۔ اسے طول نہ دیا جائے۔ مراد کو یہ عزت طور پر بری کر دیا جائے اور ان سب کو پوری امید تھی کہ وہ رہائی پا کر

یہ بتایا جا رہا تھا کہ مرینہ لندن کی MET آفسر ہے۔ وہ اپنے دو معاون دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ ایک زبردست مجرمانہ منصوبے پر عمل کرنے آئی تھی۔ بہرام برنارڈ کے ساتھ حرام موت مر چکا ہے۔ دارا اکبر نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے۔ مرینہ سکھر کے ایک اسپتال میں پڑی ہے۔ اسے پولیس کسٹڈی میں لے لیا گیا ہے۔ جیلر دلاور جان فرار ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔

مراد کے متعلق یہ عام رائے قائم کی جا رہی تھی کہ ایسا دلیر اور محب وطن کسی زلیخا کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس پر جموٹے قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ محبوب نے سراخساں حماد صدیقی نے اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران نے عدالت سے سفارش کی تھی کہ مقررہ تاریخ میں اس مقدمہ کو ختم کر دیا جائے۔ اسے طول نہ دیا جائے۔ مراد کو یہ عزت طور پر بری کر دیا جائے اور ان سب کو پوری امید تھی کہ وہ رہائی پا کر

یہ بتایا جا رہا تھا کہ مرینہ لندن کی MET آفسر ہے۔ وہ اپنے دو معاون دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ ایک زبردست مجرمانہ منصوبے پر عمل کرنے آئی تھی۔ بہرام برنارڈ کے ساتھ حرام موت مر چکا ہے۔ دارا اکبر نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے۔ مرینہ سکھر کے ایک اسپتال میں پڑی ہے۔ اسے پولیس کسٹڈی میں لے لیا گیا ہے۔ جیلر دلاور جان فرار ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔

مراد کے متعلق یہ عام رائے قائم کی جا رہی تھی کہ ایسا دلیر اور محب وطن کسی زلیخا کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس پر جموٹے قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ محبوب نے سراخساں حماد صدیقی نے اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران نے عدالت سے سفارش کی تھی کہ مقررہ تاریخ میں اس مقدمہ کو ختم کر دیا جائے۔ اسے طول نہ دیا جائے۔ مراد کو یہ عزت طور پر بری کر دیا جائے اور ان سب کو پوری امید تھی کہ وہ رہائی پا کر

انہوں میں واپس آئے گا۔

اور انہوں میں اس کا کون تھا؟ لہو کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ایک ماروی تھی جس سے پیار کا بھی نہ ٹوٹنے والا محکم رشتہ تھا لیکن تقدیر مذاق کر رہی تھی۔ اس ایک چاہنے والی کے بھی دماغ سے اور دل سے مناد یا تھا۔

یہ سدا سے سنتے آئے ہیں اور دیکھتے بھی آئے ہیں کہ جب تک جان نہ جائے پیار دل سے نہیں جاتا۔ یہ عجب سانحہ تھا کہ وہ جان سے نہیں گئی تھی۔ زندہ تھی اور اس نامراد کے دھڑکتے ہوئے دل کو چھوڑ گئی تھی۔

مٹی دن رات ماروی کے ساتھ رہتی تھی۔ اسے اٹھنے بیٹھنے نہانے دھونے کپڑے پہننے اور پکانے کھانے کے متعلق سمجھاتی اور سکھاتی رہتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن ماہر نفسیات ڈاکٹر عدیلہ رحمان آنے والی تھی۔ اس کے ساتھ روزانہ آٹھ دس گھنٹے رہ کر اس کی اسٹڈی کرنے والی تھی۔ اپنے طور پر نفسیاتی ٹریسٹ کے ذریعہ اس کی یادداشت واپس لانے والی تھی۔

تب تک مٹی اس کی پچھلی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں اسے بتاتی رہتی تھی۔ تین چار دنوں میں مراد بھی آنے والا تھا۔ اس کے دونوں چاہنے والے اس کا سامنا کرنے والے تھے۔ مٹی دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی کہ دونوں کے بیک وقت زور بردہ ہونے سے پہلے ماروی کو ان سے تعلق رکھنے والی تمام باتیں یاد آجائیں۔

وہ کند ذہن ہو چکی تھی۔ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ مٹی نے ایک رات اس سے پوچھا۔ ”بیٹی...! میں تمہیں دیکھتی رہتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں نہ جانے تمہارے معصوم سے دل میں کتنے ارمان ہوں گے؟“

اس نے بڑے ارمانوں سے کہا۔ ”ابھی تو ایک ہی ارمان ہے کہ مجھے اپنی پچھلی زندگی یاد آجائے۔“

”تم جوان لڑکی ہو۔ کیا تمہارے دل میں یہ ارمان نہیں ہے کہ مراد اور محبوب جیسا تمہارا چاہنے والا ہو؟“

”میں تو ایسی ابھی ہوئی ہوں کہ اب تک ایسے کسی چاہنے والے کی طرف دھیان نہیں جا رہا ہے۔ تم مراد اور محبوب کے بارے میں اتنی باتیں بولتی ہو۔ پھر بھی وہ مجھے اجنبی لگتے ہیں۔“

مٹی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”کبھی یہ ہاتھ سائیں محبوب کے ہاتھوں میں آیا ہوگا۔ کبھی مراد نے بڑے جذبوں سے تمہیں تمام لیا ہوگا۔ ایسے لحاظ ایک کنواری لڑکی کے لیے بہت اہم ہوتے

ہیں۔ وہ ایسے دھڑکتے ہوئے خوبصورت لحاظ لگتی ہیں۔ نہیں پاتی۔“

”اور میں بھول گئی ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی خوبصورت لمحہ میری زندگی میں نہیں آیا ہے۔ مراد اور محبوب نے مجھے ہاتھ لگایا ہوتا تو وہ میرے دل پر کھڑا ہوتا۔ ابھی میرا دماغ ناکارہ ہوا ہے، دل تو نہیں ہولے۔“ وہ اپنے حالات کے مطابق درست کہہ رہی تھی۔ دل پر کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ جو ہوتا ہے وہ دماغ کے ساتھ روشن ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ بچھ کر رہ جاتا ہے۔

فی الحال تو مراد دور تھا اور محبوب اس کے قریب آ جا تا رہتا تھا۔ وہ اس عاشق کے لیے دنیا کی سب سے خاص، سب سے اہم ہستی تھی لیکن ماروی ایسی ساوگی اور معصومیت سے اس کے سامنے آتی تھی اور اس سے باتیں کرتی تھی جیسے وہ اس کی نظروں میں دنیا والوں کی طرح ایک عام سا آدمی ہو۔

سمیرا اپنے گھر نہیں جا رہی تھی۔ اسی کوٹھی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ محبوب بھی وہیں تھا اور ماروی کے پاس تھا۔ محبوب سے دل کے معاملات تھے اور اس کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے قریب رہنے کا موقع مل رہا تھا۔

سمیرا نے چپ چاپ مراد کے حق میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ماروی کو اس کی طرف مائل کر کے رہے گی۔ وہ مراد کے حق میں ابھی تھی اور محبوب کے لیے اس سے زیادہ کیا ابھی ہوگی کہ دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی، اس کے کاروبار کو پوری دیانتداری اور ذمہ داریوں سے سنبھال رہی تھی۔ اگر کسی کو دشمن بننے کا موقع نہ دیا جائے تو وہ پیش دوست بن کر رہتا ہے۔ ماروی اگر محبوب کی طرف بھی مائل نہیں ہوگی۔ رقابت پیدا نہیں کرے گی تو سمیرا کبھی حسد، جھل اور صداوت میں مبتلا نہیں ہوگی۔

اور سمیرا اپنی کوشش کر رہی تھی کہ ہمیشہ ماروی کی دوست بن کر رہے اور ہر اچھے بڑے وقت میں اس کے کام آتی رہے۔

شام کو معروف جی آیا۔ سمیرا نے اس کے اور محبوب کے ساتھ لان میں چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم روزی آگئی ہے۔ چاہی دن رات ماروی کا خیال رکھتی ہیں۔ کل پانچ بول تک ڈاکٹر عدیلہ بھی آجائیں گی۔ پھر میں چلی جاؤں گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”تھینک یو سمیرا! تم نے ماروی کا بہت خیال رکھا ہے۔ وہ تمہیں بھولنے کے باوجود تم سے مانوس ہو گئی ہے۔“

ماروی

اس نے پوچھا۔ ”ماروی کی مستقل رہائش کہاں ہوگی؟“ معروف نے کہا۔ ”ہم اسے کسی دماغی امراض کے ہسپتال میں نہیں رکھیں گے۔ اس وسیع و عریض کوٹھی میں وہ ڈاکٹر عدیلہ کے زیر علاج رہے گی۔“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ یہ اچھی کھلی جگہ ہے۔ سمندر کا کنارہ ہے۔ ادھر شہری ہنگامے نہیں ہیں۔“

معروف نے اچانک سمیرا کے دل کی بات محبوب سے کہی۔ ”عدیلہ آجائے تو تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ یہ سوچو کہ مراد بھی آ رہا ہے۔ تم دونوں کو ماروی کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہنا چاہیے۔“

محبوب نے مسکرا کر پوچھا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں۔ ماروی ہم سے پردہ کرے؟“

وہ بولا۔ ”تم اور پردہ کراؤ گے؟ وہ ایک بار پردے میں گئی تو گھر اور کاروبار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“ میں یہ نہیں کہتا کہ تم دونوں کو ماروی سے دور رہنا چاہیے۔ ہاں قریب بھی نہیں رہنا چاہیے۔

یہ نہ بھولو کہ پہلے بھی کسی رشتے کے بغیر وہ تمہاری پناہ میں رہ کر بری طرح بدنام ہو چکی ہے۔ اور... اب ایک نہیں دو چاہنے والے یہاں اس کے ساتھ رہیں گے تو اس بچاری کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔“

محبوب نے کہا۔ ”یہ بات میرے ذہن میں ہے۔ میں اس کی نیک نائی پر آجائیں گے۔“

محبوب کی طرح اپنی کوٹھی میں رہوں گا۔ دن میں ایک بار ماروی سے ملنے آؤں گا۔ مراد میرے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو کسی کرائے کے مکان میں رہے گا۔ وہ بھی دن میں ایک بار اس سے ملنے آئے گا۔“

وہ دونوں موجودہ حالات میں ماروی کے لیے اجنبی تھے۔ دونوں کو جسے سرے سے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی۔ کوئی بھی کسی کے بھی دل میں بہترین روئے سے جگہ بنا لیتا ہے۔ لیکن کسی کے دل میں اپنے نام کی دھڑکتیں کوئی کوئی پیدا کر پاتا ہے۔ ان میں سے کون اس کی آنکھوں میں سائے گا اور دل میں آباد ہوگا یہ تو وہ دل والی بھی نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

عبدالرحمان کا کاروبار لندن میں تھا۔ اس کی بیٹی عدیلہ رحمان پاکستان میں رہنا چاہتی تھی۔ لاڈلی بیٹی کی خواہش کے مطابق ماں باپ نے کراچی آکر برسوں کی ویران کوٹھی کو آباد کیا تھا۔ اس کی رہائش کے انتظامات کیے تھے۔ آئندہ وہ یہیں رہنے والی تھی اور والدین واپس جانے

والے تھے۔ اس کی مٹی رشتی مغربی سوسائٹی اور وہاں کے ماحول کی دلدادہ تھی۔ بیٹی ماں کے مزاج کے خلاف مشرقی ماحول میں رہنے کا تجربہ کرنے آرہی تھی۔

معروف جی نے ایئر پورٹ میں آکر عبدالرحمان سے ملاقات کی۔ دونوں برسوں کے شاسا تھے۔ کاروباری معاملات میں کبھی کبھی ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ عبدالرحمان نے گرم جوش سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میری بیٹی تمہارے گھر کی فیملی ڈاکٹر بن رہی ہے۔ اب تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔“

معروف نے رشتی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بائیس یا چوبیس برس پہلے تم دونوں بے اولاد تھے۔ پریشان رہتے تھے کہ اولاد نہیں ہو رہی ہے۔ اب بتاؤ کتنی بیٹیاں اور بیٹے ہیں۔“

اس سوال پر دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو کٹکھیں سے دیکھا۔ رحمان نے کہا۔ ”ایک بیٹا ہے اور...“ رشتی نے کہا۔ ”ایک بیٹی۔ یہ جو ابھی آرہی ہے۔ بہت ہی شوخ اور چٹیل ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”میرا بیٹا بھی بہت ہی زندہ دل ہے۔“ رشتی نے کہا۔ ”میری بیٹی کے جیسا سمارٹ نہیں ہے۔“ رحمان نے کہا۔ ”وہ تو اتنا پونڈم اور اسمارٹ ہے کہ لندن کی لڑکیاں اس کے پیچھے بھاگتی رہتی ہیں۔“

”وہ ایسا بھی مغلطام نہیں ہے۔“

”تمہاری بیٹی کون سی خور پری ہے؟“

معروف دونوں میاں بیوی کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم دونوں میں ایسی نوک جھوک ہو رہی ہے جیسے تمہارا جو بیٹا ہے وہ رشتی کا بیٹا نہیں ہے اور رشتی کی جو بیٹی آرہی ہے وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”ہاں یہی حقیقت ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ تم نے دوسری شادی کی ہے۔ اس بیوی سے بیٹا ہوا ہے۔“

”میں نے دو بیویاں پالنے کی حماقت نہیں کی ہے۔ پہلی میری اکلوتی بیوی ہے۔“

رشتی نے تائید کی۔ ”میری کوئی سوکن نہیں ہے۔ اس بیٹے کو پیدا کرنے کی غلطی مجھ سے ہو گئی ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ مائیں تو بیٹوں کی تمنا کرتی رہتی ہیں۔“

رشتی نے کہا۔ ”اور باپ بیٹوں کو چاہتے ہیں۔ کیچے سے لگاتے ہیں۔ ان سے پوچھیں کیا یہ میری عدیلہ کو چاہتے ہیں؟“

رحمان نے کہا۔ ”یہی سوال میں کرتا ہوں۔ معروف کے سامنے جواب دو۔ کیا میرے عادل کو چاہتی ہو؟“

معروف نے پوچھا۔ ”اچھا تو بیٹے کا نام عادل ہے؟“

”ہاں عادل رحمان ہے۔ میرا پورا بزنس سنبھالتا ہے۔ ابھی آئے گا تو اس سے مل کر خوش ہو جاؤ گے۔“

رخشی نے کہا۔ ”وہ تو کبھی نہیں آئے گا۔ دیکھ لیتا صرف میری عدیلہ آرہی ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ آئے گا۔ اس نے مجھ سے فون پر کہا ہے۔“

رخشی نے ہاتھ بچا کر کہا۔ ”دونوں بھائی بہن میں جتنی نہیں ہے۔ وہ ایک ساتھ کبھی نہیں آئیں گے۔“

جہاز رن وے پر اتر چکا تھا۔ مسافروں کے لیے سیڑھیاں لگا دی گئی تھیں۔ معروف نے کہا۔ ”آپ دونوں جھگڑا نہ کریں۔ مسافر جہاز سے نکل رہے ہیں۔ ابھی وہ بھائی بہن دکھائی دیں گے۔“

وہ تینوں بالکونی میں کھڑے ہوئے سر جھکائے بچے دیکھ رہے تھے۔ جہاز سے اتر کر آنے والے مسافر بالکونی کے نچلے حصے سے گزرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

معروف ان مہماں بیوی کے متعلق سوچ کر حیران ہو رہا تھا۔ دونوں لندن کے پروردہ تھے۔ ذہین تھے بڑی کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن بیٹی اور بیٹے کے بارے میں جھگڑتے وقت بالکل اینارل لگ رہے تھے۔

وہ دونوں گزرتے ہوئے مسافروں کو توجہ سے دیکھ رہے تھے ابھی تک بیٹی اور بیٹا نظر نہیں آئے تھے۔ رخشی نے کہا۔ ”اللہ کرے تمہارا بیٹا نہ آئے۔“

وہ مٹھی بھینچ کر بڑے اعتماد سے بولا۔ ”چلو شرط لگاؤ تمہاری بیٹی نہیں آئے گی۔“

معروف نے کہا۔ ”ایسے نہ بولو رحمان! میں یہاں عدیلہ سے ہی ملنے آیا ہوں۔ وہ ہمارے لیے ڈاکٹر ہے۔ ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔“

رخشی نے فخر سے کہا۔ ”میری بیٹی جہاں جاتی ہے لوگوں کی ضرورت بن جاتی ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”جب آئے گی۔ جب ضرورت بنے گی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو۔ جہاز کا آخری مسافر بھی گزر گیا ہے۔ نہ بیٹی آئی ہے نہ بیٹا۔“

رخشی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کسی کو تو آنا چاہیے تھا۔ اس نے لندن سے روانہ ہوتے وقت فون پر کہا تھا کہ اسی فلائٹ سے آرہی ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”میں گھنچ ہال کی طرف جا کر دیکھتا ہوں۔ ان میں سے کوئی تو ضرور آیا ہوگا۔“

وہ ہول کی بالکونی سے نکل کے نیچے وزیٹر لابی میں آگئے۔ وہاں سے باہر آنے والے مسافروں کو دیکھتے گئے۔ بیٹا بیٹی نے آنے کا وعدہ کیا تھا، وہ یا تو نہیں آئے تھے یا پھر ماں باپ سے آنکھ مجھولی کھیل رہے تھے۔ معروف کو اپنا لگ رہا تھا جیسے صرف ماں باپ ہی نہیں بچے بھی اینارل ہیں۔

اس نے کہا۔ ”رحمان! دونوں نہیں آئے۔ کوئی ایک تو آ سکتا تھا۔ تمہارے بچے اینارل تو نہیں ہیں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ آچکے ہیں۔ ابھی گھنچ ہال سے نکلیں گے۔ تم دیکھ لیتا۔“

رخشی کے فون سے کال نکل سنا دی۔ وہ فحشی سی اسکرین کو دیکھتے ہوئے خوش ہو کر بولی۔ ”عدیلہ ہے...“

اس نے بن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہائے عادی! کہاں ہو تم؟“

وہ بولی۔ ”میں نہیں بتاؤں گی۔ آپ دونوں کی لڑائی سے میرا سر دکھنے لگتا ہے۔“

”بیٹی! ہم لڑائی نہیں کر رہے ہیں۔ تم آ کر دیکھ لو۔ تمہارے اکل معروف تجلی نہیں دیکھ سکتے آئے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”یہ فون اکل معروف کو دیں۔“

”تم ان سے کیا بات کرو گی یہاں آ جاؤ نا۔“

”نہیں۔ پہلے ان سے بات کروں گی۔“

”تم بہت ضدی ہو۔“

اس نے معروف کی طرف فون بڑھا کر کہا۔ ”جنا نہیں اس کے سر میں کیا سایا ہے۔ پہلے تم سے فون پر بات کرے گی۔“

معروف نے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو عدیلہ!“

اس نے سلام کیا۔ معروف نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے لندن کے ماحول سے آ کر سلام کیا ہے۔ خوش رہو بیٹی! کہاں ہو تم؟ یہاں آ تو گئی ہو نا؟“

”نہیں اکل! آپ سے کچھ ضروری باتیں کروں گی۔ پلیز ڈراما اور پاپا سے دور ہو کر باتیں کریں۔“

وہ ایک طرف گھوم کر ذرا دور جاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔ دور آ گیا ہوں۔ بولو۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ اپنی کار میں آئے ہیں یا ماں اور پاپا کے ساتھ ہیں؟“

”میں اپنی کار میں آیا ہوں۔“

”کہاں پارک کی ہے؟ اس کا نمبر کیا ہے؟“

ماروی

اس نے نمبر بتائے پارک کی جگہ بتائی پھر ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”ہماری بیٹی کچھ پڑا سرارین رہی ہے۔“

”ہاں اکل! ابھی آپ انجوائے کریں گے۔ جو کہتی ہوں وہ کریں۔ انکار نہ کریں۔“

”بھئی کیا کروں؟“

”آپ یہ فون ماں کو دیں۔ میں ان سے کچھ بولوں گی یعنی یہی کہ میں یہاں ان سے نہیں مل رہی ہوں۔ اپنی ایک سیکلی کے ساتھ جا رہی ہوں۔ آپ کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے ان سے الگ ہو جائیں۔ میں آپ کی کار کے پاس ملوں گی۔“

”آپ یہ فون ماں کو دیں۔ میں ان سے کچھ بولوں گی یعنی یہی کہ میں یہاں ان سے نہیں مل رہی ہوں۔ اپنی ایک سیکلی کے ساتھ جا رہی ہوں۔ آپ کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے ان سے الگ ہو جائیں۔ میں آپ کی کار کے پاس ملوں گی۔“

”بھئی میں تو تم سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ اگر اسی طرح ملاقات ہو رہی ہے تو یہی سبکی۔“

اس نے پلٹ کر واپس آ کر فون رخشی کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولنے لگی۔ رحمان نے پوچھا۔ ”یہ ہے کہاں؟ یہاں کیوں نہیں آرہی ہے؟“

رخشی نے فون پر کہا۔ ”کیوں سیکلی کے ساتھ جا رہی ہو؟ ہمیں نظر انداز کر کے ہماری اسلٹ کر رہی ہو۔ معروف صاحب کیا سوچیں گے۔“

وہ بولی۔ ”میں اکل سے معذرت کر چکی ہوں۔“

معروف نے کہا۔ ”رخشی...! میں مانٹو نہیں کروں گا۔ اسے سیکلی کے ساتھ جانے دو۔ مجھے بھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ مجھے اجازت دو۔“

اس نے رخشی اور رحمان سے مصافحہ کیا پھر وہاں سے چلتا ہوا عمارت کے باہر ایک جگہ اپنی کار کے پاس آ گیا۔ اس نے دور تک نظریں دوڑائیں پھر دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ کے دروازے کو آن لاک کر دیا۔

عدیلہ اور اس کے ماں باپ کچھ سمجھ میں نہیں پار رہے تھے۔ تقریباً چوبیس برس پہلے وہ بہت ہی ذہین اور بہت ہی مستقل مزاج تھے اور بڑی محنت اور اعتماد سے رہتے تھے۔ اس وقت ان کی نہ بیٹی ہوئی تھی نہ بیٹا ہوا تھا۔ اور نہ ہی وہ اینارل ہو کر مضحکہ خیز انداز میں جھگڑتے تھے۔

بڑی تہذیبی آئی تھی۔ اب ان میں وہ پہلے والی ذہانت اور خود اعتمادی نہیں رہی تھی۔ وہ جاہل غنوار میاں بیوی کی طرح ایسی بات پر لڑ رہے تھے کہ حیرت ہو رہی تھی۔

رحمان اپنی بیٹی کو ناپسند کرتا تھا اور اپنے بیٹے کو زیادہ چاہتا تھا۔ رخشی نے جس بیٹے کو جنم دیا تھا اس سے جیسے نفرت کرتی تھی۔ جب کہ کوئی بھی نارل رہنے والی ماں ایسا نہیں

بہت اچھی بات ہے۔“ اس نے نمبر بیچ کیے۔ پھر رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ”محبوب! ایک اچھی بات سنو ڈاکٹر عدیلہ ماروی کے معاملہ میں بہت ہی Serious ہیں۔ یہ ابھی آرہی ہیں۔ ہم اندازاً ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جائیں گے... اوکے؟“

محبوب نے خوش ہو کر کہا۔ ”اوکے...!“ اس نے فون بند کرتے ہوئے عدیلہ سے کہا۔ ”میری حیرانی دور کرو۔ تمہاری مام اور پاپا کی رائے تمہارے متعلق الگ الگ ہے۔ مام تمہیں بہت چاہتی ہیں اور پاپا تم سے بیزار نظر آتے ہیں۔“

وہ نقاب اور عبا اتارتے ہوئے بولی۔ ”پاپا کو بیٹی پسند نہیں ہے اور میں پیدا ہو گئی ہوں۔ وہ مجھے مجبوراً برداشت کر رہے ہیں۔“

”اور میں نے دیکھا ہے کہ تمہاری مام کو بیٹا پسند نہیں ہے جبکہ اسے اپنی کوکھ سے پیدا کیا ہے۔“ وہ کار کو دوسرے راستے پر موڑتے ہوئے بولا۔ ”اپنی کوکھ کی اولاد سے نفرت...؟ یقیناً نہیں آتا۔“

”وہ نفرت نہیں کرتی ہیں۔ بس اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ یہ کہہ لیں کہ اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔“ ”وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟“

وہ چپ رہ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ معروف نے اسے کن انکھوں سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”وہ تم سے بڑا ہے؟ یا تم پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ کچھ اس کے بارے میں بتاؤ۔“

وہ چپ تھی۔ اس کی نظریں ونڈ اسکرین کے پار جھی ہوئی تھیں۔ معروف نے پھر اسے سرگھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ ایکدم سے چپ ہو گئیں۔ کیا سوچ رہی ہو؟“

”سوچ رہی ہوں۔ آپ کے سوال کا کیا جواب دوں؟ آپ پوچھ رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟“ ”ہاں میں یہی پوچھ رہا ہوں۔“

وہ اس کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے بہت ہی دھیمی آواز میں بولی۔ ”وہ ہوگا تو آئے گا نا؟“

معروف نے چونک کر اسے دیکھا۔ فوراً ہی کار کی رفتار سست کی پھر پوچھا۔ ”کیا کہا تم نے...؟“ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”انکل...! میں مام اور پاپا کی ایک ہی اولاد ہوں۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“ ”آپ سے مام اور پاپا جو نہیں کہیں گے وہ کہہ رہی

ہوں۔ میری پیدائش کے بعد مام ماں بننے کے قابل نہیں رہیں تھیں۔ تب سے وہ دونوں کی قدر اپنا رٹل رہنے لگے ہیں۔“ معروف نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ”میں دیکھ رہا تھا ان کے اپنا رٹل ہونے کا کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ڈاکٹروں نے میری پیدائش کے بعد کہہ دیا تھا کہ وہ آئندہ ماں نہیں بن سکیں گی اور پاپا ایک بیٹا چاہتے تھے۔ وہ بیٹا جو پیدا نہیں ہوا اور نہ بھی ہوگا۔ وہ اسے میرے اندر دیکھتے ہیں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”کیا بتاؤں کہ اپنے ہی گھر میں کیسا تماشا بن گئی ہوں۔ وہ بچپن سے مجھے لڑکوں کا لباس پہناتے ہیں اور لڑکوں کی طرح بولنے کو کہتے ہیں۔ مام اعتراض کرتی آئی ہیں۔ میں لڑکی ہوں میری پرورش لڑکیوں جیسی کرتی آرہی ہیں۔“

”یہ سلسلہ بچپن سے ہے۔ میں کبھی عمر سے انہیں لڑتے جھگڑتے دیکھتی آرہی ہوں۔ پاپا لندن میں رہتے ہیں تو اپنے شاساؤں سے کہتے ہیں کہ ان کا بیٹا عادل رحمان پاکستان میں ہے اور پاکستان میں رہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بیٹا لندن میں رہ کر اردو بار سنبھال رہا ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”یہ تو اچھا ہی ہوا ہے کہ تم کلینکل سائیکولوجسٹ بن گئی ہو۔ اپنی مام اور پاپا کو آسانی سے ٹریٹ کرتی ہوگی۔“

”یہ جو میں نے ایئر پورٹ میں انہیں اپنی صورت نہیں دکھائی ہے اور آئندہ کئی گھنٹوں تک ان سے دور رہوں گی تو سمجھیں کہ یہ بھی ایک طریقہ علاج ہے۔“

میرے اس طریقہ کار کے نتیجے میں وہ سوچیں گے اور سمجھیں گے کہ لندن سے آنے والی بیٹی کیوں نہیں مل رہی ہے؟ وہ لڑائی جھگڑوں کو اپنی غلطیوں کو خود سمجھیں گے۔ میں ان لمحات میں ان کی بیٹی نہیں معالج ہوں۔“

”یہ وضاحت کر دوں کہ میرے مام اور پاپا دماغی مریض پانگل یا نیم پانگل نہیں ہیں۔ صرف ایک صدمہ ہے کہ کبھی ایک بیٹا پیدا نہیں کر سکیں گے۔ صرف اسی ایک پہلو سے اپنا رٹل ہیں ورنہ باقی تمام دنیاوی معاملات میں ذہین اور حاضر دماغ ہیں۔“

ان کی کار کو گھسی کے احاطے میں داخل ہوئی، سیکورٹی گارڈ نے انٹرکام کے ذریعہ اطلاع دی تھی۔ سمیرا اور محبوب نے باہر آ کر عدیلہ کا استقبال کیا۔ وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں ماروی چاچی اور میڈم روزی تھیں۔ سمیرا نے عدیلہ کو ان سے متعارف کرایا۔ عدیلہ نے

ماروی

بڑی اپنائیت سے ماروی کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے بڑے پیار سے نظر بھر کر دیکھنے لگی۔

وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر عدیلہ نے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری پیشین گوئی حسیں ہوگی اور میں کھلتے ہوئے گلاب کے ساتھ رہا کروں گی۔ مجھ سے دوستی کرو گی؟“

ماروی نے کہا۔ ”میں بچپن سے دوستی کرتی آرہی ہوں۔ جو بھی آتا ہے اسے نہ پہچانتے ہوئے بھی بڑے اعتماد سے دوستی کرتے لگتی ہوں۔ یہ میری چاچی بن گئی ہیں۔ یہ سمیرا ہیں۔ میری کنبلی بن گئی ہیں۔“

اس نے محبوب کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرے مہربان ہیں میرے سرپرست ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ مجھے چاہتے ہیں۔ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“ وہ عدیلہ کی طرف گھوم کر بولی۔ ”ان کے ایک ہم شکل ہیں بالکل ایسے ہی ہیں۔ وہ آئیں گے تو آپ دیکھیں گی ان میں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ چاچی میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔ یہ کہتی ہیں کہ میں اس ہم شکل مراد کی منگیتز ہوں۔ آج تم آئی ہو تو میں تمہاری بھی دوست بن جاؤں گی۔“

وہ بول رہی تھی۔ عدیلہ اس کی مترنم آواز اور لہجے کی محاسن کو سن رہی تھی پھر اس نے کہا۔ ”میں تم سے تنہائی میں بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ بہت سی باتیں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔“

”میرے پاس کہنے کے لیے صرف پانچ دن کی باتیں ہیں۔ اس سے پہلے یہ دنیا کہاں تھی؟ میں کہاں تھی؟ نہیں جانتی۔“

وہ اس کے ہاتھ کو تھپک کر بولی۔ ”میں تمہیں تمام بھولی ہوئی باتیں یاد دلاؤں گی۔ آؤ یہاں میرے پاس بیٹھو۔“

وہ دونوں ایک صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ عدیلہ نے محبوب سے پوچھا۔ ”کیا آپ اس کے سرپرست ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں اس حد تک سرپرست ہوں کہ دکھ سکھ میں کام آتا رہتا ہوں۔ ورنہ یہ چاچی متی ہیں۔ انہوں نے بچپن سے اس کی پرورش کی ہے۔ اب تک اسے ماں کا پیار دیتی آرہی ہیں۔ یہ ماروی کی زندگی کی ایک بات آپ کو بتا سکیں گی۔“

وہ چاچی سے بولی۔ ”میں یہاں کسی جگہ آپ سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ متی نے فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”میں حاضر

ہوں۔ ابھی میرے کمرے میں چلو۔“ عدیلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ضروری باتیں لوٹ کرنے کے لیے قلم اور سادے کاغذات کی ضرورت ہے۔“ معروف نے کہا۔ ”یہ چیزیں مل جائیں گی۔ پہلے کچھ ریفر-شمنٹ اور چائے ہو جائے۔“

”میں اسی کمرے میں چائے پیوں گی۔“ اس نے ماروی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”آؤ۔ آج سے تم میرے ساتھ رہا کرو گی۔ کیونکہ میں یہاں تمہارے ہی علاج کے لیے آئی ہوں۔“

ماروی نے صوفہ سے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی چاچی متی کے کمرے میں آ گئی۔ وہاں اس نے کمرے کی تمام چیزوں پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ماروی کا ہاتھ پکڑ کر قد آدم آئینے کے سامنے آ گئی۔

عدیلہ نو جوان صحت مند اور خوبصورت تھی۔ آئینے میں خود کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”قدرت نے ہمیں خوب سے خوب تر ہونے، بننے سنورنے اور گھرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ کیوں ماروی! ٹھیک کہتی ہوں نا؟ میری ہر بات کو سنا کرو۔ سوال بھی کیا کرو اور جواب بھی دیا کرو۔“

چاچی نے کہا۔ ”میں اسے سمجھیں سے دیکھتی آئی ہوں۔ عجیب لڑکی ہے آئینے کے سامنے نہیں جاتی۔ کبھی بال سنوارتے وقت آئینہ دیکھ لیتی ہے ورنہ ادھر نہ بھی نہیں کرتی۔“

عدیلہ نے کہا۔ ”عجب ہے۔ آئینہ تو ہر عورت کی ضرورت ہے۔ میں تو کہتی ہوں اگر آئینہ نہ ہو اور عورت کو اپنی صورت نظر نہ آئے تو وہ مر ہی جائے گی۔“

وہ ماروی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آئینے کے سامنے لا کر بولی۔ ”دیکھو تم کتنی حسین ہو؟ تمہارے سامنے حسینہ عالم بننے والیاں پھٹکی بڑ جائیں گی۔ اے...! میں تمہاری تعریفیں کر رہی ہوں۔ مسکراؤ۔ کیا تمہیں خوش نہیں ہو رہی ہے۔ فخر حاصل نہیں ہو رہا ہے۔“

ماروی نے اسے معصومیت سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”مجھے کیوں خوش ہونا چاہیے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ لڑکی جتنی حسین ہوتی ہے اتنے ہی اس کے چاہنے والے پیدا ہوتے ہیں۔“

ماروی نے پوچھا۔ ”بہت سے چاہنے والے...؟“ ”ہاں۔ جتنے چاہنے والے ہوتے ہیں عورت اتنی ہی زیادہ حسین کہلاتی ہے۔“

”چاہنے والا ایک نہیں ہوگا۔ کئی ہوں گے۔ تو یہ

مرا سر بے حیائی اور بے غیرتی ہوگی۔“
عدیلہ کو چپ لگ گئی۔ وہ ایسے مصوم سے جواب کی
کبھی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

پھر اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”ہر انسان
چاہتا ہے کہ اس کی تعریف ہوتی رہے اور لڑکیاں تو قدرتی
طور پر آرزو کرتی ہیں کہ جو دیکھے ان کی قدر کرے۔“
”میں تو ایسی آرزو نہیں کرتی۔“

چاچی نے عدیلہ سے کہا۔ ”بہن! یہ اور طرح کی لڑکی
ہے۔ مراد اسے بچپن سے چاہتا ہے یہ صرف اسی کی آرزو
کرتی ہے لیکن اسے بھی اپنا ہاتھ کبھی پکڑنے نہیں دیا۔“

عدیلہ نے اس کے قریب ہو کر کہا۔ ”ایک بار کوئی مرد
چھو لے تو تم بار بار اس کے ہاتھ کی گرفت میں آنا چاہو گی۔“
وہ بولی۔ ”میں نے ان پانچ دنوں میں صرف عورتوں
سے ہاتھ ملایا ہے اور یہ حیا کا تقاضا ہے۔ شادی سے پہلے
مجھے عورتوں کے ہی ہاتھوں میں رہنا چاہیے۔“

عدیلہ نے کہا۔ ”میں تمہاری طرح لڑکی ہوں۔ دو بار
تمہارا ہاتھ پکڑ چکی ہوں۔ کیا تم نے الگ سے کوئی بات
محسوس کی ہے؟“

ماروی نے انکار میں سر ہلایا۔ عدیلہ نے کہا۔ ”میں
ورزش کرتی ہوں۔ میرے ہاتھوں میں اور انگلیوں میں
لڑکیوں والی نزاکت اور نرمی نہیں ہے۔ کیا تم نے مردانہ
گرفت محسوس کی تھی؟“

اس نے مصومیت سے پوچھا۔ ”مردانہ گرفت کیسی
ہوتی ہے؟ میں نہیں جانتی پھر کیسے محسوس کرتی؟“

”دیکھو۔ تمہیں پچھلی زندگی کو یاد کرنا ہے۔ ابھی
باتیں کرتے وقت ذہن کے کسی گوشے میں جاتی رہو۔ کوشش
کرتی رہو کہ شاید کوئی بھولی ہوئی گرفت تمہیں یاد آ جائے۔“

وہ درست کہہ رہی تھی اسے یاد آ سکتا تھا کہ مراد نے
میں کوٹھ کے تھانے میں حوالات کے اندر رہ کر اس کا ہاتھ
تھام لیا تھا۔ محبوب گولیوں کی بوچھاڑ میں اسے بازوؤں میں
اٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ مردانہ لہجے سے اور ان کی گرفت سے آشنا
تھی۔ کلینکل سائیکولوجسٹ اسے صحیح سمت لے جا رہی تھی۔

کمرے میں ایک چھوٹی سی میز لائی گئی تھی، کاغذ قلم لا
کر رکھا گیا تھا۔ عدیلہ ماروی اور چاچی میز کے اطراف بیٹھ
گئی تھیں۔ چاچی شروع سے ماروی کی زندگی کے حالات
بیان کر رہی تھی۔ ایسے وقت عدیلہ سر جھکائے توجہ سے سن
رہی تھی اور اہم پوائنٹس نوٹ کرتی جا رہی تھی۔

محبوب، معروف اور سمیرا ڈرانگ روم میں منتظر

تھے۔ عدیلہ وہاں آتی تو وہ اس سے ماروی کی پہلی ریڈنگ
اور پہلی رپورٹ کے بارے میں بہت کچھ سن سکتے تھے۔
دو گھنٹے گزر گئے۔ سمیرا اور معروف وہیں بیٹھے بیٹھے فون کے
ذریعہ دفتری معاملات نمٹا رہے تھے۔ معروف عدیلہ کی
تعریفیں کر رہا تھا۔ محبوب اور سمیرا اسے کہہ رہا تھا کہ وہ ماروی
کے معاملے میں بڑی دلچسپی سے وابستہ ہو گئی ہے۔

وہ انہیں بتا رہا تھا کہ کس طرح عدیلہ نے طیارے
سے اتر کر اپنے ماں باپ کو بھی اپنی صورت نہیں دکھائی
ہے۔ بہت شوخ اور چنچل ہے۔ سیدھی یہاں آ کر اپنا کام
شروع کر چکی ہے۔

واقعی اس کی یہ مصروفیات ان سب کو متاثر کر رہی
تھیں۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد عدیلہ ڈرانگ روم میں
آئی۔ اس کے پیچھے ماروی اور چاچی تھیں۔ محبوب نے اسے
جھکی جھکی نظروں سے ایسے دیکھا جیسے برسوں بعد دیکھ رہا ہو۔
تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اسے دوری سے دیکھتا آ رہا
تھا۔ قریب ہونے والی کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔

عدیلہ نے ایک صوفہ پر بیٹھتے ہوئے معروف کو سمیرا کو
اور محبوب کو دیکھا پھر کہا۔ ”میں ماروی کی ہسٹری سن رہی
ہوں۔ چاچی نے پوری تفصیل سے اس کے بچپن اور جوانی
کی ایک ایک بات بتائی ہے اور میں اہم باتیں نوٹ کر چکی
ہوں لیکن۔۔۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اس نے محبوب کو
دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ایک جوان لڑکی کی زندگی میں کبھی چوری
چھپے کبھی مٹھی مٹھی رازداری سے پیار میرے واقعات یا چند
لحظات کیسے گزر جاتے ہیں یہ چاچی یا کوئی دوسرے بزرگ نہ
دیکھ سکتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔“

وہ محبوب سے بولی۔ ”میں ابھی تنہائی میں آپ سے
کچھ باتیں کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔“

محبوب نے ماروی کو دیکھا۔ پھر عدیلہ سے
پوچھا۔ ”مجھ سے...؟ آپ مجھ سے کیا بات کریں گی؟“

”میری معلومات کے مطابق ماروی کے پہلے عاشق
مراد علی سنگی ہیں اور دوسرے آپ ہیں۔“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ مگر میں ماروی کے متعلق شاید کوئی
ایسی بات نہیں بتا سکوں گا جو۔۔۔“

عدیلہ نے بات کاٹ کر کہا۔ ”آپ پریشان کیوں
ہو گئے؟ کیا اس لیے کہ جب یہ مراد سے جیل میں ملنے کے بعد
واپس جا رہی تھی تو آپ اسے اغوا ہونے سے نہ بچا سکے؟“

اس بات پر سمیرا اور معروف نے ایک دوسرے کو

ماروی

چور نظروں سے دیکھا۔ (انہوں نے اسے اغوا کر لیا تھا۔)
عدیلہ نے محبوب سے پوچھا۔ ”کیا آپ جانتے ہیں
کہ ماروی کو کس نے اغوا کیا تھا۔ یہ چاچی اور چاچا کے ساتھ
کہاں ٹھوکریں کھاتی رہی تھی اور کس طرح واپس آئی ہے؟“

یہ ایسے سوالات تھے جن کے جوابات سے بیدار
جاتا کہ سمیرا اور معروف نے ماروی کو محبوب سے دور کیا تھا۔ وہ
ان دنوں پر اعتماد کا دھڑکا رہا تھا اور یہ عجیب و غریب وقاداری تھی کہ
انہوں نے اعتماد کو قائم رکھتے ہوئے اسے دھوکا دیا تھا۔

معروف نے صوفہ پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔
”عدیلہ! تمہاری پیشین گوئی کمزوری میں جھٹلا ہے۔ تم اس کی
گمشدہ یادداشت واپس لانے کے لیے ایک اچھی ابتدا کر رہی
ہو۔ لیکن ماروی کے اغوا سے یادداشت کا کیا تعلق ہے؟“

وہ بولی۔ ”بڑا ہی رومانٹک تعلق ہے۔ انسانی نفسیات
یہ ہے کہ جوانی کے رنگین و سنگین لحظات ہماری زندگی میں
زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ویری ویری سوری۔ آپ
بوزھے ہیں اور میں جوانی کے حوالے سے بات کر رہی
ہوں۔ آپ یہ سمجھیں کہ دماغ کمزور ہو۔ یادداشت بحال نہ
ہو رہی ہو تو ایسے میں جوانی کا کوئی طوقانی لمحہ حافظے کی
چنگاری کو رکھنے سے نکال کر بھڑکا دیتا ہے۔“

سمیرا اور معروف نے پھر چور نظروں سے ایک
دوسرے کو دیکھا۔ عدیلہ نے کہا۔ ”میں ابھی چاچی سے
ماروی کی بہت ہی دلچسپ ہسٹری سن رہی تھی۔ اس کی روداد
یہاں آ کر رک گئی ہے کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا؟“

پھر یہ اغوا کی جانے والی اپنی چاچی چاچا سے کیسے مل
گئی؟ پھر یہ خفہ دار کے علاقہ تک جا کر واپس آنے لگی تو وہ
مراد اس کے پاس کیسے پہنچ گیا؟ جو ابھی جیل میں ہے؟“

وہ نوجوان خوبصورت سی ڈاکٹر اور ماہر نفسیات اپنی جگہ
سے اٹھ کر ٹھٹھنے کے انداز میں ان سب سے ذرا دور گئی۔ پھر
وہاں رک کر ان سب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بولی۔

”انسان مرجائے تو اس کے لیے ساری دنیا مرجاتی ہے۔
اس کی اچھائی برائی اس کی شرافت و ذلالت اور اس
کے تمام راز و نیاز قبر میں سوجاتے ہیں۔“

وہ ٹھٹھنے کے انداز میں واپس آتے ہوئے
بولی۔ ”کہتے ہیں کہ گڑے مردے نہ اکھاڑو۔ اُن کی ہڈیاں
بھی بول اٹھتی ہیں۔“

وہ ماروی کو دیکھ کر بولی۔ ”یہ کتنی خوبصورت، کتنی
پیاری سی ہستی ہے۔ اسے دیکھو تو دیکھتے رہنے کو جی چاہتا
ہے۔ آج اس کا دماغ بھولی ہوئی یادوں کا قبرستان بن چکا

ہے اور۔۔۔“ اس نے سب پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر
کہا۔ ”اور اس قبرستان سے گڑے مردے نکالے جائیں
گے تب ہی اس کی یادداشت واپس آئے گی۔“

وہ بڑے محسوس دلائل کے ساتھ بول رہی تھی اور وہ
سب خاموشی سے سن رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ”ماروی تمام
بیدار بھی کھول سکتی تھی لیکن افسوس...! کیا کیا جائے یہ
ناموافق حالات کے اندر میرے میں بیٹھی ہوئی ہے۔“

چاچی نے اتنا بتایا ہے کہ کسی نامعلوم شخص نے ان
سے اور چاچا سے فون پر کہا تھا کہ ماروی کی عزت آبرو اور
سلامتی چاہتے ہو تو ہالی وے پر آ جاؤ۔ وہ تمہیں زندہ
سلامت ملے گی۔

اور واقعی ماروی انہیں وہاں مل گئی تھی۔ ان تینوں کو
تاکید کی گئی تھی کہ کراچی واپس نہ آئیں۔ لہذا وہ بس میں بیٹھ
کر آگے ریتی کی طرف چلی گئیں۔“

اس وقت چاچی سر جھکائے کبھی معروف کو اور کبھی سمیرا
کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے عدیلہ کو ماروی کی ہسٹری سناتے
وقت اس حد تک سچ کہا تھا کہ کسی نے انہیں ماروی کے ساتھ
کراچی سے جانے کو کہا تھا۔ جس نے کہا تھا اس کا نام نہیں
بتایا تھا۔

عدیلہ نے کہا۔ ”مسٹر محبوب! کس نے ماروی کو آپ
سے دور کیا ہوگا؟ اور دور کر کے اس نے کیا فائدہ اٹھایا ہوگا؟ کیا
آپ کو معلوم ہے؟ اگر نہیں تو آپ کو معلوم کرنا چاہیے۔“

”میں ڈاکٹر ہوں۔ یہ صرف میرا ہی نہیں آپ کا بھی
فرض ہے کہ حقائق معلوم کریں۔ ماروی کو یہ حقیقت اور اسی
طرح کی بھولی ہوئی دوسری باتیں یاد دلائیں۔“

محبوب صوفہ پر ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔
”حقیقت یہ ہے کہ ماروی یہاں میری سرپرستی میں رہ کر
بدنام ہو رہی تھی۔ وہ اتنی گھبراہٹ مٹی کہ میری لاعلمی میں مجھ
سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانا کر
کہیں جانے سے روک رکھا تھا۔“

وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ چلی گئی۔ عقل
کہتی ہے کہ وہ خود نہیں گئی تھی۔ کیونکہ سمیرا اس کے ساتھ
تھی۔ اغوا کرنے والے اسے بیہوش کر کے ماروی کو لے
گئے تھے۔ ابھی چاچی کے بیان سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ
انہیں فون کر کے ہالی وے پر بلانے والوں نے پہلے سمیرا کو
بیہوش کیا تھا پھر ماروی کو لے گئے تھے۔“

سمیرا نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اس کے سر
سے الزام ٹل رہا تھا۔ محبوب نے کہا۔ ”میں یہ معلوم کرنا ہوگا

کہ کس نے ماروی کو اغوا کر کے اسے مجھ سے دور کیا تھا؟ ماروی تو اسے اچھی طرح جانتی ہوگی۔ اب ہمیں جاننے کے لیے اس کی یادداشت کے بحال ہونے تک انتظار کرنا ہوگا۔“

عدیلہ کے فون سے کانگ ٹون سنائی دی۔ اس کی مام کال کر رہی تھی۔ وہ کال اٹینڈ نہیں کرتا جانتی تھی۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور مٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”یس مام؟“

”ماں نے پوچھا۔ کہاں ہو؟ کیوں پریشان کر رہی ہو؟“

”جب تک آپ دونوں بیٹی اور بیٹے کے معاملے میں الجھتے رہیں گے میں دور دور رہوں گی۔“

وہ فون کو کان سے لگائے وہاں سے اٹھ کر ان سب سے دور چلی گئی۔ اس بار باپ کی آواز سنائی دی۔

”بیٹے! میں وعدہ کرتا ہوں۔ نہ ہم ابھیں گے نہ تمہیں الجھائیں گے۔ آ جاؤ۔“

ماں کی آواز سنائی دی۔ ”بیٹی! میں وعدہ کرتی ہوں تمہاری موجودگی میں رحمان سے جھگڑا نہیں کروں گی۔“

”میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔ یقین کرو اپنے بیٹے کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

وہ دونوں اسے یقین دلارہے تھے کہ اس کے لیے مسئلہ نہیں بنیں گے اور اپنے اپنے طور پر اسے بیٹی اور بیٹا بھی کہتے جا رہے تھے۔

آخر والدین تھے ان سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے میں آ رہی ہوں۔“

ادھر سے باپ نے کہا۔ ”مجھے بھی کہو کہ آ رہے ہو۔“

وہ پریشانی سے ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”یس پاپا! میں آ رہا ہوں۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ ان سب کے قریب آتے ہوئے محبوب سے بولی۔ ”میں آپ کے پندرہ منٹ چاہتی ہوں پھر اپنے گھر جاؤں گی۔ محبوب نے اٹھ کر کہا۔ ”آئیں۔ ہم ادھر ہی وی لاؤنج میں بیٹھیں گے۔“

وہ اس کے ساتھ لاؤنج میں آ کر ایک صوفہ پر بیٹھ گیا۔ عدیلہ نے کہا۔ ”ماروی کی یادداشت واپس لانے کے لیے آپ اور ماروی اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔“

”آپ مجھے بتائیں کہ کیا کرنا ہے وہ ہر حال میں کروں گا۔“

اس نے کہا۔ ”چاچی نے ماروی کی جو ہسٹری سنائی ہے۔ اس کے مطابق مراد بیٹی میں ہے۔“

”انشاء اللہ وہ آج سے تیسرے یا چوتھے دن رہائی پا کر آئے گا۔ وہ بھی ماروی کی بہتری کے لیے وہی کرے گا جو

آپ علاج کے طور پر چاہیں گی۔“

”فی الحال تو آپ اپنی اور ماروی کی لوائسٹری سنائیں۔“ وہ ہنکچاتے ہوئے بولا۔ ”ایسی تو کوئی لوائسٹری نہیں ہے۔ میری محبت ایک طرف ہے۔ میں اسے دیوانہ وار چاہتا ہوں اور وہ مراد کی دیوانی ہے۔“

وہ ہمدردی سے بولی۔ ”so sad تمہارا دل دکھتا ہوگا۔“

”بالکل نہیں۔ عشق نے سکھایا ہے کہ معشوق کو خوش دیکھتے رہنے سے پیار کی جگی مسرتیں ملتی ہیں اور یہ بالکل درست ہے۔ میں بہت سرور رہتا ہوں۔“

”پھر بھی آپ ماروی کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اپنے طور پر کوششیں کرتے ہوں گے۔“

”دنیا کہتی ہے کہ میں نے اسے جیتنے کے لیے کوشی کار اور بینک بیلنس دیے ہیں اور خدا جانتا ہے۔ میں نے مراد کی غیر موجودگی میں سہارا بننے کے لیے اسے تحفظ اور سلامتی دی ہے۔“

خدا مجھے موقع پرست نہ بنائے۔ میں نے ماروی کو دباؤ میں لانے کے لیے بھی اس پر احسان نہیں جتایا ہے۔ ایک بھوپاری کی طرح یہ معاہدہ نہیں کیا ہے۔ ایسی کوئی شرط عائد نہیں کی ہے کہ وہ میری منکوحہ بنے گی تو میں اسے تحفظ اور سلامتی دوں گا اور اس کے مراد کا مقدمہ لڑتا رہوں گا۔ خدا کا شکر ہے۔ میں ان تمام آزمائشی مراحل سے گزر چکا ہوں۔ وہ رہائی پا کر آنے والا ہے پھر وہ میرا محتاج نہیں رہے گا۔“

”یہ آپ کی شرافت اور نیکیاں ہیں لیکن ان باتوں سے اس کے علاج میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ آپ اس سے عشق کرتے ہیں اس سے انکار نہیں ہے۔ مجھے تو اس کے ساتھ ہونے والی ایسی کوئی بات کوئی ایسا واقعہ بتائیں جو ٹریسٹ کے دوران ماروی کے دماغ کو چھو سکے۔ اس کی یادداشت کو ایک ذرا بیدار کر سکے۔“

اس نے ایک ذرا سوچا پھر کہا۔ ”ایک بار ایسا ہوا کہ دشمن ماروی کو مار ڈالنا چاہتے تھے۔ اس پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ میں اسے بازوؤں میں اٹھا کر وہاں سے نکال لایا تھا۔“

”کیا پہلی بار اس کے قریب آئے تھے؟“

”نہیں پہلے بھی اس کی قربت اس طرح حاصل ہوتی رہی کہ ہمارے درمیان فاصلہ قائم رہا۔ اس روز پہلی بار میں نے اسے چھو لیا تھا۔ بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔“

”کیا آپ وہ لمحات بھی بھلا سکتے ہیں؟“

”کبھی نہیں۔ اس وقت بھی بول رہا ہوں تو میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی ہیں۔“

”کیا آپ عورتوں سے مصافحہ کرتے ہیں؟“

”پاکستان سے باہر یورپ اور امریکا میں وہاں کے باجول کے مطابق مصافحہ کرتا ہوں۔“

”مردوں اور عورتوں کے مصافحہ کی نرمی اور سختی واضح طور سے محسوس کرتے ہیں؟“

”ہاں فرق صاف ظاہر ہوتا ہے۔“

وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ”مجھ سے مصافحہ کریں۔“

اس نے عدیلہ کے دعوت دینے والے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر مصافحہ کے طور پر اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بولی۔ ”محسوس کریں۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ کیا میرے بدن کی نزاکت اس ہاتھ کے لمس میں ہے؟“

”ہاں ہے۔ مگر...“

وہ سوچنے اور محسوس کرنے لگا۔ پھر بولا۔ ”میں اسے مردانہ سختی تو نہیں کہوں گا لیکن مضبوطی ہے۔ نزاکت نہیں ہے۔“

”میں اپنی باڈی کو پرفیکٹ رکھنے کی کوششیں کرتی ہوں۔ ہاتھوں کی اور انگلیوں کی بھی ورزش کرتی ہوں۔ اس لیے انگلیاں ایک ذرا سخت ہیں۔“

”پلیز وضاحت کریں کہ آپ کے ان ہاتھوں کا ماروی کے علاج سے کیا تعلق ہے؟“

”تعلق یہ ہے کہ آپ اسے بازوؤں میں اٹھا کر لے گئے تھے۔ آپ کے بازوؤں کی مردانہ گرفت اب بھی اس لڑکی کے تحت اشعر میں چھپی ہوگی۔ اگر میں بھی سائیکو ڈراما کروں گی اور آپ اسے اپنی گرفت میں لیں گے تو اسے آپ کی پہلی گرفت ضرور یاد آئے گی۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”سوری۔ وہ مراد کی امانت ہے۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں اور اس سے جنون کی حد تک پیار کرتا ہوں گا لیکن اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔“

عدیلہ نے اسے حیرانی سے دیکھا پھر کہا۔ ”آپ عجیب قسم کے عاشق ہیں۔ بلکہ بے مثال عاشق ہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی لیکن... ماروی سے جنون کی حد تک عشق کا دعویٰ ہے تو اس کی بہتری کے لیے آپ کو وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ ”ابھی تو مجھے جانا ہے۔ مام اور پاپا انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ ڈرائنگ روم میں آ کر ان سب سے رخصت ہونے لگی۔ محبوب وہاں آ کر ماروی کو دیکھنے اور سوچنے

لگا۔ عدیلہ نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دل کو گتے والا حکم دیا تھا کہ ماروی کے علاج کی خاطر کبھی کسی ڈرامائی سچویشن میں اسے چھوٹا ہوگا، اسے اپنی گرفت میں لینا ہوگا۔

ادھر عدیلہ نے ماروی سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”جانے کو تو جی نہیں چاہتا۔ مگر جانا ہوگا۔ کل سے صبح دس بجے آیا کروں گی اور رات دس بجے تک رہا کروں گی۔“

ماروی نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت میں دیکھا۔ پھر کہا۔ ”آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

عدیلہ نے کہا۔ ”ہاں آؤ۔ ادھر چلو۔“

وہ دونوں دوسروں سے ذرا دور ہو گئیں۔ ماروی نے کہا۔ ”آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہا تھا کہ کبھی کوئی تہذیبی محسوس کروں تو آپ کو فوراً بتاؤں۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”ہاں بولو۔ کیا محسوس کر رہی ہو؟“

”آپ نے چاہتی کے کمرے میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا تھا، کیا میں نے مردانہ گرفت محسوس کی ہے؟“

”تم نے محسوس نہیں کی تھی۔“

وہ بولی۔ ”اس وقت محسوس نہیں ہوئی تھی پھر میں نے وہاں سے یہاں تک کئی گھنٹوں کے بعد اچانک ہی آپ کے لمس کو یاد کیا تو ایک ذرا تہذیبی محسوس کی۔ تعجب ہے ایسی مضبوطی محسوس کی جو عورتوں کے ہاتھوں میں نہیں ہوتی۔“

عدیلہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”یعنی میرے ہاتھوں میں نسوانی نزاکت نہیں ہے۔“

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”شاباش! سوچ ذرا بھی تبدیل ہو۔ احساسات کچھ نئے نئے سے لگیں تو فوراً مجھ سے بولا کرو۔ میں جاری ہوں۔ کل آؤں گی۔“

وہ باہر آ کر محبوب کی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور اسے گھر پہنچانے جا رہا تھا۔

☆☆☆

رختی آرام وہ کرسی پر بیٹھی سوچ میں گم تھی۔ وہ کرسی اسے ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔ اس کی سوچ کی طرح اسے آگے پیچھے لے جا رہی تھی۔ بیٹی نے فون پر کہا تھا کہ ابھی آ رہی ہے۔

تصور میں بیٹا دکھائی دے رہا تھا۔ جبکہ اسے دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ لیکن تنہائی میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بدن سے لڑکیوں والا لباس اتر رہا تھا اور لڑکوں والا لباس اسے بیٹا بنا رہا تھا۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو وہ بیٹی بھی تھی اور بیٹا بھی

تھا۔ کیونکہ ماں نے ایک ہی اولاد کو جنم دیا تھا۔ دوسری کوئی اولاد نہیں تھی جو بھی تھی وہی بیٹی اور بیٹا بن جایا کرتی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک کمرے میں رحمان کیپوٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے سے مائیں پر اس کا بیٹا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ باپ گراٹک کے ذریعہ اسے بیٹی بنا رہا تھا۔ اس کے بدن کے ایک ایک حصے کی ایڈیٹنگ کر رہا تھا۔

وہ کیا تھی؟ وہ کون تھا؟ عدیلہ رحمان یا عادل رحمان؟ کار کا ہارن سنائی دیا۔ وہ آگئی۔ وہ آگیا۔؟ وہ اپنے کمرے میں رہا۔ ماں نے آکر بیرونی دروازے کو کھولا۔ وہ شانے سے بیگ لٹکائے کھڑی تھی۔ ماں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چوم کر گلے سے لگایا۔ پھر کہا۔ ”تم بیٹی بن کر آگئیں۔ دل خوش کر دیا۔ اب اپنے پاپا کے پاس جاؤ۔“

وہ اس کمرے سے گزر کر ایک کوریڈور میں آئی۔ وہاں باپ کھڑا تھا۔ وہ بولی۔ ”ہائے پاپا۔۔۔!“ وہ دوسری طرف منہ پھیر کر بولا۔ ”تمہیں معلوم ہے میں تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ میرے بیٹے بن جاؤ۔“ وہ آگے بڑھ کر سامنے والا دروازہ کھول کر کمرے میں گئی۔ عبدالرحمان دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے شانے سے بیگ کو اتار کر ایک طرف پھینکا۔ پھر باپ کو دیکھتے ہوئے بلاؤز اتارنے لگی۔ دیکھا جائے تو یہ سراسر بے حیائی تھی۔ لیکن حیائی کوئی بات ہوتی تو بے حیائی ہوتی۔ اس نے بریسٹ فارم والے بریزر کو اتار تو وہاں سینہ سپاٹ تھا۔ وہ لڑکی نہیں تھی۔ لڑکا تھا۔ عدیلہ نہیں تھی۔ عادل رحمان تھا۔ عبدالرحمان نے آگے بڑھ کر اسے پیار کیا پھر گلے سے لگالیا۔ کیونکہ وہ بیٹی نہیں تھی، پیدا انہی طور پر بیٹا تھا۔

اب یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ ایٹارل افراد کا گھرانہ ہے۔ تیس برس پہلے عبدالرحمان نے رخصتی سے شادی کی تھی۔ پھر اولاد کے انتظار میں چھ برس گزار دیے۔ انہیں مایوسی ہوئی رہی کہ شاید کبھی ایک بچے کے بھی ماں باپ نہیں بن پائیں گے۔

رحمان دل و جان سے رخصتی کو چاہتا تھا۔ بچے پیدا کرنے کے لیے اس پر سوکن نہیں لانا چاہتا تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر انتظار کر رہا تھا۔ آخر ان کی محبت رنگ لائی۔ ایک روز لیڈی ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی کہ رخصتی ماں بننے والی ہے۔ دونوں میاں بیوی خوشی سے جیسے پاگل ہو گئے۔ رخصتی شروع سے کہتی آرہی تھی کہ اسے بیٹی کا شوق ہے اور رحمان کہتا تھا کہ بیٹا ہونا چاہیے۔ اب اولاد متنازعہ ہو گئی کہ کیا

ہو۔۔۔؟ بیٹی یا بیٹا۔۔۔؟

جب ماں بننے کے آثار پیدا ہوئے تو وہ بولی۔ ”میں اپنی حسرت پوری کروں گی۔ پہلے بیٹی پیدا کروں گی۔“ وہ بولا۔ ”نہیں تمہیں بیٹا پیدا کرنا چاہیے۔ پہلے بیٹا ہوگا تو جلدی جوان ہو کر کاروبار سنبھالے گا۔“ وہ بولی۔ ”بیٹا برس دو برس بعد بھی ہوگا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پہلے بیٹی ہونی چاہیے۔ بیٹی سے گھر میں رونق ہوتی ہے۔ وہ ہنستی ہے تو اس کی شرمیلی ہنسی سے سات سروں کی برسات ہوتی ہے اس کی اداؤں سے پھول کھلتے ہیں اور اس کے حسن و جمال سے رنگ بکھرتے رہتے ہیں۔“

وہ اپنی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ رحمان نے ایک ننھے سے بچے کی تصویر بیڈ کے سامنے والی دیوار پر لگا لی تاکہ رخصتی سوتے جاگتے ایک بیٹے کی تصویر دیکھتی رہے اور اس نفسیاتی حربے کے باعث ایک بیٹا پیدا کرے۔ رخصتی نے اس بچے کے برابر ایک خوبصورت سی بیٹی کی تصویر لگا دی۔ صرف اتنا ہی نہیں کیپوٹر اور موبائل فون کے وال پیپر بھی وہی بیٹی نظر آنے لگی۔ بیٹی اور بیٹے کے لیے ان کا یہ دیوانہ پن دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے سمجھایا اولاد کے معاملے میں اتنے کریزی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جنون بڑھتا رہے گا تو بیٹی ہو یا بیٹا اس کی زندگی پر برا اثر پڑے گا۔

ڈاکٹر کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ واقعی جنون اس قدر بڑھ گیا تھا کہ زوجگی کا کیس بگڑ گیا۔ بچہ پیدا ہی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بعد میں میجر آپریشن کے ذریعہ ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ یہ قدرتی مجبوری تھی۔ وہ خود کو سمجھاتی اس بار نہ سہی دوسری بار بیٹا ہوگا۔ لیکن یہ ڈاکٹری رپورٹ بڑھ کر اس کے دل پر بجلی گر پڑی کہ وہ آئندہ ماں نہیں بن سکے گی۔

آئندہ بیٹی پیدا کرنے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ وہ ماں بن ہی نہیں سکتی تھی۔ اس ناکامی و نامرادی نے اسے ذہنی مریض بنا دیا۔

وہ اپنے حواس میں نہیں رہتی تھی۔ بچے کو دیکھ کر کہتی تھی کہ وہ بیٹی ہے۔ ابتدا میں اسے نارمل رکھنے کے لیے اس کی ہاں میں ہال ملائی گئی کہ وہ بیٹا نہیں بیٹی ہے۔

چند ماہ بعد رخصتی نے تسلیم کیا کہ وہ بیٹا ہے۔ لیکن اسے بیٹی بنا کر رکھے گی۔ رحمان نے اعتراض کیا اور کہا۔ ”یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی پرورش مرد بچے کی طرح ہونی چاہیے۔“

وہ اصولاً درست کہہ رہا تھا۔ لیکن پرورش کی ذمہ داریاں تو ماں پر ہوتی ہیں۔ باپ تو کمانے کے لیے گھر سے باہر رہتا ہے۔ رحمان کا رو باری دورے پر گھری گھری جاتا

ماروی

تھا۔ وہ اس آکر ایک گڑیا جیسی بیٹی کو پونی ٹیل اور لڑکیوں کے رنگ رنگ لباس میں دیکھتا تھا۔ جھنجھٹاتا تھا پھر اس کا لباس بدل کر اسے بیٹا بناتا تھا۔

وہ ماں کے ساتھ لڑکیوں کے انداز میں بولتا تھا اور بڑی اداؤں سے لہرا کر چلتا تھا۔ رحمان اسے اپنی طرح بولنا اور چلنا پھرنا سکھاتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں اسے اپنے مزاج اور اپنی پسند کے مطابق ڈھالتے رہتے تھے۔ لیکن باپ کی کلاس کھٹے دو کھٹے رہتی تھی۔ وہ چلا جاتا تھا۔ ماں کا اسکول دن رات کھلا رہتا تھا۔ اسے ایک لڑکی کے مزاج میں ڈھالنے کی پکی تربیت ہو رہی تھی۔

دو یا تین برس کی عمر میں ہی یہ بات ذہن نشین ہو گئی کہ وہ لڑکی ہے۔ اس کے ذہن میں نسوانی حسن اور نزاکت رچ بس گئی تھی۔ ماں سمجھاتی تھی کہ وہ غلطی سے لڑکے کے جسم میں سا گئی ہے۔ وہ جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتا گیا۔ یہ تسلیم کرتا گیا کہ اصل حسن و جمال عورتوں میں ہوتا ہے۔ ساری دنیا مرد کو پتھر اور عورت کو پھول کہتی ہے۔ دیکھنے والی ہر آنکھ عورت کا ہی حسن دیکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ دیکھے جانے والی اور داد حاصل کرنے والی چیز بن چلا گیا۔

وہ اپنے چہرے اور جسم کو حسین اور دلنشین بنائے رکھنے کے جدید مراحل سے گزرتا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں ماں اسے ہر پہلو سے گائیڈ کرتی رہتی تھی۔ کئی ماہر نفسیات لیڈی ڈاکٹر کی بھی خدمات حاصل کرتی رہی تھی

جوانی میں موٹھیں ڈاڑھی نکھنے والی تھیں۔ اس سے پہلے رخصتی اسے Feminizing hormones نامی دوا کھلایا کرتی تھی۔ یوں بھی اس کی جلد بچکتی تھی۔ ہال برائے نام تھے۔ اس دوا کے اثر سے بالکل ہی ختم ہو گئے۔ اپنے جسم میں نسوانی نزاکت اور نرمی پیدا کرنے کے لیے بازار میں کئی طرح کی فیمینی نائزنگ ڈرگس دستیاب ہیں وہ ان کے ذریعہ رفتہ رفتہ تبدیل ہوتا رہا تھا۔ اور باپ کی پریشانیاں بڑھتی رہی تھیں۔ اس نے بیٹے سے پوچھا۔ ”کیا تم سچ سچ دل سے اور دماغ سے عورت بن گئے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”نوپا! میں مرد ہوں مرد ہی رہوں گا۔“ ”پھر تم سر سے پاؤں تک لڑکی بن کر کیوں رہتے ہو؟“ ”نوپا! میں علم نفسیات کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ آپ کو یہ بتاؤں کہ انسان میں کسی کو چاہنے کی اور کسی سے چاہے جانے کی خواہش رہتی ہے۔ میرے اندر چاہے جانے کی

خواہش زیادہ ہے۔ میں چاہتا ہوں سب ہی مجھ پر صدمے ڈالی جائیں۔“ وہ ایک ادا سے ہاتھ نچا کر بولا۔ ”اور آپ تو جانتے ہیں کہ ساری دنیا نسوانی حسن اور اس کی اداؤں پر مرمی رہتی ہے۔ جب میں عدیلہ بن کر باہر جاتی ہوں۔ کسی محفل میں پہنچتی ہوں تو کتنے ہی مرد مجھ سے دوستی کرنے کے لیے بگل جاتے ہیں اور میں یہ کہہ کر انہیں مایوس کر دیتی ہوں کہ میرا آئیڈیل کوئی اور ہے۔“ ”کیا کبھی کسی کو شہ نہیں ہوتا ہے کہ تم ایک لڑکے ہو؟“ ”آج تک کسی کو ایک ذرا سا شہ نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا۔“ ”آخر یہ نائنگ کب تک کرتے رہو گے؟“ ”یہ نائنگ نہیں ہے۔ میں تو ساری زندگی ایسی ہی رہوں گی۔ میرا مطلب ہے رہوں گا۔ آپ کے سامنے مجبور ہو کر لڑکوں کی طرح بولنا پڑتا ہے۔“

رحمان نے بڑے صدمے سے کہا۔ ”میرے بیٹے۔۔۔! کیا میرے پوتے پوتیاں نہیں ہوں گے؟ کیا میں اپنی آئندہ نسل کو کھلتے پھولتے بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔“ اس نے باپ کے دکھ کو سمجھا پھر کہا۔ ”کئی بار میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ شادی نہیں کروں گا۔ اولاد نہیں ہوگی تو آپ صدمے سے ٹوٹے رہیں گے۔ پاپا! میں آپ کو بہت چاہتا ہوں۔ آپ کی خوشی پوری کرنے کے لیے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میرا دل کسی لڑکی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ جبکہ میں لڑکیوں کے جھوم میں رہتا ہوں۔“

رخصتی دروازے پر کھڑی باپ بیٹے کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کمرے میں آکر بولی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی بیٹا بن جائے۔ لیکن کروڑوں کی جاکداد اور کاروبار سنبھالنے کے لیے پوتی اور پوتے ضروری ہیں۔“ وہ بیٹے کے پاس بیٹھ کر بولی۔ ”تمہیں اتنی جھوٹ ضرور دوں گی کہ تم ایک بھولا ڈور عبدالرحمان کی نسل آگے بڑھاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”یہاں لندن سے پاکستان تک یہ جھوٹ بولا گیا ہے کہ میں عدیلہ ہوں اور میرا ایک بھائی عدیل لندن میں ہے۔“

اسے سچ ثابت کرنے کے لیے میں دو برس پہلے عدیل رحمان بن کر پاکستان گیا تھا۔ لیکن میں تو مستقل طور پر عدیلہ ہی بن کر رہوں گا کیونکہ میں نے کلینکل سائیکولوجسٹ کا ڈپلومہ عدیلہ رحمان کے نام سے حاصل کیا ہے۔ عدیلہ ہی کے نام سے مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے اور آپ بھی مجھے عدیلہ بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔“

رختی نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اور کیا تم ہمیشہ میری بیٹی بن کر رہنا نہیں چاہتی؟“

”چاہتی ہوں۔ یہی روپ میرے دل و دماغ میں میری رگ رگ میں سا گیا ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں ہے کہ تم ہاں بیٹی کیا چاہتی ہو۔ رختی! مجھ پر اتنا احسان کرو کہ اسے کچھ عرصہ تک بیٹا بن کر بھولانے دو۔ یہ مجھے ایک پوتا اور ایک پوتی دے اور بس۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہوں گا۔“

رختی نے کہا۔ ”ایسا بڑی رازداری سے ہوگا۔ یہ جس لڑکی کو پسند کرے گا۔ اسے اپنی رازدار بنا کر ہمارا بیٹا عادل رحمان بن کر اس سے شادی کرے گا اور اولاد پیدا کرے گا۔“

رحمان نے کہا۔ ”ایسا ہو سکتا ہے صرف ہماری بہو کو معلوم ہوگا کہ اس گھر میں کوئی بیٹی عدیلہ نہیں ہے۔ صرف عدیلہ ہے۔“

صرف رختی کے ذہنی مریض بن جانے سے وہاں خلاف فطرت باتیں ہو رہی تھیں۔ اس مریض نے بیٹے کو دنیا کی نظروں میں بیٹی بنا دیا تھا۔ وہ اسکول سے لے کر ماہر نفسیات کی سند حاصل کرنے تک بیٹی ہی بن کر رہا تھا۔

وہ لندن سے پاکستان تک کی سوسائٹی میں اور دور کے رشتے داروں میں عدیلہ رحمان ہی تھا۔ عادل رحمان کو کبھی کبھی کسی نے ماں باپ کے ساتھ لندن یا پاکستان میں دیکھا تھا۔ وہ بھی ضرورتاً عارضی طور پر بیٹا بن جایا کرتا تھا۔ یہ تانک برسوں سے کھیلا جا رہا تھا۔

عبدالرحمان بعض اوقات جھنجھلا جاتا تھا۔ وہ بھی غصہ میں اپنا ریل ہو جاتا تھا اور کہتا تھا۔ ”تمہاری بیٹی تمہیں مبارک ہو۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میرا صرف ایک بیٹا ہے۔“

اور وہ بیٹا گھر کی چار دیواری میں عادل رحمان بن کر باپ کو خوش کر دیتا تھا۔ باپ بھی بڑے اعتماد سے کہتا تھا۔ ”تمہاری ماں تمہیں کچھ بھی بنا ڈالے۔ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم تو وہی رہو گے جو خدا نے تمہیں بنایا ہے۔“

بہر حال رختی نے یہ سمجھوتا کیا کہ عبدالرحمان کے وارثوں کو جہنم لینا چاہیے۔ اس نے وعدہ کیا کہ بہو آئے گی تو اس کے سامنے بیٹے کو عدیلہ نہیں کہا کرے گی اور بیٹا کو شش کرنے لگا کہ جلد ہی کوئی لڑکی اسے پسند آجائے۔ اس نے دو چار لڑکیوں کی طرف مائل ہونے کی کوشش کی

پھر پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ خود پر جبر کر رہا ہے۔ اس کے اندر کسی شریک حیات کی طلب نہیں ہے۔ وہ بحیثیت ایک لڑکی کسی جاننے والے کا طلب گار نہیں تھا۔ اسے خسران نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ مرد پیدا ہوا تھا۔ مرد ہی تھا۔ ماں نے اسے ایک نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ اب شادی کرنے کا مرحلہ آیا تو پریشان ہو رہا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے دل کو جبراً کسی لڑکی کی طرف مائل کرنا ہوگا۔ ورنہ اس خاندان میں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ اپنی نسل بڑ جانے کی خاطر اسے کچھ عرصہ تک مرد بن کر کسی منکوحہ کے ساتھ ازدواجی دن رات گزارنے ہوں گے۔

وہ خود کو اندر سے اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ شادی کے بعد ازدواجی لحاظ گزار سکے گا۔ ان دنوں وہ ایک منیٹل اسپتال میں انٹرنی کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہاں ایک نرس جولی اسے بہت اچھی لگی۔ اس نے پہلے اس سے دوستی کی پھر اس سے بے تکلف ہونے لگا۔ اس نے جولی کو ایک بار سینے سے لگا کر یقین کیا۔ اس کے سینے میں ایک مرد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اُدھر جولی کچھ پریشان ہو گئی۔ جلدی سے الگ ہو کر بولی۔ ”تمہاری قربت سے ڈر بھی لگتا ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔“

اس نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ ”میری جان...! مجھے بتاؤ۔ اچھا کیوں لگتا ہے؟“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”میں کیا بتاؤں؟ مجھے شرم آتی ہے۔“

اس کے شرمانے کی ادا میں ایسی دلکشی تھی کہ وہ اور زیادہ اس کا طلب گار بن گیا۔ اس کے قریب آ کر اس سے لگ گیا۔ وہ پیچھے ہٹ کر دیوار سے لٹی ہوئی بولی۔ ”پلیز مجھ سے دور رہو۔“

اس نے جھک کر پوچھا۔ ”قریب کیوں نہ رہوں؟“

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کچھ ہو رہا ہے۔“

وہ اس کے پیچھے پڑ گیا۔ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسے کیا ہو رہا ہے؟ اس نے ضد کی۔ ”کچھ معلوم تو ہو کیا ہو رہا ہے؟“

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”ابھی تم نے سینے سے لگایا تو میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں اپنے آنیڈیل کے بازوؤں میں آ گئی ہوں۔“

اس نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”میری جان...! آنکھیں بند کرو۔ پھر وہی جادو جگاؤں گا۔“

وہ بھی اُجھن میں تھی۔ معلوم کرنا چاہتی تھی کیا یہ پھر سینے سے لگائے گا تو پھر وہی جذبہ پھیل چائیں گے؟

کی گھنٹی میں پلا دی تھی۔ وہ خود کو پیدا انہی طور پر عدیلہ سمجھتے ہوئے بڑے مزے سے لائف انجوائے کر رہا تھا۔

دوسری بات یہ کہ جولی نے اسے ایک بیٹی کا باپ بنا کر مرد ہونے کا سٹیٹمنٹ دیدیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح صرف ایک لڑکی نہیں رہا تھا۔ اسے مرد بننے کا بھی چسکا پڑ گیا تھا۔ اس کے دل میں آئندہ ازدواجی زندگی گزارنے کی خواہش نہیں تھی۔ لیکن اب کبھی کبھی لڑکی کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ عدیلہ رحمان بن کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اسی نام سے اس نے ایک ڈاکٹر اور سائیکولوجسٹ ہونے کا ڈپلومہ حاصل کیا تھا اور اسی نام سے وہ مستقبل میں ساجی و معاشرتی زندگی گزار سکتا تھا۔ لہذا وہ مستقل مرد بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ اب تک بڑے مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔ بہت خوش تھا۔ عدیلہ بہن اور عدیلہ سہیلی بن کر خوب انجوائے کر رہا تھا اور کبھی کبھی کسی من پسند سہیلی کے ساتھ سیلا بھی بن جایا کرتا تھا۔

اور اب... اب وہ عادل، وہ ڈاکٹر عدیلہ پاکستان آ کر گڑ بڑا گئی تھی۔ اس کی نئی پیشنت گڑ بڑ کر رہی تھی۔ اس کے اندر یہ ہلچل پیدا کر رہی تھی کہ ایسی ہستی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا چاہیے۔ وہ مرد ہے اسے اب مرد بن کر رہنا ہوگا۔

اس نے نسل بڑھانے کی خاطر جولی کو ضرورتاً پسند کیا تھا۔ لیکن ماروی کسی ضرورت کسی طلب اور کسی خواہش سے پہلے ہی اس کے مردانہ احساسات پر دستک دے رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بجے تھے۔ ماروی اپنے کمرے میں تھامی۔ اپنے بیڈ پر لیٹی چھت کو تنگ رہی تھی۔ کمرے میں زیر و پاور کی مدھم مدھم روشنی تھی اور اس کی یادداشت کے خانے میں زیر و پاور تو کیا ایک جگہ کی لحاظی روشنی بھی نہیں تھی۔

موجودہ خالی ذہن میں جو سوچ آتی تھی۔ سامنے جو کچھ دیکھتی تھی اسی کو سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ چاچی کے ساتھ بیٹھنی ٹی وی پر ایک ڈراما دیکھ رہی تھی۔ ڈراما کی ہیروئن فضیلہ اس کی طرح ایک سیدھی سی ان پڑھ اور دیہاتی لڑکی تھی۔ اس کی زندگی میں ایک چاہنے والا نوجوان شیرازی آتا ہے اور اس سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔

فضیلہ شرم و حیا کے باعث اس سے کتراتے ہیں۔ اس

وہ سرگوشی میں بولا۔ ”آنکھیں بند کرو۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کے اُبلے تھمتاتے ہوئے چہرے پر ٹپک گیا۔ بڑے پیار سے اس کے لبوں پر اتر گیا۔

جولی حیرانی سے ذرا کسمسائی۔ ایسے جادو کی حملے کے باوجود اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ان لحاظات میں دماغ نے سمجھایا آنکھیں نہ کھولنا ورنہ جادو بھاگ جائے گا۔

اس کنواری کے لیے واقعی جادو کی لحاظات تھے۔ ایسا سحر طاری ہو رہا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر ڈاکٹر عدیلہ کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

اس نے ایک کان کو چومتے ہوئے پوچھا۔ ”میری جان جولی...! مجھ سے محبت کرو گی؟“

وہ ایک ہائے کے انداز میں بولی۔ ہائے ہائے ہاں۔“

”میری رازدار بن کر رہو گی۔ میں اپنی زندگی کا ایک بہت اہم راز تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے لگتا ہے میرا آنیڈیل مجھے مل گیا ہے۔ میں تمہارے راز کو اپنی دھڑکنوں کی طرح چھپا کر رکھوں گی۔“

”تو پھر آنکھیں کھولو۔ میں تمہاری طرح لڑکی نہیں ہوں۔ ایک مرد ہوں۔“

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بولا۔ ”میرے بلاؤ ز اور اسکرٹ کو نہ دیکھو۔ میں عدیلہ نہیں عدیل ہوں۔“

اس نے اپنی مختصر سی ہسٹری اسے بتائی۔ جولی اس کی رازدار بننے پر راضی ہو گئی۔ وہ ایک یتیم لڑکی تھی اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ چٹ مگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق کورٹ میرج کے بعد عبدالرحمان کی بہو بن کر لندن والے بنگلے میں آ گئی۔ پھر دو برس کے اندر ہی اس نے باپ بننے کی سند حاصل کر لی۔ رختی کی برسوں کی تمنا پوری ہو گئی۔ وہ خود تو بیٹی پیدا نہیں کر سکی تھی۔ اسے ایک پوتی مل گئی تھی۔

یہ سب کچھ تین برسوں میں ہوا۔ تیسرے برس جولی کچھ عرصہ بیمار رہ کر وفات پا گئی۔ اب اس کی بیٹی تین برس کی تھی اور لندن کی ایک چھٹی نرسری میں پرورش پا رہی تھی۔

جھوٹ اور فریب کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ عادل رحمان عدیلہ بن کر اتنی دور نکل گیا تھا کہ ہمیشہ عادل بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔

اس سلسلے میں دو باتیں اہم تھیں ایک تو یہ کہ اسے خود عدیلہ کی شخصیت بچپن سے پسند تھی۔ ماں نے یہ شخصیت اس



لاوا

بابر نعیم

محبت اور یادیں ہر زندہ انسان کے لیے کسی آکسیجن سے کم نہیں ہوتیں... عمر کا کوئی بھی حصہ ہودل میں قیمتی لمحات کی گمشدگی پر ایک کسک سی ضرور محسوس ہوتی ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی موڈ پر آنے سامنے کھڑے تھے۔

حال کے آئینے میں ماضی کے بکھرے ٹکس درگس

اس بوڑھے نے اپنی بیوک ایک خوب صورت مکان کے سامنے پارک کر دی اور کار کا انجن بند کرنے کے بعد پیسیجر سیٹ پر رکھے ہوئے خست اخبار پر نظریں جمادیں۔ وفات کی اطلاع کی حاشیہ بردار خبر اسے اپنی طرف گھورتی محسوس ہوئی۔

مکان کے ڈرائیوے میں ایک اکلوتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ بے شک اس وقت وہاں لوگوں کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ تدفین کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔

شام کو عدیلہ کے جانے کے بعد سمیرا اور معروف چلی گئے۔ کہا تھا انہیں بھی اپنے گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔ محبوب نے بڑی حسرت سے ماروی کو دیکھا تھا۔ دل اس سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ ایک ہی صحت کے لیے ساتھ رہنے والا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اب سے پہلے وہ قریب نہ رہتے ہوئے بھی اس کی بدنامی کا باعث بن چکا تھا۔

اس نے کہا۔ ”میں کل دن کے دس بجے عدیلہ کو یہاں لاؤں گا۔ یوں ماروی کی خیر خیریت بھی معلوم کروں گا۔“ سمیرا نے کن انکھوں سے ماروی کو دیکھا پھر کہا۔ ”آپ کو دن میں ایک بار یہاں آنا چاہیے۔“ وہ بولا۔ ”کیا حرج ہے؟ دو بار آ جاؤں گا۔ رات دس بجے عدیلہ کو اس کے گھر پہنچاؤں گا۔“

معروف نے کہا۔ ”اس طرح تم دو بار یہاں آؤ گے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ کام ہمارے ڈرائیور کا ہے۔“ معروف نے قریب آ کر اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”میری بات کو سمجھو جو کام ڈرائیور کا ہے اسے ڈرائیور کو کرنے دو، اپنی شخصیت کو ہلکا نہ کرو۔ پھر یہ کہ مراد کو آنے دو۔ دونوں مل کر یہ طے کرو کہ تم میں سے کس کو کتنی بار یہاں آنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عدیلہ بہتر مشورے دے گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ کل صبح ڈرائیور عدیلہ کو یہاں لائے گا۔ میں اسے رات کو واپس پہنچانے یہاں سے جاؤں گا۔ آپ درست فرماتے ہیں، عدیلہ محتاج ہے۔ ہمیں اس کے مشوروں کے مطابق چلنا چاہیے۔“

اس نے ماروی پر ایک الوداعی نظر ڈالی پھر سمیرا اور معروف کے ساتھ چلا گیا۔ جب سے اس کی یادداشت کم ہوئی تھی۔ تب سے مراد پہلے اس کے سامنے آیا تھا پھر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد محبوب آتا تھا پھر چلا جاتا تھا۔ وہ انہیں دوسرے دن تک بھول جایا کرتی تھی۔ لیکن پہلی بار... ہاں پہلی بار عدیلہ کے جانے کے بعد اسے نہیں بھول رہی تھی۔ پہلی بار کسی نیم مرد نے ہی کسی اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ جیت اسی کی ہوتی ہے جو چھو لیتا ہے۔

وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو تھام کر دیکھ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔ اس کی نئی زندگی میں نئی یادوں میں وہی ایک ہاتھ اسے چھو کر گیا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

سے دور دور رہتی ہے۔ ایک بار شیرازی اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ وہ شرماتی ہے گھبراتی ہے پھر فوراً ہاتھ چھڑا کر چلی آتی ہے۔ لیکن... لیکن تنہائی میں اس کے ہاتھوں کی گرفت کو محسوس کرتی ہے۔ بہت بے چین ہوتی ہے۔ رات کو بستر پر... کروٹیں بدلتی ہے۔

ایسے وقت ماروی اس کی بے چینی کو محسوس کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ایک مرد چھو لے تو پتا نہیں کیا ہونے لگتا ہے؟

ماروی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے چورا احساسات ہوتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آتے اور بے چین کرتے رہتے ہیں۔

ابھی وہ صرف پانچ دنوں کی کوری کنواری لڑکی تھی۔ ماضی میں کیا ہوا تھا۔ بھول گئی تھی۔ ان پانچ دنوں میں چاچی اور سمیرا نے اسے ہاتھ لگایا تھا کوئی اپنا یا پر اپنا اسے چھوئے نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود ڈرائیور کی کھینچنے کے دوران ایک بار ڈاکٹر عدیلہ اس کے تصور میں جھلکی تھی پھر کم ہو گئی تھی۔

اب اس نے ڈراما کی ہیروئن فزیلہ کو تصور میں دیکھا۔ پہلے تو وہ کروٹیں بدل رہی تھی پھر اس نے اپنے اس ہاتھ کو دیکھا جسے شیرازی نے تھام لیا تھا۔ وہ ابھی ہوئی تھی اس نے اپنے اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تھام کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لیا۔ پھر ذرا سی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

ماروی حیران ہو گئی۔ یہ کیا جادو ہوتا ہے اس ہاتھ نے شیرازی کے کس نے اسے سلا دیا تھا۔ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ ایک چاہنے والا چھو لے تو رت جگا ختم ہو جاتا ہے اور نیند آ جاتی ہے؟

ڈاکٹر عدیلہ نے جس ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ ماروی نے اسے اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا پھر اسے اپنی دھڑکنوں پر رکھ لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے کی خاموشی اور نیم تاریکی میں لمحات گزرنے لگے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عدیلہ کے کس نے جادو نہیں جگایا تھا۔ فزیلہ کی طرح اسے نہیں سلا یا تھا۔

ماروی سوچ میں پڑ گئی پھر سمجھ گئی کہ فزیلہ کو ایک مرد کی گرفت نے متاثر کیا تھا۔ جادو مرد کا چلتا ہے۔ عدیلہ عورت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی گرفت عورتوں سے کچھ الگ سی تھی لیکن وہ عورت ہی تھی۔ اس کی گرفت جادو جگانے والی نہیں تھی۔

چل جھوٹ

منظر امام

بعض اوقات زندگی ختم ہو جاتی ہے اور نہ ختم ہونے والی یادیں رہ جاتی ہیں لہذا بہت ضروری ہے کہ زندگی کے یادوں میں ڈھل جانے سے قبل یادوں کے احاطے میں کچھ اچھی باتیں محفوظ ہو جائیں تاکہ حالات کے گھٹن زدہ لمحات کی انیت خوشگوار احساس کے لبائے میں قید رہے... یہی سوچ ان کے دلوں میں تلاطم برپا کیے ہوئے تھی تب ہی وہ ایک منظر بار بار سب کو دھوکا دے رہا تھا۔

بند نشوں میں قید محبت کا اعادہ اور قریب انداز

میں نکلا اظہار



میری بیوی کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی۔
میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں یہ بیان دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“
”اس لیے کہ آپ میری قدر نہیں کرتے۔“
”تو پھر کون تمہاری قدر کرتا ہے؟“

بوڑھے نے نظریں جھکا کر وحشی آواز میں کہا۔
”اکیاون سال، سات مہینے اور گیارہ دن بعد۔“
”یہ تو اچھی خاصی مدت ہے۔“ بوڑھی عورت نے کہا۔ ”حیرت ہے تمہیں کیا چیز یہاں پہنچ لائی؟“

بوڑھے نے یوں محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہتے ہوئے شرمارہا ہو۔ ”میرین، میں نے یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دینے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن ناکام رہا، اب میں یہ بات زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں نے اپنی زندگی میں اس بات کا اظہار نہیں کیا تو میری روح اگلے جہان میں بھٹکتی پھرے گی۔ بات یہ ہے میرین کہ جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو اسی وقت تم سے محبت ہو گئی تھی۔ ہم نے جو بھی لمحات ساتھ گزارے وہ میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میں تمہیں کبھی یہ نہیں بتا سکا کہ اس دور میں، میں حقیقت میں کیا محسوس کرتا تھا۔ اس لیے کہ میں اس وقت نو عمر تھا..... اور میرا خیال ہے کہ میرے اندر وہ حوصلہ بھی نہیں تھا۔“ یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی آنکھ سے ایک آنسو بہہ نکلا اور اس کے رخسار پر آگیا۔ ”آخر میں میری کیفیت اس گمشدہ بچے کی سی ہو گئی تھی جو اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ مار رہا ہو۔ تمہیں کھو کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ جو بات میں تم سے پہلے بھی نہ کہہ سکا تھا وہ آج کہنے آیا ہوں۔ میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے، میرین۔ تم سے اور صرف تم سے! اور ہمیشہ! اور میں یہ بات کہے بغیر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب میرے دل کو قرار آ گیا ہے۔ اب میں اطمینان سے مر سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر بوڑھے نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور پلٹ کر تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔
بوڑھی میرین کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس نے اپنی محبت کے اظہار میں بہت دیر لگا دی۔ اس کی نگاہیں اسی بوڑھے پر جمی ہوئی تھیں جو لنگڑااتا ہوا ڈرائیو سے گزر کر اپنی بیوک کار میں سوار ہو رہا تھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور پلٹ کر میرین کی طرف دیکھے بغیر اتنی تیزی سے اپنی کار آگے بڑھائی کہ اس کے تاثر چرچرا اٹھے۔

میرین دیر تک کھڑی خالی نگاہوں سے اس راہ کو بکھتی رہی۔



بوڑھے نے زبان پر انگلیاں پھیرتے ہوئے انہیں گھبراہٹ اور سر کے اڑتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں جھادیا۔ پھر عتیق نشست پر رکھی ہوئی گلابی رنگ کے پھولوں کی ٹوکری اٹھائی اور کار سے اتر کر آگے چل دیا۔

دروازے پر پہنچ کر وہ کئی سیکنڈ کھڑا رہا پھر دروازے پر دستک دی۔ ایک نوجوان عورت نے دروازہ کھولا۔ پھولوں کی ٹوکری پر نگاہ پڑتے ہی اس عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“ اس نے ملائم لہجے میں پوچھا۔
”میں نے کلین کی وفات کے بارے میں سنا۔ میں قتل تو نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرین کے ساتھ چند خیالات شیئر کرنے کی ضرورت ہے۔ سو میں حاضر ہو گیا۔“

”اندر آجائیں۔“ نوجوان عورت نے اسکرین ڈور کھولتے ہوئے کہا۔ ”میں ان کی نو اسی کیرن ہوں۔ میں انہیں آپ کی آمد کی اطلاع کرتی ہوں، مسٹر.....؟“
بوڑھے نے منہ ہی منہ میں اپنا نام بڑبڑایا اور پھر بولا۔ ”میں میرین کا ایک پرانا دوست ہوں۔“
”اچھا ہوا آپ گزرتے ہوئے یہاں رک گئے۔ میں تانی کو لے کر آئی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ نوجوان عورت زینے سے اوپر چلی گئی۔

بوڑھے نے پھولوں کی ٹوکری داخلی دروازے کے قریب موجود میز پر رکھ دی اور پھر ساکت کھڑا ہو گیا۔
اسے اوپری منزل سے آوازیں سنائی دیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ پھر قالین پر کسی شے کے گرنے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی ایک بلند آواز سنائی دی۔

برسوں گزرنے کے باوجود اس نے وہ آواز پہچان لی۔ وہ میرین کی آواز تھی بالآخر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی جو دھیرے دھیرے زینے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ پھر ایک دبلی پتلی بوڑھی عورت زینے سے نیچے اترنے لگی۔ اس کی نظریں بوڑھے پر جمی ہوئی تھیں۔ جب وہ نیچے آگئی تو بوڑھے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ ”اوہ خدا یا، یہ تم ہو۔“
وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ہم کتنے عرصے بعد مل رہے ہیں؟“

”ہے ایک آدمی۔“ اس نے اٹھلاتے ہوئے بتایا۔
”میں جب بھی باہر نکلتی ہوں، وہ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔“
”میرا خیال ہے کہ وہ کباڑیا ہوگا۔ پرانی چیزوں کا بیوپاری۔“
”آپ تو خیر ایسی باتیں کریں گے۔“ راحیلہ نے کہا۔
”لیکن یہ مذاق نہیں ہے۔ وہ شخص مجھے گھور گھور کر دیکھتا رہتا ہے اور دیکھنے میں بھی بد معاش معلوم ہوتا ہے۔“
”اچھا۔“ اب میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”کہاں کھڑا رہتا ہے؟“

”اسکول سے کچھ فاصلے پر۔“ راحیلہ نے بتایا۔
راحیلہ اسکول میں فجر بھی اور اسکول چونکہ قریب تھا۔ اس لیے پیدل ہی آیا جایا کرتی تھی۔ وہ میری بیوی تھی اور میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ کسی کی نگاہیں اس کی طرف لگی رہیں۔

میں تو خیر اس سے مذاق کرتا تھا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی کے تین برسوں کے بعد بھی وہ شادی شدہ نہیں معلوم ہوتی تھی، اس کے چہرے پر ہلاکی ملاحظہ تھی۔ اکثر لوگ اسے دیکھ کر رک جاتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ کوئی ہاتھ دھو کر پیچھے ہی پڑ جائے۔

دوسری صبح میں خود راحیلہ کو پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ گیا۔ اسکول کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک درخت تھا اور وہ شخص اسی درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ راحیلہ نے اشارے سے بتایا کہ یہ وہی آدمی ہے۔

وہ واقعی ایک بد معاش صورت آدمی تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ اس سے ڈر کر خاموش رہا جائے۔ راحیلہ نے اسکول کے گیٹ کے پاس پہنچ کر مجھ سے کہا۔ ”دیکھیں۔ آپ اس سے جھگڑا مت کیجئے گا۔“

”نہیں، تم بے فکر رہو، میں کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف واچ کرتا رہوں گا۔“

اس دن میں نے دفتر سے چھٹی کر لی تھی۔ اسکول ختم ہونے سے پہلے میں راحیلہ کو لینے اسکول پہنچ گیا۔ وہ آدمی اسی طرح اس درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

جب راحیلہ گیٹ سے باہر نکلی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ کم بخت راحیلہ کو دیکھے جا رہا تھا، اس کی نگاہیں راحیلہ پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔

”دیکھ لیا آپ نے۔“ راحیلہ نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”کس طرح دیکھ رہا ہے۔ خدا کرے اندھا

ہو جائے۔“
”راحیلہ، یہاں قدم قدم پر ایسے لوگ ملتے ہیں۔ ہم کس کس سے جھگڑا کریں گے۔ تم یہ بتاؤ اس نے بھی تم سے کچھ کہا تو نہیں۔“
”نہیں۔ کہا تو کچھ نہیں۔ بس دیکھتا رہتا ہے۔“ راحیلہ نے بتایا۔

”تو پھر دیکھنے دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے۔“
”نہیں، میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔“

”برداشت تو خیر میں بھی نہیں کر سکتوں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے خلاف کیا ایکشن لیا جائے۔ وہ تو صاف اٹکار کر دے گا کہ وہ دیکھتا ہی نہیں ہے۔ ایکشن اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی طرف سے کوئی قدم اٹھایا جائے۔“

راحیلہ خاموش ہو گئی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ فی الحال تو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ راحیلہ اسکول جاتی رہی اور وہ اسے دیکھتا رہا۔

پھر ایک دن راحیلہ نے بتایا۔ ”آج..... آج اس نے ایک قدم آگے بڑھا دیا ہے۔“
”وہ کیا؟“

”اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔“
یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ صرف دیکھتا ہی رہتا تو نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ لیکن بات کرنے، مخاطب کرنے کی کوشش..... یہ ایک خطرناک حرکت تھی۔

”کیا کہا تھا اس نے؟“ میں نے پوچھا۔
”اس نے باقاعدہ آواز دی تھی۔ کہہ رہا تھا محترمہ! ذرا بات سنیں۔“

”کیا تھا اس کا لہجہ، بد معاشوں والا؟“
”نہیں، بد معاشوں والا تو نہیں تھا۔“ راحیلہ نے بتایا۔ ”اس نے بہت مہذب اور شریف آدمیوں کی طرح آواز دی تھی۔“

”ارے بھائی۔ تو پھر اس میں کیا پریشانی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تم اسے نظر انداز کر کے اپنا راستہ لو۔ ہاں، اس کا لہجہ خراب ہو یا وہ کوئی اور حرکت کرے تو پھر پریشانی کی بات ہے۔“

”پھر بھی، کسی غیر عورت کو اس طرح آواز دے کر بلانا کوئی اچھی حرکت تو نہیں ہے۔“

اس پر میں نے راحیلہ کو ایک طویل لیکچر دے ڈالا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس دور میں اپنی عزت اور شرافت

بچانے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی نظر انداز کرنا سکھ لے۔ ورنہ پاگل ہو کر رہ جائے۔ کیونکہ یہاں ہر قدم پر ایسے ہی لوگ ملتے ہیں۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ راحیلہ نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ البتہ اتنا ضرور بتاتی رہی تھی کہ وہ آدمی اسی طرح کھڑا رہتا ہے اور مخاطب کرنے کی کوشش بھی کر چکا ہے۔ میں نے راحیلہ کو پھر صبر کرنے اور نظر انداز کروینے کی تلقین کی۔

میرا رویہ اس سلسلے میں ایسا اس لیے ہو رہا تھا کہ میں اس شہر میں بے شمار واقعات دیکھ چکا تھا اور سن چکا تھا کہ اس قسم کے غنڈے شریفوں کی زندگی کس طرح عذاب بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

ایک بار پھر وہی واقعہ یاد آ گیا۔ جو اکثر یاد آ کر رہتا تھا اور میں کئی بار اپنے دوستوں کو سنا چکا ہوں۔

میں جب میٹرک کر کے پہلی بار کالج گیا تو کلاس روم میں استاد نے ہم سب لڑکوں کو انگریزی کا ایک لفظ لکھنے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یاد رکھو، جس کی بھی Spelling غلط ہوگی۔ اسے کلاس سے باہر کر دیا جائے گا۔

اتفاق سے پوری کلاس میں سے صرف دو ایسے تھے جن کی Spelling درست تھی۔ باقی سب نے غلط لکھا تھا۔ اس پر استاد نے کہا۔ ”چونکہ چالیس لڑکوں میں سے صرف دو نے صحیح لکھا ہے۔ اس لیے پوری کلاس کو تو ہم باہر نہیں نکال سکتے لیکن وہ دونوں کلاس سے باہر چلے جائیں۔“

پھر انہوں نے سمجھایا کہ ہمارا معاشرہ ایسا ہو گیا ہے کہ یہاں صحیح انسان کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسی لیے اس معاشرے سے باہر نکل جانا چاہیے یا نظر انداز کر دینا چاہیے۔ تو اس وقت میں یہی کر رہا تھا۔

میں برداشت کر رہا تھا۔ کیونکہ میں ایک طرف تو یہ جانتا تھا کہ اس قسم کے بد معاش لوگ جب بد معاشی پر اتر آئیں تو بہت براہ کھڑی کر دیتے ہیں اور دوسری طرف یہ اطمینان تھا کہ اس قسم کے لوگ صرف اسی حد تک جاسکتے ہیں۔

وہ بد معاش جو کچھ اور کرنا چاہتے ہوں، مثال کے طور پر اغوا وغیرہ۔ وہ اتنی دیر نہیں لگاتے کہ ہفتوں کھڑے دیکھتے رہیں اور ایک دن ہمت کر کے سلام کر لیں۔ یہ معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا تھا اسی لیے مجھے اطمینان تھا۔

ایک دن راحیلہ نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”سن لیا آپ نے۔ وہ بد معاش اب میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔“

”کیا؟“ اس بار میں واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ ”کیا

پہلی گولی

ایک سینما ہال میں پاکستانی پنجابی فلم چل رہی تھی۔ ایک سین میں ولن کی ماں بندوق لے کر آتی ہے۔ ولن ایک تیار کی عزت لوٹنے کے لیے اس پر حملہ کرتا ہے۔ ولن کی ماں بندوق سیدھی کر کے ولن کو گولی مار دیتی ہے۔ پھر بڑے فخر سے گردن اکڑا کے کہتی ہے۔ سن دے بے غیرتا..... پہلی گولی تینوں ایس لٹی ماری اے..... تے دو جھی گولی ایس لٹی نہیں ماری کہ توں..... اتنا کہہ کر ولن کی ماں خاموش ہو جاتی ہے۔ ولن سینہ تمام کے نیچے گر جاتا ہے اور غیرت مند ماں سے سوال کرتا ہے۔ جھپتی دس ماں۔ تو دو جھی گولی میوں کیوں نہیں ماری۔

سن دے بے غیرتا..... دو جھی گولی تینوں ایس لٹی نہیں ماری..... ماں پھر خاموش ہو جاتی ہے۔

وَلن پھر سوال کرتا ہے۔ دس دی کیوں نہیں ماں۔ توں میوں دو جھی گولی کیوں نہیں ماری؟

وَلن کی ماں فخر سے سینہ تان کر کہتی ہے۔ کن کھول کے سن دے بے غیرتا..... دو جھی گولی تینوں ایس لٹی نہیں ماری۔ بندوق اچ صرف اکو ای گولی سی۔

مرسلہ: بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور

بات ہوئی تھی۔ پوری بات بتاؤ۔“

”میں اپنے راستے پر واپس آ رہی تھی کہ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔“

”اور کیا کیا اس نے؟“

”یہ کہہ رہا تھا کہ آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”تو پھر۔ پھر کیا ہوا؟“

”ہونا کیا ہے۔ میں اس سے کترا کر آگے نکل آئی۔“

”تمہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس قسم کے لوگوں کو لفظ نہیں دینی چاہیے اور ویسے بھی یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی کچھ کہنا چاہتا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی کوئی ضروری بات کرنی چاہتا ہو۔“

حکیم الاولیا

ضیائیم بگرا می

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو ایک مخصوص درجہ اور اپنے قرب سے سرفراز کیا اسی طرح ولیوں میں بھی کچھ کی جگہ اتنی بلند ہے کہ دوسرے اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے جنہیں اللہ نے ایک خاص مقام عطا کیا اور حکیم الاولیا کا لقب ملا۔ آپ کے رہنما استاد محترم حضرت خضر علیہ السلام تھے تو کیسے آپ کے علم میں تشنگی باقی رہ جاتی... آپ ایسے کامل ولی تھے جن کے علوم سے خلقِ خدا نے انتہا فیض پایا۔

ہر آزمائش میں پورے اترنے والے اللہ کے خاص بندے کا دلگداز ماجرا



ترمذ کے شیخ محمد بن علی نے اپنے دو ساتھیوں میں سے ایک کو بتایا کہ تینوں کو حصولِ تعلیم کی خاطر بغداد اور ایسے ہی چند دوسرے شہروں کا سفر کرنا چاہیے۔ یہ تجویز محمد بن علی کی تھی۔ ایک دوست نے کہا: ”اگر ہم تینوں یہیں ترمذ میں رہ کر تعلیم حاصل کریں تو کیا خرچ ہے؟“ آپ نے جواب دیا: ”خرچ تو کوئی نہیں، یہاں بس ایک ہی خرابی ہے، وہ یہ کہ بغداد اور دوسرے شہروں میں جیسی یگانہ

”آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔“

”را حیلہ سمجھا کرو۔ یہ معاشرہ ہی ایسا ہو گیا ہے، بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔“

را حیلہ خاموش ہو گئی۔

پھر کچھ بھی نہیں ہوا۔ را حیلہ یہ بتاتی رہی کہ وہ مخاطب کرنے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن وہ اس سے کترا کر نکل آتی ہے۔ میں نے یہ سن کر را حیلہ کو شاباشی دی اور اس کی ہمت کو سراہا۔

پھر ایک دن را حیلہ نے وہ بات کہہ دی جس کا ڈر تھا، اس نے بتایا: ”آج اس کم بخت نے مجھ سے محبت کا اظہار کر دیا ہے۔“

”کیا؟“ یہ سن کر مجھے چکر سا آ گیا تھا۔ ”محبت کا اظہار؟“

”ہاں۔“ اس نے اپنی گردن ہلا دی۔

”اس کی یہ مجال، تم یہ بتاؤ۔ کیا اس نے بد معاشوں والے اسٹائل میں اظہار کیا تھا۔“

”نہیں۔“ را حیلہ نے بتایا۔ ”وہ میرے سامنے آیا اور بہت نرم لہجے میں کہنے لگا کہ میں اسے بہت اچھی لگتی ہوں۔“

”دیکھو را حیلہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس معاشرے میں ہمیں قدم قدم پر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن یہ بے وقوف قسم کے جذباتی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ صرف محبت کا اظہار کر کے رہ جاتے ہیں۔“

”دیکھیں، یہاں تک تو نوبت آن پہنچی ہے۔“

”میں نے کہا تھا کہ سن کر نظر انداز کر دو۔ اپنا راستہ بدل لو، وہ دیکھ لیتا، کچھ بھی نہیں ہوگا۔“

کئی دنوں کے بعد را حیلہ نے پھر بتایا۔ ”آج تو انتہا ہو گئی۔“

”کیا ہوا۔ کیا اس نے پھر کچھ کہہ دیا؟“

”اس نے ہوٹل میں کھانا کھانے کی آفر کی تھی۔“

را حیلہ نے بتایا۔

”آخر اس کا کہینہ پن سامنے آ ہی گیا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ جس معیار کا انسان ہے، تم کو اسی معیار سے ہوٹل میں اپنے ساتھ لے جاتا اور تم وہاں جا کر بدنام ہو جاتیں۔“

”نہیں۔ اس نے P.C. میں کھانا کھلانے کی بات کی تھی۔“

”دیکھو را حیلہ مسئلہ یہ ہے کہ ہوٹل میں فرق ہوتا

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے جب منصوبہ بنایا تھا، خود سے بنایا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ میری ایک ماں بھی ہے جو بہت بوڑھی ہے۔ میں اگر بغداد چلا جاؤں گا تو میری بوڑھی ماں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک میری ماں زندہ ہے میں اس قسم کا مدت العری سفر نہیں کر سکتا۔“

دونوں دوستوں نے کہا۔ ”واہ جناب! ہم دونوں نے مرضی نہ ہونے کے باوجود تمہاری پُر زور دلیلوں پر سفر کا منصوبہ بنایا تھا، اب اگر آپ نہیں جا رہے تو نہ چاہیے، ہم دونوں تو جائیں گے ہی، خدا حافظ۔“

آپ نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”تمہارا ساتھ نہ دے سکتے میں میرا اپنا نقصان ہے۔ سالوں کے بعد جب تعلیم حاصل کر کے تم دونوں واپس آؤ گے تو میں تم دونوں کے سامنے جا مل ٹھہروں گا۔ کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے مستقبل کا یہ کرب اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے گوارا کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دس سال بعد بھی تعلیم حاصل کر سکوں لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں اپنی ماں کو ایک بار کھو کر دوبارہ حاصل کر لوں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ قابلِ تلافی نقصان کو ناقابلِ تلافی نقصان پر قربان کر دوں چنانچہ اسی لیے میں تمہارا سفر نہیں ہو رہا ہوں۔“

دونوں دوست خاموش ہو گئے۔ کچھ سکوت کے بعد کہا۔ ”ابن علی ہمارے پاس تمہاری زوردار دلیلوں کا کوئی جواب نہیں لیکن جب ہم فارغ التحصیل ہو کر واپس آئیں گے تو ممکن ہے تمہیں لا جواب کر سکیں۔“

محمد بن علی نے جواب دیا۔ ”خدا تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔“

دونوں دوست چلے گئے اور آپ پر غموں نے وہ دباؤ ڈالا کہ بڑی دیر تک طبیعت قابو میں نہیں آئی۔ آپ نے دل کے بوجھ سے تنگ آ کر قبرستان کا رخ کیا۔ وہاں بڑی دیر تک گھوم پھر کر آنسو بہاتے رہے۔ انہیں سب سے زیادہ یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ سالوں کے بعد جب ان کے یہ دونوں دوست واپس آئیں گے تو ان پڑھے لکھے دوستوں میں ان کی اپنی کیا حیثیت ہوگی؟ شاید جاہل ٹھہرائے جائیں گے۔ قبرستان میں چونکہ ہر طرف عبرت ہی کا سامان تھا اور وہاں دنیا اور متعلقات دنیا بچ نظر آتی تھیں اس لیے یہاں طبیعت ٹھہر گئی اور دل کو کچھ سکون ملا پھر تو آپ نے یہ دستور بنالیا کہ جہاں طبیعت ٹھہرائی آپ نے قبرستان کا رخ کیا اور جب طبیعت ٹھہر گئی تو پھر گھر واپس آ گئے۔

ایک دن حسبِ معمول جو آپ قبرستان تشریف لے گئے تو ایک پرانی قبر کے سرہانے ایک بزرگ کو فاتحہ پڑھتے دیکھا۔ آپ بھی وہیں پہنچ گئے اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ آپ نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لی تھیں اور نہایت خشوع و خضوع سے سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کا ورد کر رہے تھے۔ اسی عالم میں لمحہ بھر کے لیے اس شخص کا خیال آیا جو آپ سے پہلے یہاں کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی آپ نے آنکھیں کھول دیں، اب وہ شخص وہاں نہیں تھا۔ آپ نے فاتحہ پڑھ کر جیسے ہی واپسی کے لیے قدم اٹھائے، دیکھا وہ شخص اب بھی ان کے پیچھے موجود ہے۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو محمد بن علی نے اپنے دل پر ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی۔ اجنبی بوڑھا مسکرا رہا تھا۔ آخر اس نے پوچھا۔ ”ابن علی! تو مجھے دیکھ کر ٹھہرا کیوں گیا؟“

ابن علی نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں، خوب اچھی طرح اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو یہاں قبرستان میں کیوں آتا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تو اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ بغداد نہیں جا سکا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو نے اس سفر میں اپنے دوستوں کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ میں تیری ماں کے بڑھاپے سے بھی واقف ہوں۔“

آپ کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ آپ نے اس کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا، بولے۔ ”مجھے حیرت ہے کہ آپ تو میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور میری ذرا ذرا سی بات آپ کے علم میں ہے لیکن میں آپ کو بالکل نہیں جانتا اور اسے میں اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتا ہوں۔“

اجنبی نے کہا۔ ”ابن علی! ان باتوں کو چھوڑ دو اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہارے کیا کام آ سکتا ہوں؟“

ابن علی نے جواب دیا۔ ”میں آپ سے واقف ہی نہیں تب پھر میں یہ فیصلہ کس طرح کر سکتا ہوں کہ آپ میرے کیا کام آ سکتے ہیں۔ آپ خود ہی بتائیں کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

اجنبی بوڑھے کو ہنسی آ گئی، کہا۔ ”ابن علی! تو باتیں بڑے مزے کی کرتا ہے اور دلیلیں بھی اچھی دے لیتا ہے۔“

آپ نے کہا۔ ”ساری باتیں اپنی جگہ، اب آپ اپنا تعارف کروائیں۔ اس کے بعد اور باتیں ہوں گی۔“

روزگار شخصیتیں پائی جاتی ہیں، ترجمان سے محروم ہے۔ اس لیے ہمیں بھی ان اساتذہ و ہر اور یگانہ عالمِ علم سے تحصیلِ علم کرنی ہے جن کی اس عہد میں دوسری کوئی مثال نہ ملے گی۔“

دوسرے دوست نے کہا۔ ”لیکن جناب اس میں ایک قباحت بھی ہے۔ وہ یہ کہ ترمذ سے دور دراز شہروں کا سفر اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا خوش فہمی میں ہم تنوں سمجھ بیٹھے ہیں۔“

محمد بن علی نے جواب دیا۔ ”اگر آپ لوگ اس خوش فہمی میں ہیں کہ حصولِ علم کی راہ میں پیش آنے والی صعوبتیں اور مصائب ہمیں تنگ کر دیں گے اور ہماری زندگی دو بھر کر دیں گے تو میں اس سفر سے آپ کو روک دوں گا کیونکہ علم جیسی نادر اور قیمتی شے کی حصولِ یابی اتنی آسان نہیں ہے جتنی آپ دونوں سمجھ بیٹھے ہیں۔“

پہلے دوست نے کہا۔ ”لیکن ذرا سے علم کے لیے سفر کی صعوبتیں جھیلنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں جو کچھ لکھ پڑھنا ہے ہمیں ترمذ میں ہی رہ کر لکھ پڑھ لیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ خیال بھی درست ہے، ذرا سے علم کی خاطر سیکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ تو ان فاتحین سے زیادہ احمق نظر آتے ہیں جو ایک ایک شہر یا قصبے کی خاطر ہزاروں میل کے سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔“

دونوں ساتھی آپ کے استدلال پر شرمندہ ہو گئے، بولے۔ ”اچھا جناب، ہم دونوں سفر پر آمادہ ہیں آپ منصوبہ بنا لیجیے۔“

آپ نے کہا۔ ”کیسا منصوبہ؟ ہمارے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور اس علم کی تحصیل کے لیے شہروں کی خاک چھانتا ہے۔ بس یہی ہمارا منصوبہ ہے اور اسی میں ہمارا مستقبل ہے۔“

تینوں نے آپس میں عہد و پیمان کیے کہ اس وقت جو کچھ ملے پایا ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یہاں تک کہ حصولِ تعلیم کی راہ میں ہماری جانیں تک چلی جائیں تو ہم اس کی پروا نہیں کریں گے۔

تینوں نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ محمد بن علی بھی تیاریاں کرنے لگے۔ آپ کی تیاریاں دیکھ کر بوڑھی ماں نے پوچھا۔ ”بیٹے! یہ سامان کیوں بندھ رہا ہے، خیریت تو ہے، کہاں جانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں؟“

محمد بن علی نے جواب دیا۔ ”ماں میں آپ کو اپنے اس منصوبے کے بارے میں جاننے سے پہلے ضرور بتانا لیکن اب جبکہ آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو میرا جواب بھی سن لیجیے۔ میں حصولِ علم کی خاطر بغداد جا رہا ہوں اور بغداد کے بعد کہاں جاؤں گا کچھ پتا نہیں کیونکہ یہ بغداد بھی کبھی معلوم ہوگا۔“

ماں نے پوچھا۔ ”بیٹے! اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ہمیں اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ پانچ سال لگ جائیں، دس سال بھی لگ سکتے ہیں، دس سال سے زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔ ابھی کل از وقت میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔“

ماں نے پھر سوال کیا۔ ”اور بیٹے! اس وقت میری عمر کیا ہوگی؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”یہی کوئی ساٹھ بیسٹھ کے لگ بھگ مگر کیوں..... آپ اس قسم کی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟“

ماں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”تیرے بقول میں ساٹھ بیسٹھ کو پہنچ چکی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ دو چار سال اور جی لوں گی۔ اب اگر تو دس پندرہ سال کے لیے میرے پاس سے چلا گیا تو میری دیکھ بھال کون کرے گا؟ آخری وقت میں میرے پاس کون ہوگا؟ میں تجھے دیکھنے اور تجھ سے بات کرنے کو ترسوں گی اور تو سیکڑوں میل دور لا پتا ہوگا۔ بتا کیا اس حالت میں تیرا سفر کرنا درست ہے؟ میں تجھے یہ سفر نہیں کرنے دوں گی۔“

محمد بن علی بڑی مصیبت میں پھنس گئے، سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”اچھا پھر میں یہ سفر نہیں کروں گا، آپ کے پاس ہی رہوں گا۔“

ماں خوش ہو گئیں اور بیٹے کو دعائیں دینے لگیں۔

دونوں دوست تیاری کر کے آگئے اور کہا۔ ”ابن علی! ہمیں کل صبح بغداد روانہ ہونا چاہیے۔“

محمد بن علی نے سکوت اختیار کیا۔ دونوں دوستوں نے پوچھا۔ ”آخر تم کیوں خاموش ہو؟ کیا تم نے ابھی تک تیاری نہیں کی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے ابھی تک تیاری نہیں کی اور نہ ہی سفر کی تیاری کرنے کا ارادہ ہے۔“

دونوں دوستوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آخر کیوں، کیا ہوا؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”ابن علی! یہ سمجھ لے کہ میں تیرا استاد ہوں اور تجھے وہ سب پڑھانا چاہتا ہوں جس کے لیے تیرے دونوں دوستوں نے بغداد کا سفر کیا ہے۔“

ابن علی نے حیرت سے نیچے سے اوپر تک دیکھا، پوچھا۔ ”آپ مجھے کیا پڑھا سکتے ہیں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”وہ سب کچھ جو تو پڑھنا چاہتا ہے۔“

”کیا سچ؟“

”میں جھوٹ نہیں بولتا اور یہ بھی ذہن نشین رکھ کہ میں تیرے پاس کیوں آیا؟ تو نے اپنی بوڑھی ماں کی خاطر جو قربانی دی ہے اس کا کم سے کم جوصلہ بحکم خداوند میں دے سکتا ہوں یہی ہے کہ میں تجھے وہ سب پڑھا دوں جس کے لیے تو سفر کرنا چاہتا ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”آپ کا مبلغ علم کیا ہے؟“

بوڑھے نے جواب دیا۔ ”میرا مبلغ علم پوچھتا ہے؟ گستاخ! میرا مبلغ علم اتنا ہے کہ بغداد اور دوسرے شہروں کے سارے ہی علمائے کرام اگر مل کر اپنے مجموعی علم سے میرے علم کا مقابلہ کرنا چاہیں تو وہ مجھ سے ہار جائیں گے۔“

بڑے میاں کی لاف و گزاف ابن علی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس لیے ان سے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر بعد بڑے میاں نے پھر اپنی زبان کھولی، کہا۔ ”ابن علی، تو تامل اور سوچ بچار میں اپنا وقت ضائع نہ کر۔ میں تجھے پابندی سے پڑھا دیا کروں گا اور اس کا تجھ سے کوئی معاوضہ بھی نہیں لوں گا۔ بول، کیا تجھے میری یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں؟“

ابن علی نے کہا۔ ”بڑے میاں! تمہاری عمر تو خاصی اچھی طرح گزری ہوگی۔ میں حیران ہوں کہ تم یہاں ترمذ میں موجود ہو اور میں واقف نہیں۔“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”مجھے بڑے میاں نہ کہوا ابن علی کیونکہ میں بڑھاپے سے نفرت کرتا ہوں۔“

ابن علی نے کہا۔ ”میں خود بھی تم سے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”تجھے یہاں اسی طرح آتے رہنا چاہیے اور میں تجھے یہیں اسی قبرستان میں پڑھا دیا کروں گا۔ علم کے سلسلے میں اس بات کا ہمیشہ خیال رہے کہ جب تو پڑھ لکھ کر فارغ ہو جائے تو، تو مغرور نہیں ہوگا اور بے کار بحث مباحثے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرے گا۔“

”میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں اور کچھ؟“

”اور یہ کہ تو ہمیشہ انکسار اور عجز کو اپنا شعار بنائے گا۔“

”میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں۔“

”اور یہ کہ تو اپنے علم سے خلق خدا کو فائدہ پہنچائے گا۔“

”یہ وعدہ بھی رہا مگر ہا یہ مسئلہ کہ میں خلق خدا کو فائدہ پہنچاؤں گا، آخر کس طرح؟“

”اپنے علم سے اور کس طرح۔“ بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”وہ اس طرح کہ تو طب پڑھے گا، طب پڑھے گا سے میرا یہ مطلب ہے کہ تو طب بھی پڑھے گا۔“

ابن علی نے حیرت سے سوال کیا۔ ”کیا تو طب بھی پڑھا دے گا مجھے؟“

”کیوں نہیں، کیا میں نے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا ہے کہ میں تمہارے سب پڑھا سکتا ہوں جس کے لیے تو بغداد جا رہا تھا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”بہر حال میں پڑھنا تو آج ہی سے شروع کر سکتا ہوں لیکن بڑے میاں تم آدمی بے حد دلچسپ ہو اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی ایک شخص میں سارے علوم کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”دیکھنا کیا معنی، وہ تو تو عملاً تجربہ کرے گا اس کا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اور کتابوں کا کیا ہوگا، کتابیں کون فراہم کرے گا۔ مجھے لانا پڑیں گی یا تم لاؤ گے؟“

بڑے میاں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”تو کہے گا تو کتابیں بھی میں ہی لے آؤں گا۔“

ان دونوں میں طے ہو گیا کہ دوسرے دن سے پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ محمد بن علی بشارت اور ایک قسم کا جھس لے گھر آگئے اور بڑے میاں کی بات چیت پر غصہ دل سے غور کیا کہ یہ بوڑھا واقعی کوئی عالم بے بدل ہے یا سگی، پاگل؟ وہ رات بڑی فکر اور بڑی جستجو میں گزاری، دوسرے دن صبح ذرا معمول سے پہلے ہی قبرستان پہنچ گئے اور ان بڑے میاں کو ادھر ادھر دیکھنا شروع

کر دیا۔ ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ یہ مایوس ہو کر سوچنے لگے کہ اس بوڑھے نے کل خوب بے وقوف بنایا۔ اب وہ کہیں بیٹھا خوب ہنس رہا ہوگا کہ محمد ابن علی کو اچھا بے وقوف بنایا۔ یہ سوچ کر انہیں بڑا غصہ آیا۔

ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ بڑے میاں ان کے پیچھے سے آگئے۔ ان کی بغل میں کتابیں دی تھیں اور وہ بالکل تازہ دم نظر آ رہے تھے۔ قریب آتے ہی بولے۔ ”میاں صاحبزادے! آنے میں ذرا سی دیر کیا ہوئی کہ تم نے میرے بارے میں غلط انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مجھے سگی، دیوانہ سمجھ لیا۔“

یہ بہت شرمندہ ہو گئے، بولے۔ ”بابا! میں شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کے خلاف اس طرح سوچا اور اس پر حیرت زدہ کہ آپ کو میری سوچ کا علم بھی ہو گیا۔“

بڑے میاں نے ہنس کر کہا۔ ”دیکھ لو تم، میں کتنا عجیب انسان ہوں۔“

اس کے بعد اپنی بغل کی کتابیں ان کے سامنے رکھ دیں، کہا۔ ”دیکھو میں تمہارے لیے کتنی کتابیں لایا ہوں۔ اب پڑھائی شروع کر دو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ سالوں کے بعد جب تمہارے دونوں دوست پڑھ لکھ کر ترمذ واپس آئیں تو تم ان دونوں میں زیادہ مہم نظر آؤ اور تمہیں ان کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔“

اب تو محمد بن علی میں یارائے گفتگو ہی نہ رہا۔ کتابیں دیکھیں تو اور رنگ رہ گئے۔ تصوف، اہلبیات، حکمت، طب معلوم نہیں کتنے موضوعات پر یہ کتابیں تھیں۔ ان کی پڑھائی شروع ہو گئی اور انہیں پہلے دن ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ بڑے میاں انہیں پڑھا نہیں رہے ہیں بلکہ گھول کے پلائے دے رہے ہیں۔ جو کچھ پڑھا رہے تھے حیرت انگیز طور پر دل و دماغ میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

اب تو آپ کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی قبرستان چلے جاتے اور وہاں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھائی میں مشغول ہو جاتے۔ کچھ دنوں بعد یہ انکشاف بھی ہوا کہ جب یہ دونوں درس و تدریس میں مشغول ہوتے ہیں اور وہاں کوئی تیسرا شخص آجاتا ہے تو وہ ان بڑے میاں کو دیکھنے سے قاصر رہتا ہے کیونکہ ہر آنے والا آپ سے تعجب سے سوال کرتا۔ ”میاں صاحبزادے! یہ پڑھنے کی کون سی جگہ ہے اور پھر اس طرح کہ نہ کوئی استاد ہے نہ کوئی سامعی۔ آخر تنہائی میں دل کس طرح لگتا ہے؟“

بڑے میاں اشارے سے محمد بن علی کو منع کر دیتے کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے چنانچہ یہ ٹالنے والا جواب دے کر اسے چلتا کر دیتے۔

ان کی ماں کو بڑی تشویش تھی کہ ان کا بیٹا یہ ہر روز صبح صبح جاتا کہاں ہے؟ انہوں نے بڑے میاں سے کہا۔ ”کیا میں اپنی ماں کو جو کچھ میں جانتا ہوں، بتا سکتا ہوں یا انہیں بھی ٹالنا ہوں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”نہیں، انہیں بتا دو کہ خدا کا ایک بندہ تمہیں ہر روز بلا معاوضہ پڑھانے آ جاتا ہے اور بس۔“

چنانچہ آپ نے اپنی ماں کو بتا دیا۔ ماں نے اپنے بیٹے کے ساتھ ہی بڑے میاں کو بھی بڑی دعا مانگی دیں کہ وہ ان کے بیٹے کو بلا معاوضہ پڑھا رہا ہے۔ محمد بن علی تین سال تک ان بڑے میاں سے پڑھتے رہے اور اس عرصے میں انہوں نے کئی علوم حاصل کر لیے اور ان علوم میں علم طب بھی شامل تھا۔

محمد بن علی کو ذہن رسا کے ساتھ ہی حسن بھی وافر ملا تھا۔ اس پر جوانی کا رنگ، چودہ دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ عورتیں آپ سے بات چیت کی منتہی رہتیں۔ لڑکیاں آپ کی ایک جھلک کے لیے گھنٹوں چشم براہ رہتیں لیکن خود آپ کا یہ حال تھا کہ کسی پر توجہ ہی نہ دیتے۔ ایک تو طبیعت میں یوں ہی شرم و حیا اور حلم اور سنجیدگی بہت زیادہ تھی۔ اس پر بڑے میاں کی محبت کا اثر، آپ کو دنیا کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی دلچسپی محسوس ہی نہ ہوتی۔

ایک خوب صورت عورت بہت دنوں سے آپ سے بات کرنے کی خواہش مند تھی۔ وہ کئی بار سناٹے میں آپ کی راہ میں حائل ہوئی لیکن آپ اس سے بچ کر نکل گئے۔ اس نے ایک آدھ بار آپ کو آواز بھی دی لیکن سنی ان سنی کر گئے۔ عورت بھی بڑی ہمت والی تھی، اس نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ محمد بن علی کو زیر کر کے ہی دم لے گی۔ دوسری عورتیں اور لڑکیاں اس کی ناکامی پر خوش نہیں اور مذاق میں ہنستیں۔ ”تو کچھ بھی کر لے، محمد بن علی تجھے دیکھنا تک گوارا نہ کریں گے۔“

عورت کہتی۔ ”بس یہی تو مجبوری ہے، اگر ابن علی ایک بار بھی مجھے دیکھ لیں تو میں دعوے سے کہتی ہوں کہ وہ میرا اثر قبول کیے بغیر نہ رہیں گے اور میرے عشق میں بولائے بولائے پھرتے رہیں گے اور پھر میں بھی کنارہ کشی اختیار کر لوں گی اور انہیں اس سے زیادہ ستاؤں گی جتنا یہ مجھے ستا رہے ہیں۔“

عورتیں طرزا کہتیں۔ "ارے ابن علی تیرے قابو میں نہیں آئیں گے۔ یہ بہت مغرور ہیں۔"

عورت نے کہا۔ "ابھی میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر تو چلایا ہی نہیں۔ جب میں ابن علی سے ہر طرح مایوس ہو جاؤں گی تو اپنا وہ آخری تیر چھوڑوں گی جس کا نشانہ بھی خطا ہوا ہی نہیں اور جو دنیا کا خطرناک تیر کہلاتا ہے۔ مردوں کے حق میں عورتوں کا بہترین تیر۔"

ایک عورت نے پوچھا۔ "اپنا وہ آخری تیر مجھے بھی تو بتاتا کہ میں بھی آزما کے دیکھوں۔"

عورت نے جواب دیا۔ "واہ، میں کیوں بتاؤں تجھے۔ پہلے میں آزمالوں پھر تجھے بتا دوں گی۔"

عورتوں نے جواب دیا۔ "اچھا جب وہ آخری تیر لے کر ابن علی کے پاس جانا تو ہمیں بھی دکھا دیتا۔"

عورت نے جواب دیا۔ "نہ صرف دکھاؤں گی بلکہ بتا بھی دوں گی، تم لوگ فکر نہ کرو۔"

اس کے بعد اس عورت نے بڑی محنت اور جانفشانی سے آپ کے معمولات کا پتا چلانا شروع کر دیا۔ کتنی دیر گھر میں رہنے لگی۔ گھر سے نکلتے ہیں تو کہاں کہاں، کس کس کے پاس جاتے ہیں اور کتنی کتنی دیر ٹھہرتے ہیں۔ ان معمولات میں اسے ایک ہی عمل کام کا نظر آیا۔ ابن علی ہر روز ترند کے ایک ایسے باغ میں ضرور جاتے ہیں جو عموماً ویران رہتا ہے اور اس میں دوسرے لوگ جانا پسند نہیں کرتے۔ ابن علی اس باغ میں گھنٹوں غور و فکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اس باغ کو اس عورت نے اپنی کمین گاہ تصور کر لیا اور وہاں پہنچنے اور اپنے منصوبے پر کامیابی سے عمل درآمد کی تدبیریں سوچنے لگی۔

ایک دن اس عورت نے بہترین لباس زیب تن کیا اور ترغیب اور تحریص آرائشیں کر کے اپنی حاسد عورتوں میں پہنچی اور کہا۔ "ذرا دیکھو تو میں کسی لگ رہی ہوں؟"

عورتوں نے متعجب طور پر جواب دیا۔ "قیامت، بھلا مرد تو مرد ہم عورتوں پر تیرے حسن اور آرائش کا جادو اثر کر رہا ہے۔"

عورت نے جو لباس پہن رکھا تھا اس میں عریانیت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ نیم عریانیت جو عریانیت سے کچھ زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس نے کہا۔ "عورتو! آج میں اپنا آخری تیر آزمانے جا رہی ہوں۔ میرا یہ تیر ترغیبات اور تحریصات کا تیر ہے۔ نیم عریانی کا تیر ہے۔ آنسوؤں کا تیر جو ابن علی کے سامنے چلے گا، ناز اور غرے کا تیر ہے جو ان کے سامنے چھوڑا جائے گا اور خلوت کی کمین گاہ میں جب یہ تیر ایک ساتھ چلیں گے تو میں دیکھوں گی کہ ابن علی ان تیروں سے کس طرح بچتے ہیں۔"

آج ان حاسد عورتوں کو بھی اس عورت کی کامیابی کا کچھ کچھ یقین ہو گیا۔ پہلے وہ اس عورت کی ناکامی پر خوش ہوا کرتی تھیں۔ آج اس کی کامیابی کے خیال سے غمزہ ہو گئیں اور دل ہی دل میں ناکامی کی دعا بھی مانگنے لگیں۔

یہ عورت آپ سے پہلے ہی اس باغ میں پہنچی تھی اور ایک کچھ میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ابن علی بھی وہاں پہنچے اور ایک مرد کے نیچے بیٹھ کر کچھ سوچنے لگے۔ ان دنوں ان کا دل معارف و اسرار کا گنجینہ بنا جا رہا تھا۔ سرو کی جڑ میں تنے سے پشت کا کردہ معلوم نہیں کیا سوچے رہے۔ ان کے آس پاس جھاڑیاں تھیں، ان جھاڑیوں نے آپ کو دنیا والوں کی نظر سے چھپا لیا تھا۔ اس عورت کو اس سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی تھی جہاں وہ اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے ابن علی کو بے بس اور حواس باختہ کر سکتی۔

وہ ابھی اور آہستہ آہستہ آپ کی طرف بڑھی اور بڑھتے بڑھتے بالکل ان کے قریب پہنچی مگر اس نے اپنے دل پر چمکینی اور یاس کا اثر قائم کیا یہاں تک کہ اس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس کا چہرہ حسرت و اندوہ کا مرقع بن گیا پھر وہ سسکیاں بھی لینے لگی۔ آپ نے سسکیوں کی آواز جوتی تو ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا وہ سسکیاں لیتے ہوئے آپ کے قریب پہنچی مگر اور اونٹلا کرتے ہوئے بولی۔ "اے نوجوان! خدا کے لیے میری مدد کر، میں بڑی مظلوم عورت ہوں۔"

آپ نے اس عورت کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس کا حسن ہوشیار اور آرائش و زیبائش زہر شکن۔ عورت نے خود کو ابن علی کی گود میں گرا دینے کی کوشش کی، بولی۔ "مجھے بچالے اے نوجوان، مجھے بچالے۔"

آپ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "عورت! ذرا ہوش و حواس میں رہ اور دور سے بات کر، آخر تیرے ساتھ ہوا کیا ہے؟"

عورت نے جواب دیا۔ "میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں اور اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اپنی آغوش میں لے کر میری پتاسن تاکہ میرے دل سے ڈر نکلے اور میں اطمینان سے باتیں کر سکوں۔"

آپ نے کہا۔ "پھر بھی تو مجھ سے دودھ اور دہی سے بات کر۔ میری موجودگی میں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

عورت نے جواب دیا۔ "تو بڑا بے حس نوجوان ہے کہ ایک مظلوم اور مجبور عورت کی بے بسی سے بھی نہیں بچ رہا ہے۔"

حکیمہ الاولیا

آپ نے کہا۔ "اچھا تو بیٹھ کر باتیں کر اور یہ بتا کہ کیا یہاں تیرے علاوہ بھی کوئی شخص ہے؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ہاں ایک شخص اور بھی تھا میرے ساتھ اب معلوم نہیں کہ وہ موجود بھی ہے یا چلا گیا۔"

آپ نے کہا۔ "اچھا تو بیٹھ جا اور اطمینان سے بتا کہ تیرے ساتھ کیا ہوا؟"

عورت آپ کے سامنے بیٹھ گئی اور بات کیے بغیر آنسو بہانے لگی۔ آپ کو اس کے آنسوؤں پر بڑا رحم آیا اور آپ کو اپنے دل میں اس

عورت کے لیے دکھ درد محسوس ہوا۔ آپ نے مزید کہا۔ "میں تیری حالت پر افسوس کر رہا ہوں۔ بتا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

عورت نے کہا۔ "پہلے آپ یہ یقین دلادیں کہ آپ واقعی میری مدد کریں گے ورنہ یوں ہی بلاوجہ حال زار سنانے سے فائدہ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے ایک بار تجھ سے کہہ تو دیا کہ میں جس حد تک تیری مدد کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔"

عورت نے کہا۔ "میں ایک غمزہ عورت ہوں۔ میں شادی شدہ بھی لیکن میرا شوہر مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور ایک عورت اسے لے

گئی۔ اب میں ہوں اور ایک لمبی تنہائی ہے جس کا بظاہر کوئی علاج نہیں۔"

آپ نے پوچھا۔ "اس سانحے کو کتنا عرصہ گزرا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "تقریباً تین سال ہوا چاہتے ہیں۔"

آپ نے پھر پوچھا۔ "اور اس دوران تجھے اپنے شوہر کی کوئی خبر بھی نہیں ملی؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ملی کیوں نہیں، سستی ہوں اصفہان میں ہے اور اس عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مٹا رہا ہے۔"

آپ نے کہا۔ "اور تو نے کوشش نہیں کی کہ اسے بلوالے؟"

عورت نے جواب دیا۔ "میں کیا کوشش کرتی۔ وہ اپنی مرضی سے بتائے بغیر گیا ہے، میں اس کا چچا کس طرح کر سکتی ہوں؟"

آپ نے پوچھا۔ "لیکن اس وقت تو یہاں کس طرح آگئی؟"

عورت نے جواب دیا۔ "یہ ایک الگ داستان ہے۔ میرے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ تیرا شوہر اصفہان سے آیا ہوا ہے اور تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں اس کی باتوں میں آگئی اور اچھے سے کڑے پہن کر اپنے کو خوب بنایا سنوارا مگر وہ مجھے بری نیت سے اس باغ میں لے آیا اور چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ زیادتی کرے کہ یہاں تو نظر آگیا، وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہو گیا اور میں بھاگ کر تیرے پاس آگئی۔"

آپ نے عورت کو سرزنش کی۔ "تو نے ایک غیر مرد کی باتوں پر اعتبار کیوں کر لیا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "محمد بن علی! تو ایک عالم ہے اور عالم ہو کر ایسی بات کرتا ہے۔ جس عورت نے شوہر کی مفارقت میں کئی سال

گزار دیے ہوں اور اس دوران اس نے دوسرے مرد کی صورت تک نہ دیکھی ہو کیا تو اس کی پریشانیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا؟"

اتنا کہہ کر وہ ذرا وقار روئے لگی، بولی۔ "محمد بن علی، کہتے ہیں اضطراری حالت میں حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے، تو یقین کر شوہر کی جدائی کے بعد اب میں اضطراری حالت کا شکار ہو گئی ہوں اور میں اپنے خیال میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اب حرام بھی مجھ پر حلال ہو گیا ہے۔"

آپ نے غصے میں کہا۔ "اے عورت! تو یہ بیک کیا رہی ہے، کیا تو نے اپنی باتوں کے معافی و مطالب بھی سمجھے؟"

عورت نے جواب دیا۔ "میری باتوں کے معافی و مطالب کوئی مجھ سے بہتر بھی سمجھ سکتا ہے؟"

آپ نے کہا۔ "باتیں تو بھکی بھکی ہی کر رہی ہے اس وقت۔"

عورت پھر رونے لگی، بولی۔ "اب میں زندہ ہی مظلوم نہیں کیوں ہوں، ورنہ مصائب نے مجھے مردے سے بدتر کر رکھا ہے، اب تو میری مدد کر۔"

آپ نے پوچھا۔ "عورت! میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

عورت نے جواب دیا۔ "تو میری مدد کر سکتا ہے اور خوب کر سکتا ہے۔"

آپ نے کہا۔ "بتا، اگر میرے بس کی بات ہوئی تو ضرور کروں گا تیری مدد۔"

عورت نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ "میں حیرانہ پکڑ رہی ہوں، تو بھی میرا ہاتھ پکڑ لے اور وعدہ کر کہ تو زندگی بھر میرا ساتھ

دے گا اور میں بھی عہد کرتی ہوں کہ ہمیشہ تیری وفادار اور فرمانبردار رہوں گی۔"

آپ نے نفرت سے کہا۔ "تو میرا ہاتھ چھوڑ دے، یہ ہاتھ کیوں پکڑ رکھا ہے۔"

ماہل ہے؟

”ہاں تو میرا شاگرد ہے، خضر کا شاگرد اور خدا نے یہ کام اس لیے میرے سپرد فرمایا تھا کہ تو نے اپنی ماں کے احرام میں تحصیل

علوم کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔“

آپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ بڑی دیر تک آپ سے باتیں کرتے رہے۔ آخر میں رخصت ہوتے ہوئے فرمایا۔ ”ابن علی! میں ہفتے میں ایک بار اس غرض سے تمہارے پاس آتا رہوں گا کہ میں نے تمہیں اب تک جو کچھ پڑھایا ہے اس پر عملی مباحثے کر کے مزید اضافہ کروں۔“

یہ واقعہ راز نہیں رہا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ابن علی کے پاس خضر آتے ہیں۔ اس کا علم اس عہد کے صوفی ابوبکر وراق کو بھی ہو گیا۔ وہ آپ سے ملنے آئے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد عرض کیا۔ ”ابن علی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے پاس خضر تشریف لاتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ درست ہے بلکہ میں نے علم ہی ان سے حاصل کیا ہے۔“

ابوبکر وراق نے کہا۔ ”تب پھر ان سے میری ملاقات کرائیے۔ اس وقت میں یہی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”خضر ہفتے میں ایک بار میرے پاس آتے ہیں۔ میں ان سے اجازت لے لوں اس کے بعد آپ کو ان سے ملوادوں گا۔“

ابوبکر وراق چلے گئے۔ اس ہفتے جب حضرت خضر ان سے ملنے آئے تو آپ نے ان کے آگے ابوبکر وراق کی درخواست پیش کی۔ حضرت خضر نے جواب دیا۔ ”جس باغ میں عورت نے آپ کو جھلائے معصیت کرنا چاہا تھا۔ آپ مجھے کی شب ابوبکر وراق کو لے کر آجائیے، وہیں ملاقات ہو جائے گی۔“

آپ نے ابوبکر وراق کو مطلع کر دیا اور جمعہ کی شب یہ دونوں اس باغ میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک درخت کے سائے میں ایک بہت بڑا تخت بچھا ہوا تھا اور وہاں معلوم نہیں کس چیز کی روشنی ہو رہی تھی جس سے پورا باغ روشن ہو رہا تھا۔ تخت پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو دیکھتے ہی تخت چھوڑ دیا۔ نیچے آگئے اور ان دونوں کی تعظیم کو چند قدم ان کی طرف بڑھے اور ان دونوں کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر لے گئے اور اپنے پاس ہی بٹھالیا پھر کچھ دیر بعد یکے بعد دیگرے چالیس بزرگ اور آگئے۔ ان کے لیے کھانا کھان سے آیا تھا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا لیکن ان دونوں نے کھانے کے بعد متفقہ کہا۔ ”ہم نے ایسا کھانا نہیں اور نہیں کھایا۔“

ابوبکر وراق نے سکوت اختیار کیا اور ابن علی اور حضرت خضر آپس میں باتیں کرنے لگے لیکن یہ دونوں کس زبان اور کس موضوع پر باتیں کر رہے تھے ابوبکر وراق نہیں سمجھ سکے۔ اب ابوبکر وراق کو ابن علی کے مرتبے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے ابن علی کی صحبت میں مستقلاً اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔

اس دوران آپ کی ماں کا انتقال ہو گیا اور آپ نے خدا کی لولہ کے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ آپ کبھی کبھی کچھ لکھنا شروع کر دیتے۔ اس طرح کچھ عرصے بعد اچھے خاصے صفحات ہو گئے۔ آپ تنہائی میں ان کا مطالعہ کرتے تو اکٹا جاتے اور ان صفحات کو ضائع کرنے کی سوچتے گئے۔ آخر ایک دن ابوبکر وراق سے کہا۔ ”ابوبکر! میں نے مختلف اوقات میں جو بے کار کام کیا ہے، اب اسے ضائع کرنا چاہتا ہوں۔“

ابوبکر نے پوچھا۔ ”کون سا بے کار کام حضرت؟“

آپ نے اپنے صفحات ابوبکر کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ”انہیں دریائے جیون میں پھینک آئیے۔“

ابوبکر نے پوچھا۔ ”ان صفحات پر لکھا کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں مختلف اوقات میں معلوم نہیں کیا کچھ لکھتا رہا ہوں، اب جو پڑھا تو انہیں اس لائق نہیں سمجھتا کہ اپنے پاس رکھوں اور میرے خیال میں ان کی بہترین جگہ دریائے جیون کی لہریں ہیں۔“

ابوبکر ان صفحات کو اپنے گھر لے گئے اور ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ چند ہی صفحات پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے وہ علم کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اسے دریائے جیون کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر ابوبکر نے وہ صفحات محفوظ کر لیے۔

کئی دن بعد آپ نے ابوبکر سے پوچھا۔ ”ابوبکر، وہ صفحات کیا ہوئے؟“

ابوبکر نے جواب دیا۔ ”حضرت! دریائے جیون میں پھینک آیا۔“

آپ نے کہا۔ ”غوب! تمہارا گھر دریائے جیون ہے، یہ بات آج ہی معلوم ہوئی۔“

عورت نے آپ کو اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگا لیا، چاہا، بولی۔ ”ابن علی! میں تیرے فراق میں آہیں بھرتی رہتی ہوں اور تو ہے کہ میری خبر ہی نہیں لیتا۔“

آپ ذرا بھی نہیں گھبرائے، بولے۔ ”واہ اتنی ذرا سی بات کے لیے اتنی لمبی تمہید کا ٹھہکی تھی تو نے۔ اس کی کیا ضرورت ہے تو اگر کسی تمہید کے بغیر ہی اپنا مطلب واضح کر دیتی تو میں تیری پیش کش پر غور تو ضرور ہی کرتا بہر حال تو مجھ سے جو کچھ چاہتی ہے وہ ایرا نہیں ہے کہ بیا سانی ہو جائے، مجھے غور کرنے کا تو موقع دے۔“

عورت نے کہا۔ ”میں بہت مبرک چٹکی، میں نے بہت ضبط کر لیا اب مزید مبرک یا راز نہیں ہے۔“

ابن علی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”تو جو کچھ چاہتی ہے وہ مجھ سے نہیں حاصل کر سکتی، اس لیے اپنا راستہ لے۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”ابن علی! تو بڑی بے وقوفی کر رہا ہے، ترنہ کے کتنے ہی مرد میرے عشق میں آہیں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک تو ہے کہ میں تیرا چچا کر رہی ہوں، اگر تو نے یہ موقع ضائع کر دیا تو زندگی بھر بچھتاؤں گا۔“

آپ نے کہا۔ ”تو غلط سمجھ رہی ہے بلکہ واقعی یہ ہے کہ اگر میں نے اس وقت تیرا کہنا مان لیا تو زندگی بھر بچھتاؤں گا۔“

عورت نے آپ کو پکڑنا چاہا، آپ نے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ آپ باغ سے باہر آگئے اور عورت مایوس ہو کر ایک درخت کے سائے تلے بیٹھ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد جب یہ عورت مایوس اور غمزدہ ان عورتوں اور لڑکیوں کے سامنے سے گزری جو اس کا انتظار کر رہی تھیں تو ان کے سوالوں سے بچنے کے لیے تیزی سے گزر کر اپنے گھر چلی گئی اور عورتوں نے اس کی شرمندگی اور عداوت سے اندازہ لگا لیا کہ وہ ناکام رہی ہے چنانچہ انہوں نے بڑی خوشی منائی۔

☆☆☆

آپ اس عورت سے بچھا چڑا کر گھر پہنچے تو بہت پریشان تھے۔ ماں نے پوچھا۔ ”بیٹے! تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“

انہوں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ ماں نے بیٹے کو دعا کی دیں کہ ”خدا تجھے اسی طرح برائیوں سے بچاتا رہے۔“

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپ باہر گئے تو دروازے پر انہی بڑے میاں کو کھڑے دیکھا جن سے وہ قبرستان میں تین سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ اس وقت خلاف توقع اپنے دروازے پر دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے، کہا۔ ”زہے نصیب کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف تولائے۔“

اس کے بعد آپ نے انہیں بیٹھک میں بٹھایا اور باتیں ہونے لگیں۔ بڑے میاں نے کہا۔ ”ابن علی! اس وقت میں خاص طور پر اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں مبارک بادوں۔“

انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کس بات کی مبارک باد؟“

بڑے میاں نے کہا۔ ”اس بات کی کہ تو زلیخا کے مکر سے بچ گیا۔“

ابن علی نے کہا۔ ”لیکن حضرت یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”مجھے کون بتاتا، میں خود ہاں موجود تھا اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔“

آپ نے سر پکڑ لیا، بولے۔ ”حضرت! میں بہت پریشان ہوں۔ آخر آپ اپنا تعارف کیوں نہیں کرواتے کہ میرے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے آپ کو اس کا بغیر بتائے ہی علم کیسے ہو جاتا ہے، کیا آپ جن ہیں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”نہیں تو۔“

آپ نے کہا۔ ”پھر کیا آپ فرشتہ ہیں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”نہیں میں فرشتہ نہیں ہوں۔“

آپ نے کہا۔ ”نہ آپ جن ہیں اور نہ فرشتہ ہیں پھر آپ ہیں کیا؟“

بڑے میاں نے پوچھا۔ ”کیا میں واقعی یہ بتا دوں کہ میں کیا ہوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر آپ اس وقت بھی اپنا تعارف نہیں کرا میں گے تو مجھے احتجاج ہو جائے گا۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”میں نہ تو جن ہوں نہ فرشتہ بلکہ میں خضر ہوں۔ جسے خدا نے بھولے بھلوں کی راہ نمائی کی خدمت سونپی ہے اور ہمیشہ کی زندگی عطا فرمائی ہے۔“

آپ سنائے میں آگئے اور خضر کی صورت دیکھتے رہے، بولے۔ ”تو گویا مجھے حضرت خضر علیہ السلام کی شاگردی کا شرف

ابوبکر آپ کے کشف پر حیران رہ گئے اور شرمندگی سے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھے ان صفحات کے مطالعے سے بڑی لذت حاصل ہوئی اس لیے میں نے سوچا کہ انہیں کیوں ضائع کروں، میں خود گاہ بیگاہ پڑھتا رہوں گا۔“

آپ نے کہا۔ ”نہیں ابوبکر، انہیں اپنے پاس مت رکھو اور دریائے جیحون میں پھینک دو کیونکہ اس خرافات کی اس سے بھر کوئی جگہ نہیں۔“

ابوبکر نے مجبوراً حکم کی تعمیل کی اور وہ صفحات اپنے گھر سے لے کر دریائے جیحون کی طرف روانہ ہو گئے۔

ابوبکر یہ صفحات دریا برد کرتے ہوئے دکھ محسوس کر رہے تھے لیکن حکم کی تعمیل بھی بہت ضروری تھی۔ مجبوراً بادل ناخواستہ انہیں دریا میں پھینک دیا۔ یہ صفحات پانی پر بکھر گئے۔ اسی وقت دریائے سندھ پر ایک صندوق نمودار ہوا، اس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ یہ سارے اوراق ایک ایک کر کے اس میں چلے گئے اور آخر میں صندوق بند ہو گیا اور صندوق دریائے سندھ میں چلا گیا۔ ابوبکر کو ان صفحات کی خرقا کا بڑا اہمال تھا لیکن اس دکھ میں یہ حیرت بھی شامل تھی کہ یہ صندوق کیسا تھا اور اس کے ڈھکنے کا کھلنا، اوراق کا اس میں سما جانا اور ڈھکنا بند ہو کر صندوق کا دریائے سندھ میں بیٹھ جانا، آخر یہ سب کیا تھا؟ لیکن یہ جو کچھ بھی تھا، اس کا ابن علی کے سامنے ذکر کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

کئی دن بعد آپ نے ابوبکر سے پوچھا۔ ”ابوبکر! وہ صفحات دریا برد کر دیے تھے؟“

ابوبکر نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں نے انہیں اسی دن دریائے جیحون کے حوالے کر دیا تھا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”وہ صفحات پانی کی لہروں پر منتشر ہوئے تھے یا نہیں؟“

ابوبکر نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ ”حضرت! میں کیا عرض کروں؟ میں نے وہاں جو منظر دیکھا اسے بیان کرنے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔“

آپ نے کہا۔ ”نہیں، ڈر مت۔ جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو، میں ناراض نہیں ہوں گا۔“

ابوبکر نے پورا واقعہ ہر ادیا، بولے۔ ”حضرت! یہ واقعہ سمجھ میں نہیں آیا۔“

آپ مسکراتے لگے، اس کے بعد آپ نے کہا۔ ”ابوبکر! اندر جا کر صندوق کھولو اور اس میں سے وہ صفحات نکال لاؤ۔“

ابوبکر اندر گئے اور صندوق سے وہ صفحات نکال لائے۔ یہ وہی صفحات تھے جنہیں وہ دریائے جیحون میں پھینک آئے تھے۔

ابوبکر حیران و پریشان صفحات لے کر آپ کے پاس لے آئے اور کہا۔ ”حضرت! میں تو پاگل ہو جاؤں گا، ایک راز سے پردہ اٹھتا نہیں کہ دوسرا مزید گر جاتا ہے۔ آخر یہ اسرار کیا ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میرے استاد حضرت خضران صفحات کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کا آنا نہیں ہو رہا تھا، مجبوراً میں نے ان کو دریائے جیحون کے ذریعے ان کے پاس پہنچ دیا چنانچہ جب انہوں نے میرے صفحات پڑھ لیے تو واپس کر دیے۔“

لیکن کچھ عرصہ بعد آپ اپنی تحریروں سے واقعی دل برداشتہ ہو گئے اور ساری تحریریں دریائے جیحون میں پھینکوا دیں لیکن اسی شام کو وہ تحریریں لیے ہوئے حضرت خضران کے پاس پہنچے اور کہا۔ ”ابن علی! یہ تم نے کیا کیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! جب میں ان صفحات کو پڑھتا ہوں تو اپنی بے بضاعتی اور جہالت پر شرمسار ہونے لگتا ہوں اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انہیں دریائے جیحون میں پھینک دوں۔“

حضرت خضر نے کہا۔ ”یہ غلط کیا تم نے، تمہیں اپنے یہ صفحات محفوظ رکھنا چاہئیں کیونکہ یہ کارآمد ہیں اور دوسروں کے لیے بے حد مفید۔ اس لیے میں انہیں تمہارے پاس لے آیا۔“

آپ حج کرنے تشریف لے گئے اور وہاں طواف کعبہ کے دوران گریہ سے بہت برا حال ہو گیا۔ جب واپس تشریف لائے تو ان کی کتیا میں ایک کتیا نے بیچ دے رکھے تھے۔ آپ اس کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ وہ خود سے چلی جائے تو بہتر ہے انہیں دھکا نہ پڑے لیکن کتیا نہیں چلی۔ آپ نے پوری رات وہاں کھڑے ہو کر گزار دی۔

اس محلے میں ایک ایسے بزرگ بھی رہتے تھے جو ابن علی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس بات سے حسد کرتے تھے کہ لوگ ان کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ آپ ان بزرگ کو سلام کرتے تو وہ منہ پھیر کر نفرت سے سلام کا جواب دیتے۔ ان بزرگ کو جب یہ معلوم ہوا کہ کتیا آپ کی جمونڈی میں بیچ دے رکھے ہیں جس کی وجہ سے آپ بے حد پریشان ہیں تو بہت خوش ہوئے۔

آپ نے اپنی رہائش دوسرے حصے میں کر لی اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ کتیا دھکارے بغیر ہی چلی جائے۔ اسی انتظار میں ستر دن گزر گئے۔ کتیا کے بیچ بڑے بڑے ہو گئے اور جب وہ خود دوڑنے بھاگنے کے لائق ہو گئے تو کتیا انہیں لے کر چلی گئی۔

آپ نے اس حصے کو خوب صاف کیا، دھویا اور اس میں دوبارہ رہائش اختیار کی۔

اسی دن بڑے میاں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ ”اے نادان شخص! تو محمد بن علی سے بلا وجہ نفرت کرتا ہے حالانکہ یہ وہ شخص ہے جو کسی کا برا چاہتا ہی نہیں، یہاں تک کہ اس نے ستر راتیں اسی انتظار میں گزار دیں کہ کتیا کو دھکارا نہ پڑے۔ جب وہ خود سے چلی گئی تو ابن علی نے اپنی رہائش گاہ کو دوبارہ کام میں لیا۔“ یہ بزرگ اس خواب کے بعد فوراً آپ کے پاس پہنچے اور قدموں میں گر کر دیر تک معافی مانگتے رہے۔

آپ نے جواب دیا۔ ”بھائی! تم نے کون سا قصور کیا ہے جو میں معاف کر دوں۔ تم نے اپنے دل میں شرمندگی محسوس کر لی، میرے اور تمہارے لیے یہی کافی ہے۔“

☆☆☆

آپ کے دونوں دوست ایک عرصہ بعد سفر سے واپس آئے تو وہ بہت بڑے عالم بن چکے تھے۔ انہیں اپنی علیت پر بڑا ناز تھا اور ان دونوں نے یہ سوچا تھا کہ ترمذی کچھ بن علی کو شرمندہ کریں گے کہ تم نے منصوبہ بنایا لیکن ناکام رہے اور ہم دونوں علم حاصل کر کے واپس بھی آ گئے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ اب وہ دلائل سے ابن علی کو جواب کر دیا کریں گے لیکن جب ترمذی والوں سے یہ سنا کہ ابن علی کے علوم کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تو حیرت ہوئی اور جب ان دونوں نے آپ سے ملاقات کی اور ابن علی کو اس سے کہیں زیادہ پایا جتنا سنا تھا تو بہت شرمندہ ہوئے۔ دونوں دوستوں کا علم منقولی اور معقولی تھا جبکہ ابن علی منقولی اور معقولی علوم کے ساتھ ہی باطنی علوم بھی رکھتے تھے۔

دونوں دوستوں میں سے ایک نے آپ کے ساتھ حسد کا سلوک کیا اور اس کوشش میں رہنے لگا کہ کوئی موقع ہاتھ آئے تو ابن علی کو شرمندہ کیا جائے لیکن اس قسم کا موقع ہاتھ آنا آسان نہیں تھا۔ وہ دوست آپ کے پاس آنے جانے والوں کو درغلانے لگا۔ وہ کہتا۔ ”ابن علی کو اتنا ہی کیا ہے؟ میں نے تو علوم کی تحصیل میں بغداد اور دوسرے کئی شہروں کا سفر کیا ہے، مصیبتیں اٹھائی ہیں اور سختیاں جھیلی ہیں لیکن ابن علی ترمذی سے باہر تک نہیں نکلے پھر ان کی علیت میرے مقابلے میں کیا ہو سکتی ہے اور تم لوگ اپنی اندھی عقیدت سے انہیں معلوم نہیں کیا کچھ سمجھنے لگے ہو۔“

لوگ آپ کے دوست کی باتیں سننے اور آپ کے گوش گزار کر دیتے کہ آپ نے اپنی آستین میں ایک خطرناک سانپ پال رکھا ہے، اس سے جلد از جلد بچھا چھڑا لیجیے ورنہ یہ کسی روز بری طرح آپ کو ڈس لے گا۔

آپ نے جواب دیا۔ ”میرا دوست اگر سانپ ہے تو یہ سانپ مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا اور نہ ہی میں اس سانپ سے ڈرتا ہوں۔“

مریدوں اور ارادت مندوں نے خاموشی اختیار کر لی اور دوست آپ کی کاٹ میں رہا۔ اب آپ اپنے دوست پر بہت زیادہ مہربان رہنے لگے تھے۔ اس کا بڑا خیال رکھتے اور یہ کوشش کرتے کہ وہ آپ کی کسی بات پر آزر نہ دے۔

آخر ایک دن وہ بہت شرمندہ ہوا اور کہا۔ ”ابن علی! میں تمہارا دوست ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ کب کہا کہ تم میرے دشمن ہو؟“

دوست نے شرمندگی سے کہا۔ ”لیکن کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے پاس رہائش کیوں اختیار کی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں جانتا ہوں۔“

دوست نے پوچھا۔ ”تم کیا جانتے ہو؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں یہ جانتا ہوں کہ تم اپنے دنیاوی علوم کے زہر کا شکار ہو گئے ہو اور چاہتے ہو کہ مجھے میرے

مریدوں اور ارادت مندوں میں کسی بات پر شرمندہ کرو۔“

دوست نے کہا۔ ”جب تمہیں میرے ارادوں کا علم تھا تو تم نے خاموشی کیوں اختیار کیے رکھی بلکہ تم نے اس دوران میری زیادہ

عزت کی ہے، آخر کیوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تم نے مجھ سے حسد کیا، معلوم نہیں کس چیز پر۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر مجھ میں کوئی ایسی چیز موجود ہے

جو میرے دوست میں نہیں ہے تو مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ رہا یہ سوال کہ میں نے تمہاری ناراضی کا جواب ناراضی سے کیوں نہیں

دیا؟ کیا میں تم سے حسد کرتا؟ اگر کرتا تو کس بات پر حسد کرتا؟ ان حالات میں میرے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ میں

تمہارے ساتھ محبت سے پیش آؤں۔“

دوست آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔

آپ سجدے میں گر کر مناجات کرنے لگے۔ ”خدا یا! اگر میں نے اپنے کسی فعل سے تجھ کو ناراض کیا ہے اور تو نے مجھے غصہ پر آمادہ کر دیا ہے تو تو مجھ سے اس مصیبت کو دور فرما دے اور جس کو میری بات ناگوار گزری ہو اس کو اس سے دور فرما دے۔“

آپ نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ آپ جو عبادت کرتے ہیں اس میں آپ کا نفس پورا ساتھ نہیں دیتا۔ انہوں نے پورے ذوق و شوق اور انتہا تک سے عبادت گزاری شروع کر دی اور نفس کے خلاف جدوجہد کرتے رہے لیکن ہر بار بھی محسوس ہوا کہ وہ کامیاب نہیں رہے۔ آخر عاجز آ کر آپ دریاے جہنم کے کنارے پہنچ گئے اور وہاں رات کے سنانے میں عبادت میں مشغول ہو گئے۔ نصف رات کے بعد وہ مایوس ہو گئے کیونکہ نفس برابر سرکشی پر مائل رہا۔ آپ نے اس سلسلے میں حضرت خضرؑ کی راہنمائی چاہی لیکن کچھ دیر کے لیے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ حضرت خضرؑ نے بھی دست کشی اختیار کر لی ہے۔ آپ نے عاجز آ کر دریا میں چلائی لگا دی کہ اس سے تو موت ہی بہتر ہے لیکن جیسے جیسے آپ ڈوب جانے کی کوشش فرماتے ہو جیسے آپ کو اوپر ہی اوپر رکھتی ہیں یہاں تک کہ دریا کی چند سرکشی اور تیز لہروں نے آپ کو ساحل پر لا ڈالا۔ آپ نے بڑی رقت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اے اللہ! العالمین! تیری ذات کتنی پاکیزہ ہے کہ جس نے میرے نفس کو نہ تو فردوس ہی کے لائق چھوڑا اور نہ ہی جہنم کے لائق۔ میں حیرا شکر یہ کس طرح ادا کروں۔“

آپ نے شادی کر لی کہ شاید نفس اسی طرح قابو میں آجائے لیکن دوسو سے اور اس نوع کے دوسرے خیالات آپ کو پریشان کرتے رہتے۔ آپ بے حد پریشان رہنے لگے۔ آپ کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ آپ نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور اس نام کی نسبت سے آپ کی کنیت ابو عبداللہ قرار پائی۔

آپ کے ضبط و احتیاط کا یہ حال تھا کہ اپنی بیوی کے سامنے بھی ناک وغیرہ صاف نہیں کرتے تھے۔ کسی بزرگ نے آپ کے ضبط و احتیاط کا ذکر کسی شخص سے کیا تو وہ آپ کو دیکھنے چلا آیا۔ آپ سے مل کر وہ آپ کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور کسی قسم کی بات چیت نہیں کی۔ آپ چند لمبے اسے دیکھتے رہے پھر پوچھا۔ ”تیرا مجھ سے کوئی کام ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، بس یونہی دیدار کو چلا آیا۔“

آپ نے کہا۔ ”تیری صورت پر تو کچھ اور ہی لکھا ہے۔“

اس شخص نے پوچھا۔ ”میری صورت پر کیا لکھا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔“

آپ نے اسی وقت اس کے سامنے اپنی ناک صاف کی اور کہا۔ ”اے شخص! تو نے میرے بارے میں جو کچھ سنا ہے، درست ہے اور اب یہ جو کچھ دیکھ رہا ہے یہ ظاہر ہے، میرا ظاہر کیونکہ اسراشائی ظاہر کر دینے والا مقرب بارگاہ نہیں رہتا۔“

ایک بار آپ سخت بیمار ہو گئے۔ اس بیماری نے آپ کو اس لائق بھی نہ رکھا کہ اوراد و وظائف کے معمولات کو بخیر جاری رکھ سکے۔ ایک دن بڑی بے بسی سے سوچا کہ اگر میں بیمار نہ ہوتا تو میرے اوراد و وظائف میں کی نہ ہوتی، کچھ اضافہ ہی ہوتا۔ آپ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ان کے کانوں میں سینیاں ہی بجنے لگیں۔ آپ ان سینوں کی آواز میں کھو گئے اور اس دوران یہ محسوس کیا کہ ان سینوں کی آوازوں میں کوئی ان سے کہہ رہا ہے۔ ”اے ابن علی! تو کتنا نادان انسان ہے جو اللہ کی مصالح پر اعتراض کر رہا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ تیرا کام سہوار میرا کام راستی پر منحصر ہے۔“

آپ اس آواز سے بہت شرمندہ ہوئے اور توبہ و استغفار کرنے لگے۔ اس کے بعد آپ نے عبادت و ریاضت میں اضافہ کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر کافی ہو چکی تھی اور عورت والے واقعے کو چالیس سال گزر چکے تھے۔ آپ خلق خدا کو قائم رہے پہنچانے کے لیے طبابت کرنے لگے تھے۔ صبح، دوپہر، شام غرضیکہ جب دیکھیے لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے اور لوگ آپ سے دعاؤں کی خواہش کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ایک دن آپ حلقے میں بیٹھے ماضی کی سیر کر رہے تھے، کچھ بعد دیگرے سارے ہی مناظر سلسلے وار گزرنے لگے۔ اس میں اس عورت کا بھی خیال آیا۔ آپ نے گہرا کر سوچنا چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کرنے لگے۔ اسی دن شام سے ذرا پہلے مریضوں نے آپ کو گھیر لیا تھا۔ آپ نہایت توجہ سے ان کا حال پوچھنے پر معائنہ کرتے اور اس سے فارغ ہو کر لٹخ لکھ دیتے۔ انہی مریضوں میں ایک عورت بھی تھی۔ یہ عورت ہذیان جیسی کیفیت کا شکار تھی اور اس وقت اس کی عمر ساٹھ یا اسی سال سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ آپ نے عورت سے پوچھا۔ ”تیری یہ کیفیت کب سے ہے؟“

حکیم الاولیا

عورت نے آپ کو غور سے دیکھا، بولی۔ ”یہ مجھ سے پوچھتے ہو کہ میری یہ حالت کب سے ہے؟ یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں اپنی عمر کے کس حصے میں ہذیان کا شکار نہیں تھی۔“

آپ نے کہا۔ ”اچھا ابھی بتا دیجیے۔“

عورت نے کہا۔ ”ابن علی! مجھے تو تم بہت ہی سیدھے معلوم ہوتے ہو، کیا تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے تجھے پہچانا کیوں نہیں، تو وہی زلیخا ہے جس نے جوانی میں مجھے گناہ کی ترغیب دی تھی اور میں بچ نکلا تھا۔“

عورت ہنسنے لگی، بولی۔ ”وہ بھی کیا دن تھے؟ بہ خدا میں آج بھی انہی دنوں کے لطف اور لذیذ تصورات کے سہارے زندگی کے بچہ شب و روز گزار رہی ہوں ورنہ اب رہ گیا کیا ہے مجھ میں؟“

آپ نے کہا۔ ”اچھا اب تو ایک بات بتانے۔ چالیس سال پہلے باغ میں، میں نے خود کو بہ مشکل پہچایا تھا۔ اب جب تو خود اپنی اس حرکت پر غور کرتی ہے تو کیا محسوس کرتی ہے؟ شرمندہ ہوتی ہے یا نہیں؟“

عورت زور زور سے ہنسنے لگی، بولی۔ ”شرمندگی؟ کیسی شرمندگی، کس بات کی شرمندگی؟ میں تو آج تک اس ناکامی پر افسوس کرتی رہتی ہوں کہ آخر میری تدبیر میں وہ کون سا نقص باقی رہ گیا تھا کہ جس نے مجھے ناکام رکھا تھا۔ خواہش وصال جس نے مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ میں تنہا اس باغ تک چلی گئی تھی۔ آج بھی حسرت بن کر میرے دل میں جا گزیں ہے۔“

آپ نے لاحول پڑھی اور کہا۔ ”اس کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دل پر واقعی مہر لگا دی ہے اور اس کو بدل دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔“

اس عورت نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ ”کیا تو نے اس ناکامی پر جو میری ہی نہیں، تیری بھی ناکامی تھی، آج تک کوئی افسوس محسوس نہیں کیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنی ناکامی پر نہیں، اس غلطی پر ضرور افسوس کیا تھا کہ میں نے اس دن تجھے اتنا وقت کیوں دیا تھا آخر؟ فوراً ہی کیوں نہیں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔“

عورت نے کہا۔ ”اگر تواب بھی راہ راست پر نہیں آیا اور اسی انداز میں سوچ رہا ہے جس طرح چالیس سال پہلے سوچا کرتا تھا تو میں تجھ سے اپنا علاج نہیں کرواؤں گی کیونکہ میرے خیال میں تو خود ایک کہنہ مرض کا شکار ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا تجھے شفا دے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اور تیرا مرض یہ ہے کہ تو اپنا زہنی توازن کھو چکی ہے، جس سے صحت یابی کو بیماری اور بیماری کو صحت یابی سمجھتی رہتی ہے۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔“

عورت ہنستی، قہقہے مارتی چلی گئی لیکن آپ کے دل میں ایک طوفان برپا کر گئی۔ پرسکون تالاب میں ہتھر پھینک کر ہلکورے پیدا کر گئی۔ اس دن آپ بہت پریشان رہے۔ آپ کے نفس نے ایک بار پھر سرکشی اختیار کی اور آپ غیر ارادی طور پر سوچنے لگے۔

”کیا یہ عورت درست کہتی تھی کہ چالیس سال پہلے مجھے جو ایک شاندار موقع ملا تھا کہ میں اس سے حظ واصل اٹھاؤں اور میں گہرا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ کیا میں نے بھاگ کر غلطی نہیں کی تھی؟ اگر میں لطف اندوز ہو لیتا اور اس کے بعد توبہ کر لیتا تو کیسا رہتا؟ شاید یہ میری بہت بڑی غلطی اور بھول تھی۔ یہ عورت درست ہی کہتی تھی کہ میں نے غلطی ہی کی تھی جو قائمہ اٹھائے بغیر ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔“

رات دیر تک اسی طرح سوچتے رہے لیکن جب صبح بیدار ہوئے اور رات کی باتوں کا خیال آیا تو اپنے دل میں بے حد نادم ہوئے۔ وہ خود پر لعنت ملامت کرنے لگے کہ انہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ وہ اسے ایک بڑا گناہ خیال کر کے گھر سے نکل گئے اور

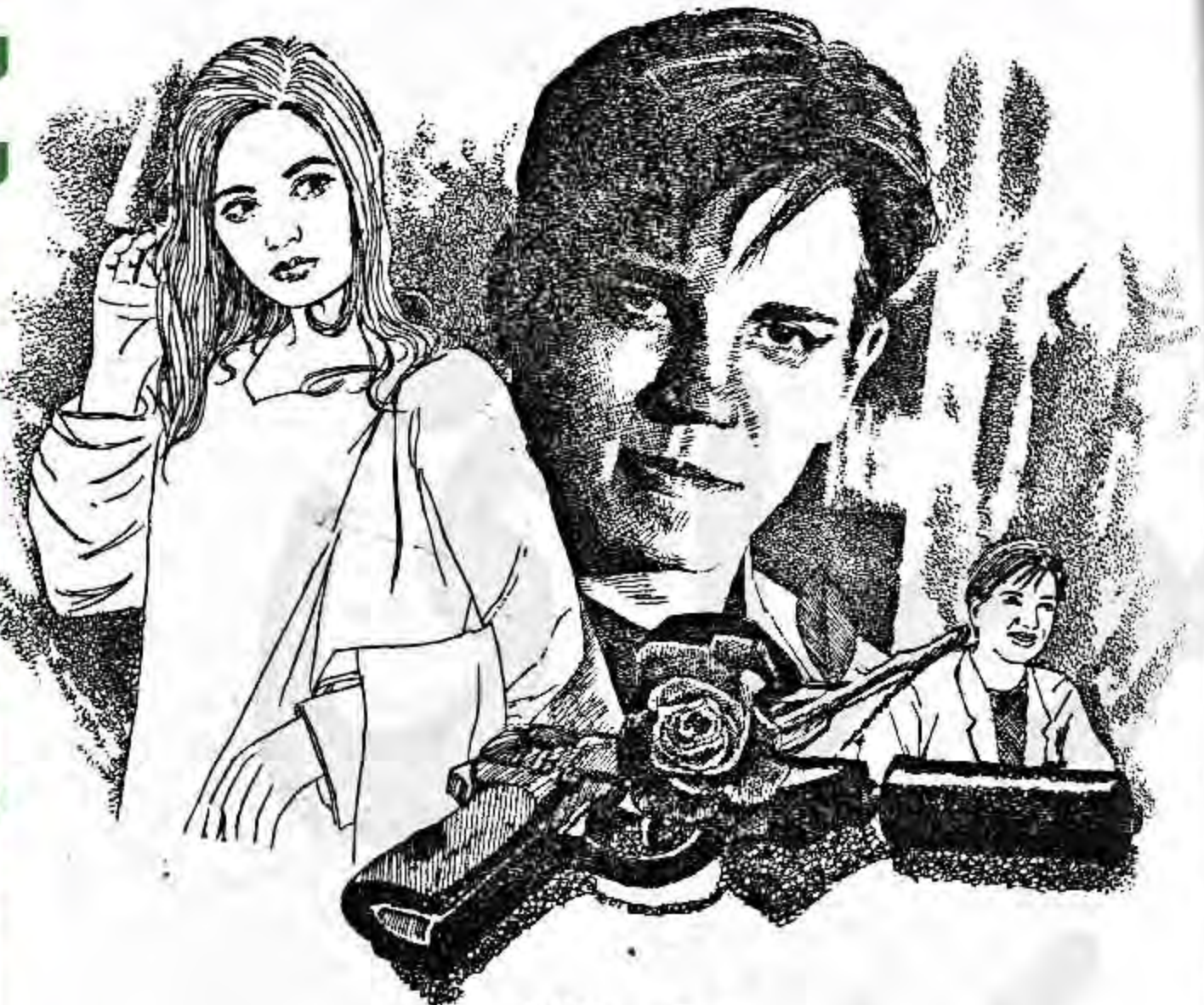
نیں دن تک پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر چوتھے دن آپ نے خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ ”اے ابن علی! تمہاری فحالت اور ہشیانی ہمیں بہت پسند آئی اور اسی صلے میں تمہیں اتنا بڑا امر تہیہ ملا ہے۔ اب تو تمہیں اس پر خوش ہونا چاہیے نہ کہ تم اداس اور طول نظر آ رہے ہو۔“

ابن علی نے کہا۔ ”میں خوش ہوں اور اس لیے خوش ہوں کہ میرا رب خوش ہے۔“

اسی دن شام کو آپ نے وعظ میں فرمایا۔ ”لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ خناس کیا چیز ہے؟“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”نہیں، ہم لوگ نہیں جانتے کہ یہ خناس کیا چیز ہے۔ آپ ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔“

آپ نے کہا۔ ”میں ضرورت بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ تم سب کو خناس کی بابت کچھ بتا دیا جائے۔“



مستقبل

سریم کے حنان

مستقبل ہمیشہ حال کا آئینہ ہوتا ہے گویا... مستقبل کی کمزوری حال کی تباہی کا کھلا اشارہ ہے... مغربی معاشیہ کی آزاد خیالی جہاں ترقی کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے وہاں مستقبل کے معماروں کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہے مگر... کیا کیجیے کہ اپنے پیروں پر کلہاڑی بھی تو انہی بڑوں نے ماری ہے۔ ان معماروں کو اگرچہ جرم کا ادراک تو نہ تھا مگر لمحاتی تسکین کی خاطر وہ ایک جنون میں مبتلا تھے اور اچھا نظر آنے کے دھوکے میں مسلسل ہرائی کی جانب محو سفر تھے۔

شہزادوں کی سرزمین پر مندی عقل کے عجیب تماشے

وین اسکول بس سے اترا اور ست قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ چونکہ اسکول کے آخری سال کا طالب علم تھا اور سولہ سال کا ہو چکا تھا اس لیے اسکول بس اسے گھر کے سامنے اتارنے کی پابند نہیں تھی۔ وہ اسے گھر کے نزدیکی بس اسٹاپ پر اتارتی اور صبح وہیں سے پک کرتی تھی۔ وین رتھ فورڈ کے گھر والے پچھلے سال ہی نیلی فورنیا کے ایک چھوٹے قصبے سے لاس اینجلس منتقل ہوئے تھے۔ یہ بڑا شہر تھا اور نصف امریکا کے خواہوں کا شہر تھا، کیونکہ ان کی

لوگ خاموشی سے آپ کا دھڑکنے لگے۔
آپ نے فرمایا۔ ”لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایلینس کھان رہتا ہے؟“
لوگوں نے جواب دیا۔ ”ہمیں نہیں معلوم، آپ ہی ارشاد فرمائیں۔“
آپ نے کہا۔ ”ایلینس کی جائے قیام نفس ہے۔ اس لیے سارے ہی برگزیدہ لوگ ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کی خطائیں معاف کر دی تھیں اور یہ دونوں ایک ساتھ رہنے لگے تھے تو ایلینس آدمی کی شکل میں حوا کے پاس پہنچا تھا کہ اے نیک بی بی! چند دنوں کے لیے میرے بیٹے خناس کو اپنے پاس رکھ لے، میں سفر پر جا رہا ہوں جب واپس آؤں گا تو اسے اپنے پاس ہی رکھ لوں گا۔“
حوانے اسے رکھ لیا اور جب آدم آئے اور حوا کے پاس خناس دیکھا تو پوچھا۔ ”اے حوا یہ کون ہے؟“
حوانے جواب دیا۔ ”خناس، ایک شخص اسے چھوڑ گیا ہے جب واپس آئے گا تو لے جائے گا۔“
آدم نے کہا۔ ”حوا! یہ تو نے بہت برا کیا جو خناس کو اپنا سہمان بنا لیا۔“ اس کے بعد آدم نے خناس کو قتل کر دیا اور اس کے جسم کے ٹکڑوں کو ادھر ادھر ڈال دیا۔ شام کو جب ایلینس گھر میں داخل ہوا تو داخل ہوتے ہی اس نے خناس کی بابت پوچھا۔ ”حوا! یہ خناس کہاں چلا گیا؟“
حوانے بڑے افسوس سے کہا۔ ”افسوس کہ اسے ضائع کر دیا گیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔“
ایلینس نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا، میرے خناس کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“
اس کے بعد ایلینس نے خناس کو آواز دی، خناس کی طرف سے فوراً ہی جواب ملا۔ ”باوا جان! میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“ اس کے بعد وہ واقعی ایلینس کے دروازے پر کھڑا ہوا۔ حوا حیران رہ گئیں۔
دوبارہ حوانے خناس کو پھر رکھ لیا اور آدم نے ایک بار پھر اسے کھڑے کھڑے کر کے درختوں میں ان ٹکڑوں کو لٹکا دیا۔ ایلینس نے پھر آواز دی اور خناس ایک بار پھر دوڑتا ہوا ایلینس کے پاس پہنچا اور خوشی میں اچھلنے کودنے لگا۔
تیسری بار پھر ایلینس نے خناس کو حوا کے حوالے کر دیا اور چلا گیا۔ اس بار آدم نے خناس کے ساتھ پھر وہی سلوک کیا کہ اس کے کھڑے کر کے جلا دیا اور اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا لیکن اس دن ایلینس نے جیسے ہی آواز دی راکھ نے خناس کی شکل اختیار کر لی اور ایلینس کے سینے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔
آخری بار خناس جب گھر میں پھر نظر آیا تو آدم نے ذرا زیادہ سختی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے خناس کو قتل کر کے پکایا اور پھر حوا اور آدم نے مل جل کر اسے کھا لیا۔
جب ایلینس کو یہ معلوم ہوا تو بہت خوش ہوا، بولا۔ ”اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں، میں بھی یہی چاہتا تھا کہ خناس تمہارے جسموں میں داخل ہو جائے، سودا دخل ہو چکا۔ اب یہ انسانوں کو تباہ و برباد کرتا رہے گا۔“
یہ داستان سناتے سناتے بعد ابن علی نے کہا۔ ”وہی خناس ہم سب کے سینوں میں موجود ہمیں درغلطا، ستا رہتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس خناس کے بارے میں فرمایا۔“ الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس (وہ خناس جو انسانی سینوں میں دوسے کرتا رہتا ہے)
اس کے بعد آپ دیر تک لاجل پڑھتے رہے کیونکہ سینے کا خناس آپ کو بہت پریشان کرنے لگا تھا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے کہ ”سو بھیڑیے بکریوں کے گلے کو اتار پریشان نہیں کر سکتے جتنا ایک شیطان پوری جماعت کو تباہ کر کے نقصان پہنچا دیتا ہے۔“ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ”خدا کے سوا کسی اور کا شکر نہ کرو اور نہ ہی کسی کے آگے عاجز بنو۔“
آپ جب تک زندہ رہے لوگوں کی روحانی اور جسمانی تکالیف کا علاج کرتے رہے اور جب رخصت ہوئے تو ایک زمانے کو رلا کر رخصت ہوئے چونکہ آپ حکیم بھی تھے اس لیے بعد میں صوفیوں میں ایک فرقہ حکیمیہ کے نام سے پیدا ہوا۔ یہ حکیمیہ، محمد بن علی کے مسلک سے تعلق رکھتا ہے اور انہی کے نام پر اس فرقہ کا نام رکھا گیا اور خود آپ کو حکیم الاولیاء کا لقب دیا گیا۔

الطبقات الکبریٰ علامہ عبد الوہاب الشعرانی۔ مروضة الراحمین، امی محمد عبد اللہ
سفینہ الاولیاء شہزادہ داسر شکرہ۔ تذکرۃ الاولیاء شیخ فرید الدین عطار

ماخذات

پسندیدہ ترین سلی برٹیز اسی شہر میں رہتی تھیں۔ وین کا باپ جون رتھ فورڈ ایک بینک میں ملازم تھا اور اس کا یہاں تبادلہ ہوا تھا حالانکہ وہ اپنے پرسکون قصبے کو چھوڑ کر یہاں نہیں آنا چاہتا تھا مگر وہ بینک برانچ ہی بند ہو گئی جس میں جون کام کرتا تھا اور اس کا فاضل عملہ لاس اینجلس منتقل کر دیا گیا تھا۔ کساد بازاری کے اس دور میں جون ملازمت چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے مجبوراً اسے لاس اینجلس آنا پڑا تھا۔

خود وین کو یہ قصبہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ تنہائی پسند اور خود میں گم رہنے والا شرمیل لڑکا تھا اور ابائی قصبے میں اس نے چند دوست بنا لیے تھے لیکن یہاں پر ابھی تک وہ ایک بھی دوست نہیں بنا سکا تھا۔ اسکول پارٹیوں اور دوسری تقریبات میں بھی وہ اکیلا رہتا تھا۔ ان کا گھر ڈیلا اسٹریٹ پر تھا۔ یہ خوب صورت سامکان تھا جس کے آگے بڑا سالان اور بڑی سڑک کے ساتھ دیو قامت درخت لگے ہوئے تھے۔ نیچے ایک بیڈ روم کے ساتھ لیوٹک روم اور کچن کے ساتھ ڈائننگ ایریا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا گیسٹ روم بھی تھا۔ اوپر تین بیڈ روم تھے۔ وین کی صرف ایک چھوٹی بہن میری تھی اور وہ بارہ سال کی تھی۔ میری بہت تیز اور شوخ تھی اور اسے اپنا چپ چاپ رہنے والا بھائی بالکل پسند نہیں تھا۔ خود وین بھی اپنی شور مچانے والی بہن کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ اس کا شکر گزار بھی تھا کہ وہ ماں باپ کی توجہ خود پر رکھتی تھی اور انہیں وین پر توجہ دینے کا موقع کم ملتا تھا، کیونکہ وہ ماں باپ کی توجہ سے بھی ابھرنے لگتا تھا۔

اس رات ڈنر پر اچانک ہی جون نے اس سے اسکول کا پوچھ لیا۔ ”تم نے کوئی دوست بنایا؟“

”نہیں پاپا۔“ وہ بولا۔

اس کی ماں ابھی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کوئی دوست نہیں بنایا۔۔۔ مگر کیوں وین؟“

اس نے شانے اچکائے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نے تڑخ کر کہا۔ ”ماما اسے کپڑے پہنے کا ڈھنگ نہیں ہے تو کوئی اس کا دوست کیوں بنے گا۔“

”تم اپنے کپڑوں پر دھیان دیا کرو۔“ ابھی نے بیٹی کی تائیدی۔ ”گئی بارتم بالکل مس کچھ کپڑے پہنے ہوتے ہو اور بن فلڈ لگ لیتے ہو۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ وین نے جان چھڑانے کے لیے وعدہ کیا لیکن اگلے روز جب وہ اسکول جانے لگا تو اس نے اپنے کپڑے نکال کر دیکھے اور پھر سر می پتلون پر ایک ہلکے سرمی رنگ کی ٹی شرٹ لی جس پر دھاریاں تھیں اور اوپر

سے سفید اور ہلکے سرخ رنگ کی چھوٹے چیک والی شرٹ پہن لی۔ اس نے ٹین کلمے رہنے دیے تھے۔ اس نے آئینے میں دیکھا تو اسے اچھا لگا تھا۔ اس روز اسکول کی کئی لڑکیوں نے اسے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ خاص طور سے اس کی کلاس میں پڑھنے والی کیرن اسے بار بار دیکھ رہی تھی۔ کیرن نازک نقوش والی لڑکی تھی لیکن اس کا جسم متناسب اور مضبوط تھا۔ وہ اسکول کی بیڈ مشن ٹیم میں شامل تھی۔ اسٹریٹ میں وہ وین کے پیچھے کینے ٹیریا تک آئی۔ اپنے لیے سچ لے کر وہ اسی کی میز پر آ گئی۔

”ہائے۔۔۔“ وین کی قدر زوریں انداز میں بولا۔

”تم کسی کے ساتھ نہیں ہو؟“ کیرن نے بے تکلفی سے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔“

وین جانتا تھا کیرن کا لونی اور باربرا کے ساتھ گروپ تھا۔ وہ ساتھ ساتھ رہتی تھیں اور لڑکوں کو منہ نہیں لگاتی تھیں۔ حاسد لڑکوں نے انہیں لڑین مشہور کیا ہوا تھا لیکن سب جانتے تھے ان میں ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے وین کو حیرت ہوئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم لڑکوں سے تو دوستی نہیں کرتی ہو؟“

”ہاں لیکن تمہاری بات دوسری ہے۔“ کیرن مسکرائی تو وین سحر زدہ رہ گیا۔ آج تک کسی لڑکی نے اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

”میں۔۔۔ میں تیار ہوں۔“ وین بولا۔

”آج ایک پارٹی ہے، چلو گے؟“

وین ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”میں چلوں گا۔“

کیرن خوش ہو گئی۔ ”میں تمہیں پتا ایس ایم ایس کر دوں گی۔“

میں روانہ ہو گئے۔ پارٹی ایک بڑے گھر میں تھی جو خاصے پوش علاقے میں تھا۔ یہاں بے شمار لڑکے لڑکیاں پارٹی میں شامل تھے۔ میوزک کے تیز شور کے ساتھ نشے میں دھت نوجوانوں کا شور بھی شامل تھا۔ ایک طرف پول پارٹی جاری تھی اور دوسری طرف مکان کے اندر ڈرنک پارٹی تھی۔ وہ اندر آئے۔ وین پہلے بھی کئی بار اس قسم کی پارٹیوں میں آچکا تھا مگر اکیلے ہونے کی وجہ سے وہ پورے گھر کو دھنچکا چلا گیا۔

مگر آج کیرن کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اسے مزہ آ رہا تھا۔ وہ اس کا تعارف دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں سے کرا رہی تھی اور وین کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سب اسے جانتے تھے اور اس سے بہت اچھے طریقے سے مل رہے تھے۔ کیرن کسی لڑکے سے بھی زیادہ پُر اعتماد تھی۔ وین نے دل میں اعتراف کیا کہ اس میں کیرن کے اعتماد کا دھواں حصہ بھی نہیں تھا۔ وہ وین کو ایک کمرے میں لائی۔ یہاں ایک لمبے بالوں والا نوجوان گھوم رہا تھا اور سب اس سے کوئی چیز لے رہے تھے۔ کیرن اس کی طرف بڑھی اور کچھ ٹوٹ اس کی منجھی میں دبا دیے جواب میں اس نے ایک چھوٹی سی پڑیا کیرن کے حوالے کر دی۔ کیرن واپس آئی تو وین نے سوال کیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”کوئین۔“ کیرن نے نارمل لہجہ میں کہا۔

”کوئین؟“ وین کھبرا گیا۔ ”یہ نشہ ہوتا ہے۔“

”کم آن، کیا تم نے شراب نہیں لی، اس میں نشہ نہیں ہوتا؟“

”ہوتا ہے۔“ وین نے اعتراف کیا۔

”اسی طرح کوئین بھی نشہ ہے، آؤ میرے ساتھ۔“

کیرن اسے ایک کمرے میں لائی یہاں کئی لڑکے اور لڑکیاں پہلے ہی بے حال پڑے تھے وہاں شیشے کی میز تھی۔ کیرن نے پڑیا کا پاؤڈر میز پر ڈالا اور پھر اسے چار حصوں میں تقسیم کر کے انہیں لائن کی صورت میں سیدھا کر دیا۔ پڑیا کے ساتھ ایک چھوٹی سی ٹنگی بھی ملی تھی۔ کیرن نے ٹنگی ناک سے لگائی اور ایک لکیر کے ساتھ اس کا دوسرا سرا لگاتے ہوئے زور سے سانس کھینچی اور ساتھ ہی ٹنگی کو حرکت بھی دی۔ سارا پاؤڈر ہوا کے ساتھ گھٹ کر کیرن کی ناک میں چلا گیا۔ اس نے سرا پر کیا اور جیب سی آواز نکالی پھر سر جھٹکا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ وہ ہنسی اور ٹنگی وین کی طرف بڑھادی۔ ”اب تمہاری باری ہے۔“

وین نے ٹنگی میں سر ہلایا۔ مگر کیرن نے اصرار کیا اور ٹنگی اسے تھمادی۔ وین نے ہچکچاتے ہوئے ٹنگی ناک سے لگا کر زور سے سانس کھینچا تو اسے لگا جیسے کوئی سچ اور میسلی سی

چیز اس کی ناک سے ہوتی اس کے دماغ میں گھس گئی ہو، اسے جھٹکا لگا اور کچھ دیر کے لیے آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ پھر دماغ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا تو وہ بالکل کیرن کی طرح ہنسا۔ کیرن نے اس سے ٹنگی لی اور کچھ دیر بعد دوسری لکیر بھی ناک میں اتار لی۔ وہ عادی تھی اس لیے برداشت کر گئی مگر وین کا سر جھکا رہا تھا اس لیے اس نے مزید لینے سے انکار کر دیا۔ کچھ دیر بعد کیرن نے آخری لکیر بھی استعمال کر لی۔ لونی اور باربرا ہرپتا نہیں کہاں تھیں؟

کیرن اور وین کچھ دیر اندر رہے۔ وین نے بیٹری تھی لیکن کیرن نے اسکا جلی۔ دو گھنٹے بعد اس نے وین سے کہا۔ ”باہر چلو۔۔۔“

وین کو مزہ آ رہا تھا اس نے پوچھا۔ ”کیوں۔۔۔؟“

”ایک کام ہے۔“

وہ باہر آئے اور ایک سڑک پر چلنے لگے۔ یہاں دونوں طرف عالی شان مکانات تھے اور سڑکوں پر لائن سے مہنگی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کیرن نے چلتے چلتے اچانک ایک گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا، کیرن اگلی گاڑی کی طرف چل پڑی۔ وین بوکھلا گیا وہ کیرن کے پیچھے لپکا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

”دیکھ رہی ہوں کوئی کار کھلی ملے تو کچھ ہاتھ آئے؟“

”کیا مطلب؟“

کیرن نے ایک گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ کھل گیا اس نے اندر گھس کر کلوڈز چیک کیا پھر سن بلاک ہٹایا تو ایک پرس نیچے گرا۔ اس میں گاڑی کے کاغذات تھے ساتھ ہی کچھ رقم بھی تھی۔ کیرن نے وہ رقم نکال کر پرس واپس رکھ دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے وین کو ٹوٹ دکھائے۔ ”یہ مطلب!“

”یہ چوری ہے؟“ وین نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”بے وقوف یہ ہم چندہ لے رہے ہیں۔“ کیرن نے کہا۔ ”تم جانتے ہو جو کوئین میں نے لی تھی اس کی کیا قیمت ملے گی؟“

وین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے پاپا اچھا کما رہے ہیں لیکن مجھے بھی اتنا جیب خرچ نہیں ملتا مجھے پورے ہفتے کے لیے سوڈا لڑتے ہیں۔“

”میرے ڈیڈی اتنا بھی نہیں دیتے۔“ کیرن بولی۔ ”لونی اور باربرا بھی ہماری طرح ہیں۔ ہمارے خرچے بہت ہیں، اسی طرح پارٹیوں میں آنا، پھر اچھی ڈریسنگ کرنا اور ٹائٹ فٹس جانا ان سب کے لیے بڑی رقم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ملیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہمیں سیکڑوں ڈالرز والی بھی نہیں ملتی ہیں۔“
وین کو حیرت ہوئی۔ ”ہزاروں ڈالرز والی چیزیں...؟“
”ہاں یہ دیکھو، کرسی روز نے یہ جو جوتے پہن رکھے ہیں ان کی قیمت ساڑھے تین ہزار ڈالرز ہے اور اس کے پاس ایسے درجنوں جوتے ہیں۔ سپر ماڈل ماہیلا کے وارڈ روم میں سیکڑوں قیمتی ملبوسات ہیں۔“
کیرن اسے سائنس کھول کر دکھانے لگی جس میں ہالی ووڈ کی سلی برٹیز کے گھروں میں ان کے وارڈ روم اور استعمال کی دوسری چیزوں کا ذخیرہ دکھایا گیا تھا۔ یہ چیزیں ایسی اور اتنی تعداد میں تھیں کہ عام آدمی ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جیسے مشہور اداکار جیمسن برگ کے پاس درجنوں ڈائمنڈز روئیس گھڑیاں تھیں اور ان میں سے اکثر خاص طور سے اسی کے لیے ڈیزائن کی گئی تھیں۔ لونی اور باربرا آگئیں اور وہ بھی ان کے مشغلے میں شامل ہو گئیں۔ وہ چاروں کمرے تھے اور ان کے اندر خواہشات بہت زیادہ تھیں۔ وہ چاروں ہائی اسکول کے آخری گریڈ کے طالب علم تھے اور ان کے گھر والے چاہتے تھے کہ وہ اچھی تعلیم حاصل کر کے اپنا کیریئر بنائیں۔
لونی نے حسرت سے کہا۔ ”کاش کہ ہم یہ سب حاصل کر سکیں۔ مجھے اچھے کپڑے چاہئیں۔“
کیرن نے کہا۔ ”میں اچھی مہنگی کارڈرائیو کرنا چاہتی ہوں۔“
”مجھے مہنگے جوتے اچھے لگتے ہیں۔“ باربرا بولی۔
”ہم کر سکتے ہیں۔“ وین نے اچانک کہا، وہ تینوں حیران ہو گئیں۔
”وہ کیسے؟“ کیرن نے پوچھا۔
وین نے لیپ ٹاپ اسکرین پر نظر آنے والی تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان سلی برٹیز کے گھر سے۔“
”مطلب؟“ لونی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، سمجھ میں تو کیرن اور باربرا کے بھی نہیں آیا تھا۔
”دیکھو، اکثر سلی برٹیز اکیلے رہتے ہیں۔ ان کے گھر پر کوئی ملازم بھی نہیں ہوتا جیسا کہ ہم نے نیٹ پر دیکھا ہے۔ شوٹنگ اور تقریبات میں شرکت کے لیے یہ گھر سے باہر زیادہ رہتے ہیں اور گھر میں کم ہوتے ہیں۔ جب یہ گھر سے باہر ہوں تو ہم ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“
کیرن پرجوش ہو گئی۔ ”زبردست آئیڈیا ہے۔“
لونی نے اسے گھورا۔ ”یہ کیسے پتا چلے گا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیں یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“
”وہ بھی..... اور تم لوگ اس سے پہلے بھی یہ سب کرتے رہے ہو؟“
”بالکل، ہم ان کاموں کے لیے اسی طرح تو رقم حاصل کرتے ہیں۔“
وین کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ یہ تینوں محسوم اور کمسن لڑکیاں جرم کر کے رقم حاصل کرتی تھیں اور اس رقم کو وہ منشیات اور تفریحات میں خرچ کرتی تھیں۔ کیرن نے اسی پر بس نہیں کیا تھا وہ آگے بھی گاڑیوں کو چیک کرتی رہی۔ اس نے وین سے کہا۔ ”تم دوسری طرف سے چیک کرتے رہو بعض اوقات فرنٹ سیٹ کا دروازہ ان لاک رہ جاتا ہے۔“
وین غیر ارادی طور پر اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ وہ باری باری کاروں کے دروازے کھول کر دیکھ رہا تھا ایک سیاہ مرسیڈز کا دروازہ کھلا ہوا ملا اور اس سے انہیں ایک جدید قسم کا شیب اور ایک لیڈیز پرس ملا تھا۔ کچھ دیر بعد کیرن کو ایک کامیابی اور لگی اور اس بار ملنے والی رقم اچھی خاصی تھی، یہ سو ڈالرز کے سات اور پچاس اور تیس ڈالرز کے چھوٹے نوٹوں پر مشتمل ہزار ڈالرز سے زیادہ کی رقم تھی۔ اس نے خوش ہو کر وین کو گلے لگا لیا۔ ”اب مزہ آئے گا۔“
وین کو اس کے گلے لگ کر ہی مزہ آ گیا تھا مگر اس نے پوچھا۔ ”کس طرح سے مزہ آئے گا؟“
”کل ہم شاپنگ پر چلیں گے۔ مجھے ایک اچھا سن گلاس اور ایک ونڈ بیگ چاہیے۔“
اگلے دن وہ ایک مہنگے سپراسٹور میں گئے جہاں کیرن نے اپنے لیے ڈھائی سو ڈالرز مالیت کا ایک سن گلاس اور ساڑھے تین سو ڈالرز کا ونڈ بیگ لیا تھا۔ پھر اس نے دوسو ڈالرز کی ایک سیٹل لی۔ باقی رقم سے اس نے وین کے لیے ایک ٹراؤزر اور ٹی شرٹ سوٹ لیا۔ وین خوش ہو گیا تھا اس کے پاس اچھے کپڑے تھے لیکن یہ جدید ترین فیشن اور ڈیزائن کے تھے۔ کیرن سے اس کی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اب اس سے گھر ملنے آتی تھی۔ جون اور ایکی خوش تھے کہ ان کے بیٹے نے سوشل سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن وہ اور کیرن انٹرنیٹ پر جدید فیشن کی چیزیں دیکھ رہے تھے۔ ان میں ملبوسات، جوتے، بیگز، گلاسز اور اسی طرح کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ سپر ماڈل اور سلی برٹیز ان چیزوں کے لیے ایڈورٹائزنگ کرتی ہیں۔ کیرن نے حسرت سے کہا۔
”یہ ہزاروں ڈالرز والی چیزیں استعمال کرتی ہیں،

”نیٹ سے۔“ وین نے کہا۔ ”اس پر ان کی تمام سرگرمیوں کی اپ ڈیٹ رہتی ہے۔“

”ہم آج ہی کوشش کرتے ہیں دیکھو کون اس وقت گھر پر نہیں ہے۔“ کیرن نے کہا تو وین نے تلاش کیا اور جلد انہیں معلوم ہو گیا کہ اداکارہ اور گلوکارہ جولیا فلاور گھر پر نہیں ہے، وہ ایک تقریب میں شرکت کے لیے لاس ویکس گئی ہوئی تھی۔ اس کا گھر بیورلی ہلز پر تھا۔ وین نے گوگل ارتھ کی مدد سے اس کے گھر کی لوکیشن نکالی اور پھر تھری ڈی گوگل کی مدد سے اس کے گھر کا چاروں طرف سے معائنہ کیا تھا۔ ذرا دیر میں وہ ساری لوکیشن سمجھ گئے تھے۔ باربرا جوش سے بولی۔

”یہ تو بہت آسان ہے۔“

”ہاں، لیکن انٹرنیٹ سے ہم گھر میں نہیں گھس سکتے۔“

”اس کے لیے ہمیں وہاں جانا ہوگا۔“

”ہم آج ہی جا سکتے ہیں۔“ کیرن فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

رات نو بجے وین خاموشی سے گھر سے نکل آیا۔ اس نے سیل فون اور اپنا پرس گھر میں چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ کوئی شناخت والی چیز ساتھ نہیں رکھنی ہے۔ ویسے بھی اب وہ بڑا ہو گیا تھا اس لیے اس کے گھر سے دیر تک باہر رہنے کے لیے ماں باپ کو بتا کر جانا ضروری نہیں تھا۔ وہ چاروں بیورلی ہلز کے پاس ایک پارک میں جمع ہوئے اور وہاں سے پیدل اوپر پہنچے۔ جولیا کا خوب صورت مکان ایک پہاڑی کے کنارے پر تھا جہاں سے شہر کا نظارہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ مکان کئی سطحوں پر تھا وہ سامنے والے حصے سے اندر داخل ہوئے مگر فرنٹ ڈور بند تھا۔ اس لیے انہوں نے عقب میں سوئنگ پول کے ساتھ شیشے کے سرکٹے والے دروازوں پر طبع آزمائی کی۔ پہلا دروازہ بند تھا۔ وہ طے کر کے آئے تھے کہ کوئی شیشہ نہیں توڑتا ہے ورنہ لازمی الارم بجے گا۔ وہ کسی کھلے راستے سے فائدہ اٹھانے کا سوچ کر آئے تھے۔ آخر کار انہیں ایک کھڑکی کھلی مل گئی اور وہ اس کے راستے اندر داخل ہوئے۔ وہ اندر آئے تو ان کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ مکان اندر سے کسی سیٹ کی طرح سجا ہوا تھا، سفید براق فرش شیشے کی طرح چمک رہا تھا اور وہاں جدید ترین دھات اور کرشل کا بنا ہوا فرنیچر اور دوسرا سامان تھا۔ وہ خوش تھے۔ کیرن نے کہا۔ ”کیا خیال ہے آج رات ہمیں نہ رہیں؟“

”بالکل نہیں۔“ وین بولا۔ ”بس اپنا کام کرو اور جلد

از جلد نکلو یہاں سے۔“

”کام کی ساری چیزیں اس کے بیڈروم یا وارڈروم میں ملیں گی۔“ باربر نے کہا۔ وہ اطمینان سے پورے گھر کا معائنہ کر رہے تھے اور وین مضطرب تھا حالانکہ یہ اسی کا منصوبہ تھا۔ مگر وہ اب پریشان ہو گیا تھا، اسے خیال آ رہا تھا کہ اگر پولیس آگئی یا کسی وجہ سے وہ پکڑے گئے تو کیا ہوگا؟

نچلے حصے میں جا بہ جا بہت قیمتی شوپیں اور تصاویر تھیں لیکن یہ سب ان کے لیے بیکار تھیں۔ اس لیے بالآخر انہوں نے اوپر کا رخ کیا۔ یہاں بیڈروم تھے اور جولیا کی ذاتی سنگ تھی۔ اس نے اپنے لیے دو بیڈروم مخصوص کیے تھے اور یہاں اس کے استعمال کی ہر چیز بے انتہا قیمتی تھی۔ وارڈروم خود ہال تھا جہاں بلاشبہ سیکڑوں کی تعداد میں سوٹ موجود تھے اس سے متصل جوتوں کا کمرہ تھا جس پر شاہیں ریک کی طرح لاتعداد جوتے سجے ہوئے تھے۔ میک اپ اور جیولری کے لیے الگ سے کمرہ تھا۔ وین حیران تھا کہ ایک فرد واحد کے ذاتی استعمال کے لیے اتنی چیزیں بھی ہوسکتی ہیں۔ لڑکیاں ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت وہ بھول گئی تھیں کہ وہ کہاں تھیں اور کس لیے آئی تھیں۔ پھر وین کو ہوش آیا۔

”پلیز، تم لوگ جلدی کرو۔۔۔“ اس نے کہا اور خود کلوزس کی تلاشی لینے لگا لیکن رقم اسے بستر کے نیچے رکھے ایک ڈبے سے ملی یہ سوڈا لرنز کے نوٹوں کا ایک بٹل تھا جو ربر بینڈ سے بندھا تھا، اس ڈبے میں کئی قیمتی زیور تھے لیکن وین نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ طے کر کے آئے تھے کہ جس کے ہاتھ جو لگے گا وہ اس کا ہوگا۔ کچھ رقم لوٹی کو ڈریسنگ ٹیبل کی ایک دراز سے ملی تھی۔ پھر انہوں نے جلدی جلدی پکڑے، جوتے، پرس، جیولری، پرفیومز اور میک اپ کی چیزیں سمیٹیں اور وہاں سے نکل آئے۔ نقد ساڑھے چار ہزار ڈالرز ہاتھ آئے تھے۔ اس سے اگلے دن ہی وین نے دل کھول کر شاپنگ کی۔ اس نے پکڑے، جوتے اور سن گلاسز لیے۔ کیونکہ جولیا کے گھر سے صرف لڑکیوں کی چیزیں ملی تھیں۔ پھر وہ رات ایک مہنگے ٹائٹ کلب میں گئے تھے۔ صرف دو دن میں انہوں نے ساری رقم اڑا دی۔ لڑکیوں نے پکڑے اور جوتے پہن کر اپنا شوق پورا کر لیا تو انہوں نے یہ فٹ پاتھ پر پرانے پکڑے اور جوتے بیچتے والوں کو فروخت کر دیے تھے۔ اگرچہ انہیں بس چند سوڈا لرنز ملے تھے، ان پکڑوں کے عوض جو یقیناً جولیا کو دسیوں ہزار ڈالرز میں پڑے تھے لیکن انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا ان

کے لیے یہ مال مفت تھا۔

اس کے بعد وہ زیادہ تر اعتماد ہو کر یہ کام کرنے لگے تھے۔ وہ انٹرنیٹ پر سیلی برٹیز کی سرگرمیاں تلاش کرتے اور جب انہیں پتا چلتا کہ فلاں شخص گھر میں نہیں ہے تو وہ اس کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ گھر تلاش کرنا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اگر گھر میں کہیں کیمرے لگے ہوتے تو وہ انہیں اسپرے پیسٹ مار کر ناکارہ کر دیتے تھے۔ وہ کوئی شیشہ یا لاک نہیں توڑتے تھے اس لیے الارم سے بھی محفوظ رہتے تھے اور واپسی میں عموماً کوئی کار چوری کر کے بیورلی ہلز سے نکل آتے تھے ورنہ ڈھیر سارے سامان کے ساتھ پولیس مشکوک سمجھ کر انہیں روک لیتی تو ان کے پاس پولیس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ فائل ٹرمز میں ابھی چھ مہینے باقی تھے۔ وین کا ان پکڑوں میں پڑنے سے پہلے ارادہ تھا کہ وہ اتنے نمبر حاصل کر لے کہ اسے سیل فوریا اسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں داخلہ مل جائے، وہ نیو ٹیکنالوجی میں داخلہ چاہتا تھا۔ مگر وہ جن پکڑوں میں پڑ گیا تھا ایسا لگ رہا تھا وہ اسے کہیں اور ہی داخلہ دلاتے۔

☆☆☆

پہلی بار انہوں نے کسی مرد سیلی برٹی کا گھر منتخب کیا تھا۔ جیڈ کیرٹن فلموں اور ٹی وی سیریز میں سخت جان ہیرو یا ولن کے کردار نبھاتا تھا اور اپنے حلقہ شائقین میں خاصا مقبول تھا۔ وہ لمبا ترنگا اور مضبوط جسامت کا حامل تھا۔ بیورلی ہلز کے ایک کونے میں اس کا دو منزلہ راک پبلکس الگ تھلک تھا۔ سفید رنگ کی پتھروں سے بنی اس عمارت میں خوب صورتی سے زیادہ مضبوطی کا خیال رکھا گیا تھا۔ اس کے دروازے بہت مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور کھڑکیوں پر فولادی گرل تھی۔ اندر داخلے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اس بار لوٹی اپنی چھوٹی بہن کوئی کو ساٹھ لائی تھی۔ وہ صرف بارہ سال کی تھی لیکن جسامت میں نو سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وین اور کیرن فکر مند تھے کیونکہ وہ بچی تھی اور ڈر تھا کہ کسی کو بتانہ دے مگر لوٹی نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ بچی ہے۔ اپنی زبان بند رکھے گی۔

مکان کے فرنٹ ڈور میں نیچے ایک چھوٹا سا کھلنے والا جتہ تھا۔ جیڈ کے پاس ایک خوب صورت اور چھوٹا سا کتا تھا۔ یہ کھلنے والا جتہ اسی کے لیے بنایا گیا تھا۔ کوئی اس راستے سے کسی قدر مشکل سے لیکن اندر داخل ہو گئی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ رات نو بجے مکان میں داخل ہوئے تھے۔ جیڈ کے بارے میں خبر تھی کہ وہ شوٹنگ کے

اخبار میں

دو چوروں نے چوری کی۔
ایک نے کہا۔ ”یار میسے کن لیتے ہیں۔“
دوسرا بولا۔ ”بے خوف وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ کل اخبار میں دیکھ لیں گے۔“

سوال و جواب

ایک کریا نہ فروش اپنے نالائق بیٹے کو سمجھا رہا تھا۔
”ارے نالائق۔ نیولین جب تمہاری عمر کا تھا تو فوجی جرنیل تھا اور تو ابھی تک میٹرک ہی پاس نہیں کر سکا۔“
بیٹے نے جواب دیا۔ ”ابا نیولین جب آپ کی عمر کا تھا تو بادشاہ تھا اور آپ ابھی تک لوبیا بیج رہے ہیں۔“

ذرا توجہ ادھر بھی

☆ بیوی میں اداکاری کی صلاحیتیں کب اجاگر ہوتی ہے؟
○ جب شوہر کو تنخواہ ملتی ہے۔
☆ کیا شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پی سکتے ہیں؟
○ بالکل بشرطیکہ بکری شیر کے پیٹ میں ہو۔
مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

لیے لاس اینجلس سے کچھ دور ایک صحرا میں گیا ہوا تھا جہاں وینٹرن مووی کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ اس کا کم سے کم دو دن تک واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ اندر آئے۔ یہاں تار کی تھی اور کہیں کہیں ہلکی سی روشنی تھی۔ فرنیچر بھی گھر سے رنگوں کا اور پرانے انداز کا تھا، دیواروں پر ساگوان اسٹائل کے کھیل لگے تھے اور یہ بھی تاریک تاڑدے رہے تھے وہ اب تک جتنے گھروں میں گئے تھے یہ سب سے الگ اور کچھ پراسرار لگ رہا تھا۔ کیرن نے سرگوشی میں دین سے کہا۔ ”یہاں کچھ الگ سا محسوس نہیں ہو رہا ہے؟“

”ہاں شاید، اس لیے کہ روشنی کم ہے۔“ وین نے کہا۔ ”خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“

اچانک ایک تاریک گوشے سے کتا بھونکا تو لڑکیوں کی چیخ کھل گئی اور ایک لمبے کوہ سب اچھل پڑے۔ یہ چھوٹا سا سفید بالوں والا کتا بھونکتا ہوا نمودار ہوا اور دوستانہ انداز میں دم ہلانے لگا۔ کیرن نے بے ساختہ اسے اٹھا لیا۔ ”اف، کتنا پیارا ہے۔“

گونی نے کتے کو گود میں لے لیا، اسے وہ زیادہ ہی اچھا لگا تھا۔ کچھ دیر میں سب پرسکون ہوئے تو انہیں خیال آیا۔ کیرن نے کہا۔ ”چلو کام شروع کرو، یہ بیکس بہت بڑا ہے۔“ راک بیکس کی مستطیل عمارت تقریباً سو فٹ لمبی اور تقریباً ستر فٹ سے زیادہ چوڑی تھی۔ اس کی دو منزلیں تھیں اور سب سے اوپر وسط میں وہائٹ ہاؤس جیسا ایک گول گنبد جیسا بنا ہوا تھا۔ یقیناً اس میں بہت سارے کمرے تھے کیونکہ عمارت خاصے بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ درمیانی عمارت کے مرکزی ہال میں داخل ہوئے تھے اس میں دائیں بائیں سے دو سیڑھیاں بیک وقت اوپر جا رہی تھیں وین نے ان تینوں سے کہا۔ ”تم تینوں اوپر جاؤ، میں گونی کے ساتھ نیچے کا دیکھتا ہوں۔“

”نیچے کیا ہوگا؟“

”یہ مرد کا گھر ہے اور وہ پورا گھر استعمال کرتا ہے۔“ وین نے اندازے سے کہا۔ ”تم اوپر جاؤ اور پلیز جو کرنا جلد کرنے کی کوشش کرنا دیر مت کرنا، ٹھیک ہے؟“

کیرن نے شانے اچکائے اور وہ تینوں اوپر کی طرف بڑھ گئیں۔ وین نے کتے کو گود میں تھامے ہوئے گونی سے کہا۔ ”تم یہیں روکو گی یا میرے ساتھ رہو گی؟“

گونی نے جھرجھری لی۔ ”میں تمہارے ساتھ رہوں گی، مجھے اکیلے رہنے سے ڈر لگے گا۔“

وین نے اسے ساتھ لیا اور پہلے دائیں حصے کی طرف بڑھا۔ یہاں بڑی سی راہداری تھی جس میں جاہل جامیزوں پر شوہیں رکھے تھے، دیواروں پر پینٹنگز تھیں اور کتبیں کتبیں چھوٹے صوفے موجود تھے۔ دائیں بائیں کمرے تھے۔ وین انہیں کھول کھول کر دیکھتا رہا، ان میں سے بیشتر لاک تھے۔ جو چند ایک کھلے تھے ان میں کچھ خاص نہیں تھا۔ ایک اسٹڈی تھی اور ایک شاید گیسٹ روم تھا باقی سب کمرے بند تھے۔ وین نے گیسٹ روم اور اسٹڈی میں جھانکا۔ اسے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ وین واپس آیا پھر اس نے بائیں طرف کا حصہ دیکھا۔ یہاں کچن، ڈائننگ ہال، ایک چھوٹا لیونگ روم اور چند کمرے تھے۔ کمرے سارے بند تھے۔ وین نے فرنگ کھولا اور اس

میں موجود اعلیٰ درجے کی اٹالین چاکلیٹ کا ڈبا نکال کر گونی کو تھما دیا۔ ”لو کمرے کرو۔“

وہ خوش ہو گئی تھی۔ اپنے لیے وین نے براڈری کی چھوٹی بوتل نکالی لیکن اس سے پہلے وہ بیکس کی مکلی بوتل سے چند گھونٹ لینا نہیں بھولا تھا۔ ان چند گھونٹوں میں وہ بہت تیزی سے شراب، کوکین اور سگریٹ کا عادی ہو گیا تھا۔ اس نے بوتل کھولی اور اس سے گھونٹ لینا ہوا درمیانی ہال کی طرف آیا، نیچے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی۔ گونی نے چاکلیٹ کا ڈبا اور کتے کو سنبھالا ہوا تھا اور وہ خود کھانے کے ساتھ ساتھ کتے کو بھی کھلا رہی تھی۔ وہ ہال کے صوفے پر بیٹھ گئی اچانک کتا اچھل کر فرش پر آیا اور بھونکتا ہوا عمارت کے دائیں حصے کی طرف بھاگا۔ گونی چلائی۔ ”اسے روکو۔۔۔“

”تم یہیں بیٹھو۔“ وین نے کہا۔ ”میں اسے لے کر آتا ہوں۔“

وین کتے کے پیچھے آیا وہ راہداری میں بھاگتا ہوا اسٹڈی کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور دروازے کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ وین نے اسے چونکارتے ہوئے اٹھایا اور واپسی کے لیے پلٹ رہا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا، کتا یہاں کیوں آیا تھا؟ اور وہ کس پر بھونک رہا تھا؟ کیا اس نے کسی کی موجودگی محسوس کی تھی؟ لیکن چند منٹ پہلے اس نے اسٹڈی میں جھانکا تھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کتے کو سہلاتے ہوئے وہ اندر کی سن گن لینے لگا۔ پھر اس نے ہمت کر کے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ مگر اس بار بھی اسے کوئی نظر نہیں آیا اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ اندر میز کا لیمپ روشن تھا اور اس کی روشنی کمرے کے ہر گوشے تک پہنچ رہی تھی۔ اگرچہ یہ بدہم تھی مگر سب نظر آ رہا تھا۔ وین اندر جھانکتا رہا پھر اس نے دروازہ بند کرنا چاہا تھا کہ اندر سے ہلکی سی کراہ سنا دی اور آواز نسوانی لگ رہی تھی۔

وین کو اپنے روٹنے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ آواز واضح تھی مگر یہ پتا نہیں چلا تھا کہ کمرے کے کس حصے سے آئی تھی۔ وین نے کتے کو نیچے چھوڑا تو وہ بھونکتا ہوا میز کی طرف دوڑا اور اس کے عقب میں چلا گیا۔ وہ بھونکے جا رہا تھا۔ وین محتاط قدموں سے اندر آیا اور اس نے ہچکچاتے ہوئے میز کے عقب میں جھانکا۔ کتا نیچے کسی چیز پر بھونک رہا تھا۔ وین نے جھک کر دیکھا اور پھر جھٹکے سے پیچھے گیا۔ میز کے نیچے خلا میں ایک عورت مڑی مڑی کسی ہوتی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس کا پورا جسم زخموں اور

ان سے بہنے والے خون سے ڈھکا ہوا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ اور پاؤں ری سے نہ بھی بندھے ہوتے تب بھی وہ میز کے نیچے اس خلا میں اس طرح گھسائی گئی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی تھی اور لازماً اسے یہاں پھنسا یا گیا تھا۔ چھوٹی سی جگہ میں وہ تڑمڑ رہی آئی ہوگی۔ اس کے سوجے اور نیچے چہرے پر بھی نشان ہی نشان تھے اور ایک آنکھ تو بالکل بند تھی۔

”کک... کون ہو تم؟“ وین نے ہکا کر پوچھا مگر عورت نے کوئی جواب نہیں دیا وہ شاید اپنے حواس میں نہیں تھی۔ وہ بے ہوشی میں کراہی تھی۔ وین جلدی سے کتا اٹھا کر وہاں سے نکلا اور بھاگتا ہوا ہال میں آیا۔ اس نے چاکلیٹ کھاتی گونی کو کتا تھمایا اور بولا۔ ”اسے پکڑ کر رکھنا، میں ابھی آتا ہوں۔“

وین بھاگتا ہوا اوپر آیا۔ وہ دہلی آواز میں کیرن، لونی اور باربرا کو پکارتا ہوا انہیں تلاش کر رہا تھا۔ پھر ان کی ہنسی نے وین کی رہنمائی کی اور وہ ان تک جا پہنچا۔ وہ ایک کمرے میں جمع ہو کر نسوانی لمبوسات چہن کر دیکھ رہی تھیں۔ وین نے بدحواسی میں ہانپتے ہوئے کہا۔ ”جلدی... نکلو یہاں سے۔“

کیرن نے غور سے اسے دیکھا۔ ”ایک منٹ، کیا ہوا ہے؟“

وین نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”نیچے اسٹڈی میں ایک عورت زخمی حالت میں پڑی ہے۔ پلیز یہاں سے نکلو۔“

زخمی عورت کا سن کر وہ تینوں بھی پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے اب تک جو چیزیں جتنی تھیں وہ سمجھیں اور وین کے ساتھ نیچے روانہ ہو گئیں۔ وہ نیچے آئے تو وین نے گونی سے کہا۔ ”چلو اٹھو اور کتے کو یہیں چھوڑ دو۔“

”ایک منٹ۔“ کیرن بولی۔ ”یہاں صرف وہی عورت ہے؟“

”ہاں اور وہ بھی بندھی ہوئی ہے۔“

”تب ہم پہلے اسے دیکھیں گے۔“ کیرن نے فیصلہ کیا۔ ”ممکن ہے اسے طبی مدد کی ضرورت ہو۔“

وین متفق نہیں تھا لیکن ان سب میں کیرن باس تھی اور اسی کا فیصلہ چلتا تھا۔ لونی بھی فوراً نکلنے کے حق میں تھی البتہ باربرا اس عورت کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسٹڈی میں آئے۔ زخمی عورت کو دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ لونی ہکا کر بولی۔ ”یہ... یہ تو بہت زخمی ہے۔“

وین نے نیمبل لیمپ اٹھا کر عورت پر روشنی ڈالی۔ اس بار وہ کہیں واضح نظر آئی اور اس کی حالت دیکھ کر ان کے

روٹنے کھڑے ہو گئے۔ اس کے پورے جسم پر جگہ جگہ چاقو یا کسی تیز دھار آلے سے کٹ گئے تھے۔ البتہ اس کے زخم خاصے پرانے تھے، ان سے خون رستا بھی بند ہو گیا تھا۔ باربرا نے کہا۔ ”ہمیں ایمر جنسی کو کال کرنی چاہیے۔“

”ہرگز نہیں۔“ لونی نے مخالفت کی۔ ”اس طرح تو ہم خود پھنس جائیں گے۔“

”اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہ عورت مر جائے گی۔“ کیرن نے باربرا کی تائید کی۔

”یہاں فون ہے۔“ وین بولا۔ اس نے کئی جگہوں پر فون سیٹ دیکھے تھے۔ ”ہم نکلنے وقت پولیس کو کال کر سکتے ہیں۔“

”نہیں اگر پولیس جلدی آگئی تو ہم بھی پھنس سکتے ہیں۔“ لونی نے پھر کہا۔ ”پلیز یہاں سے نکلو ایسا نہ ہو کوئی اور آجائے۔“

”اور کون...؟“ باربرا نے پوچھا۔

”جس نے اس عورت کا یہ حال کیا ہے۔“

اس وقت ان کے ذہن میں آیا کہ کسی نے تو اس عورت پر یہ انسانیت سوز تشدد کیا ہوگا؟ وہ شخص کون تھا اور کہاں تھا؟ وین کو اپنے روٹنے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ”لونی ٹھیک کہہ رہی ہے ہمیں فوراً سے پشتر یہاں سے نکل جانا چاہیے اور ہم راستے میں کسی فون بوتھ سے پولیس کو کال کر سکتے ہیں۔“

کیرن قریب سے عورت کا معائنہ کر رہی تھی۔ ”یہ مجھے جانی پہچانی لگ رہی ہے۔“

”ٹھیک کہا تم نے...“ باربرا نے تائید کی۔ ”اوہ میرے خدا، میں نے اسے پہچان لیا... یہ رابین مثل ہے... یہ بھی ماڈل ہے اور جیڈ کی گرل فرینڈ ہے۔“

وہ سب بھی اسے پہچان گئے تھے۔ کیرن نے ہمت کر کے گردن پر اس کی نبض دیکھی اور تشویش سے بولی۔ ”اس کی نبض کی رفتار بہت سست ہے۔ یہ مرنے والی ہے، اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

”اسے یہاں سے تو نکالو۔ کیسے بے دردی سے پھنسا رکھا ہے اسے یہاں۔“

لونی اور باربرا اسے ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھیں، وین اور کیرن نے بہ مشکل اسے میز کے خلا سے نکالا اور قالین پر لٹا دیا۔ میز کے نیچے قالین پر اس کا خون جما ہوا تھا۔ رابین نے کوئی رد عمل نہیں دکھایا تھا۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے وہ اس کا جسم ڈھک سکتے، کیرن بولی۔ ”یہ کم سے کم ایک دن سے اس حالت میں ہے۔“

وین کو حیرت ہوئی کہ اتنی دیروہ ان زخموں کے ساتھ زندہ کیسے رہی۔ اس نے رومال سے پکڑ کر اسٹڈی کے فون کا ریسپورڈ اٹھایا، اس سے ٹون آرہی تھی لیکن جب اس نے کال کرنے کی کوشش کی تو ریکارڈ شدہ آواز آئی۔

”پلیز ان لاک ٹوا کیس۔“
”یہ بند ہے۔“ وین نے انہیں مطلع کیا کیرن نے اس سے ریسپورڈ کر سنا اور بولی۔

”یہ مرکزی سسٹم سے منسلک ہے اور جیڈ نے اس پر لاک کیا ہوا ہے جب تک وہ لاک نہیں کھلے گا یہاں سے کال نہیں کی جاسکتی۔“

”خدا کے لیے۔“ لونی رونے والی ہو رہی تھی۔ ”یہ تم لوگ کن چکروں میں لگ گئے ہو، یہاں سے نکلو اور باہر کہیں سے پولیس کو کال کرو۔ اگر کوئی آگیا تو ہم کہیں بڑے معاملے میں پھنس جائیں گے۔“

اس بار سب متفق ہو گئے۔ وہ جلدی سے اسٹڈی سے باہر آئے۔ لونی نے دستور کتے کے ساتھ چاکلیٹ کھانے میں مگن تھی اس نے کسی عورت کی یہاں موجودگی کی اطلاع کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔ لونی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہینچا۔ ”چلو یہاں سے۔“

لونی نے چاکلیٹ کا ڈبا پکڑا ہوا تھا البتہ اسے کتے کو چھوڑنا پڑا اور وہ بھونٹکا ہوا ان کے پیچھے آیا۔ لونی نے اپنی بہن سے پوچھا۔ ”کیا میں اسے لے جاسکتی ہوں؟“

”ہرگز نہیں، یہ کسی اور کا کتا ہے۔“
وہ دروازے تک آئے لیکن جیسے ہی وین نے دروازہ کھولا سامنے پورچ میں روشنی لہرائی اور اس نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو آنے والا کھلا دروازہ دیکھ لیتا۔ کیرن نے کھڑکی سے جھانکا اور گھبرا کر بولی۔ ”میرے خدا، یہ تو جیڈ ہے۔ وہ گاڑی سے اتر رہا ہے۔“

”اب کیا ہوگا؟“ لونی پھر رونے والی ہو گئی۔ ”میں کہہ رہی تھی تاکہ یہاں سے چلو۔“
”ہاں، تمہیں پہلے پتا چل گیا تھا کہ کوئی یہاں آنے والا ہے۔“ باربر نے طنز کیا۔

”پلیز آپس میں لڑو نہیں۔“ وین نے کہا۔ ”یہاں سے ہٹو۔“
وہ افراتفری میں پیچھے ہوئے اور پھر وہ دائیں طرف والی گیلری میں آ گئے۔ وین کو گیسٹ روم کا خیال آیا۔ وہ ان سب کو وہاں لے آیا۔ اس نے کہا۔ ”سب یہاں چپ کر کے بیٹھو جب جیڈ اوپر چلا جائے تو ہم خاموشی سے یہاں سے ہٹو۔“

سے نکل جائیں گے۔“
”سنا...“ لونی نے نقطہ اٹھایا۔ ”اس کا کیا کریں؟ اسے چھوڑتے ہیں تو یہ جیڈ کو ہمارے بارے میں بتا دے گا۔“
”زبان سے۔“ باربر نے پھر طنز کیا۔

”خدا کے لیے۔“ لونی بہتا کر بولی۔ ”سنا اپنے مالک کو کیسے کچھ بتا سکتا ہے کیا تم نہیں جانتی ہو۔ اگر اسے باہر نکال دیا اور یہ دروازے پر کھڑا ہو کر بھونٹنا شروع کر دے تو کیا جیڈ آکر اس کمرے میں نہیں جھانکے گا؟“
”لونی ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ وین بولا۔ ”اس کتے کا کچھ کرنا ہوگا۔“

گیسٹ روم سے متصل ایک باتھ روم تھا۔ کیرن اور لونی نے کوئی کتے سمیت وہاں بند کر دیا۔ کوئی تیار نہیں تھی اس لیے اسے جیڈ کا خوف دلایا کہ وہ ظالم آدمی ہے اگر انہیں یہاں پکڑ لیا تو بہت برا کرے گا۔ وین نے کہا۔ ”اس کتے کو چپ کرانا ورنہ یہ بھونٹ کر اپنے مالک کو بتا دے گا کہ ہم کہاں ہیں۔“

اسی اثنا میں داخلی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ جیڈ اندر آ گیا تھا۔ پھر راہداری کے فرش پر اس کے قدموں کی آواز گونجنے لگی۔ وین نے سرگوشی میں کہا۔ ”وہ ہمیں آ رہا ہے۔“

انہوں نے گیسٹ روم کا دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا، اب باہر سے اسے صرف چابی سے کھولا جاسکتا تھا۔ گیسٹ روم کا دروازہ پہلے تھا اور اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند لمحے کو قدموں کی آواز کی اور ان سب کی سانس بھی رک گئی۔ دروازہ لاک تھا مگر جیڈ کے لیے مسئلہ نہیں تھا وہ چابی سے کھول کر بھی اندر آ سکتا تھا مگر پھر آواز آگے بڑھ گئی اور انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ کیرن نے وین کے کان میں کہا۔ ”رائین مثل کا حشر کرنے والا جیڈ ہے؟“

”ہو سکتا ہے۔“ وین نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ ”وہ بے بھی مشہور ہے وہ وحشی قسم کا آدمی ہے۔ لیکن ایسا سلوک...“ وین نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جبرجبری لی۔

”وہ مرنے والی ہے اور وہ مر گئی تو یہ قتل ہو گا۔“ کیرن نے خیال آرائی جاری رکھی۔
”خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔“
”ہمیں سوچنا چاہیے، اس صورت میں جیڈ قاتل ہوگا اور اگر ہم نے یہاں سے نکل کر پولیس کو اطلاع کر دی تو وہ

پکڑا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے جیل چلا جائے گا، کیا وہ یہ چاہے گا؟“
وین نے غور کیا۔ ”ہرگز نہیں...“
”جب اسے خطرہ ہوا کہ کوئی اسے پکڑوا سکتا ہے تو وہ اس کے ساتھ کیا کرے گا؟“
جواب خاصا خوفناک تھا۔ وین نے تھوک نکل کر کہا۔ ”وہ اسے بھی قتل کر دے گا۔“
”ہم اسے پکڑوا سکتے ہیں اس لیے اگر وہ جان گیا کہ ہم یہاں ہیں تو وہ کی صورت ہمیں جانے نہیں دے گا۔“
”وہ کیسے جان سکتا ہے۔“ لونی نے مداخلت کی۔
”ہم نے رائین کو میز کے نیچے سے نکال کر غلطی کی۔ وہ بندھی ہوئی تھی اور اس کی حالت بھی ایسی نہیں تھی، جیڈ اسے دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ کسی نے اسے یہاں سے نکالا ہے اور پھر وہ ہمیں تلاش کرے گا۔“ کیرن کی پٹپٹی تصویر خاصی ہولناک تھی۔

”جب ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ باربر نے جلدی سے کہا۔ کیرن نے ٹٹی میں سر ہلایا۔
”ابھی ہم باہر نہیں نکل سکتے... جب تک جیڈ اوپر نہیں چلا جاتا۔“

باہر سے جیڈ کی ہلکی سی آواز آئی وہ کسی روکی کو پکار رہا تھا۔ یقیناً روکی وہی چھوٹا کتا تھا جو کوئی کے ساتھ واش روم میں بند تھا۔ اس نے اپنے مالک کی آواز سن لی تھی مگر کسی وجہ سے خاموش تھا بعد میں پتا چلا کہ لونی نے اس کا منہ دبایا ہوا تھا تاکہ وہ بھونٹ نہ سکے۔ وہ گھبرا گئے، لونی نے کہا۔ ”وہ کتے کی تلاش میں ہے۔“

”اب وہ لازمی یہاں آئے گا جب اسے کتا نہیں ملے گا۔“ باربر ابولی۔
”لیکن وہ پہلے اسے پورے گھر میں تلاش کرے گا جب تک وہ ہر جگہ نہیں دیکھ لے گا یہاں نہیں آئے گا کیونکہ اتنی عقل تو اس کے پاس بھی ہوگی کہ کتا بند دروازہ نہیں کھول سکتا۔“

”اسے پورا گھر دیکھنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی کیونکہ اکثر کمرے تو لاک ہیں۔“ وین نے کہا۔ ”نیچے بس یہی دو کمرے کھلے ہیں۔“
”اوپر بھی بیشتر کمرے لاک ہیں۔“ کیرن نے بتایا۔ ”صرف جیڈ کا بیڈ روم اور اس کے ساتھ والا کمرہ کھلا تھا جہاں عورتوں کے کپڑے بھی تھے۔“

وین نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پکڑا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے جیل چلا جائے گا، کیا وہ یہ چاہے گا؟“

وین نے غور کیا۔ ”ہرگز نہیں...“

وین نے غور کیا۔ ”ہرگز نہیں...“

وین نے غور کیا۔ ”ہرگز نہیں...“

وین نے غور کیا۔ ”ہرگز نہیں...“

دروازے تک آیا۔ وہ کان لگا کر سننے لگا۔ جیڈ غالباً روکی کو تلاش کرتا ہوا کچن والے حصے کی طرف گیا تھا۔ اس نے کیرن سے کہا۔ ”اب وہ اوپر جائے گا اور ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

کیرن اور باقی سب نے سر ہلایا۔ وین نے دروازہ کھولا اور لونی سے اس کا چھوٹا سا آئینہ لے کر اسے فرش کے ساتھ لگا کر باہر نکالا۔ اسے ہال کی طرف کا منظر دیکھنا تھا جیڈ جب بھی بیڈ روم سے اوپر جاتا اسی حصے سے گزر کر جاتا۔ وہ آئینے میں نہیں تھا چند لمحے بعد وہ کچن والے حصے کی طرف سے نمودار ہوا اور بیڈ روم چڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی وین کھڑا ہو گیا۔ ”بس نکلو یہاں سے۔“

”گوئی...“ لونی نے یاد دلایا۔ ”میری بہن کو چھوڑے جا رہے ہو۔“
”سنا...“ اب کیرن کو بھی خیال آیا۔ ”وہ بھونٹ بھونٹ کر اپنے مالک کو اطلاع کر دے گا۔“

باربر نے اس کا حل نکالا۔ اس نے اپنا موزہ اتارا اور روکی کے منہ پر باندھ دیا۔ اب وہ بھونٹ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی خود سے واش روم کا دروازہ کھول کر باہر آ سکتا تھا۔ وہ سب لائن سے باہر نکلے، انہوں نے اپنے اپنے جوتے اتار لیے تھے تاکہ چلنے کی آواز نہ ہو اور دبے قدموں دوڑتے ہوئے دروازے تک آئے، وین نے بے تابی سے ہینڈل گھمایا لیکن دروازہ نہیں کھلا اس نے ذرا زور آزمائی کی مگر دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ کیرن نے اسے روکا اور دروازے کے درمیان میں لگے قطار میں تین لاک کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرا خیال ہے اس نے انہیں بند کر دیا ہے۔“

یہ حفاظتی لاک تھے جو اندر اور باہر دونوں طرف سے صرف چابی سے ہی کھلتے تھے۔ لونی کا نیتی آواز میں بولی۔ ”ہم پھنس گئے ہیں، وہ جان گیا ہے ہم یہاں ہیں۔“

”لیکن وہ تو کتے کو تلاش کر رہا ہے۔“ کیرن نے یاد دلایا۔ ”اور کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں جب وہ گھر میں ہوتے ہیں تو اس طرح کے لاک لگاتے ہیں جنہیں صرف چابی سے کھولا جاسکتا ہے۔“

”ممکن ہے وہ اس طرح دھوکا دے رہا ہو۔“ وین نے کہا۔ ”کتے کے بہانے وہ ہمیں تلاش کر رہا ہو۔“

”اب یہاں سے کیسے نکلیں گے؟“ باربر نے پوچھا۔
”تم بتاؤ نا... کیا صرف سوال کرنے آتے ہیں یا اعتراض۔“ اس بار لونی نے جوابی طنز کیا۔
”پلیز خاموش رہو۔“ کیرن نے کہا۔ ”وہ تم لوگوں

کی آوازیں سن کر ہی ہمیں تلاش کر لے گا۔“

وین نے کہا۔ ”سنو، ہمیں الگ الگ ہو جانا چاہیے... تاکہ نکلنے کا راستہ تلاش کر سکیں۔ سب ایک جگہ ہوں گے تو پکڑے جانے کا امکان بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔“

اچانک لونی کو دروازے کے نیچے کتے والے خانے کا خیال آیا۔ ”کیا ہم اس سے نہیں نکل سکتے؟“

”صرف گوئی اور روکی نکل سکتے ہیں۔“ کیرن نے کہا۔

”ہم ان دونوں کو نکال دیتے ہیں گوئی باہر جا کر پولیس کو کال کر سکتی ہے۔“

”اور جب پولیس ہمیں پکڑے گی تب ہم کیا وضاحت پیش کریں گے؟“ گوئی نے سوال کیا۔

”اس وقت کی اس وقت دیکھی جائے گی۔ ابھی تو جان پر مبنی ہے۔“ کیرن نے وین کی تائید کی۔ ”ہم تینوں الگ ہو جاتے ہیں۔ گوئی وین کے ساتھ رہے گی۔“

”ہم کہاں جائیں؟“ باربر نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے تم لوگ مگن کی طرف جاؤ اور جب جیڈ اوپر سے آئے تو تم لوگ اس طرف کی سیڑھیوں سے اوپر چلی جانا۔“ وین نے مشورہ دیا۔ ”گوئی میرے ساتھ ہے میں روکی کو لے کر آتا ہوں ان دونوں کو باہر نکالنے کے لیے۔“

”میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔“ گوئی نے گھبرا کر کہا۔

”تمہیں ہمت کرنا ہوگی بے بی آؤ، میرے ساتھ۔“

وین نے اس کا ہاتھ تھاما اور راہداری میں آگیا۔ گیسٹ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئے۔ کتابچہ روم میں تھا اور بند منہ کی وجہ سے بس ہلکی سی کون کون کی آوازیں ہی نکال پارہا تھا۔ وین نے شکر ادا کیا کہ جیڈ نے اپنے جیسا لہجہ نہ نکالتا تھا۔ وین نے پالا ہوا تھوڑا سا منہ ہی ان کے لیے کافی ہوتا۔ اگر وہ ان سے مل بھی جاتا تب بھی اس کا منہ بند رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا۔ وین نے گوئی کو بیڈ پر بٹھایا اور بولا۔ ”گوئی تم ایک بہادر اور ذہین بچی ہو۔“

”میری تعریفیں کرنے کے بجائے یہ بتاؤ کہ مجھے کرنا کیا ہے؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”اوکے گوئی تم نے یہ کرنا ہے کہ روکی کو لے کر یہاں سے نکلتا اور باہر جا کر کسی بھی فون بوتھ سے پولیس کو کال کرنا۔ اس مکان کا ایڈریس مجھے لو۔“ وین نے پتا بتایا اور نئی بار بتایا تاکہ گوئی کو ذہن نشین ہو جائے پھر کئی بار اس سے پوچھا۔ اس نے فر فر دہرا دیا۔ ”گڈ، اب تم تیار ہو لیکن باہر نکل کر ڈرائیو سے مت جانا بلکہ لان والی طرف سے پودوں کی آڑ لیتے ہوئے جانا اور باہر نکلتے ہی سر پر

پاؤں رکھ کر بھاگنا۔“

”میں سمجھ گئی۔“

وین نے اسے مزید پکا کرنے کے لیے کہا۔ ”دیکھو گوئی تمہاری بہن اور ہم تینوں کی زندگی خطرے میں ہے یہاں ایک عورت ہے جو بہت زخمی ہے اور اسے جیڈ نے زخمی کر کے بے رحمی سے اسٹری کی میز کے نیچے ٹھوسا ہوا تھا۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ یہ شخص کس قدر سفاک ہے۔ اس لیے باہر نکلتے ہی جلد از جلد مدد لانے کی کوشش کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس بات پر گوئی سنجیدہ ہو گئی شاید اس لیے کہ اس کی بہن بھی ان لوگوں میں شامل تھی۔ ”میں ایسا ہی کروں گی۔“

”گڈ گرل۔“ وین نے اس کا سر تھپکا۔ وہ واش روم میں آیا جہاں روکی دروازے سے لگا بیٹھا تھا۔ اس نے وین کو دیکھ کر مظلومانہ سی آواز نکالی، وین نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ ”گڈ بوائے... بس کچھ دیر کی تکلیف اور ہے پھر تم اور تمہارا منہ آزاد ہوں گے۔“

وہ کتے کو باہر لایا اور گوئی کے حوالے کر دیا۔ اس نے چاکلیٹ کا پیکٹ بھی سنبھال رکھا تھا وہ وین نے لے لیا۔ ”میں اسے سنبھال کر رکھوں گا اور بعد میں تمہیں مل جائے گا ابھی تو تم صرف اس کتے پر اور اس کام پر توجہ دو جو تمہارے ذمے لگایا ہے۔“

گوئی نے منہ بنایا اور روکی کو پکڑ لیا۔ ”اب چلو۔“

”خیال رکھنا یہ آزاد نہ ہو ورنہ یہ واپس گھر میں آ کر ہمارا راز فاش کر دے گا۔“

”میں اسے زیادہ دیر نہیں اٹھا سکتی۔“ گوئی نے شکایت کی۔ ”یہ ہلکا ہے لیکن میں بھی بچی ہوں۔“

وین نے اس کی شکایت پر غور کیا۔ ”اوکے، تم اسے کسی ایسی جگہ چھوڑ دینا یا باندھ دینا جہاں سے یہ واپس نہ آ سکے۔“

وین نے احتیاط کے پیش نظر دروازہ کھول کر پہلے آئینے سے باہر دیکھا اور یہی احتیاط کام آگئی۔ جیڈ نے اپنے جوتے اتار دیے تھے اور برسرِ سول کے تقریباً بے آواز پمپ شوژ پہن کر نیچے آچکا تھا اور وہ راہداری میں داخل ہو رہا تھا۔ وین نے آئینہ واپس کھینچا اور دروازہ بند کر کے گوئی اور روکی سمیت جلدی سے واش روم میں آگیا۔ پہلے یہاں کی لائٹ روشن تھی اب اس نے لائٹ بھی بجھا دی اور سرگوشی میں گوئی سے کہا۔ ”خاموش رہنا وہ باہر آ گیا ہے اور اس کا منہ بھی بند کرو۔“

وین کے کان آہٹ پر گئے تھے۔ اس بار قدموں کی چاپ نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے اسے پتا نہیں چلا کہ کب جیڈ دروازے تک آیا اور اس نے اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھولا۔ آواز آئی تو وین اور گوئی دونوں اچھل پڑے تھے۔ اس موقع پر کتے نے بھی آواز نہیں نکالی ورنہ چند گز کے فاصلے سے اس کی کون کون بھی اس کے مالک کو صاف سنائی دیتی۔ جیڈ چند لمحوں میں گن لیتا رہا پھر اس نے جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ غالباً اسے کوئی آہٹ یا آواز سنائی دی تھی اور اس نے اپنا ٹھک دور کرنے کے لیے کمرے میں جھانکا تھا لیکن ایک بات تھی کہ اسے رائین مثل کو میز کے نیچے سے باہر دیکھ کر خشک نہیں ہوا تھا ورنہ وہ اس وقت انہیں تلاش کر رہا ہوتا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ رائین نے کسی طرح خود کو میز کے نیچے سے نکال لیا تھا۔ وین اور گوئی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس وقت باہر نکلتے۔ گوئی نے وہی دہی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

کیرن، لونی اور باربرا مگن پہنچیں۔ یہ بہت بڑا اور جدید ترین مگن تھا۔ باربرا کھانے پینے کی شوقین تھی اس نے فوراً فریج کھول کر دیکھا اور چاکلیٹ کا دوسرا ڈبّا نکال لیا۔ لونی نے خوف زدہ ہونے کے باوجود ایک انرجی ڈرنک لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ کیرن نے انہیں گھورا مگر کچھ کہا نہیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ہنگامی حالات میں چھپنے کے لیے کون سی جگہ موزوں ہو سکتی تھی۔ مگن کیبٹ چھوٹی تھیں اور ان میں سامان بھی رکھا ہوا تھا اگر وہ سامان نکالتی تو وہ فوراً نظر میں آ جاتا۔ اس نے ان دونوں کو خبردار کیا۔ ”یہاں سے کوئی چیز مت ہلانا اور نہ اٹھانا۔ ورنہ فوراً نظر میں آ جائے گی۔“

واپسی وہاں اتنی صفائی ستھرائی اور ہر چیز ایسی ترتیب سے رکھی تھی کہ اس میں ذرا سی بھی گڑبڑ فوراً نظر میں آ جاتی۔ لونی ایک فلاور پاٹ چھیڑ رہی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے خوش رنگ پھولوں والا پودا لگا ہوا تھا۔ باربرا کی توجہ کا مرکز نازک کرشل کے گلاس تھے جو یقیناً بہت قیمتی تھے۔ وہ ڈانٹنگ ہال میں آگئیں یہاں چاروں طرف شیشے سے بنی الماریوں میں کرا کر رہی تھیں مگر چھپنے کی کوئی جگہ یہاں بھی نہیں تھی۔ کیرن نے زیر لب جیڈ اور اس کے گھر پر لعنت بھیجی جہاں اتنی جگہ ہونے کے باوجود چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اچانک باربرا تیزی سے نیچے جھکی تو وہ دونوں بھی میز کے نیچے ہو گئیں۔ مگر کوئی آہٹ نہیں تھا بلکہ باربرا کے ہاتھ سے ایک چاکلیٹ چھوٹ کر گر گئی تھی۔ لونی

اپنا محاسبہ

یونان کے ایک مصور نے تصویر بنائی اس میں ایک آدمی کو انگور کا خوشہ پکڑے دکھایا گیا تھا۔ اس نے تصویر کو بازار میں ایک جگہ لٹکا دیا۔ ہر کوئی تصویر کو دیکھتا اور اس کی تعریف کرتا تھا۔ مصور کے کچھ دوست اس سے ملے اور مبارکباد دیتے ہوئے کہنے لگے۔ ”تم نے انگور کا خوشہ اس قدر زبردست بنایا ہے کہ چڑیاں آتی ہیں اور اسے اصلی سمجھ کر چوچ مارتی ہیں۔ مصور خوش ہونے کے بجائے افسردہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ آدمی کو بنانے میں مجھ سے غلطی ہو گئی ورنہ چڑیاں اگر آدمی کو بھی اصل سمجھتیں تو اس کے ڈر سے انگوروں پر چوچ مارنے کی جرأت نہ کرتیں۔ مصور نے وہ تصویر اتاری اور ایک دوسری تصویر بنائی اس تصویر میں بھی ایک آدمی انگور کا خوشہ لیے کھڑا تھا۔ انگور کا خوشہ دوبارہ اس قدر شاندار بنایا گیا تھا کہ چڑیاں اس کو دیکھ کر اس کے پاس آئیں مگر اب چوچ مارنے کی ہمت نہ ہوتی جو آدمی انگور کا خوشہ لیے ہوئے تھا اس کی آنکھوں میں اس قدر غصہ بھرا تھا کہ چڑیاں دیکھ کر ہی اڑ جاتی تھیں۔

دنیا میں اعلیٰ مقام انہی لوگوں نے حاصل کیا ہے، جنہوں نے خود اپنے آپ پر تنقید کی۔ اپنا محاسبہ خود کیا کیونکہ جب دوسرا تنقید کرتا ہے تو انسان رنج کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے آپ پر خود تنقید کرے، اپنی غلطیاں خود نکالے تو جتنا زور اور جتنا وقت وہ دوسروں سے اس بحث میں لگائے کہ وہ بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی نقص نہیں ہے، وہی وقت، وہی کوشش وہ اپنے آپ کو درست کرنے میں اور اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے میں صرف کر سکتا ہے۔

مرسلہ: توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی

نے دانت چس کر کہا۔ ”ہم یہاں کھانے نہیں آئے ہیں۔“
 ”ہم یہاں پہنچنے بھی نہیں آئے ہیں۔“ باربر نے
 ترکی بہ ترکی جواب دیا اس کا اشارہ انرجی ڈرنک کی
 طرف تھا۔

”پلیز چپ رہو۔“ کیرن گھبرا کر بولی۔ وہ دوبارہ
 کچن میں آگئے تھے۔ ”ضروری نہیں ہے وہ اب آواز کرتا
 ہوا آئے اور ہم خبردار ہو جائیں۔“
 ابھی کیرن کہہ رہی تھی کہ لوئی اور باربر ایک وقت آڑ
 میں ہو گئیں۔ کیرن نے گہرا سانس لیا اور اشارے سے
 بولی۔ ”کیا؟“

جواب میں لوئی نے اس کے پیچھے اشارہ کیا اور اس
 نے مڑ کر دیکھا تو جیڈ ہال سے ہوتا ہوا دوسری راہداری میں
 جا رہا تھا۔ کیرن بدحواسی میں لوئی کے پاس آڑ میں آگری
 تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا، جیڈ جا چکا تھا اس کی قسمت
 کہ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا ورنہ کیرن سانسے کھڑی تھی۔
 اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”شکر ہے دیکھا نہیں۔“

”اس لیے لپکھ کر دینے سے زیادہ تم آس پاس توجہ
 دو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ لوئی نے کہا۔ اس نے خالی انرجی
 ٹن شیلف پر رکھا تھا کیرن نے اسے اٹھا کر واپس فریج
 میں رکھ دیا اور بولی۔

”ہمیں اوپر جانا چاہیے۔“
 ”اوپر تو ہم پھنس جائیں گے۔“ باربر نے
 اختلاف کیا۔

”ممکن ہے کوئی راستہ مل جائے۔“ کیرن بولی۔ ”وہ
 نیچے ہے اور یہاں زیادہ خطرہ ہے۔“
 ”ہمیں چابی تلاش کرنی چاہیے جس سے دروازہ کھل
 سکے۔“ لوئی نے کام کی بات کی۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ کیرن نے سر ہلایا وہ ہال میں
 آئیں۔ لوئی اور باربر براہ سیزھیوں پر چڑھ گئیں اور کیرن ہال
 میں چابیاں دیکھنے لگی۔ وہاں ایک کی ہولڈر دیوار پر نصب تھا
 لیکن اس میں کوئی چابی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ چابیاں
 جیڈ نے اپنے پاس رکھی تھیں۔ کیرن سوچ رہی تھی کہ کیا اسے
 گھر میں کسی کی موجودگی پر شک ہوا تھا اور اس نے جوتے
 بھی بدل لیے تھے اس لیے انہیں اس کے نیچے آنے کا پتا
 نہیں چلا تھا۔ کیا وہ ان کے ساتھ بیچوے والا ٹھیل کھیل رہا
 تھا؟ کیرن پلٹ کر سیزھیوں پر آئی، یہ کچن کی طرف جانے
 والی راہداری کے ساتھ تھیں۔ اگر جیڈ ان سے اترتا تو لازمی
 انہیں دیکھ لیتا لیکن وہ دوسری سیزھی سے اترتا تھا جو اسٹڈی کی

طرف جانے والی راہداری کے ساتھ تھی۔ لوئی اور باربر
 سیزھیوں پر انگی بیٹھی تھیں، کیرن ان کے پاس سے ہوئی اور
 ان کو اشارہ کرتی اوپر آئی۔ یہاں بڑے ہال کے دائیں
 بائیں اسی طرح دو دو قطاروں میں ہر طرف چار چار کمرے
 تھے۔ جیڈ کا بیڈروم اور اس سے ملحقہ کمرہ اسٹڈی والی سمت
 کے اوپر والے حصے میں تھا، اسی وجہ سے آنے جانے کے
 لیے اسی طرف کی سیزھیاں استعمال کرتا تھا۔ وہ پہلے دائیں
 طرف آئیں اس طرف کے آٹھوں دروازے لاک تھے۔
 وہ پہلے بھی چیک کر چکے تھے لیکن کیرن نے ایک بار پھر
 چیک کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ راہداری کا آخری
 حصہ ایک چھوٹی سی بالکونی میں کھل رہا تھا۔ کیرن نے دروازہ
 کھول کر باہر جھانکا مگر یہاں بلندی میں فٹ سے زیادہ تھی
 اور نیچے پکا فرش تھا، اگر وہ گر کر فریج بھی جاتیں تب بھی ہڈی
 پہلی لازماً ٹوٹ جاتی۔ لوئی نے کہا۔

”ہم رسی کی مدد سے اتر سکتے ہیں۔“
 ”رسی کہاں سے آئے گی اور اسے باندھا کہاں
 جائے گا۔ بالکونی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔“

کیرن درست کہہ رہی تھی بالکونی میں کوئی جگہ نہیں تھی
 جہاں رسی باندھی جاسکتی اور وہ بھی اس صورت میں جب رسی
 ملتی۔ وہ واپس آئیں اور ہال سے ہوتے ہوئے بائیں
 طرف کی راہداری میں داخل ہوئیں۔ یہاں بس وہی دو
 کمرے کھلے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیڈ بس یہی
 کمرے استعمال کرتا تھا اور باقی پورا گھر اس نے بند کیا ہوا
 تھا دوسرا کمرہ بھی بیڈروم تھا اور وہاں شاید اس سے ملاقات
 کے لیے آنے والی خواتین اور لڑکیاں سوتی تھیں کم سے کم
 نسوانی ملبوسات سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا
 کہ یہ ملبوسات راجین کے ہوتے جو اس وقت بے لباس
 اسٹڈی میں لب مرگ پڑی تھی۔ کیرن کو اس پر رحم آیا تھا مگر
 وہ اس کے لیے کیا کر سکتے تھے جب کہ انہیں اس وقت اپنی
 جان کی فکر تھی۔ جیڈ خوفناک آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے
 اپنی محبوبہ کا یہ حال کیا تھا۔ اگر وہ اس کے ہاتھ آجاتے تو وہ
 ان کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرتا۔

جیڈ کے بیڈروم میں داخل ہو کر انہوں نے سب سے
 پہلے چابیوں کی تلاش کی۔ ڈریسنگ ٹیبل، سائڈ ڈرائز، ٹی وی
 ٹرائی اور دیواروں پر لگے ریکس پر چیک کیا مگر چابیاں
 غائب تھیں۔ لوئی اور باربر دوسرے کمرے میں چلی گئی
 تھیں۔ دونوں کمرے ایک درمیانی دروازے سے آپس
 میں ملے ہوئے تھے۔ کیرن سائڈ ڈراز دیکھ رہی تھی،

اچانک اسے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی اور وہ نہایت
 تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس سے پہلے کہ جیڈ اندر آتا وہ
 بیڈ کے نیچے جا چکی تھی۔ نیچے آنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا
 کر ہتھی بیڈ شیٹ تھام لی اور اسے ساکت کر دیا اسے خوف تھا
 کہ ہتھی چادر جیڈ کو متوجہ نہ کر لے۔ مگر وہ دوسری طرف گیا تھا
 اور اس نے ادھر تو جہ نہیں دی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا کر رہا تھا
 انہیں شبہ تھا کہ وہ ان کے بارے میں جان گیا تھا مگر اس کے
 انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ انہیں تلاش کر رہا تھا۔

کیرن کا خوف سے برا حال تھا۔ اسے خیال آیا کہ
 برابر والے کمرے میں لوئی اور باربر تھیں کہیں وہ بے خبری
 میں کوئی آواز نہ نکال دیں اور پکڑی جائیں۔ کوئی ایک پکڑا
 جاتا تو سب ہی پکڑے جاتے۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر
 رہی تھی کہ وہ آواز نہ نکالیں اور جیڈ جلد از جلد یہاں سے دفع
 ہو جائے۔ اس کی دعا قبول ہوئی اور جیڈ شاید غفلت میں کسی
 کام سے آیا تھا، اس نے الماری سے بڑا سا پیراشوٹ سے
 بنا ہوا بیگ لیا اور چلا گیا، اس کے جاتے ہی کیرن بیڈ کے
 نیچے سے نکلی اور دوسرے کمرے میں آئی وہاں لوئی اور
 باربر بھی بیڈ کے نیچے محسوس ہوئی تھیں۔ دونوں کمروں میں
 چھپنے کے لیے بھی جگہ نہیں تھیں۔ اس نے نیچے جھانکا تو ان
 دونوں کی ہلکی سی چیخیں نکل گئیں۔ کیرن نے جلدی سے
 کہا۔ ”آرام سے... آرام سے، یہ میں ہوں۔“

”وہ چلا گیا۔“ لوئی نے تصدیق چاہی۔ ”شکر ہے،
 میں کمرے میں آ رہی تھی کہ وہ اندر آیا اور اس نے دیکھا ہی
 نہیں کہ دروازہ ذرا سا کھلا ہے۔“

”اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ باربر
 بولی۔ ”اس سے پہلے کہ وہ ہمیں دریافت کر لے۔“

”تم لوگ بھول رہی ہو۔ باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں
 ہے تمام کھڑکیوں پر گرلز ہیں اور اس پیلس میں آمدورفت کا
 ایک ہی دروازہ ہے جو لاک ہے۔“

”بالکونی۔“ لوئی نے پھر کہا۔ ”اگر رسی نہیں ہے تو ہم
 اس چادر کے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ اس کی رسی بنا کر نیچے اتر
 سکتے ہیں۔“

اس بار لوئی کی تجویز دل کو لگی۔ انہوں نے دوسرے
 بیڈروم کے بیڈ کی چادر اتاری یہ خاصی موٹی اور مضبوط تھی
 چادر تھی۔ اس کی ہتھی نہ کاٹن کی تھی تاکہ یہ بیڈ پر سر کے
 نہیں۔ اب مسئلہ اسے کاٹنے کا تھا کیونکہ اسے پھاڑنا ممکن
 نہیں تھا۔ یہ مسئلہ باربر نے حل کیا، اس نے ڈریسنگ کی
 دراز سے ایک چھٹی نکالی جو زیادہ بڑی تو نہیں تھی لیکن اس

سے کام چل سکتا تھا۔ کیرن نے کہا۔ ”یہاں خطرہ ہے وہ کسی
 وقت بھی آسکتا ہے ہمیں بالکونی میں چل کر یہ کام کرنا
 چاہیے۔“

انہوں نے اتفاق کیا اور وہ تینوں بیڈروم سے نکلیں
 اور ہال سے ہوتی ہوئی دائیں طرف والی بالکونی میں
 آگئیں۔ یہاں تاریکی تھی لیکن نیچے لان میں چلنے والی
 روشنیوں کا عکس کسی قدر آ رہا تھا۔ وہ نیچے سے چادر کاٹنے
 میں لگ گئیں۔ لوئی چادر پکڑے ہوئے تھی اور باربر نیچے
 سے کاٹ رہی تھی جب کہ کیرن کاٹنے جانے والے ٹکڑوں
 میں پہلے مناسب فاصلے پر گر رہیں لگا رہی تھی پھر انہیں آپس
 میں جوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

وین اور کوئی ساکت بیٹھے تھے۔ بالآخر وین باہر نکلا
 اور اس نے دروازے کے پاس جا کر سن گئی۔ مسئلہ یہ تھا
 کہ کمرے خاصی حد تک ساؤنڈ پروف تھے اور ہلکی سی آواز
 اندر یا باہر سنائی نہیں دیتی تھی۔ جب تک جیڈ نے لیدر شوژ
 پہن رکھے تھے اس کے چلنے پھرنے کی آواز آتی تھی مگر ربر
 شوژ میں بہت معمولی سی آواز تھی۔ اس لیے وہ یقین سے نہیں
 کہہ سکتا تھا کہ وہ باہر موجود ہے یا نہیں۔ اس نے ڈرتے
 ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ اتفاق سے اسی وقت
 جیڈ راہداری سے مڑ کر سیزھیوں کی طرف جا رہا تھا۔ وین
 نے غفلت میں کوئی کو آواز دی۔ وہ واش روم سے باہر آئی۔
 وین نے ایک بار پھر جھانکا اور کوئی سے کہا۔ ”میں سیزھیوں
 تک جا رہا ہوں اگر ہال میں کوئی نہ ہوا تو میں تمہیں اشارہ
 کروں گا اور تم بھاگ کر آنا مگر اپنے جوتے اتار دو۔ یہ آواز
 کریں گے۔“

”میں جوتوں کے بغیر باہر نہیں جاسکتی۔“
 ”اوکے انہیں تسموں سے گلے میں باندھ لو۔“ وین
 نے مشورہ دیا۔ ”باہر نکل کر پکچن لیتا۔“

کوئی نے ایسا ہی کیا۔ روکی دیکھی نظروں سے انہیں
 دیکھ رہا تھا غالباً وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلوک
 کیوں کیا جا رہا تھا؟ وین دبے قدموں چلتا ہوا راہداری کے
 سرے تک آیا اور اس نے جھانک کر سیزھیوں پر دیکھا جیڈ
 اسے نظر نہیں آیا تھا، اس نے ہاتھ کے اشارے سے کوئی کو
 آگے آنے کو کہا اور وہ دوڑ کر آنے لگی تھی۔ وین نے ایک بار
 پھر جھانکا تو اسے جیڈ اوپر سے نمودار ہوتا دکھائی دیا اور وین
 واپس بھاگا۔ وہ آواز نہیں نکال سکتا تھا، کوئی کے پاس سے
 گزرتے ہوئے وہ اسے بھی سمجھ کر واپس لے گیا۔ کوئی

حیران ہوئی مگر اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ ادھر وہ گیٹ روم میں داخل ہوئے اور ادھر جیڈ سیز جیوں سے پیراشوٹ کا بنا ہوا بیگ اٹھائے نمودار ہوا۔ وین نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کیا اور گونی کو واش روم میں جانے کا اشارہ کیا وہ واش روم میں چلی گئی اور اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ وین کمرے کے دروازے کے ساتھ لگا ہوا کھڑا تھا۔ اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور یہ آہٹ پھر دروازے کے سامنے رکی۔ وین جلدی سے دروازے کے عقب میں اور ساکت ہو گیا۔ اچانک دروازہ کھلا۔ وین نے آنکھیں بند کر لیں اور سانس روک لی اسے لگا کہ اب وہ پکڑا جائے گا لیکن جس طرح اچانک دروازہ کھلا تھا اسی طرح دھڑام سے بند ہو گیا اور وہ آواز سن کر اچھل پڑا۔ پتا نہیں جیڈ کے ساتھ کیا مسئلہ تھا کہ وہ اس کمرے کا دروازہ کھولا اور بند کرتا تھا۔ وین نے رکی ہوئی سانس خارج کی اور دوبارہ کان لگا کر سنا، اسٹڈی کا دروازہ کھلتے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ وین کے خیال میں یہ آخری موقع تھا جب وہ گونی اور روکی کو اس جیل ثابت ہونے والے کمرے نکال سکے اور یہی ان کی بچت کا آخری موقع تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اوپر وہ تینوں بالکونی میں کیا کر رہی تھیں۔ اس نے واش روم کا دروازہ کھولا اور گونی کو باہر آنے کا اشارہ کیا وہ سبھی ہوئی اور بیزار تھی۔ وہ دبے قدموں باہر آئے اور پھر داخلی دروازے تک پہنچے لیکن اس سے پہلے کہ وین گونی کو باہر کرتا اچانک کال نکل گئی۔ بدحواس وین نے گونی کو کھینچا اور دائیں طرف والی سیز جیوں کے ساتھ رکھے صوفے کے پیچھے جا بکا اسی لمحے راہداری سے جیڈ نمودار ہوا تھا۔

☆☆☆

رسی تیار ہو چکی تھی اور وہ سوچ رہی تھیں کہ اسے کہاں باندھا جائے کہ وہ سب بہ حفاظت نیچے اتر سکیں۔ اچانک کیرن بولی۔ ”میرے خدا..... ہم وین کو بھول گئے۔“

”ہاں گونی نکل جائے گی لیکن وین تو اندر ہی ہو گا۔“ باربرا پریشانی سے بولی۔ ”لونی رسی اٹھا کر اسے نیچے لٹکا کر دیکھ رہی تھی کہ وہ زمین تک پہنچ بھی سکتی ہے یا نہیں۔ رسی کی لمبائی مناسب تھی۔ اچانک سامنے سڑک پر ایک پولیس کار نمودار ہوئی وہ آہستہ سے چلتی ہوئی جاری تھی جیسے معائنہ کر رہی ہو۔ لونی تیزی سے بالکونی کی دیوار کے نیچے ہو گئی۔ وہ دونوں بھی ڈر گئی تھیں باربرا نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”پولیس کار... سامنے سڑک پر ہے۔“ لونی نے کہا۔

باربرا نے ذرا سر نکال کر جھانکا اور پھر پیچھے کر لیا۔ ”وہ کونے تک پہنچ گئی ہے۔“

وہ تینوں پولیس سے ڈر رہی تھیں کیونکہ وہ خود اس کمرے میں چوری کے ارادے سے گھسے تھے اور پولیس کا خوف ان کے ذہنوں پر تھا اسی وجہ سے کچھ دیر کے لیے بھول گئیں کہ وہ کس صورت حال سے دوچار تھیں۔ پھر کیرن چوکی۔ ”یہ کیا حماقت ہے، ہمیں پولیس کو متوجہ کرنا چاہیے تھا۔“

”ادھر سوری مجھے خیال نہیں رہا۔“ لونی عداوت سے بولی۔ وہ تینوں بیک وقت انھیں مگر اس دوران میں پولیس کار گھوم کر مکان کے سامنے والے حصے میں آچکی تھی اور اب وہ بالکونی سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ تینوں مایوس ہو گئیں۔ باربرا نے کہا۔

”وہ چلی گئی۔“

”وقت مت ضائع کرو۔“ کیرن نے کہا۔ ”میں وین کو بلانے جا رہی ہوں۔ جب تک تم لوگ یہیں رہو اور خدا کے لیے اس رسی کو تو کھینچ لو۔“

لونی رسی کھینچنے لگی اور کیرن اندر آئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور دبے قدموں چلتی ہوئی سیز جیوں تک آئی تھی کہ کال نکل کی آواز سنائی دی۔ وہ اچھل پڑی تھی۔ جلدی سے سیز جیوں کے ساتھ ریٹنگ سے نیچے ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ جیڈ اوپر ہوا تو نیچے جاتے ہوئے اسے دیکھ سکتا تھا، اگرچہ وہ دوسری سیز جی سے ہی نیچے جاتا جو اس کے بیڈ روم کے پاس پڑتی تھی مگر وہ ہال سے گزرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ کیرن کو علم نہیں تھا کہ جیڈ نیچے اسٹڈی میں ہے۔ وہ سیز جیوں پر بیٹھے بیٹھے نیچے سرکنے لگی۔ نصف سیز جیوں پر اسے نچلا ہال نظر آیا اور پھر اس کی نظر بالکل نیچے صوفے کے پیچھے دبکے وین اور گونی پر گئی کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اسی لمحے جیڈ داخلی دروازے تک پہنچا، اس نے چابی سے تینوں لاک کھولے اور پھر دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ وہ فوراً باہر نکل کر دروازہ بند کر گیا۔ اس کے جاتے ہی کیرن نے ہلکی سی آواز نکال کر وین کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

☆☆☆

وین اور گونی صوفے کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ جیڈ اندر سے آکر دروازے تک پہنچا اور اس نے دروازہ کھولا تو وین نے ہلکی سی آواز سن کر باہر کوئی شخص جیڈ کا پوچھ رہا تھا۔ جیڈ نے باہر جا کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ وین نے صوفے سے جھانک کر دیکھا اور پھر ہلکی سی ”شش“ کی آواز سن کر چونکا اس نے پیچھے دیکھا تو کیرن کی آواز آئی۔ ”ادھر

دیکھو، میں اوپر ہوں۔“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو وہ دونوں کہاں ہیں؟“ وین نے آواز دبا کر پوچھا۔

”ہم نے بالکونی سے فرار کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔“ کیرن نے کہا۔ ”میں تمہیں لینے آئی ہوں۔“

وین گونی کے ساتھ اوپر آیا۔ ”بالکونی سے کیسے؟“

کیرن نے اسے بتایا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ وین خوش ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے یہاں سے نکلنا تو مشکل لگ رہا ہے، میں نے جتنی بار کوشش کی گونی اور روکی کو نکالنے کی اتنی بار یہ شخص آ گیا۔“

”بس فوراً چلو اب کوئی نئی مصیبت نہ آگئی ہو باہر۔“ کیرن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ باہر پولیس آئی ہے تو وہ اوپر کے بجائے نیچے کا رخ کرتے۔

☆☆☆

جیڈ نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور ایک پولیس والے نے اپنا جیج آگے کیا تو وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔ باہر دو پولیس والے موجود تھے۔ وہ اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے بولا۔ ”آفسرز... میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

اپنا جیج دکھانے والے نے کہا۔ ”مسٹر کیرن... ہم تمہارے لیے کچھ کرنے آئے ہیں۔ ایک لڑکی تمہارے مکان کی بالکونی میں ہے اور وہ رسی جیسی کوئی چیز لٹکا رہی ہے۔“

”اوہ...“ جیڈ نے صرف اتنا کہا۔

”اگر اس نے ٹریس پاس نہیں کیا تو یقیناً بہت خطرناک حرکت کر رہی ہے۔“

”اوہ ہاں... وہ ٹریس پاس نہیں ہے، میری بھانجی ہے میری کزن کی بیٹی، میں اسے سمجھاتا ہوں۔ وہ بس کچھ ایڈ ونچرس ہے خبردار کرنے کا شکر یہ آفسرز۔“ جیڈ واپس اندر جانے لگا کہ دوسرے آفسر نے اسے روکا۔

”ایک منٹ مسٹر کیرن۔“ اس نے اپنی جیب سے ایک آٹو گراف بک اور پین برآمد کیا۔ ”میرا بیٹا آپ کا فین ہے آپ آٹو گراف دینا پسند کریں گے؟“

بادل ناخواستہ جیڈ نے اس سے آٹو گراف بک لے کر اس پر کچھ لکھ دیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیا لکھا اور پھر معذرت کی۔ ”سوری آفسرز مجھے اس شرارتی لڑکی کو روکنا ہو گا اس سے پہلے کہ وہ کوئی قلعہ حرکت کر کے خود کو نقصان پہنچالے۔“

دونوں پولیس والے مسکرائے اور واپسی کے لیے مڑ گئے۔ ان کی کار راک ٹریس کے باہر موجود تھی۔ جیڈ

دروازے کی جھری سے انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا اور پھر وہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے تینوں لاک بند کیے اور پھر تقریباً بھاگتا ہوا اپنی اسٹڈی میں آیا؟ اس نے ایک درواز چابی سے کھولی اور اس میں رکھا ہوا چاندی جیسا پستول نکالا۔ رائیٹن قاتلین پر کروٹ کے بل پڑی تھی اور جیڈ کا لایا ہوا بیگ اس کے برابر میں پڑا تھا، ایسا لگ رہا تھا وہ رائیٹن کو بیگ میں ڈال کر کہیں منتقل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ مگر اب یہ نیا مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر میں ایک لڑکی موجود ہے اور وہ بالکونی کے راستے اترنے کی تیاری کر رہی ہے۔ یقیناً اس نے رائیٹن کو دیکھ لیا تھا اور بالکونی کے راستے فرار ہونا چاہتی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اندر کیسے آئی اور کیوں آئی؟ ان سوالوں کے جواب وہی دے سکتی تھی۔ جیڈ پستول لیے باہر آیا اور اوپری منزل کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

وہ تینوں بالکونی میں آئے جہاں لونی اور باربرا چاکلیٹ کے آخری تین کھارہی تھیں۔ وین نے انہیں گھورا ”تم لوگ کھانے پینے آئے ہو کیا؟“

”اب کیا کریں یہاں تو فرار کا راستہ ہی نہیں ہے۔“ لونی نے کہا۔

”بس اب جلدی کرو اس سے پہلے کہ پکڑے جائیں۔“ وین بولا۔ ”سب سے پہلے گونی کو تار تے ہیں۔“

مگر گونی نے اس رسی کے سہارے اترنے سے صاف انکار کر دیا جس کی گریہ نہایت اتار ڈی انداز میں باندھی گئی تھیں۔ وین نے باربرا کی طرف دیکھا۔ ”ٹھیک ہے پھر تم جاؤ۔“

وہ مجبوراً راضی ہوئی تھی۔ انہوں نے رسی کا سرا اس کی کمر سے باندھا مگر اس طرح کہ وہ آسانی سے کھول سکے۔ رسی ان تینوں نے پکڑی اور باربرا نیچے اتر گئی۔ اس کی حالت بری تھی اگر رسی اس کی کمر سے نہ بندھی ہوتی تو وہ شاید نیچے ہی گر جاتی اس وقت بھی وہ جھولتے ہوئے ڈری ڈری آواز میں نکال رہی تھی۔ مگر ابھی وہ کچھ ہی نیچے گئی تھی کہ دروازہ کھلا اور جیڈ نے بالکونی میں قدم رکھا اور پستول لہراتے ہوئے کہا۔ ”اسے واپس اوپر لاؤ۔“

ان کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وین اور کیرن کے چہرے سست گئے تھے۔ جب کہ لونی اور واپس آنے والی باربرا نے رونا شروع کر دیا تھا۔ البتہ گونی پرسکون تھی، اس نے کہا۔ ”مسٹر کیرن میں جی ہوں مجھے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

امید ہے تم مجھے کچھ نہیں کہو گے۔
 بالکل میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ دانت پس کر بولا۔ وہ ایک لڑکی کا سوچ کر آیا تھا اور یہاں پورا ٹولہ تھا۔ اب اندر چلو اور یہی بھی اٹھاؤ تم لوگوں نے میری قیمتی بیڈ شیٹ کا کیا شکر کیا ہے؟ جیڈ کے لہجے میں غصہ تھا۔ وہ پستول کے زور پر انٹریں سیز جیوں سے سب سے اوپر والی منزل پر لایا یہاں گنبد نما کمر تھا، اس کا دروازہ چابی سے کھولتے ہوئے انہیں اندر جانے کا حکم دیا۔ یہ کمر اصل میں کاٹھ کباڑ کے لیے مخصوص تھا۔ جیڈ نے انہیں اندر دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اپنا کتا واپس نہیں لیا تھا۔ اس کے جاتے ہی کیرن بولی۔
 یہ یقیناً نارائن کو شہکارنے لگانے گیا ہے۔
 نارائن زندہ ہے۔ لونی بولی۔
 تم نے اس کی حالت دیکھی تھی۔ وہ کچھ دیر کی مہمان تھی۔ اسے اس حال میں پہنچانے والا یہ شخص اسے زندہ رہنے دے گا، اس صورت میں وہ کم سے کم دس سال کے لیے جیل جائے گا اور اس کا کیریئر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔
 تب تو وہ ہمیں بھی نہیں چھوڑے گا۔ باربرانے گھبرا کر کہا۔ ہم اس کے جرم کے معنی گواہ ہیں۔
 مجھے چھوڑ دے گا۔ لونی نے کہا۔ وہ قلموں میں بچوں سے نرمی سے پیش آتا ہے۔
 احمق وہ قلمیں ہوتی ہیں اور یہ اس کی حقیقی زندگی ہے۔ لونی نے اپنی بہن کو جھڑک دیا۔
 وہ کسی کو نہیں چھوڑے گا، ہمیں آزادی کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔
 یہاں سے آزادی... کیرن نے باپوی سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ گنبد نما کمر گولی اور تقریباً تیس فٹ قطر کا تھا۔ چھت تقریباً تیس فٹ اوپر تھی اور اس میں زمین سے پانچ فٹ کے بعد شیشے کی کھڑکیاں تھیں جن کے باہر ڈیزائن والی فولادی گرل تھی، گنبد کے اوپری حصے میں دائرے میں رنگین شیشے کے تھے۔ وسط میں ایک قانونس بھی لٹکا ہوا تھا لیکن وہ آف تھا۔ روشنی کے لیے دیواروں کے ساتھ پینل لائٹس لگی تھیں اور وہی روشن تھیں۔ آمد و رفت کے لیے واحد دروازہ بہت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور جیڈ اسے باہر سے لاک کر گیا تھا۔ وین نے کسی ایسی چیز کی تلاش شروع کر دی جس سے دروازہ کھولا پاس کا لاک توڑا جاسکے مگر وہاں کاٹھ کباڑ میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ وین پلاسٹک

کر وہ متفق ہوئیں اور پھر سب حرکت میں آ گئے۔ وین نے کہا۔ ”ہمیں کچھ تاریخیں درکار ہیں۔“ انہوں نے تلاش شروع کی اور مچھلی پکڑنے والی ڈور ایک ڈبے سے ملی۔ پھر انہوں نے ایک میز اور اس کی چھوٹی میزوں کی مدد سے وین کو فائوس تک پہنچایا اور اس نے اس تین منزلہ میز پر کرسی رکھ کر تقریباً ڈوبتے ہوئے اپنا کام کیا۔ یہ بہت نازک کام تھا اور ذرا سی غلطی سے پورا منصوبہ برباد ہو جاتا۔ یہ کام کر کے انہوں نے فرنیچر واپس اپنی جگہ رکھا اور وین نے فرش پر نشان لگایا۔ پھر تار ایک کرسی کے پائے سے باندھ کر گونی کو روکی سمیت اس پر بٹھا دیا۔ اب انہیں جیڈ کا انتظار تھا۔ اگر وہ آتا تو ان کا منصوبہ کامیاب ہو سکتا تھا لیکن اگر وہ نہ آتا تو پھر انہوں نے جو اتنی جدوجہد کی تھی وہ رائگاں جاتی۔

☆☆☆

جیڈ اس وقت اسٹڈی میں رائین کی لاش بیگ میں ٹھونس رہا تھا اور زیر لب اپنے مقدر کو گالیاں دے رہا تھا۔ پہلے ایک لاش ٹھکانے لگانے کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا رائین اس کی مجبور تھی لیکن وہ جیڈ سے بے وفائی کر رہی تھی اور وہ یہ کام تو اتر سے پچھلے تین سال سے کر رہی تھی۔ جب یہ حقیقت جیڈ کے علم میں آئی تو اس کے اندر کا درندہ جاگ اٹھا اور ایک جھگڑے کے بعد اس نے رائین کو بے بس کر کے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ جب اس کا غصہ سرد ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس نے کیا کر دیا ہے اور اب اسے رائین کو ٹھکانے لگانا تھا۔ وہ پورے بارہ گھنٹے انتظار کرتا رہا کہ رائین مرے اور وہ اسے ٹھکانے لگائے۔ غصہ سرد ہونے کے بعد اس میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اسے قتل بھی کرتا۔ اس کی شوٹنگ طے شدہ تھی۔ مجبوراً اسے رائین کو ایسے ہی چھوڑ کر شوٹنگ پر جانا پڑا اور وہاں اسے ایک سائٹ مل گئی جہاں وہ آرام سے رائین کی لاش ٹھکانے لگا سکتا تھا اور پھر وہ قیامت کے دن ہی دریافت ہوتی۔ شوٹنگ پیک ہوتے ہی وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ وہ اسے لینے آیا تھا، اس کا خیال تھا کہ رائین اب تک مر چکی ہوگی اور اسے زندہ پا کر جیڈ کو حیرت ہوئی تھی مجبوراً اسے کچھ دیر رائین کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھنا پڑا۔ اب وہ اسے اس بیگ میں بیگ کر رہا تھا۔ یہ بیگ اس نے کچھ عرصے پہلے شاہ پرز لانے کے لیے لیا تھا یہ شاہ پرز اس نے بند کمروں میں فرنیچر اور دوسرے قیمتی سامان پر چڑھائے تھے تاکہ وہ گردوغبار سے محفوظ رہیں۔ اب خالی بیگ اس کے کام آ رہا تھا، اگر اتفاق سے لاش دریافت بھی

ہو جاتی تو کوئی اس بیگ سے جیڈ کا تعلق ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے لاش ٹھونس کر بیگ بند کیا۔

پھر وہ بیگ گھسیٹا ہوا باہر اپنی گاڑی تک لایا۔ روانہ ہونے سے پہلے اسے خیال آیا کہ وہ جا کر ایک نظر ان پانچوں کو دیکھ لے ایسا نہ ہو وہ کسی طرح سے خود کو آزاد کر لیں اور وہ مارا جائے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ انہیں اس وقت تک وہاں بند رکھے گا جب تک وہ بھوک پیاس سے مر نہیں جاتے۔ اس طرح اسے ان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا پڑیں گے ویسے بھی وہ بچے تھے۔ اسے ان پر اور خاص طور سے چھوٹی بچی پر رحم آ رہا تھا مگر جیڈ اپنی آزادی کی قیمت پر انہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے ان سے پوچھا انہیں کہ وہ کون ہیں مگر وہ جان گیا تھا کہ وہ چوری کی نیت سے اس کے گھر میں داخل ہوئے تھے اور کس طرح داخل ہوئے تھے یہ بھی جان گیا تھا۔ یہ وہی مشہور گروہ تھا جو بیورلی ہلز میں پہلے بھی کئی وارداتیں کر چکا تھا۔ وہ اوپر آیا اور اس نے پہلے دروازے پر رک کر سن گن لی لیکن اندر خاموشی تھی۔ اس نے چابی سے دروازہ کھولا اور اندر آیا تو پہلے اسے بوسی محسوس ہوئی لیکن وہاں کوئی مشکوک چیز نہیں تھی، وہ چاروں ایک طرف قالین پر بیٹھے تھے اور بچی جس کے پاس اس کا کتا تھا، ان سے ذرا دور کرسی پر براجمان تھی۔ اس نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

”تم لوگ کیا کر رہے ہو؟“

”ہم بیٹھے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔“ کیرن نے کہا۔ وین نے اپنے ہاتھ پیچھے کر رکھے تھے، جیڈ ان کی طرف بڑھا۔ ”بیٹے تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟“ ”کچھ بھی نہیں۔“ وین نے یوں کہا جیسے اس کے ہاتھ میں سچ کچھ ہو۔ جیڈ نے آگے آتے ہوئے اپنا پستول سامنے کیا۔

”اپنا ہاتھ آگے لاؤ، اس میں کیا ہے؟“

”کچھ نہیں ہے۔“ وین نے اس کے قدموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو فرش پر ان کے بنائے نشان سے کچھ پیچھے تھے وہ دل ہی دل میں اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ آگے آئے۔ جیڈ اس کے انداز سے مزید مشکوک ہو رہا تھا، اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مسمک دی۔

”ہاتھ آگے کرو ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

”پلیز۔“ کیرن نے گھبرا کر کہا۔ ”اسے ہاتھ دکھا دو۔“ ”لو دیکھو۔“ وین نے اپنے دونوں خالی ہاتھ آگے کر دیے اور گونی کی طرف دیکھا جس نے آڑ میں لائٹر جلا کر

اسے مچھلی پکڑنے والی ڈور کو دکھایا وہ ایک سیکنڈ میں جل کر ٹوٹ گئی اور اوپر فائوس میں سے لٹکا ہوا مٹی کے تیل کا ڈبا الٹا ہوا۔ ڈوری نے اسے سیدھا رکھا تھا، اب وہ الٹا لٹک رہا تھا اور اس میں موجود سارا تیل چند سیکنڈ میں جیڈ کو سر سے پاؤں تک بھگو گیا تھا۔ عقب سے گونی نے لائٹر اس کے قریب کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مسٹر، اپنا پستول پیچیک دو ورنہ میں لائٹر تم پر پیچیک دوں گی۔“

”اس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت تمہیں جل کر مرنے سے نہیں بچا سکے گی۔“ وین نے کہا۔ جیڈ نے کن آنکھوں سے جلتے لائٹر کو دیکھا جو اس سے مشکل سے ایک فٹ کے فاصلے پر تھا اور وہ واقعی سر سے پاؤں تک مٹی کے تیل میں بھگا ہوا تھا، ایک شعلہ اسے جسم کرنے کے لیے کافی تھا۔ جب اس نے حرکت نہیں کی تو وین نے گونی کی طرف دیکھا۔ ”میں تین تک گنوں گا اگر اس نے پستول نہ پیچیکا تو تم اس پر لائٹر پیچیک دینا۔“

”ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔“ کیرن نے جلدی سے کہا۔ ”ہمارا پولیس کے پاس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اس صورت میں ہم خود بچس سکتے ہیں۔“

وین نے گنتا شروع کیا۔ ”ایک... دو... تین۔“

”اوکے۔“ جیڈ نے کہا اور پستول وین کے سامنے فرش پر پیچیک دیا اور فوراً ہی اس نے ہاتھ گھمایا مگر جب اس نے پستول پیچیکا تو سب کے ساتھ گونی کی نظر بھی اس طرف گئی تھی اور اس... کا لائٹر والا ہاتھ نیچے ہوا۔ نتیجے میں جیڈ کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر لگنے کے بجائے اوپر سے گزرا اور لائٹر کے شعلے سے اس کی آستین نے آگ پکڑ لی۔ آگ تیزی سے اوپر آئی اور اسے بجھانے کی کوشش میں جیڈ نے دوسری آستین میں بھی آگ لگا لی تھی۔ گونی کتے سمیت بھاگی اور اس سے دور چلی گئی۔ دس سیکنڈ سے بھی پہلے جیڈ کا پورا جسم شعلوں کی زد میں آچکا تھا اور وہ بھیا تک آواز میں چلاتا ہوا پورے کمرے میں بھاگ رہا تھا اور چیزوں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ سب اس سے بچ کر بھاگتے ہوئے کمرے سے نکلے، چاہیوں کا کچھا دروازے کے لاک کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ وین سب سے آخر میں باہر آیا اور اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے چابی گھما کر اسے لاک بھی کر دیا پھر اس نے چابی نکالی۔ اس دوران میں وہ سب نہایت پھرتی سے نیچے والی منزل تک پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے کتے کو وہیں چھوڑا اور چاہیوں سے لاک کھول کر باہر نکل آئے جب وہ راک

بیس کے سامنے والی سڑک پر بھاگ رہے تھے تو اسس کے اوپر کی کمرے کی کھڑکیوں سے شعلوں کی چمک دور سے نظر آرہی تھی۔ ایک اسٹریٹ کر اس کر کے انہیں ایک کار مل گئی اور وہ اس میں بیورلی ہلز سے نکلنے میں کامیاب رہے۔ جب ان کی کار پہاڑی سے اتر رہی تھی تو فائر بریگیڈ کی گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی اوپر جا رہی تھیں۔ راک بیس میں گئی آگ اب دور سے دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

وین بستر پر اوندھے منہ لیٹا ہوا ٹی وی پر راک بیس میں لگنے والی آگ، جیڈ کی کھٹکھٹ کی جلتے سے ہلاکت اور اس کی گاڑی میں پائی جانے والی رائین مٹل کی لاش کے بارے میں ٹی وی رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ رپورٹرز کے سوالوں کے جواب میں تفتیشی پولیس افسر نے بتایا کہ ایسے شواہد ملے ہیں کہ راک بیس میں کچھ اور لوگ بھی تھے جو وہاں سے فرار ہو گئے اور پولیس انہیں تلاش کر رہی ہے۔ پولیس نے آس پاس رہنے والوں سے بھی اہلی کی، اگر انہوں نے کچھ دیکھا ہے تو وہ پولیس سے رابطہ کریں۔ پولیس نے ایسے شواہد حاصل کر لیے تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ رائین مٹل کا قاتل جیڈ ہی تھا لیکن جیڈ کو آگ لگا کر اس کمرے میں کس نے بند کیا تھا اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ پولیس جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک وین کے موبائل کی بیل بجی اس نے دیکھا، کیرن کی کال تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”تم ٹی وی دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں۔“ وین نے جواب دیا۔

”میرا نہیں خیال کہ پولیس ان لوگوں تک پہنچ سکے۔“

اب اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔

”مجھے بھی امید ہے۔“

”تب کیا خیال ہے کوئی نیا کام کریں؟“ کیرن نے

معنی خیز انداز میں پوچھا۔ وین کچھ دیر کے لیے چپ رہا پھر اس نے کہا۔

”سوری کیرن، میں آج سے ایسے کسی کام میں شامل

نہیں ہوں گا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے غلطی

کی اور تم لوگوں کے ساتھ مل کر جرم کرتا رہا۔ اگر ہم پکڑے

جاتے تو ہم سب کا مستقبل برباد ہو جاتا۔ اس معاملے کو اب

میں ختم کر دو، ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی تعلیم اور

کیریئر پر توجہ دیں یہی ہمارا مستقبل ہے۔“ وین نے کہتے

ہوئے کال کاٹ دی اور پھرتی وی بھی بند کر دیا۔



اظہار

ڈاکٹر صاحبہ

یہ شک جوڑے آسمان پر بنتے ہیں لیکن... ٹوٹتے زمین پر ہیں... خوابوں کا دیکھنا، بکھر جانا... لوگوں کا ملنا، بچھڑ جانا زندگی کا حصہ ہوتے ہیں... مکمل زندگی نہیں اور اگر ایسا ہو جائے تو اس ماحول میں کوئی مکمل زندگی نہیں جی سکتا کیونکہ زندگی کسی پابند غزل کے مانند نہیں گزاری جاسکتی البتہ آزاد نظم کی صورت اس کا عنوان بھلا لگتا ہے لیکن سکون تب ہی ملتا ہے جب سب کچھ ایک ردھم میں چل رہا ہو، جہاں توازن بگڑا وہیں تباہی نے دروازے پر دستک دی... یہ اور بات کہ سماعت اپنی شناخت قائم رکھے اور دستک کے انداز سے آنے والے کو پہچان لے۔ وہ جو گلی گلی، کبھی صحرا میں کبھی جنگل میں کسی روح کی طرح بھٹکتی پھر رہی تھی جانے کیسی پیاس من میں چھپانے ایک مخصوص دریا کی تلاش میں تھی۔ ابر کی خواہش میں دھوپ میں جل رہی تھی۔ پیروں کے آبلے تھے کہ پڑاؤ کا تقاضا کرتے تھے مگر دل کی لگن اسے ٹھہرنے سے روک رہی تھی۔ احساسات کی ڈور میں گرہیں لگ جاتیں اور جب... ادراک و شعور اور قوت فیصلہ میں برجستگی اور حالات کی نزاکت کو جانچنے کی صلاحیت نہ ہو تو روحیں یونہی بھٹکتی رہتی ہیں... دل یونہی پیاسا رہ جاتا ہے اور من کا مندر کسی دیوتا کی آس میں بند گنبد کے مانند گونجتا رہ جاتا ہے۔ اپنی ہی صدائیں پلٹ کر آتی ہیں اور سرگوشیوں میں وحشتوں کی خبریں جاتی ہیں۔ وہ بھی انہی وحشتوں کے بیچ اپنی ڈولتی کشمکش کو سنبھالنے کی کوشش میں دھیرے دھیرے بھنور کی جانب بڑھ رہی تھی۔

جنہوں کے سمندر میں طوفانی لہروں سے تیرا آتما ایک دوشیزہ کی

بکھرتی ذات کی کرب انگیز داستان

جوڑے آسمان پر بنتے ہیں لیکن ٹوٹتے زمین پر ہیں۔
درخشاں کی ماں شوہر کے مرنے کے بعد آسمان سے
زمین پر آگئی تھی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہاتھی مرنے کے بعد
بھی سوا لاکھ کا۔ حامد علی خاں بہت بڑے آفسر تھے لیکن
ایماندار تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے پوش علاقے میں
شاندار مکان بنوایا تھا۔ ایک لائق بیٹا اور ایک خوب صورت
بیٹی پسند گان میں چھوڑے تھے۔ چھت کا سہارا بہت ہوتا
ہے۔ جیلہ خاتون دونوں بیٹیوں کو لے بیٹھ گئیں۔ گھر کی گاڑی
تھی۔ میاں کی پنڈم پنشن تھی۔ اچھی طرح گزارہ ہونے لگا
لیکن شوہر کی بات ہی دوسری ہوتی ہے جبکہ بیٹا ابھی ملازمت
کے لائق نہیں ہوا تھا۔ درخشاں بڑی تھی اور علی حامد چھوٹا تھا۔
درخشاں تو ماں سے لگی بیٹھی رہی لیکن علی باپ کے
عدم وجود سے فائدہ اٹھا کر گلی میں نکل گیا۔ ابھی میٹرک کیا تھا
کہ بری صحبتوں میں پڑ کر نشے کا عادی ہو گیا۔ لڑکا تھا اور بن
باپ کا تھا۔ ماں کے لیے اکلوتا تھا۔ کسی نے غور بھی نہیں کیا

کہ کس راہ پر چل نکلا ہے، ہوش تو اس وقت آیا جب گھر کی
چیزیں غائب ہونے لگی تھیں۔
”اماں میری گھڑی یہاں رکھی تھی اب نہیں ہے۔“
”بیس ہوگی بیٹا۔ کہاں چلی جائے گی۔“
”سب جگہ دیکھ لی۔ کہیں بھی نہیں ہے۔“
”تمہاری ہمیشہ سے عادت ہے۔ چیزیں رکھتی کہیں
ہو دیکھتی کہیں ہو۔“
”ابھی تو رکھ کر گئی ہوں۔ کیا مصیبت ہے۔“
”میں تو تمہاری چیزیں دیکھتی نہیں ہوں۔ خود ہی کہیں
رکھ کر بھولی ہوگی۔“ ماں نے کہا اور یہ ظاہر بات ختم ہوگئی۔
درخشاں نے گھر کا چچا چچا چچا مارا۔ گھڑی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔
کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ درخشاں نے ایک مرتبہ
پھر گھر سر پر اٹھالیا۔
”اماں میرے ٹاپس۔“
”کہاں رکھے تھے؟“



رات اتارے تھے۔ یہیں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔

”کہیں اور دیکھو۔“

”سب جگہ دیکھ کر ہی آپ سے پوچھ رہی ہوں۔“

”کہیں اور چھوڑ کر آئی ہوگی۔ چیز گھر میں ہو تو کہیں نہیں جاتی۔“

”کہاں چھوڑ کر آئی ہوں گی۔ ٹاپس کوئی پاؤں کے چپل ہیں کہ کہیں جا کر اتار دیے ہوں گے اور پھر ننگے پاؤں گھر آ گئی۔“

”اب میں کیا بتاؤں۔ گھر میں تم ہو یا میں ہوں۔“

”علی بھی تو ہے۔“

”وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا؟ میں اسے باقاعدگی سے پاکٹ منی دیتی ہوں اور اب تو وہ سدر بھی گیا ہے۔ باقاعدگی سے کالج جانے لگا ہے۔“

”پھر تو جنات ہی ہوں گے جو میرے ٹاپس لے گئے۔“ ایک مرتبہ پھر خاموشی نے چادر تان لی۔ درخشاں رو دھو کر چپ ہو گئی۔

جیلہ خاتون نے ڈرتے ڈرتے علی کو ہلا کر پوچھا بھی لیکن اس نے قسمیں کھا کر ماں کو یقین دلادیا کہ درخشاں کے ٹاپس اس نے دیکھے تک نہیں لیتا تو بڑی بات ہے۔

وقت پھر دے قدموں گزرنے لگا۔ گھر میں لوگ ہی کتنے تھے ہر وقت سناٹا منہ چڑاتا رہتا۔ علی کو دوستوں سے فرصت نہیں تھی۔ درخشاں اپنے کمرے میں بند رہتی۔ جیلہ خاتون ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر وقت گزاری لیتیں۔

ایک دن یہ خاموشی پھر لوٹی۔ اس وقت یہ واردات جیلہ خاتون کے کمرے میں ہوئی۔ درخشاں اور وہ شاپنگ کے لیے بازار گئی تھیں۔ علی گھر پر تھا۔ شام کے وقت گئی تھیں، واپس آتے آتے رات ہو گئی۔ صبح ہوئی۔ کسی کام سے الماری کھولی تو پرائز بونڈ وہاں نہیں تھے۔ انہوں نے گھبرا کر درخشاں کو آواز دی۔

”درخشاں، دس ہزار کے پرائز بونڈ میں نے الماری میں رکھے تھے۔ اب نہیں ہیں۔“

”آپ کو اچھی طرح یاد ہے۔ الماری ہی میں تھے؟“

”ہاں بیٹا، کل ہی تو جب ہم شاپنگ کے لیے جا رہے تھے میں نے دیکھے ہیں۔“

”اماں، اب تو آپ کو یقین آ گیا کہ چور گھر کا ہے۔“

”بیٹا، میں کمرے کو لاک کر کے گئی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کمرے کی چابیاں بھی کسی کے

پاس ہیں اور یہ علی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”بیٹا بغیر دیکھے کسی کو چور کیسے کہہ دوں۔“

”خدا کو دیکھا نہیں ہے عقل سے بچانا چاہتا ہے۔“

جب ہم شاپنگ کے لیے گئے ہیں تو علی گھر پر تھا۔

”اگر یہ اس کی حرکت ہے تو بیٹا میں کس کس چیز کی حفاظت کروں گی، گھر میں ہزار چیزیں ہیں۔“

”آپ بتھا کر اس سے بات کریں۔ یہ کیا بات ہوئی۔“

”کیا بات کروں؟ ایسی آنکھیں نکالنا ہے جیسے کھا جائے گا۔“

”تو پھر اسی طرح چیزیں لٹواتی رہیے۔ ایک دن گھر خالی ہو جائے گا۔“

”اپنی حفاظت خود کرو بیٹا۔“

”کس طرح حفاظت کریں۔“

جو حفاظت ممکن تھی وہ بھی تھی کہ دونوں نے اپنے اپنے کمرے کے لاک بدلوا لیے کہ اگر علی کے پاس چابیاں ہوں تو وہ چابیاں بے کار ہو جائیں۔

جب گمرانی بہت بڑھنے لگی تو علی جھنجھلا نے لگا۔ بات بات پر درخشاں سے الجھنے لگا۔ ماں بچ میں بولتی تو وہ ان سے بھی بدزبانی پر اتر آتا۔ گھر کے ماحول میں ایسا تناؤ ہو گیا کہ درخشاں کا سانس لینا محال ہو گیا۔ ایسے میں اس نے بھی سوچا کہ کہیں نوکری کر لے۔ دن بھر تو گھر سے دور رہے گی۔

”اماں گھر میں رہ رہ کر اسکا گئی ہوں۔ میں نے اپنی ایک سہیلی کے ابو سے کہا ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے کہیں نوکری دلادیں گے۔“

”بس ایک سہیلی کی رہ گئی تھی۔ اب تم نوکری بھی کرو گی۔“

”تو پھر اور کیا کروں۔ مجھ سے گھر کے اس ماحول میں نہیں رہا جاتا۔ گھر سے نکلوں گی تو چار بیسے ہی آئیں گے۔“

”خاندان والے کیا کہیں گے کہ خان بہادر کی پوتی حاملہ علی خاں کی بیٹی معمولی سی نوکری کر رہی ہے۔“

”خاندان والے ہم سے ملنا تک تو گوارا نہیں کرتے۔ کچھ کہیں گے کس منہ سے۔“

”بیٹی، میں نے بہت سے لوگوں سے کہا ہوا ہے۔ کوئی اچھا سارشتہ آئے تو میں تجھے تیرے گھر کا کر دوں۔ اس ماحول سے خود نجات مل جائے گی۔ نوکری کا خیال دل سے نکال دے۔“

”کئی دن یہ بھکار چلتی رہی اور بالآخر جیلہ خاتون کو اس کی بات ماننے پڑی۔

اس کی سہیلی کے ابو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ

آب طلب

وہ کسی دفتر کے بجائے اسکول میں نوکری کرے۔ آدھے دن کی نوکری ہوتی ہے اور سب خواتین ٹیچرز ہوتی ہیں لیکن وہ بند تھی کہ نوکری تو وہ کسی دفتر ہی میں کرے گی، گورنمنٹ نہ کسی پرائیویٹ نہ۔ اب وہ انہیں یہ کیا بتاتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہنا چاہتی ہے۔

ایک روز اسے یہ خوش خبری مل گئی کہ اس کی نوکری پکی ہے۔ سفارش اتنی مضبوط ہے کہ وہ جائے گی اور کسی انٹرویو کے بغیر اسے نوکری مل جائے گی۔

گھر کی گاڑی تھی۔ وہ ڈرائیو کرتی بھی تھی لیکن جب سے علی نے جوانی میں قدم رکھا تھا گاڑی پر اس کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اس نے سوچا کہ دن بھر گاڑی اس کے پاس رہے گی تو اماں کو تکلیف ہوگی۔ وہ بھی بھی علی کے ساتھ کہیں چلی جاتی ہیں۔ بس سے جانا ہی ٹھیک رہے گا۔

پہلا دن تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جہاں اسے جانا ہے وہاں کون سی بس جاتی ہے، اس لیے اس نے بھی بہتر سمجھا کہ ٹیکسی کر کے چلی جائے۔

اس نے ٹیکسی ڈرائیو کو پتا سمجھایا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ پہلا موقع تھا جب وہ ٹیکسی میں اکیلی جا رہی تھی لیکن مطمئن تھی کہ دن کا وقت تھا اور راستے اس کے دیکھے بھالے تھے۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی۔ درخشاں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر جائزہ لیا اور دروازہ کھول کر اتر گئی۔ کرایہ ادا کیا اور ادھر ادھر دیکھ کر سڑک پار کر لی۔ اس نے دور ہی سے ایک عمارت پر لکھا دیکھا تھا۔ ”دہلی گارمنٹ (ہیڈ آفس)“ یہی نام اسے بتایا بھی گیا تھا۔

سڑک پار کر کے وہ اس عمارت کے نیچے رک گئی۔ پرس سے ٹشو پیپر نکال کر ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے قطرے صاف کیے اور مرکزی دروازے سے اندر جا کر لفٹ میں داخل ہو گئی۔ اسے اس عمارت کی پانچویں منزل پر جانا تھا۔ پانچویں منزل پر پہنچنے کے بعد بھی اسے ایسا ہی ایک بورڈ نظر آیا۔ وہ اس بورڈ پر بنے تیر کے نشان پر چلتی رہی، ایک راہداری سے گزرنے کے بعد دائیں طرف مڑی تو استقبال کا دفتر نظر آ گیا۔

”مجھے اکرام صاحب سے ملنا ہے۔“

”آپ نے ان سے وقت لیا تھا؟“

”میرا نام درخشاں ہے اور مجھے تسکین صاحب نے بھیجا ہے۔ یہ دونوں باتیں انہیں بتا دیجیے۔“

استقبال پر بیٹھی لڑکی نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور انٹرکام پر اطلاع دے دی۔

”جائے آپ کو بلا رہے ہیں۔“

”مجھے کس طرف جانا ہوگا؟“

”غیر ہے، میں چہرہ اسی کو بلاتی ہوں، وہ آپ کو چھوڑ آئے گا۔“

اس نے چہرہ اسی کو بلایا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی مسٹر اکرام کے کمرے میں پہنچ گئی۔

اس کے سامنے ایک نہایت خوش شکل مہذب نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر غرور ذرا سا بھی نہیں تھا۔ درخشاں کو دیکھتے ہی اکرام کے ہونٹوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”تشریف رکھیے۔“

”سر! وہ میں.....“ درخشاں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تسکین صاحب نے آپ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ آپ نے چونکہ بی۔ کام کیا ہے اس لیے آپ ہمارے اکاؤنٹس سیکشن میں بہتر کام کر سکیں گی۔ کیا کہتی ہیں آپ؟“

”سر! مجھے نوکری سے غرض ہے۔“

”ہمیں کام سے غرض ہے اور میرے خیال میں آپ اکاؤنٹس کے شعبے میں ٹھیک رہیں گی۔ میں منجر کو بلواتا ہوں۔ وہ آپ کو کام سمجھا دیں گے۔ شعبے کے انچارج سے بھی ملو ادیں گے۔ بس ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ میں زیادہ چھٹیاں کرنے والے ملازمین کو قطعی پسند نہیں کرتا۔“

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اپنے گھر سے اتنی تنگ ہے کہ اس کا بس چلے تو رات بھی دفتر ہی میں گزار دے، چھٹی کیا کرے گی۔“

اکرام نے فون اٹھایا اور منجر کو بلالیا۔ دفتر تھا ہی کتنا بڑا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کمرے میں آیا اور نہایت ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ مس درخشاں ہیں۔ میں نے ان کا اکاؤنٹ کے شعبے میں تقرر کیا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے کہیں ملازمت نہیں کی ہے لہذا قطعی تجربہ نہیں ہے البتہ بی کام ہیں۔ مرزا صاحب سے کہنا انہیں ان کا کام سمجھا دیں بلکہ کچھ دنوں میں محنت کر کے سکھا بھی دیں۔“

”جی بہتر۔“ منجر نے کہا۔

”آپ جب چاہیں میرے پاس آ سکتی ہیں۔“

”شکر یہ سر۔“

وہ منجر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اکاؤنٹ کا شعبہ غالباً اوپری منزل پر تھا اسی لیے منجر اسے لے کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ درخشاں کے ذہن میں پہلی مرتبہ

خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ سوچ رہی تھی اس نے اس دفتر کا انتخاب کر کے غلطی کی۔ یہاں تو عورت نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ اتنے مردوں میں ایسی کام کیسے کروں گی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ منبر نے اس کا ذہنی تسلسل توڑ دیا۔

”میرا نام ارشاد حسین ہے۔ آپ کو یہاں کوئی بھی تکلیف ہو فوراً مجھ سے رابطہ کریں۔ اکرام صاحب سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑے لوگ کسی کام نہیں آتے۔“

درخشاں دل ہی دل میں ہنس دی۔ بی بی ابھی تو دیکھتے جاؤ کتنے ہمدردوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مردوں کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ جہاں کوئی لڑکی دیکھی اور لگے ہمدردی کے ڈوگرے برساتے۔

منبر اسے لے کر کڑی کے بنے ہوئے ایک کیمین میں لے گیا۔ وہاں انہی کی عمر کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ تین صاحب ہیں۔ اس شعبے کے انچارج اور یہ مس درخشاں ہیں۔ آپ کی نئی ماتحت۔ اکرام صاحب نے ان کا تقرر کیا ہے۔ آپ کو انہیں کام سمجھانا اور سکھانا ہے۔“

”سر، میں پوری کوشش کروں گا کہ ان کا یہاں دل لگ جائے۔“

ارشاد صاحب اس کا تعارف کرانے کے بعد رخصت ہو گئے۔ تین صاحب کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

”یہاں کام زیادہ نہیں ہے اور جتنا کچھ ہے بھی اس کے کرنے کے لیے یہاں اور لوگ موجود ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔“

”سرا میں یہاں کام کرنے کے لیے آئی ہوں۔ بیٹھی رہوں گی تو کام کیسوں کی کیسے؟“

”میرا مطلب یہ تھا کہ آہستہ آہستہ کام سیکھتی رہیں کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔“

”سرا میں تو کام سے زیادہ یہ سوچ رہی ہوں کہ اتنے مردوں کے درمیان میں ایسی بیٹھوں گی کیسے؟“

”میں بھی یہ کب چاہوں گا کہ آپ سب کے درمیان بیٹھیں۔ آپ جب کمرے میں داخل ہوتی ہیں میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ آپ کو کہاں بٹھانا ہے۔ میرے کیمین کے برابر میں ایک کیمین ہے۔ وہ آپ کا ہوگا۔ اس کا ایک بچھلا دروازہ بھی ہے اس سے آپ میرے کیمین میں آجاسکتی ہیں۔ آپ کو سیکشن میں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کی ہر مدد کے لیے میں جو موجود ہوں۔“

اس نے شکر کا سانس لیا لیکن تین صاحب کی طرف سے کچھ چوکنی بھی ہو گئی۔ ان کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا جسے ایک

عورت اچھی طرح پہچانتی ہے۔

”ایک بات اور بتا دوں۔“ تین صاحب ہلکے ہوئے۔ ”یہ ارشاد بھروسے کے لائق نہیں۔ ان سے دیکھنا ضبط کچھ کم ہی رکھیے گا۔“

”مجھے کسی سے کیا سروکار۔“

”آئیے میں آپ کو آپ کے کیمین میں لے چلوں۔“

وہ پچھلے دروازے سے دوسرے کیمین میں چلے گئے۔ اس کا ایک دروازہ سیکشن میں کھلتا تھا دوسرے سے وہ تین صاحب کے کمرے میں آسکتی تھی۔ ”سیکشن میں بھی کسی کو منہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ بس مجھ سے تعلق رکھیے گا۔“

”تین صاحب جیسے حالات ہوں گے ویسا کروں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔“

تین صاحب کو اس کی طرف سے ایسے خشک جواب کی توقع نہیں تھی۔ جھینپ کر رہ گئے۔ ”میں ضروری فائلیں لا کر آپ کی میز پر رکھ دیتا ہوں۔ ٹائپسٹ باہر بیٹھا ہے۔ اگر کچھ ٹائپ کرانا ہو کرے تو آپ اسے بلوا سکتی ہیں۔“

وہ کچھ اس طرح باہر نکلے تھے جیسے خفا ہو گئے ہوں۔ ان کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگی تھی کہ اسے ایسا جواب نہیں دینا چاہیے تھا۔ ان سے تو بنا کر رکھنی چاہیے۔ آنکھوں میں بے ہودگی ہے تو ہوا کرے۔ کچھ دن میں خود ہی مایوس ہو جائیں گے۔

کیمین میں اس کیلے بیٹھے بیٹھے اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ پچھلے دروازے سے نکلی اور تین صاحب کے پاس پہنچی مگنی۔ ”سرا فائلیں ابھی نہیں پہنچیں۔ کوئی کام بھی آپ نے نہیں بتایا۔ میں تو ایسی بیٹھی بیٹھی بور ہو گئی۔“

”میں نے چہرہ اسی سے کہہ تو دیا تھا۔ خیر آپ چلیں میں آتا ہوں۔“

وہ اپنے کیمین میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد چہرہ اسی فائلیں لے کر آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین صاحب بھی پہنچ گئے۔ وہ اسے ایک ایک فائل کے بارے میں بتاتے اور سمجھاتے رہے۔ اسی میں دوپہر ہو گئی۔

”آپ سچ نہیں کریں گی یا میرے ساتھ باہر چلیں گی۔“ تین صاحب نے نہایت بے تکلفی سے بہت بڑی بات کہہ دی۔

”میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاتی۔“

”اوہ تو آپ اسی لیے اتنی اسارت ہیں۔“

یہ جملہ بھی کم از کم ان کی عمر کے آدمی کی زبان سے ناقابل برداشت تھا لیکن درخشاں کو برداشت کرنا پڑا،

البتہ وہ یہ سوچ ضرور رہی تھی کہ یہ آدمی تو اس کے لیے مصیبت بن جائے گا۔

تین صاحب اٹھ کر چلے گئے تھے۔ وہ فائلوں پر جھکی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ایک اٹھارہ بیس سال کا لڑکا اندر آیا۔ ”مس، میرا نام ارسلان ہے۔ میں یہاں ٹائپسٹ ہوں۔ تین صاحب نے کہا تھا آپ سے مل لوں۔“

”میں خود ابھی باہر آنے والی تھی۔ سب لوگوں سے ملیں گی۔ آخر آپ لوگوں کے ساتھ ہی کام کرنا ہے۔ اچھا ہوا تم آگئے۔ کوئی کام ہوا کرے گا تو تمہیں بلوالیا کروں گی۔“

”جی میڈم۔“ وہ بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ چلا گیا۔ اس نے باہر نکلتے ہی خوش خبری سنا دی کہ مس درخشاں ابھی باہر آئیں گی اور سب سے ملیں گی۔

”ابے تو نے کیا جادو کر دیا کہ وہ منبر سے باہر آنے پر تیار ہو گئی۔“

”جادو کیا۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کبھی کبھی آپ کے پاس آکر بیٹھ جایا کروں۔ کہنے لگی صرف تم آؤ گے تو سب کو اعتراض ہوگا۔ پہلے میں خود باہر آکر سب سے ملیں گی۔ پھر تم آجایا کرو گے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”ابے شرم کر۔“ تجھ سے تو وہ بڑی ہی ہوگی۔ وہ تو ہمارے جوڑی ہے۔“ ایک نے کہا اور سب نے قہقہے لگائے یہ قہقہے اچانک منہ کے منہ میں رہ گئے۔ درخشاں اپنے کیمین سے باہر نکلی تھی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔“

”بھئی، آپ لوگوں سے تعارف ضروری تھا۔ آپ ہی لوگوں کے ساتھ مل کر مجھے کام کرنا ہے۔“

”ہم لوگ تو خود ہی یہ سوچ رہے تھے کہ جب تک تعارف نہیں ہوگا کام کیسے چلے گا۔“

”میرا نام درخشاں ہے۔“ اس نے اپنا نام بتایا اور پھر ایک ایک کے نام سے واقفیت حاصل کی۔ کچھ دیر کام کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ اٹھ کر اپنے کیمین میں آگئی لیکن اپنے پیچھے باتوں کا بازار چھوڑ آئی۔

”یارو یہ ہے بااخلاق۔ پہلے ہی دن عمل مل گئی۔“

”یارا یہ جو نوکری والی لڑکیاں ہوتی ہیں، ہوتی بڑی چلتی ہیں۔“

”ابے سب ایک سی نہیں ہوتیں۔ کوئی مجبوراً بھی نوکری کرنے نکلتی ہے۔“

”یہ مجبوری والی نہیں لگتی۔ کپڑے دیکھتے تم نے۔“

”دیکھو کس کے ہاتھ لگتی ہے۔ پہلے والی تو تین صاحب نے ایک لی تھی۔“

”یہ تو مجھے ایسی لگتی ہے کہ سب کی پلیٹ میں کھائے گی۔ صرف تین صاحب سے بھلنے والی نہیں۔“ ایک مرتبہ پھر قہقہہ بلند ہوا۔

”چلو یار، اس کے آنے سے کچھ رونق تو آئی۔ پڑے بور ہوتے رہتے تھے۔“

یہ دن اس نے دفتر میں کوئی ایسا برا بھی نہیں گزارا تھا۔ تھوڑے سے لوگ تھے۔ کوئی لمبا چوڑا اسٹاف نہیں تھا اور سب یہ ظاہر ہمدردی معلوم ہوتے تھے۔ چھٹی کے بعد وہ خوش خوش گھر پہنچی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کوئی ہنگامہ اس کا منتظر ہوگا۔ اسے دیکھتے ہی علی نے گھر سر پر اٹھالیا۔

”سنا ہے تم نے نوکری کر لی ہے؟“

”ہاں اور کیا کرتی۔ نوکری تو تمہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”گھر میں کیا فائدے ہو رہے ہیں؟“

”تم سلامت ہو تو وہ بھی ہونے لگیں گے۔“

”صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں گھومنے پھرنے کا بہانہ چاہیے تھا۔“ پھر وہ ماں سے مخاطب ہوا۔ ”اماں اس کی شادی گردوور نہ یہ ہم سب کی ناک کٹوا دے گی۔“

”بکواس بند کر دینی۔“ ماں نے اسے ڈانٹا۔ ”بڑی بہن سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔“

”میں بھائی ہوں۔ اس کی آوارگی کا دکھ مجھے نہیں ہوگا تو کسے ہوگا۔ لڑکے تو مجھے طے دیں گے ناکہ تمہاری بہن نوکری پر جاتی ہے۔“

”اتنی غیرت ہے تو چلو پھر پانی میں ڈوب مرو۔“

”میں یہ بھی معلوم کر لوں گا کہ یہ نوکری پر جاتی ہے یا کسی سے ملنے۔“ اس نے کہا اور پاؤں پختا ہوا باہر نکل گیا۔

درخشاں بڑی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ جبکہ خاتون بھی بھیگی آنکھوں سے علی کی ہدایت کے لیے دعا میں مانگتی رہیں۔ اسی دن درخشاں کے پرس سے سو روپے کا نوٹ پھر غائب ہو گیا لیکن اس نے کسی سے ذکر تک نہیں کیا کہ ابھی اتنا ہنگامہ ہوا ہے۔ ایک جھگڑا اور کھڑا ہو جائے گا۔

وہ رات کو سونے کے لیے لیٹی تو دفتر کا ماحول گھر کے ماحول سے کہیں بہتر نظر آنے لگا۔ اب تک وہ یہ سوچتی رہی تھی کہ اتنے مردوں کی عید پر نظروں کا وہ کب تک مقابلہ کرے گی جبکہ اس کا حصہ بانٹنے کے لیے دوسری عورت بھی موجود نہیں۔ استقبال پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو تو دفتر سے باہر ہی سمجھو۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

میڈم باوری کہیں سے برآمد ہوئی۔
کچھ دیر بعد درخشاں خود باہر آگئی اور باتوں کا سلسلہ رک گیا۔ اب پورا سیکشن اس کی تحریکوں اور خوشامد میں لگا ہوا تھا۔
متین صاحب کی زبان درازیوں کا سلسلہ کچھ دنوں کے لیے بند ہو گیا تھا۔ بیٹیوں کا ذکر چھیڑ کر درخشاں نے انہیں شرمندہ کر دیا تھا لیکن ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد وہ اپنی روش پر لوٹ آئے۔ درخشاں ان کی فطرت سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی۔ ایک روز اسے معلوم ہوا اکرام صاحب دور سے پر آرہے ہیں۔ سب سے پہلے یہ خبر ارسلان ٹائپسٹ نے آکر اسے دی۔

”اکرام صاحب دور سے پر آرہے ہیں۔ آپ کوئی فائل کھول کر بیٹھ جائیں تاکہ انہیں معلوم ہو آپ مشغول ہیں۔“ سیکشن میں سناٹا چھا گیا۔ صرف ٹائپ مشین کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ بھی کام میں مشغول ہو گئی۔
دروازے پر کسی نے دستک دی اور اکرام صاحب اس کے کہیں میں داخل ہوئے۔ وہی ہنسا مسکراتا مہذب چہرہ۔
”گڈ مارننگ سر۔“
”گڈ مارننگ۔ کیسی ہو درخشاں؟“
”ٹھیک ہوں سر۔“

”میرے دفتر میں تو تم اس دن کے بعد سے آئیں ہی نہیں۔“
”جی، میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“
”جب مناسب سمجھو تو ضرور آنا۔“ انہوں نے کہا اور کہیں سے نکل گئے۔
ابھی دو تین دن ہی گزرے تھے کہ معلوم ہوا اکرام صاحب پھر دور سے پر آرہے ہیں۔ وہ تصدیق کے لیے کہیں سے باہر آئی تو وہاں ہونے والی باتوں میں سے کچھ اس کے کانوں میں بھی پڑ گئیں۔

”اکرام صاحب آج کل بڑے دورے کر رہے ہیں۔ پہلے تو مہینوں میں چکر لگاتے تھے۔“
”درخشاں کو دیکھنے آتے ہیں اور کچھ نہیں۔“
”بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔“
وہ اٹھ قدموں لوٹ آئی۔ ”کیا یہ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اکرام صاحب کیا واقعی مجھ میں دلچسپی لے رہے ہیں؟“ اسے اپنے آپ پر فخر ہونے لگا۔
سیکشن میں پھر سناٹا چھا گیا۔ کسی خبر نے آکر اطلاع دی تھی کہ اکرام صاحب نیچے آنے کے لیے اپنے کمرے سے نکل چکے ہیں۔

صبح وہ وقت سے بہت پہلے اٹھ گئی۔ جلدی جلدی تیار ہوئی اور دفتر کے لیے نکل گئی۔ اسے ڈرتا کہ علی اٹھ گیا تو پھر کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ اس نے ٹیکسی کے بجائے بس کا سہارا لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ وقت سے پہلے دفتر پہنچ گئی۔ اس وقت تک کوئی بھی نہیں آیا تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ اس کے پہنچنے ہی متین صاحب بھی پہنچ گئے۔
”کیا اس دفتر میں لوگ دیر سے آتے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”لوگ دیر سے نہیں آتے ہم جلدی پہنچ گئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا تم ابھی نئی ہو جلدی دفتر آؤ گی لہذا میں بھی آ گیا۔ گھر سے چائے بنا کر لایا ہوں آؤ بیٹھ کر پیو۔“
درخشاں کو بھی مذاق سوجھا اور وہ ان کے ساتھ ان کے کہیں میں چلی گئی۔

”سرا! آپ کے کتنے بچے ہیں؟“
”بھئی یہ بچے درمیان میں کہاں سے آگئے۔ یہ لو چائے پیو۔“ انہوں نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”سرا بتائیے نا۔ بیٹیاں کتنی ہیں؟“
”دو بیٹیاں ہیں میری۔“ متین صاحب کا جوش و خروش رخصت ہو گیا تھا۔
”شادی شدہ ہیں؟“

”نہیں بھائی بیٹے بڑے ہیں۔ بیٹیاں چھوٹی ہیں۔“
”کتنی چھوٹی۔ میرے برابر تو ہوں گی۔“ وہ دیکھ رہی تھی کہ متین صاحب کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ”کبھی آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلوں گی۔ آئی سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور آپ کی بیٹیوں سے بھی۔“
”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔“ انہوں نے اس طرح کہا جیسے قبر سے مردہ بول رہا ہو۔

”میں اپنے کہیں میں ہوں۔ کوئی کام ہو تو بلا لیجے گا۔“
وہ کہیں سے باہر آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سب لوگ آپکے ہیں۔ وہ سب کی طرف ایک مسکراہٹ اچھالتی ہوئی اپنے کہیں کی طرف بڑھ گئی۔
”یار! یہ متین صاحب اس عمر میں بھی خوب چکر باز ہیں۔ آتے ہی درخشاں پر جادو کر دیا۔“
”تف ہے تم جوانوں پر۔“

”یار! یہ اپنے عہدے کا قلم فائدہ اٹھا رہے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔“
”یہ لوگ رات کو گئے بھی تھے یا نہیں۔ صبح ہوتے ہی

کچھ دیر بعد پھر وہی ہوا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور اکرام صاحب اس کے سامنے تھے۔

”گڈ مارنگ سر۔“

”گڈ مارنگ۔ کیسی ہو درخشاں؟“ انہوں نے کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ پہلے وہ کھڑے کھڑے چلے گئے تھے لیکن اس مرتبہ بیٹھ گئے تھے۔

”اسٹار فیئر کس کی فائل مجھے دکھائیے۔“

”جی بہتر۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور شیلف میں اسی جگہ ہاتھ ڈالا جہاں وہ فائل تھی۔

”گڈ۔ ویری گڈ۔ میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ تمام فائلیں آپ کی نظر میں ہیں یا نہیں۔“

”میری نظر میں فائلیں ہی نہیں لوگ بھی ہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”کبھی آپ نے موقع دیا تو ضرور بتاؤں گی۔“

”یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ آپ کچھ دیر بعد میرے کمرے میں تشریف لائیں۔ تفصیلی بات وہاں ہوگی۔“

ان کے چلے جانے کے بعد اس نے اپنے پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکالا۔ لب اسٹک کے شیڈ کو گہرا کیا۔ بالوں میں ہلکا سا کنگھا پھیرا اور کہیں سے نکل گئی۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ سیکشن کا منجر دوڑتا ہوا آیا۔

”باادب با ملاحظہ ہو شیار۔ آپ لوگوں میں سے کوئی بتا سکتا ہے مس درخشاں یہاں سے نکل کر کہاں گئی ہیں۔ یقیناً نہیں بتا سکتا۔ یہ بندہ ناچیز مطلع کر رہا ہے کہ اس کی گناہ گار آنکھوں نے درخشاں کو اکرام صاحب کے کمرے میں گھسے دیکھا ہے۔“

”لو بھی کر لوگل۔“ کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

”ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ اکرام صاحب کا جلد جلد دورے کرنا خالی از علت نہیں۔ چڑیا گئی ہمارے ہاتھوں سے۔“

اکرام نے اسے کمرے میں دیکھتے ہی کسی مہذب آدمی کی طرح کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور جب تک وہ بیٹھ نہیں گئی وہ اپنی کرسی پر نہیں بیٹھا۔

اس نے کھٹی بجائی اور چہرہ اسی چائے اور بسکٹ لے کر آگیا۔

”سر آپ نے یہ تکلف کیوں کیا؟“

”اس لیے کہ آرام سے اور تفصیل سے بات ہو سکے۔ اب مجھے بتائیے وہ کیا بات تھی جو آپ مجھ سے کہنا چاہتی تھیں؟“

”سر! کوئی خاص بات نہیں۔ آپ تو فکر مند ہو گئے۔“

”میں نے آپ کے لہجے کی تشویش کو بھانپ لیا تھا۔“

”کیسے کیا بات ہے۔“

”سرا میری عادت نہیں کہ کسی کی شکایت کروں لیکن بات ایسی ہے جو میرے کام پر اثر انداز ہو رہی ہے اس لیے کہہ بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔“

”اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔“

”سرا تین صاحب کے رویے نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ وہ اپنی عمر کا بھی خیال نہیں کرتے اور ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو میرے لیے کوفت کا باعث بنتی ہیں۔ صاف لفظوں میں تو یہ ہے کہ وہ اپنی دانست میں مجھ سے عشق فرما رہے ہیں اور دوسروں کے سامنے اس کا چرچا بھی کرتے ہیں۔“

”اے آپ معمولی بات کہہ رہی ہیں لیکن کیا کروں کہ وہی سے ان کا اور میرے والد صاحب کا ساتھ ہے ورنہ آپ کے سامنے بلا کر انہیں ڈالنا بلکہ کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیتا۔ پھر بھی آپ اطمینان رکھیں میں اکیلے میں بلا کر انہیں سمجھاؤں گا۔“

”شکر یہ سر لیکن بات اس طرح کیجیے گا جیسے آپ کو کہیں سے معلوم ہوا ہے۔ میرا نام درمیان میں نہ آئے۔“

”میں اتنا نادان نہیں ہوں۔“

اس کے بعد وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے لیے بہت کچھ پوچھتے رہے۔ وہ بھی محتاط انداز میں کچھ چھپاتی کچھ بتاتی رہی۔ وہ وہاں سے لوٹ کر آئی تو اکرام کے کمرے میں ہونے والی گفتگو پر غور کرنے لگی۔ اسے اب پورا یقین ہونے لگا تھا کہ اکرام اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ کوئی اپنے ملازموں سے اس طرح پیش نہیں آتا جس طرح وہ پیش آیا تھا۔ وہ کوئی مہمان نہیں تھی جو اس کے لیے چائے منگائی جاتی۔ پھر اس نے اس کی ذاتی زندگی سے متعلق جو باتیں پوچھی تھیں ان کے ذریعے شاید وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں شادی شدہ تو نہیں ہوں۔

اس کو اکرام کا اس طرح دلچسپی لینا برا نہیں لگا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ دولت مند تھا یا نوجوان تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی آنکھوں میں شیطانت نہیں تھی۔ بوالہوسی کے رنگ نہیں چمک رہے تھے۔ ایک مصیبت تھی جو اس کے احماد کی انگلی تمام کر آگے بڑھنا چاہتی تھی۔

اگلے دو دنوں میں اسے معلوم ہوا کہ تین صاحب کو اکرام نے بلایا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر وہ چونکتی۔ کسی دفتری کام سے بھی بلایا جاسکتا تھا۔ وہاں کیا باتیں

اب طلب

ہوئی تھیں یہ تو اس کو اس وقت معلوم ہوا جب تین صاحب شرمندگی اور گھبراہٹ کا مجسمہ بن کر اس کے سامنے آئے۔

”بٹی درخشاں تم نے کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اکرام صاحب سے میری شکایت کر دی۔ پہلے مجھ سے تصدیق تو کر لی ہوتی۔ لوگوں نے تمہیں بھڑکا دیا اور تم پہنچ گئیں اکرام صاحب کے پاس۔“

”تین صاحب! نہ مجھے کسی نے بھڑکایا نہ میں نے آپ کی شکایت کی۔ انہیں خود کچھ معلوم ہوا تو الگ بات ہے۔ کیا انہوں نے میرا نام لیا ہے کہ میں نے شکایت کی ہے؟“

”وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ آپ کا نام لیتے۔ کہا تو انہوں نے یہی ہے کہ انہیں کہیں سے معلوم ہوا ہے لیکن میں نے بھی بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ بٹی درخشاں! میں اس کے باپ کا دوست ہوں۔ وہ میرے بچوں کی طرح ہے۔ اس کے سامنے میری بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

درخشاں کو ان کے بڑھاپے پر رحم آگیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”انکل! آپ یقین کیجیے میں نے اکرام صاحب سے آپ کی شکایت نہیں کی۔ مجھے آپ سے شکایت ضرور تھی لیکن میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔“

”مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنی عمر کو بھول کر تم سے کچھ باتیں کہیں۔ اب اگر میری عزت کا تمہیں پاس ہے۔ میرے سفید بالوں کا خیال ہے تو اکرام صاحب سے جا کر کہو کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ کسی نے غلط فہمی کی ہے اور اگر کوئی بات ہے بھی تو تم نے مجھے معاف کر دیا۔ پلیز درخشاں، میری نوکری چلی جائے گی ورنہ ابھی مجھے بٹی کی شادی بھی کرنی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں اکرام صاحب سے بات کر لوں گی۔ آپ کی نوکری نہیں جائے گی۔ آپ بھی وعدہ کریں کہ آئندہ مجھے اپنی بٹی سمجھیں گے۔“

”سمجھیں گے کیا۔ آج سے تم واقعی میری بٹی ہو۔“ انہوں نے جذباتی انداز میں کہا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اب آپ اپنے کمرے میں تشریف لے جائیں۔“

میں اکرام صاحب کے پاس جاتی ہوں۔“

”درخشاں بٹی! میں تمہارا کس منہ سے شکر یہ ادا کروں۔“

”باپ بٹی کے درمیان شکر یہ کا لفظ موزوں نہیں ہوتا۔“

اس یاد دہانی کے باوجود تین صاحب نے ایک مرتبہ

تفصیل سے بات کروں۔“

”میں کیسے مان لوں کہ آپ اس کے دفتر ہی سے آئے ہیں؟“

”نہ صرف اس کے دفتر سے آیا ہوں بلکہ اس نے مجھے بھیجا ہے۔ یہ دیکھیے اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے اپنا ایڈریس لکھ کر دیا ہے۔ یہ دیکھیے۔ اچھی طرح دیکھ لیں اسی کی رائٹنگ ہے۔“ انہوں نے پرچہ جیلہ خاتون کی طرف بڑھا دیا۔

”ہے تو اسی کی رائٹنگ لیکن میرا بیٹا اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں۔ جب میرا بیٹا آجائے اس وقت آئیے گا۔“

”اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ بہن، آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ بس آپ کا تھوڑا سا وقت لوں گا۔ ممکن ہے اس وقت تک آپ کا بیٹا بھی آجائے۔ ویسے درخشاں نے منع کر دیا تھا کہ میں اس کے بھائی کے سامنے کوئی بات نہ کروں۔ اس وقت اچھا موقع ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ بس جلدی جلدی کچھ باتیں کر لوں گا۔“

انہوں نے یہ باتیں کچھ اس انداز سے کہیں کہ جیلہ خاتون طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا ہو گئیں۔ انہوں نے بھی سوچا اچھا ہے بات جتنی جلدی کر سائے آجائے۔

”آئیے بھائی صاحب اندر آجائیے۔“

”شکر یہ بہن کہ آپ نے مجھ پر اعتبار کیا۔“

جیلہ خاتون انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔

”بہن! مجھے درخشاں کا بزرگ سمجھیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ جب بچیاں گھر سے باہر نکلتی ہیں تو کوئی نہ کوئی انہیں پسند آتی جاتا ہے یا کوئی انہیں پسند کر لیتا ہے۔ درخشاں کو بھی ہمارے دفتر کے مالک اکرام صاحب نے پسند کر لیا ہے۔ درخشاں بھی انہیں پسند کرتی ہے۔ دونوں شادی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ میرے ذمے دونوں کی جانب سے یہ ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ میں اس رشتے کے لیے آپ کو راضی کروں۔ اس کے بعد لڑکے کے والد آپ سے بات کر لیں گے۔“

”جب اس نے سب باتیں خود ہی طے کر لیں تو مجھ سے کیا پوچھتا۔ خود چلی جائے اور شادی کر لے۔“

”ایسا نہ کہیں۔ رشتہ ہوگا تو آپ کی اجازت سے ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔“

”وہ دفتر کا مالک ہے تو عمر میں بھی زیادہ ہوگا۔“

”عمر کا تو زیادہ نہیں لیکن چند باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ کل کو آپ میرا گریبان نہ پھڑیں کہ میں نے آپ سے کوئی بات چھپائی۔“

سوچ کر تو کچھ اور آیا تھا لیکن جب آپ کو بہن کہہ دیا تو بھائی بن کر بھی دکھاؤں گا۔“

”ایسی کون سی بات ہے بھائی؟“

”بات یہ ہے کہ اکرام صاحب آج دولت مند بن گئے ہیں ورنہ ان کے باپ تو دہلی میں کسی کے گھر سودا سلف لانے پر ملازم تھے۔ خیر یہ بھی کوئی بری بات نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ لوگ خاندانی فقیر تھے۔ ان کے دادا بھیک مانگتے تھے۔ اکرام صاحب کے والد نے بھی کچھ دنوں پہلی پیشہ اختیار کیے رکھا پھر کسی گھر میں ملازمت کر لی۔ پھر ان کا گھر چھوڑ کر میرے گھر آ گئے۔ یعنی میرے گھر ملازمت کر لی۔ پھر پاکستان بن گیا۔ دہلی میں کل وغارت گری ہوئی تو وہ کہیں گئے ہم کہیں۔ کئی برس بعد ملاقات ہوئی تو میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک بن چکے ہیں اور میں ملازمت ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے ملازمت دے دی۔ میں ضرورت مند تھا میں نے قبول کر لی۔ قدرت کے کھیل دیکھیے کہ کل کا نوکر آج کا مالک بن گیا۔ اس کا بیٹا جب چاہتا ہے مجھے ڈانٹ دیتا ہے اور میں چپ کر کے سنا رہتا ہوں۔“

”اتنی اصلیت بتانے کے بعد بھی آپ مجھ پر زور دیں گے کہ میں یہ رشتہ منظور کر لوں۔ فقیروں کے خاندان میں اپنی بیٹی بیاہ دوں؟“

”ارے بیگم صاحبہ، اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب خاندان کون دیکھتا ہے۔ اب تو سب دولت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ لڑکا تو دولت مند ہے اور پھر درخشاں کی پسند بھی ہے۔“

”آپ کا یہ خیال ہوگا میرا نہیں۔ میں اپنے خاندان میں یہ بیوند نہیں لگا سکتی۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ درخشاں اس کے باوجود بھی اسی سے شادی کر لے۔“

”میں درخشاں کو جانتی ہوں۔ جب میں اسے یہ باتیں بتاؤں گی تو وہ خود انکار کر دے گی۔“

”آپ اسے وہ سب باتیں بتا دو گی جو میں نے آپ سے کی ہیں؟“

”یہ باتیں بتائے بغیر میں اسے روکوں گی کیسے؟ جب تک آئینہ سامنے نہ ہو چہرہ نظر کیسے آئے گا اور پھر آپ کیوں ڈرتے ہیں، آپ نے تو یہ سب باتیں اس کی بھلائی کے لیے کی ہیں۔“

”ایسا نہ کیجیے گا بیگم صاحبہ۔ جوانی کا بہاؤ بڑا تیز ہوتا ہے۔ درخشاں تو یہی سمجھے گی کہ میں نے آپ کو بھڑکا دیا

اب صلب

ہے۔ میری بتائی ہوئی کسی بات پر یقین نہیں کرے گی۔ الٹا اکرام صاحب سے کہہ کر مجھے نوکری سے نکلوا دے گی۔“ وہ اٹھے اور اب جیلہ خاتون کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

”بھائی صاحب! آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔“

”میری نوکری اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ باتیں میرے حوالے سے درخشاں تک پہنچیں تو مجھ کو میری نوکری گئی۔“

”عجیب آدمی ہو۔ اتنا ڈرتے تھے تو یہ باتیں بتائیں کیوں؟ میں اندھیرے میں کبھی نکل لیتی تو دوسری بات تھی۔ اب تم ہی بتاؤ کبھی ماروں تو کیسے..... نکلوں تو کیسے؟“

”ترکیب میں بتاتا ہوں عمل آپ کر لیجیے گا۔ آپ فی الحال اپنی رضامندی ظاہر کر دیں۔ درخشاں کے سامنے میری تعریف کیجیے اور اس سے کہیے کہ متین صاحب نے لڑکے کی اتنی تعریف کی ہے لہذا میں اجازت دے رہی ہوں کہ اس کے گھر والے باقاعدہ رشتہ لے کر آجائیں۔ میں حتی فیصلہ لڑکے کے باپ سے مل کر کروں گی صرف متین صاحب کے کہنے پر ہاں نہیں کر سکتی۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”اس سے یہ ہوگا کہ جب اللہ دیا یعنی اکرام صاحب کے والد، آپ کے ہونے والے سمجھی سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی تو آپ درخشاں سے کہہ سکتی ہیں کہ لڑکے کے خاندان کی طرف سے آپ مطمئن نہیں۔ یا ایسے کیجیے گا کہ اللہ دیا سے میرا تذکرہ مت کیجیے گا۔ وہ پوچھے گا بھی نہیں۔ اس لیے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔“

جیلہ خاتون کو یہ تجویز مقبول معلوم ہوئی اور انہوں نے اجازت دے دی کہ لڑکے کا باپ ان سے آکر مل سکتا ہے۔ متین صاحب سرخرو ہو کر درخشاں کے گھر سے نکلے۔ دفتر پہنچے تو وہ بے چینی سے ان کا انتظار کرتی رہی تھی۔

”کیا ہوا انکل، سب ٹھیک ہو گیا نا؟“

”بھئی تمہاری والدہ بڑی میزبانی کر رہی ہیں۔ یہ میرا ہی دم تھا کہ انہیں قائل کر لیا۔ اکرام صاحب اور ان کے ان دیکھے خاندان کی اتنی تعریف کہیں کہ میرا منہ دکھ گیا تب جا کر انہوں نے اجازت دی کہ اکرام صاحب کے والد ان سے مل سکتے ہیں بس ایک ڈر ہے۔“

”وہ کیا انکل؟“

”بھئی، تمہاری والدہ بھی دہلی کی ہیں اور اکرام صاحب کے والد بھی دہلی کے ہیں۔ کوئی ایسی جان پہچان نہ نکل آئے جس سے میری محنت ہی اکارت چلی جائے۔“

”انکل آپ بھی کیا اندیشے لے کر بیٹھ گئے۔ دہلی اتنا بڑا شہر تھا۔ گھر میں بیٹھی ہوئی عورت بھلا انہیں کیا جان سکے گی۔ جان پہچان کیا نکلے گی۔“

”بس بیٹا، میں تو شکرانے کے نفل پڑھوں گا جب میری بیٹی رخصت ہو کر اکرام صاحب کے گھر پہنچے گی۔ ہاں ایک بات ہے۔ اکرام صاحب کو یہ مت بتانا کہ تم نے مجھے اپنے گھر بھیجا تھا۔ اللہ نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ الزام مجھے دیں گے۔ میں نہ لینے میں نہ دینے میں۔ میں کیوں سزا بھگتوں۔“

”آپ کا نام قطعی درمیان میں نہیں آئے گا۔ میں اٹھتے بیٹھتے آپ کے لیے دعا کیا کروں گی انکل۔“

”جیٹی رہو بیٹی۔“ انہوں نے درخشاں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اپنے کہیں میں آ گئے۔ بہت اونچا اڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے پر کاٹ کر زمین پر پھینک دیے۔ اللہ دیا نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میری بیٹی بی اے کر لے تو اکرام سے اس کی شادی کر دے گا۔ یہ سچ میں خواہ مخواہ کو پڑی۔ اکرام بھی درخشاں کی ماں پھیلنے لگی تو کوئی اور چال چلوں گا۔ میرے ترکش میں کوئی تیروں کی کمی ہے۔ بڑی آئی مجھے انکل کہنے والی۔

اس نے سوچا کہ وہ یہ خوش خبری ابھی اکرام تک پہنچا دے لیکن یہ جلد بازی اسے اپنی حیثیت کے متافی معلوم ہوئی۔ اسے ابھی دو چار دن اکرام کو سراپا انتظار بنائے رکھنا چاہیے۔ اسے بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ اماں کو منانے کے لیے مجھے کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔ گھر جاؤں تو یہ بھی معلوم ہو کہ متین صاحب نے کیا باتیں کی ہیں اور اماں کا رد عمل کیسا ہے۔ اکرام کے والد کو آنا چاہیے۔ اماں کے منہ سے سنوں گی تو اور اطمینان ہو جائے گا۔

وہ گھر پہنچی تو جیلہ خاتون نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایسی اجنبیت اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ”ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”خیریت تو ہے اماں۔ علی نے پھر کوئی حرکت کر ڈالی؟“ درخشاں نے انجان بننے ہوئے کہا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اماں کیا بات کرنے والی ہیں۔

”میں نے کیا نا آرام سے بیٹھو تو بات کرتی ہوں۔“ وہ جلدی سے غسل خانے میں ٹمٹم گئی۔ شاور لینے کے بعد باہر نکل۔ جیلہ خاتون نے چائے تیار کر لی تھی۔ صرف یہ انتظار تھا کہ علی باہر جائے تو وہ درخشاں سے بات کریں۔

انہیں زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑا۔ علی چائے پیتے ہی روانہ ہو گیا۔ وہ گھر میں زیادہ ٹکٹا ہی کہاں تھا۔ ”درخشاں! یہ اکرام صاحب کون ہیں۔“

”اماں میں جس دفتر میں کام کرتی ہوں اس کے مالک کے بیٹے ہیں۔ کیوں؟ ان کا کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”کوئی متین صاحب آئے تھے۔ اکرام صاحب کا رشتہ تمہارے لیے لے کر۔ اکرام صاحب کے والد مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”میرا رشتہ! کیا کہہ رہی ہوا ماں؟“
 ”تو تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم؟“
 ”قسم لے لو اماں۔ مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔“
 ”میں نے ایک عمر گزاری ہے۔ دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ تمہاری مرضی کے بغیر وہ تمہارا رشتہ بھیج سکتے تھے؟ سچ بتاؤ بات کہاں تک پہنچی ہے؟“
 ”اماں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ان کے دل میں کچھ ہو تو ہو۔“
 ”تمہارے دل میں کچھ نہیں؟“
 ”وہ میرے پاس ہیں۔ اچھے آدمی ہیں۔ نہایت مہذب ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“
 ”اگر اس رشتے سے میں انکار کر دوں تو تمہیں دکھ تو نہیں ہوگا؟“

وہ کچھ دیر کے لیے گڑبڑا گئی لیکن پھر ہمت کر کے بولی۔ ”صرف اتنا دکھ ہوگا کہ یہ ایک اچھا رشتہ تھا۔“

”میں نے متین صاحب سے کہہ دیا ہے کہ ان کے والد کو بھیج دیں۔ سنا ہے دہلی کے ہیں۔ خاندان وغیرہ کے بارے میں معلوم کر لوں گی۔ اگر مناسب ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا ورنہ انکار کر دوں گی۔ اگر تمہاری پسند ہوتی تو میں یہ اجازت بھی نہیں دیتی، کیونکہ ہمارے خاندان میں لڑکیاں لڑکوں کو پسند نہیں کرتی پھرتی ہیں۔“

درخشاں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ اب اسے آنے والے وقت کا انتظار کرنا تھا اور کچھ نہیں۔ پھر بھی وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”دیکھ لیں اماں۔ آج کل خاندانوں کو کون دیکھتا ہے۔ اکرام صاحب اتنے بڑے دفتر کے مالک ہیں۔ آگے پیچھے کوئی ہے نہیں۔ علی سے بھی پوچھ کر دیکھ لیں۔“

”علی کے سامنے تو ابھی منہ سے بھانپ بھی نہیں نکالنی ہے۔ وہ تو یہی کہے گا کہ گھڑی کی چوٹائی میں تجھے نکال باہر کروں مگر میں تیری شادی خوب ٹھوک بچا کر کروں گی۔ محل میں ٹاٹ کا پھوند لگانے کی میں قائل نہیں۔“

دو چار دن کانتوں کے بستر پر سونے کے بعد درخشاں
نے اکرام کو بتا دیا کہ وہ اپنے والد کو اس کے گھر بھیج سکتا ہے۔
لیکن آنے سے ایک دن پہلے وہ اسے بتا دے۔ اس کی وجہ
یہ تھی کہ ایسے وقت کا انتخاب کیا جائے جب علی گھر پر نہ ہو۔
اکرام نے اسے دوسرے دن ہی بتا دیا کہ دو دن بعد
اس کے والد اس کے گھر آئیں گے۔

علی کو گھر سے بھاگنے کا آسان طریقہ تھا۔ اس کی جیب میں پیسے ہوتے تو وہ گھر میں نہیں ٹکنا تھا۔ اس نے علی کی جیب میں چند نوٹ ٹھونس دیے اور وہ غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہی جم جم کرتی ایک کار اس کے دروازے کے سامنے آ کر رکی، اس روز وہ بھی گھر پر رہی تھی تاکہ جو بات ہو اس کے سامنے ہو۔

جمیلہ خاتون نے اتنی رعایت ضرور برتی کہ اس سے کہا کہ اکرام کے والد کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے لیکن خبردار وہاں ایک منٹ بھی نہ بیٹھے اور نہ گفتگو میں شریک ہو۔ اچھا نہیں لگتا کہ لڑکی ہونے والے سر کے سامنے بیٹھے یا بات چیت میں شریک ہو۔ وہ دروازے پر گئی اور اکرام کے والد کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی آئی۔ شاید انہیں معلوم بھی نہ ہو سکا ہوگا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا رشتہ مانگنے وہ آئے ہیں۔

جیلہ خاتون کمرے میں پہنچیں تو بیٹھے ہی انہیں احساس ہوا کہ اس شخص کو وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہیں۔ یہی حال اللہ دیا کا بھی ہوا تھا۔ جیلہ خاتون دیکھ رہی تھیں کہ اس آدمی کے چہرے کا رنگ وہ نہیں ہے جو کچھ دیر قبل تھا۔ اللہ دیا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

”آپ دہلی میں کہاں رہتے تھے؟“

”میلی ماراں کے نزدیک ایک چھوٹے سے گھر میں۔ اس وقت ہمارے حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ یہ پاکستان کی برکت ہے کہ آج میرے پاس سب کچھ ہے۔“

”تم نے سچ کہا۔ کچھ لوگ وہاں سے آکر اجڑ گئے کچھ بن گئے۔ وہاں میرے سرخان بہادر کہلاتے تھے۔ نوکر جا کر گھر میں تھے۔ یہاں بس دن گزار رہی ہوں۔“

”میں یہاں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کے لیے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگ سکوں۔ آپ میرے بیٹے کے بارے میں کوئی سوال کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں۔“

جیلہ خاتون کی نظر میں اللہ دیا کے چہرے پر جی ہوئی تھیں۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

”آپ وہاں کیا کرتے تھے۔“
 ”بیگم صاحبہ سچ بتا دوں۔ آپ کی مروت شاید کہنا
 نہیں چاہتی لیکن میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ جموٹ نہیں
 بولوں گا۔ میں وہی اللہ دیا ہوں جو آپ کے گھر کا سودا سلف
 لانے پر ملازم تھا۔ آپ کے نمک میں اتنی برکت تھی کہ آج
 میں لاکھوں میں کھیل رہا ہوں۔“

”لاکھوں میں کھیلنے سے انسان کی ذات نہیں بدل جاتی۔“
 ”آپ نے بجا کہا لیکن یہ بھی تو سوچئے آپ کا ملازم
 میں تھا میرا بیٹا نہیں۔ وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ ہمیں
 بچوں کی خوشی کے لیے اپنے اصولوں کو بھول جانا چاہیے۔“
 ”آدھار رشتہ خاندان سے ہوتا ہے۔ میں اپنی نسل
 نہیں بگاڑ سکتی۔ درختاں کا باپ حکومت پاکستان کا ایک بڑا
 افسر تھا۔ آپ تو اپنے مرحوم سمدھی پر فخر کر سکیں گے۔ میں
 کس بات پر فخر کروں گی۔ تم جاسکتے ہو اور ہاں اپنے بیٹے
 سے کہنا جس گھر میں تمہارا باپ ملازم تھا اس گھر کی لڑکی
 تمہارے دفتر میں ملازمت نہیں کر سکتی۔ اس کا استعفیٰ انہیں
 ڈاک سے مل جائے گا۔“

اللہ دیا ممکن ہے کچھ اور کہتا لیکن جلیلہ خاتون اسے
چھوڑ کر کمرے سے باہر آ چکی تھیں۔ انہوں نے تو بس یہ
دیکھا کہ درختاں دروازے سے لگی ان کے درمیان ہونے
والی گفتگو کو سن رہی تھی، انہیں دیکھتے ہی جھپاک سے اپنے
کمرے میں چلی گئی۔

اللہ دیباہر جانے کا راستہ دیکھ ہی چکے تھے۔ کچھ دیر ڈرائنگ روم میں کھڑے دیواروں کو ہنستے رہے اور پھر قدموں سے باہر نکل گئے۔ جلیلہ خاتون سیدھی درخشاں کے کمرے میں پہنچیں۔

”تم نے کہا تھا، اگر میں انکار کر دوں تو تمہیں دکھ نہیں ہوگا۔ گفتگو تم نے سن لی ہے۔ میں نے انکار کر دیا ہے۔ مجھے بھی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا۔“

”اماں مجھے اپنا دکھ نہیں ہے۔ دکھ تو یہ ہے کہ آپ باپ کی سزا ایسے کو کیسے دے سکتی ہیں جبکہ یہ گناہ بھی نہیں کہ اللہ دیا آپ کے گھر ملازم رہ چکے ہیں بلکہ وہ تو عظیم آدمی ہیں کہ انہوں نے اپنی محنت سے ترقی کی۔“

”اے محنت کیا خاک کی ہوگی۔ کسی کا گھر لوٹا ہوگا یا بینک میں ڈاکا ڈالا ہوگا۔ بیٹوارے کے وقت یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ تم ایسے ایماندار باپ کی اولاد ہو کہ اس نے کلیم تک داخل نہیں کرایا۔ آج جس گھر میں بیٹھی ہو وہ اپنی محنت سے کمزرا اور میں تمہیں اللہ دیا کے گھر میں جھونک دوں۔ تم

فوراً اپنا استعفیٰ لکھ کر بھیج دو۔ نہ شادی ہوگی نہ نوکری۔“ اس کی تربیت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ غم ٹھونک کر ماں کے سامنے آجاتی۔ صرف اتنی اجازت لے سکی کہ وہ ایک مرتبہ اکرام صاحب سے مل آئے۔ اس کے بعد بے شک استعفیٰ دے دے گی۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ جب استعفیٰ دینا ہی ہے تو ملنا کیا ضروری ہے۔

وہ ماں کی اجازت کے بعد دوسرے دن حسب معمول دفتر گئی۔ اگرچہ پہلے ہی اس گفتگو سے واقف ہو چکا تھا جو اس کے گھر میں ہوئی تھی۔ درختوں نے کچھ بتانا چاہا تو

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا قانون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چارو دستیاب ہو۔
☆ شہر اور ضلع کے نام۔
☆ مکمل و تھوڑے بک اسٹال کا PTCL یا سویا گیل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوی، پاکیزہ، ہرگز

C-63 فیئر III یکیشٹین ویشنس اوسٹریا کی بین الاقوامی روڈ، کراچی

صورتِ قبولِ نماز میں سر پہنکی راہِ کر کے ہیں

35802552-35386783-35804200

جی میل: jdpgroup@hotmail.com

اکرام نے اسے خاموش کر دیا۔

”درخشاں! مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ ڈیڈی نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم بہت غریب لوگ تھے لیکن غریب ہونا جرم تو نہیں۔“

”اکرام! میں تم سے متفق ہوں، تمہارا ساتھ دینے کو اب بھی تیار ہوں۔ تم اگر مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو میں اپنی ماں سے بغاوت کے لیے تیار ہوں۔“

”اب میں یہ کہوں گا کہ تمہاری یہ سوچ غلط ہے۔ ماں باپ اس لیے نہیں ہوتے کہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے انہیں چھوڑ دیا جائے۔“

”میں انہیں چھوڑنے کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ ہم شادی کے بعد بھی ان کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ ان کا خیال رکھنے کے لیے ان کا بیٹا یعنی میرا بھائی بھی موجود ہے۔ تم خود بتاؤ کیا ہم شادی کر کے کوئی غیر اسلامی قدم اٹھائیں گے؟“

”شادی غیر اسلامی نہیں لیکن ماں کی نافرمانی غیر اسلامی ضرور ہوگی۔“

”اکرام! ہم دونوں بالغ ہیں۔ اپنی مرضی سے شادی کر سکتے ہیں۔“

”اسلام اس کی اجازت دیتا ہے لیکن ذرا سوچو تمہاری ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ کسی طرح بھی تم اپنی ماں کو متاںو در نہ ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔“

”اگر آپ ماں کی فرماں برداری کی بات کرتے ہیں تو اماں نے کہا تھا میں استعفیٰ دے کر واپس آ جاؤں۔ میں استعفیٰ دے رہی ہوں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔“

”رشتے آسمان پر بنتے ہیں لیکن ٹوٹتے زمین پر ہیں۔ اوپر والے نے تو ہمیں ملانے کی پوری تیاری کر لی تھی لیکن زمین والے اس پر تیار نہیں۔“

اس نے بڑی ہمت دکھائی تھی کہ اتنی باتیں کر لی تھیں، ڈوبی تو وہ اتنے گہرے پانی میں تھی کہ کئی پھندے ایک ساتھ لگے تھے لیکن جب وہ اکرام کی جھولی میں اپنا استعفیٰ ڈال کر گھر پہنچی تو بادل اس زور سے گرجے، گھٹا ایسی اندکرائی کہ جل جل محفل ہو گیا جتنا رو سکتی تھی جی بھر کے روئی۔

روتے روتے تھک گئی تو ماں سے لڑنے پہنچ گئی۔

”اماں اب زمانہ تمہارا دالائیں رہا۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔“

”جو کچھ آپ کر رہی ہیں وہ جہالت ہے۔“

”غریب، امیر کی تفریق تو ہمارے مذہب کو بھی

پہنچ نہیں۔“

”آپ ایک نہیں دو دلوں کو توڑ رہی ہیں۔“

وہ دلیلوں کے انبار لگاتی رہی۔ جیلہ خاتون کے پاس بس ایک جواب تھا۔

”ہم اپنی نسل نہیں بگاڑ سکتے۔“

”علی بھی تو آپ کی اعلیٰ نسل کا اعلیٰ سپوت ہے۔ دیکھ لو کیا کرتا پھر رہا ہے۔“

”وہ لڑکا ہے جو بھی کرے۔ بی بی تم اپنا مقابلہ اس سے مت کرو۔“

اکرام کا خط آیا۔

”درخشاں! میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اپنی ماں کا کہا مان لو۔ کسی اعلیٰ خاندان میں شادی کر لو تا کہ بقول تمہاری والدہ ”نسل نہ بگڑے“ ہم اتنی ہی دیر کے لیے ملے تھے۔ اب میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ ہاں تمہیں یاد ضرور رکھوں گا۔“

”کاش! میں نے شادی کی بات نہ کی ہوتی تو تم بہت دن تک میرے دفتر میں کام کر سکتی تھیں۔ اگر تم کہو تو میں کسی اور جگہ تمہاری ملازمت کا بندوبست کروں؟“

درخشاں نے پردے گرا دیے کھڑکیاں بند کر لیں۔ دل کے محلے میں اب نہ کسی کی یاد تھی نہ آواز۔

وہ دلی کی تمام کھڑکیوں پر دیز پردے ڈالے بیٹھی تھی کہ ہوا کے ایک جمونکے نے ایک پردہ ہٹا دیا۔ دروازے کے باہر ایک کار آ کر رکی۔ ڈرائیور تیزی سے اترا اور آگے پیچھے کے دونوں دروازے کھول دیے۔ ایک عورت اور دو لڑکیاں ایک ایک کر کے کار سے اتریں۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر کال تیل پر ہاتھ رکھ دیا اور دوبارہ کار میں جا کر بیٹھ گیا۔

درخشاں کو تو جیسے اب گھر سے کوئی سروکار ہی نہیں رہ گیا تھا۔ جیلہ خاتون دروازے پر گئیں۔ ان کے سامنے انہی کی عمر کی ایک عورت غرارہ پہنے چٹا ہوا دوپٹا گلے میں ڈالے کھڑی تھی۔ دونوں لڑکیاں البتہ فیشن ایبل نظر آ رہی تھیں۔

جیلہ خاتون حیران تھیں کہ یہ کون سی رشتہ دار آ گئیں۔

”حامد علی خاں مرحوم کا مکان یہی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”یقیناً آپ ان کی بیگم جیلہ خاتون ہیں؟“

”آپ اندر تو آئیے سب تعارف ہو جائے گا۔“

”شکریہ بہن۔“

وہ تینوں اندر آ گئیں۔ جیلہ خاتون نے انہیں

آب طلب

ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

”بہن! آپ بھی سوچ رہی ہوں گی کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں آن چکی۔ میں مسز امیر علی ہوں اور یہ میری دونوں بیٹیاں عدیلہ اور فرخندہ ہیں۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ آپ یہاں کس سلسلے میں تشریف لائی ہیں۔ کوئی سا بھندہ تعارف نہ ہونے کی صورت میں یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔“

”بہن سلسلہ نہ پوچھو۔ جس گھر میں پیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ ہم لوگ آپ کی بیٹی درخشاں کو دیکھنے آئے ہیں کہاں ہے وہ۔ اسے بلائیے نا۔“

”میں اسے دیکھتی ہوں۔ شاید سو رہی ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دو اکھا کر سوتی ہے۔“

جیلہ خاتون کو یقین نہیں تھا کہ وہ ان کے بلانے پر آجائے گی۔ اسی لیے انہوں نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ پہلے ہی کر دیا تھا۔

وہ ڈرتے ڈرتے درخشاں کے پاس آئیں۔

”درخشاں! خدا نے ہماری سن لی ہے۔ کوئی بیگم صاحبہ آئی ہیں۔ بہت اچھے خاندان کی معلوم ہوتی ہیں۔ گاڑی میں آئی ہیں ڈرائیور کے ساتھ۔ تمہیں دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کر رہی ہیں۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔ ان کے ساتھ ان کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔“

”اماں! ان کا خاندان دیکھ لیا ہے؟“

”خاندانی لوگ الگ سے پتا چل جاتے ہیں۔ جب بات آگے بڑھے گی تو مزید معلومات کر لیں گے۔“

جیلہ خاتون نے اسے تیار ہونے کا حکم دیا اور مہمانوں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”بہن! میرا بیٹا مراد انجینئر ہے۔ ویسے ہم بزنس پیشہ لوگ ہیں۔ میرے شوہر کا اسپورٹ انجینسپورٹ کا بزنس ہے۔ اگر درخشاں ہمارے گھر آجائے تو ہمارا گھر مکمل ہو جائے گا۔“

”بہن جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں۔ اگر قسمت میں ہوگا تو ضرور ہماری مراد پوری ہوگی۔“

”آمین۔“

ابھی کچھ اور باتیں ہوتیں لیکن اسی وقت درخشاں کمرے میں داخل ہوئی۔

”یہ ہے میری بیٹی درخشاں۔“

”ماشا اللہ جیسی کسی نے بتایا تھا ویسی ہی ہے بلکہ اس

موسم

”فجر۔“ بتاؤ سال میں کتنے موسم آتے ہیں؟“

”شاگرد۔“ 4۔

”فجر۔“ کون، کون سے؟“

”شاگرد۔“ ہر سال، ہنگامے، ڈبل سواری پر پابندی اور مو بائیک سروس بند۔

”فجر۔“ سچ دی لعلت۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سے بھی کچھ زیادہ۔“

درخشاں نے سلام کیا۔ دونوں لڑکیوں سے ہاتھ ملایا اور ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔ پھر وہی روایتی باتیں کیا کرتی ہو، تعلیم کتنی ہے، وقت کیسے گزرتی ہو، کون سا رنگ اچھا لگتا ہے، کھانے میں کیا پسند ہے وغیرہ وغیرہ۔ درخشاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ناشاد وغیرہ تیار کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

”بہن آپ کی مرضی ہو تو میں کسی روز مراد کو لے کر آ جاؤں۔ اچھا ہے وہ بھی لڑکی دیکھ لے گا۔ آج کل تو یہ کوئی معیوب بات نہیں رہی ہے۔“

”میں اپنے اصولوں پر اب تک قائم ہوں۔ لڑکی لڑکے کے ملنے کی میں قائل نہیں۔ آپ تصویر لے جائیں، لڑکے کی تصویر مجھے بھیج دیں ہم اپنے طور پر چھان بین کر لیں گے۔ اس کے بعد آپ کی مرضی ہوگی تو بسم اللہ۔“

”میں مراد کی تصویر پہنچا دوں گی۔ درخشاں کی تصویر کی ہمیں ضرورت نہیں۔ میں نے دیکھ لیا بس یہ کافی ہے۔ اب یہ بتائیے آپ کب جواب دے رہی ہیں؟“

”بھئی! یہ سروس نہ جمائیے۔ میں اچھی طرح تحقیق کر کے جواب دوں گی۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ یہ عورتیں جیلہ خاتون کے دل میں اتر گئی تھیں۔ اکھڑی اکھڑی باتیں تو وہ دکھاوے کے لیے کر رہی تھیں ورنہ دل میں فیملہ کر چکی تھیں کہ درخشاں کے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کہیں کی جان نہ پہچان۔ یہ مہمان تو غیب سے آ گئے۔

انہوں نے علی کے سامنے آنے والی عورتوں کا نقشہ ایسا بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ اس نے بھی ماں پر زور دیا کہ یہ شادی جلد سے جلد ہو جانی چاہیے۔ اتنا اچھا رشتہ ہے کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

درخشاں دوسرے دن اچھی طرح تیار ہوئی اور ماں

سے کسی سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے اکرام کے دفتر پہنچ گئی۔ اتنے دن بعد وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہو گیا۔
”میرا میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ وہ عورتیں آپ نے کون عورتیں؟“

”کچھ عورتیں میرے گھر آئی تھیں میرا رشتہ لے کر۔ انہیں یقیناً آپ نے گناہ کیا ہے۔ آپ کی کوئی جاننے والی ہوں گی۔“

”میں تمہارے لیے کبھی برا سوچ سکتا ہوں؟ آپ کی والدہ کسی اعلیٰ خاندان میں آپ کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے وہ خاندان بتا دیا اور میں اپنے ہم پلہ خاندان میں شادی کر رہا ہوں۔ میری شادی تین صاحب کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔“

”اکرام! کیا یہی تمہاری محبت ہے کہ مجھے کسی اور کے حوالے کر رہے ہو؟“

”محبت کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔ ہم شادی کے بغیر بھی تو محبت قائم رکھ سکتے ہیں۔ میں غربت اور امارت کی دیوار گر اسکتا تھا مگر یہ احساس مجھے ہمیشہ رہتا کہ تم اپنے سے کم تر خاندان میں بیاہ کر آگئی ہو۔ اب یہ احساس مجھے طمانیت بخشنے کا تم کسی اچھے خاندان میں گئی ہو۔ میں تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں شادی سے انکار مت کرنا۔ اسی میں میری خوشی ہے اور تم یقیناً مجھے خوش دیکھنا چاہو گی۔“

”انسان نفرت کے واسطے ٹھکرا دیتا ہے محبت کے نہیں۔ تمہارا بیچا ہوا جھنڈا میں ضرور قبول کروں گی۔“

وہ گھر آئی اور ماں سے کہہ دیا کہ اسے مراد کا رشتہ قبول ہے۔ جتنی جلدی ہو شادی کر دیں۔

”ہمیں ایسی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں جو منہ پھاڑ کر کہیں کہ ان کی شادی کر دو۔ ویسے بھی ہمارے خاندان میں پہلے منگنی ہوتی ہے۔ اس بہانے آنا جانا ہوتا ہے۔ دیکھا اور پرکھا جاتا ہے اس کے بعد شادی کا سوال اٹھتا ہے۔ پہلے تمہاری منگنی ہوگی اور اس کے سال دو سال بعد شادی۔“

”آپ کی جو مرضی ہو کریں۔ زہر کوئی ساہو میں پینے کے لیے تیار ہوں۔“

”تو بچی۔ زہر نہیں تیرے دشمن۔ کیوں ایسی باتیں کرتی ہے۔ دیکھ تو سہی میں کس دھوم دھام سے تیری منگنی کرتی ہوں۔“

مراد کے گھر میں کس چیز کی کمی تھی۔ ارمانوں کی

بہتات یہاں بھی تھی۔ جیلہ خاتون اچھے دن دیکھے ہوئے تھیں۔ کنبوس تھیں نہیں کہ سادگی شعار کرتیں۔ ایسی دھوم دھام سے منگنی کی کہ بڑی بڑی شادیوں کو مات کر دیا۔ درخشاں تو ڈوریوں سے چلنے والی کٹھن تکی بنی ہوئی تھی۔ جب چاہا اٹھا دیا، جب چاہا بٹھا دیا۔ خاموشی سے پیسوں کو آگ لگتے ہوئے دیکھتی رہی۔

منگنی کی دھوپ نے منہ پار کیا تو جیلہ خاتون نے گاڑی میں پاؤں رکھا۔ ”علی چل ذرا ہونے والے بہنوئی کے گھر تو لے چل۔ آنے جانے سے محبت بھی بڑھتی ہے اور وقت نا وقت جانے سے گھر کے رنگ ڈھنگ بھی آنکھوں پر کھل جاتے ہیں۔ شادی ہونے سے پہلے مجھے اچھی طرح تحقیق بھی تو کرنی ہے۔ ذرا اڑوس پڑوس بھی گھوم آؤں گی۔ پڑوسیوں سے کوئی بات چھی نہیں ہوتی۔“

اب یہ ان کا ہر دوسرے تیسرے دن کا معمول ہو گیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ لڑکے والوں کے خاندان کی تحقیق کر رہی تھیں۔

منگنی کو تقریباً چھ مہینے ہو گئے تھے۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے استا مگنی تھی۔ اتفاق سے گاڑی گھر پر کھڑی تھی۔ علی کہیں گیا ہوا تھا وہ تیار ہوئی اور ماں سے اجازت لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

ماں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا تھا جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ ہفتوں بعد وہ تیار ہوئی تھی اور ماں سے بات کی تھی۔ انہوں نے خوش خوشی اجازت دے دی۔

”ہاں بیٹا جاؤ۔ کہیں گھوم پھر آؤ۔“

وہ گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کہاں جائیں۔ کوئی اور ساتھ ہوتا تو کسی ریسٹورنٹ ہی میں جا کر بیٹھ جاتی۔ ایسی بیٹھتی کیا اچھی لگوں گی۔ کسی پارک میں جا کر تو اور اداس ہو جاؤں گی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی لیکن منزل کا تعین نہیں کر پائی تھی۔ پھر اسے خیال آیا آئرس کونسل میں تصویروں کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ اس نے گاڑی آئرس کونسل کے راستے پر ڈال دی۔

گاڑیوں کی قطار میں اس نے بھی اپنی گاڑی پارک کی اور نمائش گاہ میں داخل ہو گئی۔ اسے اپنے باپ کی یاد آگئی جن کے ساتھ وہ ایسی ہی ایک نمائش دیکھنے آئی تھی۔ وہ مصورہ نہیں تھی لیکن مصوری کا شوق ضرور رکھتی تھی۔ اس بارے میں اس نے کچھ لٹریچر بھی پڑھ رکھا تھا۔

یہ تصویریں بالکل جدید طرز کی تھیں۔ رنگوں کا امتزاج اور اسٹروکس نہایت شاندار تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا

کہ کسی نوجوان ذہن کے زندہ شاہکار ہیں۔ ایک تصویر تو ایسی شاندار تھی کہ بے اختیار اس کا جی چاہا اسے خرید لے لیکن اس کی قیمت دیکھ کر دل گئی۔ قیمت اس لیے زیادہ لگ رہی ہے کہ میری جیب سے بہت زیادہ ہے ورنہ یہ تصویر واقعی انمول ہے۔

اتنی دیر میں شور سا مچا، نقاش آرزو اپنے مداحوں کو آؤگراف دینے آئے ہیں، یہ نقاش آرزو کون ہیں؟

ارے بھائی ان تصویروں کے خالق۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک نوجوان لڑکا کچھ لڑکیوں کے درمیان گھبراہٹا تھا۔ یہ ہے مصور؟ مصوروں کے بارے میں تو اس نے نہ جانے کیا کیا سن رکھا تھا۔ یہ تو ان سب کے برعکس تھا۔ بالکل عام لوگوں کی طرح۔ سلیقہ مند شرفا کے حلیے میں۔ نہ بکھرے روکھے سوکھے بال۔ نہ اجاڑ سا وجود۔ نہ انسان بیز آؤگرافیں۔ نہ بکیر نہ غرور۔ اس کا دل بے اختیار اس کی طرف کھینچنے لگا۔ اس شخص سے تو نہ صرف آؤگراف لیے جائیں بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ لڑکیوں کی بھیڑ چھوڑے تو وہ بھی اپنی جگہ بنائے۔

کچھ دیر میں لڑکیوں نے اس کا پیچھا چھوڑا اور وہ اپنی ایک تصویر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت درخشاں وہاں پہنچ گئی۔

”میرا نام درخشاں ہے۔“

”بہت اچھا نام ہے۔“

”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”یہاں نہیں۔ اگر آپ کا کوئی اسٹوڈیو ہے تو وہاں۔“

”معاف کیجئے گا، اگر آپ مصورہ وغیرہ ہیں تو مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”میں تصویروں سے دلچسپی اور مصوروں سے عقیدت رکھتی ہوں۔“

”میں مردم بے زار نہیں ہوں۔ میں نے اپنی ہر تصویر کے نیچے اپنا فون نمبر لکھ دیا ہے۔ کوئی بھی شخص اس فون نمبر پر رابطہ کرے مجھ سے ملاقات کر سکتا ہے۔“

”میں، کوئی بھی جتنا نہیں چاہتی۔“

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ ”آپ میرا ذاتی نمبر لے لیجئے۔ یہ نمبر صرف چند دوستوں کے پاس ہوتا ہے۔“ اس نے نمبر دے دیا۔ اسی وقت کچھ لوگ اس کے پاس آگئے اور درخشاں کو اس کے پاس سے ہٹا پڑا۔

وہ کچھ دیر یہ سوچ کر نمائش میں رکی رہی کہ شاید اس

سے پھر ملاقات ہو جائے لیکن لوگ اسے گھیرے ہی رہے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئی۔ اس کا نمبر تو وہ لے ہی چکی تھی، مگر پہنچے ہی اس نے اسے فون کیا۔ ”آپ کی مداح جس کو آپ نے اپنا ذاتی نمبر دیا تھا۔“

”میں کتنے ہی لوگوں کو نمبر دیتا ہوں۔ اب مجھے کیا معلوم آپ کون بول رہی ہیں؟“

”میرا نام درخشاں ہے۔“

”بہ خدا مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ ناموں کے معاملے میں میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے ہاں چہرے بھی نہیں بھولتا۔ آپ سامنے آئیں تو ممکن ہے آپ کو پہچان لوں۔“

”بلانے کا یہ اچھا بہانہ ہے۔ اچھا یہ بتائیے کہاں ملاقات ہو سکے گی؟“

”ابھی تو میں اپنی نمائش میں مصروف ہوں۔ کل آخری دن ہے پرسوں آرام کروں گا۔ اس کے بعد آپ مجھے فون کیجئے گا۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اس نے فون رکھ بھی دیا۔ ”برخوردار بڑے خیرے والے معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکیاں ذرا بات کیا کر لیتی ہیں دماغ آسان پر پہنچ گیا ہے۔“

جیلہ خاتون دیکھ رہی تھیں کہ درخشاں ایک تہذیبی سے دوچار ہو رہی ہے۔ اجاڑ بڑی رہتی تھی اب بات بے بات تیار ہو رہی ہے۔ اسے گنگناتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھی۔ یہ شہت تہذیبی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی ہوں گی کہ درخشاں نے اب منگنی کو قبول کر لیا ہے۔

☆☆☆

درخشاں کئی ملاقاتوں کے بعد اس قابل ہو گئی تھی کہ وہ نقاش آرزو کو اس کے اسٹوڈیو سے ریسٹورنٹ تک لے آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں آئے سامنے بیٹھے تھے۔

”تم اپنے گھر والوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟“

”میری مصروفیات کچھ ایسی ہیں کہ دنیا داروں کی تنگ جھولی میں نہیں سما سکتیں۔ ویسے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ صبح شام گھر جاتا ہوں۔ والدہ تو ہیں نہیں والد صاحب بڑے بھائی کے پاس رہتے ہیں۔ ان کا تمام خرچ میں اٹھاتا ہوں۔ بس یوں سمجھو کہ تصویریں بنانے اور سونے کے لیے اسٹوڈیو آ جاتا ہوں۔“

”جس سے شادی کرو گے وہ بھی تو دنیا دار عورت ہوگی۔ ایسا کرو کی مصورہ سے شادی کر لو۔“

”دو بادشاہ ایک مملکت میں نہیں رہ سکتے۔ شادی تو میں

اس لڑکی سے کروں گا جو مصوری کا شوق رکھتی ہو مصور نہ ہو۔“
”اور مصور سے عقیدت رکھتی ہو۔“ درخشاں نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”اچھی رعایا ہونے کی پہلی شرط تو یہی ہے۔“

”تو آپ بیوی کو رعایا سمجھتے ہیں؟“

”بہت اچھے حکمران کی بہت اچھی رعایا۔ اگر حکمران اچھا ہو تو اس سے بڑھ کر رعایا کی خوش نصیبی اور کیا ہوگی۔ حکمران رعایا کی ضرورتوں کا خیال رکھے گا اور رعایا عیش کرے گی۔“

”پھر کب کر رہے ہیں شادی؟“

”جب آپ کہیں۔“

فحاش نے یہ سوال اتنی جلدی کر دیا کہ درخشاں اسے دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر اس نے ہمت جمع کی۔

”آپ مجھ سے شادی کریں گے؟“

”اگر آپ کی اجازت ہوگی۔“

”آپ کے بڑے اجازت دے دیں گے؟“

”نہیں۔ میری شادی میں کوئی شریک نہیں ہوگا۔ میری منگنی میری خالہ زاد سے کر دی گئی ہے اور میں وہاں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے وہ منگنی توڑنی ہوگی۔ اس کے بعد سوچو میری شادی میں کون شریک ہوگا۔ ہو بھی سکتا ہے وہ مجھے معاف بھی کر دیں۔“

”میرا حال بھی تم سے مختلف نہیں۔ میری بھی منگنی کر دی گئی ہے۔ مجھے بھی وہ منگنی توڑنی پڑے گی۔ مجھے معلوم ہے یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے نہیں ہوگا لیکن تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

دونوں اپنی اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

”ہیلو، مراد صاحب؟“

”جی بول رہا ہوں۔“

”میں آپ کی منگیت درخشاں بات کر رہی ہوں۔“

”زبے نصیب۔ آپ کو ہمارا ایک سال بعد خیال آیا ہے۔ فرمائیے۔“

”جو بات میں کہنا چاہتی ہوں وہ فون پر نہیں ہو سکتی۔ کیا ہم کسی جگہ مل سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے نہ آپ کے گھر نہ میرے گھر۔“

”خیریت تو ہے۔ آپ کی آواز سے کچھ گھبراہٹ بھی ظاہر ہو رہی ہے۔“

”شاید اسی لیے کہ میں آپ سے پہلی بار مخاطب ہو رہی ہوں۔“

”آپ فرمائیے، میں آپ سے کہاں مل سکتا ہوں؟“

”فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں آسکتے ہیں۔ وہ میرے گھر سے قریب بھی ہے۔“

”بالکل آسکتا ہوں۔ کس وقت آ جاؤں؟“

”آج شام پانچ بجے آ جائیں۔ میں نے آپ کو تصویر میں دیکھ رکھا ہے پہچان لوں گی۔“

”میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیں۔ جب تک آپ آ نہیں جاتیں میں گاڑی میں بیٹھا رہوں گا۔“ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر دیا۔

جیلہ خاتون حالات سے بے خبر مراد کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

”درخشاں، میری تحقیق بھی مکمل ہو گئی ہے اور تیاری بھی۔ آج میں تیری سسرال جا رہی ہوں۔ ان لوگوں سے کہوں گی بھی ایک سال مکمل ہو گیا ہے اب آپ لوگ تاریخ لینے آ جائیں۔ میں نے تمہارے چچا اور پھوپھوں سے کہہ دیا ہے کہ کبھی بھول کر اس طرف کارخ نہیں کیا لیکن یہ موقع ایسا ہے کہ انہیں آنا ہوگا۔ دو چار مرے جیتے میرے بھی ہیں وہ بھی آ جائیں گے۔“

انہوں نے علی کو ساتھ لیا اور چلی گئیں۔

درخشاں نے ان سے کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کہاں جائے گی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے گھر کو تالا لگایا اور باہر آ گئی۔

ریسٹورنٹ گھر کے نزدیک ہی تھا لیکن اسے اتنی جلدی تھی کہ اس نے رکشا لیا اور ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ گاڑی کا نمبر بھی وہی تھا اور اس گاڑی کے قریب کھڑا ہوا لڑکا بھی وہی تھا جسے وہ تصویر میں دیکھ چکی تھی۔ اس لڑکے نے بھی درخشاں کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

”آپ ہی مراد ہیں؟“

”اور آپ درخشاں؟“

مزید کچھ کہے بغیر وہ ریسٹورنٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

درخشاں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ دونوں ایک خالی میز دیکھ کر آسنے سانسے بیٹھ گئے۔

”کیا پیئیں گی۔ چائے، کولڈ ڈرنک یا کافی؟“

”میں یہاں کچھ پیئے نہیں آئی ہوں۔“

”پھر بھی۔ یہاں پیئے ہیں تو اس میز کا کرایہ تو دینا ہوگا۔“

”چائے منگو لیں۔ کولڈ ڈرنک تو ہم باہر کھڑے ہو کر

آب طلب

بھی پی سکتے تھے۔“

”جتنی دیر میں چائے آتی ہے میں اپنی بات شروع کیے دیتی ہوں۔“

مراد نے چائے کا آرڈر دے دیا اور پھر درخشاں کی طرف متوجہ ہوا۔

”جی فرمائیے۔“

”میں بات کو بے جا طول نہیں دوں گی۔ مختصر آتا کہوں گی کہ میں آپ سے شادی کے حق میں نہیں ہوں، آپ میری خاطر اتنا کیجیے کہ مجھ پر الزام نہ آنے دیں خود انکار کر دیں۔“

وہ اس کا عجیب و غریب مطالبہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ ایسا خوفزدہ نظر آ رہا تھا جیسے وہ ابھی اٹھے گی اور اس کا منہ لوچ لے گی۔

”میں اپنا وہ عیب پوچھ سکتا ہوں جس کی وجہ سے آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گی؟“

”عیب آپ میں کیا ہوگا۔ تو مجھے معلوم نہیں۔ عیب مجھ میں ہے کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔“

”یہ خیال آپ کو ایک سال بعد آیا ہے؟“

”نہیں۔ کسی سے محبت کی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ نفرت کا تو کوئی سبب ہوتا بھی ہے، محبت کا سبب کوئی نہیں ہوتا یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ محبت تو مجھے آپ سے کبھی تھی ہی نہیں۔ نفرت کا حق نہیں۔ بس اتنا چاہوں گی کہ آپ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔ مجھے اپنانے سے انکار کر دیں۔“

”یہ اتنا معمولی فیصلہ نہیں جو میں یہاں اکیلا بیٹھ کر کر لوں گا۔“

”میں یہ کب کہہ رہی ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ گھر جائیں اور اپنی والدہ سے بات کریں۔“

”جی ہاں، میں ان سے کہوں میں آپ لوگوں کی عزتیں اچھا رہا ہوں۔ ایک نہایت نیک اور پارسا لڑکی سے کسی وجہ کے بغیر شادی سے انکار کر رہا ہوں۔ منگنی توڑ دیں۔ محترمہ! یہ منگنی ٹوٹنے کی تو صرف اس لیے کہ آپ انکار کر رہی ہیں۔ یہ داستان آپ کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔“

”آپ مرد ہیں۔ اپنی بات منوان سکتے ہیں کہہ دیں کہ آپ نے میرے بارے میں کچھ ایسی باتیں سنی ہیں جس کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں۔“

”معاف کیجیے گا، یہ منگنی بڑوں نے طے کی تھی انہی کے سامنے ٹوٹنے کی اور مطالبہ آپ کی طرف سے ہوگا۔ منگنی ہم نہیں تم توڑ رہی ہو۔“

”اگر آپ کہتے ہیں یہ داستان میرے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوگی تو بے شک میرا نام لے دیجیے۔ کہیے کہ میں ہوں میں آپ سے ملی تھی اور آپ سے منگنی توڑنے کا کہا تھا۔“

”محترمہ! یہ بھی میں کیوں کہوں۔ آپ خود اپنی والدہ سے کیوں نہیں کہتیں؟“

”اس لیے کہ اگر آپ نے زبردستی مجھ سے شادی کر بھی لی تو میں نہ آپ کو خوش رکھ سکوں گی نہ خود خوش رہوں گی، اگر آپ جہنم خریدنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ریسٹورنٹ سے نکل گئی۔ اس نے رکشا کا انتظار بھی نہیں کیا اور پیدل ہی گھر کی طرف چل دی۔

وہ مراد کے دل میں شک کا ایسا بیج بو آئی تھی کہ اسے یقین تھا مراد کی طرف سے انکار کا پیغام آ جائے گا۔ اس کا نام درمیان میں آیا تو یہ بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

وہ انتظار کرتی رہی کہ ادھر سے کیا جواب آتا ہے۔ دوسری طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ اسے یہ خیال بھی ہو رہا تھا کہ اگر مراد نے چپ سادہ لی تو کیا ہوگا۔ اسی کشمکش میں چار دن گزر گئے لیکن پانچویں دن مراد کی والدہ کا فون آ گیا۔ وہ جیلہ خاتون سے ملنے آنا چاہتی تھیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن ان کا لہجہ غالباً ایسا تھا کہ جیلہ خاتون نے بھی محسوس کیا اور درخشاں کو بھی بتایا۔

”مجھے کچھ اکھڑی اکھڑی لگ رہی تھیں۔ بڑی رکھائی سے بات کر رہی تھیں۔ میں ابھی بات ہی کر رہی تھی کہ فون کھٹاک سے بند کر دیا۔“

”کبھی بھی لائن بھی کٹ جاتی ہے اماں۔“

”مجھ سے زیادہ نہیں جانتی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کسی نے ان کے کان بھر دیے ہیں۔“

”کان کون بھرے گا؟“

”تمہاری پھوپھیاں کیا کم کٹ کھنی ہیں۔ میں نے خوشی میں آ کر انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ ایک مرتبہ انہیں ان کے گھر لے کر بھی گئی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی وہ آگ لگا گئیں گی۔“

”اماں تم بھی تو عقل مند کی کام کرتی ہو۔ خیر انہیں آنے تو دو۔ ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو آپ کچھ اور سمجھ رہی ہوں۔“

”دیکھو بیٹیا، مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔“

درخشاں سمجھ رہی تھی وہ کیا بات کرنے آ رہی ہیں لیکن وہ پریشان ہونے کے بجائے خوش تھی کہ داستان مکمل ہوئی۔ آخر وہ دن آئی گیا جب مراد کی والدہ اور اس کی دونوں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ علامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریمڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

کے لیے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔
 ”اماں! انہیں اگر مگنی ختم کرنی ہی تھی تو مجھ پر الزام تو نہ لگاتے۔ انہوں نے یہ کیوں کہا کہ میں مراد سے ملنے گئی تھی۔“
 ”بیٹا! اسی سے تو خاندان کا پتا چلتا ہے۔ پیسا آجانے سے خاندان تھوڑی بدل جاتا ہے۔ اچھا ہوا ہم بھنسنے سے بچ گئے۔ میری عقل مندی دیکھو۔ میں نے اسی لیے ایک سال تک مگنی رہنے دی تھی تاکہ حقیقت سامنے آنے کے لیے کچھ وقت مل جائے۔ ویسے تو فکر مت کر۔ میں نے دو چار سے کہا ہوا ہے۔ کوئی نہ کوئی اچھا رشتہ آ ہی جائے گا۔“
 درخشاں نے داستان کا ایک حصہ مکمل کر لیا تھا۔ اب اسے نقاش سے کہنا تھا کہ وہ اپنی مگنی ختم کر لے اور اس کے گھر رشتہ لے کر آئے۔
 وہ کئی دن سے مسلسل رابطے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نقاش سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ تھک ہار کر وہ اس کے اسٹوڈیو پہنچ گئی۔ یہاں وہ ایک دوبار اور بھی آچکی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا قلیت تھا جس میں اس کے دو اور ساتھی بھی کام کرتے تھے۔ اسی لیے وہ یہاں آنے سے گریز کرتی تھی لیکن اب آنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ یہاں بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ ایک روز اس کے والد یہاں آئے تھے۔ دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کے بعد سے ہم سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔
 ”کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“
 ”اس کے والد نے اس کی کہیں مگنی کر دی تھی۔ وہ اب چاہ رہا ہے کہ اس کی مگنی توڑ دی جائے۔“
 ”خیر یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے تو ایک تصویر کے بارے میں اس سے بات کرنی تھی۔ اس لیے چلی آئی۔ میں پھر فون کر کے دیکھوں گی۔ شاید بات ہو جائے۔“
 وہ چلی آئی۔ شام کو اس نے پھر فون کیا اور فون مل گیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ خاندان میں بہت جھگڑے ہو رہے ہیں۔ اس کی مگنیتر چونکہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس لیے پورا خاندان ملوث ہو گیا تھا۔ اس کے والد کے سوا کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا اس لیے اس پر بہت دباؤ پڑ رہا تھا۔ خاندان کے لوگ اسے فون کر کے پریشان کر رہے تھے اس لیے اس نے فون بند کر دیا تھا۔
 ”یہ تو سوچا ہوتا میں کتنی پریشان ہو جاؤں گی۔“
 ”مجھے احساس تھا لیکن سوچ رہا تھا کسی خوش خبری کے بعد ہی تمہیں فون کروں گا۔“

بہنیں اس کے گھر پہنچ گئیں۔ گاڑی سے اترتے ہی ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کیا ارادہ لے کر آئی ہیں۔ درخشاں جان بوجھ کر ان کے ساتھ نہیں بیٹھی کہ جب کوئی بات ہوگی تو اماں خود اسے بلا لیں گی۔ وہی ہوا کچھ دیر بعد جیلہ خاتون غصے میں بھری ہوئی باہر آئیں۔
 ”تم مراد سے ملی تھیں؟“
 ”میں کیوں ملنے لگی۔ میں نے تو انہیں آج تک سامنے دیکھا بھی نہیں ہے مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“
 ”اس کی ماں کہہ رہی ہے کہ تم اس سے ملی تھیں اور اس سے کہہ کر آئی ہو کہ وہ مگنی توڑ دے؟“
 ”جھوٹ بولتی ہیں وہ۔ اماں قسم لے لو جو میں اس سے ملی ہوں۔ آخر ان لوگوں کے مقاصد کیا ہیں؟ کیا چاہتی ہیں وہ؟ اگر انہیں مگنی توڑنی ہے تو توڑ دیں لیکن کسی پر الزام تو نہ دھریں۔ اپنے بیٹے سے جا کر پوچھیں کہ وہ کس کے دام میں پھنسا ہوا ہے کیوں مگنی توڑنا چاہتا ہے۔“
 ”ہاں بات تو یہی ہے لیکن انہوں نے بہت گھٹیا راستہ اختیار کیا ہے۔ منع کرنے کے اور بھی طریقے تھے۔ یہ الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ بس تو ان کے سامنے آکر کہہ دے کہ تو مراد سے نہیں ملی پھر دیکھ میں انہیں کیسا ذلیل کرتی ہوں۔“
 درخشاں تو کھیل بگاڑنے کو تیار ہی بیٹھی تھی۔ ماں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچی اور ان پر برس پڑی۔ جیلہ خاتون تو ان کی بے عزتی کیا کرتیں جو اس نے کی۔ سارا الزام مراد کے سر تھوپ دیا۔ ان لوگوں کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا جس سے وہ ثابت کرتیں کہ درخشاں مراد سے ملی تھی۔ مگنی تو انہیں ختم کرنی ہی تھی یہ کہہ کر اٹھ گئیں۔
 ”اگر یہ بات غلط بھی ہے تو بھی ہم نے لڑکی کی زبان درازی دیکھ لی۔ اچھا ہوا ہم بال بال بچ گئے۔ ایسی لڑکا لڑکی کو ہم اپنی بیوی نہیں بنا سکتے۔ اس قصے کو ہمیں ختم کرو۔ میں مگنی توڑتی ہوں۔“
 ”میری بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔ آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔ میری حقیقت تو اب مکمل ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے ہم بچ گئے۔ مگنی ٹوٹنے کا داغ اگلا طاق کا نہیں۔“
 اتنی بے عزتی کے بعد کون کہیں نکلتا ہے۔ وہ یوں انہیں جیسے کسی نے دھکے دے کر نکالا ہو۔
 ان کے چلے جانے کے بعد جیلہ خاتون کا طیش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مراد کے گھر والوں کو جھولیاں پھیلا پھیلا کر کوس رہی تھیں۔ درخشاں بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے

”میں اس کال کو خوش خبری سمجھوں؟“
 ”ابھی نہیں لیکن بہت جلد معاملات طے ہو جائیں گے۔“
 اگلے ہی دن اس کا فون آگیا۔ اس کی منگنی ختم ہو گئی تھی۔
 ”بس ذرا معاملہ ٹھنڈا ہو جائے پھر میں والد صاحب کے ساتھ تمہارے گھر آؤں گا۔“
 درخشاں خود بھی یہ چاہتی تھی کہ ابھی کچھ دن ٹھہر کر وہ اس کے گھر آئے تو اچھا ہے۔ کہیں اس کی والدہ کو کچھ شک نہ ہو جائے۔ اس دوران وہ دونوں گھر سے باہر ملتے رہے۔
 درخشاں نے ایک ٹیوشن کا بہانہ کر کے کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر رہنے کا موقع نکال لیا تھا۔
 گھر کا ماحول پھر اپنی جگہ آگیا تھا۔ علی کی آوارگیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اب وہ نشے کی حالت میں گھر بھی آنے لگا تھا۔ جیلہ خاتون کی سختیاں دم توڑنے لگی تھیں۔ علی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ طبیعت کا برا نہیں تھا لیکن نشے کی لت نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی تھیں۔ کبھی وہ اتنا میٹھا بن جاتا کہ جیلہ خاتون کو اس پر پیار آنے لگتا کبھی زہر سے زیادہ کڑوا ہو جاتا۔ ایسی غلیظ زبان استعمال کرتا کہ دیواریں بھی اپنے کان بند کر لیں۔
 ایک روز درخشاں نقاش سے ملنے گئی تو وہ معمول سے زیادہ خوش تھا۔
 ”تم اگر کچھ دیر اور نہ آتیں تو میں تمہیں فون کر کے بلانے والا تھا۔“
 ”کیوں ایسی کیا بے باتی ہو گئی؟“
 ”تم بھی سنو گی تو مجھ سے گردن تن جائے گی۔ فرانس میں میری تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے۔“
 ”سچ! یہ تو واقعی بہت بڑی خوشخبری ہے۔“
 ”مزے کی بات یہ ہے کہ یہ نمائش میں نہیں کر رہا ہوں۔ وہاں کے آرٹسٹوں نے مشترکہ طور پر اس نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ پچھلے دنوں میری ایک تصویر کی بہت دھوم مچی تھی۔ اسی تصویر سے متاثر ہو کر یہ نمائش ہو رہی ہے۔ مختلف شہروں میں تقریباً بیس دن تک یہ نمائش ہوگی۔ اس کے بعد دیکھنا میری شہرت بین الاقوامی سرحدوں کو چھونے لگے گی۔ میرا ہٹا ملک بھی میری قدر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم شادی کریں گے تو سوچو اس شادی کی خبریں کہاں کہاں شائع نہیں ہوں گی۔ تم دنیا کے بہت بڑے آرٹسٹ کی بیوی کہلاؤ گی۔ والد صاحب کہہ رہے تھے تمہاری منگنی ختم ہو گئی ہے جہاں چاہتے ہو وہاں شادی کرلو۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ فرانس سے واپس

آتے ہی ان کے لیے ایک عدد بھوکا انتظام کروں گا۔“
 ”تو کیا تم بھی فرانس جاؤ گے؟“
 ”مجھے تو جانا پڑے گا۔ میرے اعزاز میں وہاں تقاریب ہوں گی۔ ہزاروں ڈالر کا نذرانہ ملے گا۔ میں تمہیں بھی ساتھ لے جاتا لیکن بھتے کے اندر اندر رونا لگی ہے۔ اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ شادی کے بکھیرؤں میں پڑوں گا یا جانے کی تیاری کروں گا؟“
 ”میں اتنے دن تمہارے بغیر کیسے گزاروں گی؟“
 ”اخباروں میں خبریں پڑھ پڑھ کر اور کیسے۔ روزانہ میرے نام کے فیصے شائع ہوں گے۔ بیس دن چکی بجاتے گزر جائیں گے۔ واپس آتے ہی میں تمہارے گھر رشتہ لے کر آؤں گا۔ اتنی شہرت ہو چکی ہوگی کہ تمہاری والدہ انکار نہیں کر سکیں گی۔“
 کوئی ایسی مدت نہیں تھی۔ بیس دن یوں گزر جاتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ بیروں میں زنجیر ڈال کر اسے روک لیتی۔
 نقاش آرزو اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ اس ایک ہفتے میں وہ ایک دن بھی درخشاں سے ملنے نہ آسکا۔ درخشاں اسے رخصت کرنے ایئر پورٹ تک نہ جا سکی۔ جاتی بھی تو کس رشتے سے۔ اس نے بس اگلے دن کے اخبار میں پڑھ لیا کہ مایہ ناز مصور نقاش آرزو کی فرانس روانگی۔
 دن پردن گزرتے جا رہے تھے۔ وہ تو یہ کہہ کر گیا تھا کہ اخبارات اس کی خبروں سے بھرے ہوں گے۔ فیصے شائع ہوں گے لیکن ایک خبر کے سوا کوئی خبر تک نہیں چھپی۔ وہ تمام قابل ذکر اخبارات روزانہ خرید کر لاتی اور مایوس ہو کر دور پیچک دیتی۔
 اس کی تعریفوں کے پل تو کیا باندھے جاتے ایک دن خبر آئی تو یہ ”مصور نقاش آرزو فرانس میں ایک حادثے کا شکار ہو کر جاں بحق۔“
 اس نے اخبار کے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دیے۔ دوسرا اخبار اٹھایا۔ دیوانوں کی طرح خبر ڈھونڈنے لگی کہ شاید اس اخبار میں یہ ہو کہ وہ زخمی ہوا ہے۔ اس اخبار میں بھی ہلاکت کی خبر تھی۔ اس نے اس اخبار کو بھی پرزے پرزے کیا اور ہوا میں اچھال دیا۔ پھر اخباروں کے پرزے ہوتے رہے۔ پرزوں کے ساتھ ساتھ اس کے قہقہے بھی ہوا میں بکھرنے لگے۔ جیلہ خاتون کمرے میں آئیں تو سمجھ ہی میں نہ آسکا کہ ہوا کیا ہے۔ کمرے میں ہر طرف

اخبار بکھر ہوئے تھے اور درخشاں دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی اس کے قہقہے آنسوؤں میں بدل گئے۔ گلے لگ کر خوب روئی۔ اچانک وہ پھر قہقہے لگانے لگی۔ جیلہ خاتون کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ درخشاں کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی علی کے کمرے میں نکلیں۔ اتفاق سے وہ گھر پر تھا۔ اس نے جوستا تو وہ بھی بھاگتا ہوا آیا۔ بہن بھائیوں میں کچھ دنوں سے پول جال بند تھی لیکن آخر بھائی تھا۔ بہن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ جیسے تیسے گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے کر بھاگا ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد بتایا کہ یہ لڑکی اچانک کسی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔

یہ راز نہیں کھلتا تھا کہ اس نے اخبار کیوں پھاڑے یا اخبار پڑھ کر پاگل پن کا دورہ پڑا پھر یہ بھی سوال اٹھتا تھا کہ اس نے صرف اخبار ہی کیوں پھاڑے۔ کمرے میں رکھی اور چیزوں کو ہاتھ کیوں نہیں لگایا۔ اخبار میں ایسی کیا خبر تھی جس نے اسے صدمہ پہنچایا۔ یہ صرف اسی وقت معلوم ہو سکتا تھا جب درخشاں اس پاگل پن سے نکلے تو شاید کچھ بتا سکے۔ ڈاکٹروں کو یہ بھی شک تھا کہ شاید شادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ پاگل پن کا شکار ہوئی ہے لہذا انہوں نے ہدایت دی کہ جیسے ہی اس کی طبیعت بحال ہو اس کی شادی کر دی جائے۔ اسے ایک اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔
 ”آپ کسی نقاش کو جانتی ہیں؟“ ڈاکٹروں نے مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد جیلہ خاتون سے پوچھا۔
 ”نہیں، اس نام کے تو کسی آدمی کو ہم نہیں جانتے۔“
 ”بے ہوشی کے عالم میں وہ کہہ رہی تھی، نقاش تم جلدی آ جاؤ ورنہ گھروالے میری شادی کہیں اور کر دیں گے۔“
 ”معلوم نہیں یہ نام اس کے ذہن میں کہاں سے آگیا۔ اس کے منگیتر کا نام تو مراد تھا اور یہ منگنی ٹوٹ بھی گئی۔“
 ”یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لڑکیاں تصور میں کوئی نام آباد کر لیتی ہیں۔ یہ نام ہے بھی رومانٹک سا۔ ممکن ہے یہ فرضی نام ہو۔ بہر حال ہم اور کوشش کریں گے۔ اگر تفصیلات معلوم ہوئیں تو ہم آپ لوگوں کو ضرور بتائیں گے۔ ٹھیک ہو جانے کے بعد آپ اس سے پیار سے پوچھیے گا اور اگر کوئی نقاش نام کا لڑکا ہے تو اس سے شادی کرنے میں دیر نہ لگائیے گا ورنہ یہ دورہ پھر بھی پڑ سکتا ہے۔“

وہ پندرہ دن اسپتال میں رہ کر گھر آ گئی لیکن اب بھی حالت یہ تھی کہ جیسے کسی اجنبی جگہ آ گئی ہو۔ دن دن بھر دیواروں کو کتکتی رہتی تھی۔ کسی نے کھانے کو دے دیا تو کھالیا۔

بات کر لی تو جواب دے دیا۔ جیلہ خاتون اسے دیکھ دیکھ کر کڑھ رہی تھیں۔ بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر خود ان کا حال یہ ہو گیا کہ چہرے پر اچانک جھریاں نمودار ہو گئیں۔ بال کچھ سیاہ تھے کچھ سفید اب بالکل سفید ہو گئے۔
 درخشاں کی دوائیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ علاج ہو رہا تھا۔ اس دوائی کا اثر تھا کہ رفتہ رفتہ اس کے ہونٹ ہنسی سے واقف ہونے لگے۔ اس کی سنبھلتی ہوئی حالت کو دیکھ کر جیلہ خاتون کی ہمت ہوئی۔

”بیٹی تو کسی نقاش کو جانتی ہے بے؟“ جیلہ خاتون نے بڑے پیار سے پوچھا۔
 ”کون نقاش؟“

”تو جب اسپتال میں تھی تو بے ہوشی کے عالم میں اسے پکار رہی تھی۔“

”بے ہوشی میں تو میں نے اور نہ جانے کیا کیا بتایا ہوگا۔ ہر بات صحیح ٹھوڑی ہوگی۔ میں تو اس نام سے واقف نہیں۔“

”اگر تو کسی نقاش سے واقف ہے تو بتا دے۔ میں اس سے تیری شادی کر ادوں گی۔ اس کا خاندان کیسا بھی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تو بتا تو سہی وہ ہے کون؟“

”اماں میں کیسے بتاؤں میں کسی نقاش کو نہیں جانتی۔ اور میری شادی کو تو آپ بھول جائیں۔ میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ مٹی یہ چلتے چلتے مٹی میں سو جاؤں گی۔“

”ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں تیری شادی کر دی جائے۔ یہی تیرا علاج ہے۔“

”بکو اس کرتے ہیں ڈاکٹر۔ کسی نے اگر شادی کا نام بھی لیا تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔“

جیلہ خاتون خاموش ہو گئیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ غصہ اتر جائے گا تو خود ہی تیار ہو جائے گی۔ وقت نے پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ درخشاں کی حالت میں صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ وہ کبھی بھی باہر جانے لگی تھی۔ گھر میں آتے ہی پھر اداس ہو جاتی تھی۔ شادی کے نام پر تو ایسی بھڑک جاتی کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

اس حادثے کا البتہ اتنا فائدہ ہوا تھا کہ علی کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

”باجی! ایک بات کہوں۔“ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اسے باجی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا ورنہ ہمیشہ وہ اس کا نام ہی لیتا رہا تھا۔

”کیا بات ہے، آج مجھے باجی کہہ رہے ہو؟“

”باجی وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بتایا جاتا ہے۔“

”کتنے پیسے چاہئیں؟“
 ”میں پیسے مانگنے کی نہیں کمانے کی بات کر رہا ہوں۔“
 ”کہیں نوکری مل گئی ہے؟“
 ”اسی کی تو بات کرنے آیا ہوں۔ آپ جہاں نوکری کرتی تھیں۔ وہاں جو اکرام صاحب ہوتے ہیں جنہوں نے آپ کے لیے رشتہ بھی بھیجا تھا۔ اگر انہیں ایک فون کر دو تو مجھے نوکری مل سکتی ہے۔“
 ”میں بڑی اچھی لگوں گی ان سے بات کرتی ہوئی۔“
 ”میں نے تو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنالیا جاتا ہے۔“
 ”ایسا کون سا وقت پڑ گیا۔ جب تم نے تہیہ کر ہی لیا ہے تو دفتر بہت نوکریاں بہت۔“
 ”باجی کتنے دن سے تو فلو کریں کھا رہا ہوں۔ اثر پاس کو نوکری کون دیتا ہے ہر جگہ تو سفارش، اس نے اتنی ضد کی کہ درخشاں نے فون تو نہیں کیا البتہ اسے یہ اجازت دے دی کہ وہ اس کا نام لے کر اکرام سے مل سکتا ہے۔ ایک پر چاہی لکھ کر دے دیا جس پر صرف اتنا لکھا۔“
 ”یہ میرا بھائی ہے۔ اسے نوکری چاہیے۔ مجھ پر احسان ہوگا۔“

یہ قدم بھی اس نے صرف اس لیے اٹھایا تھا کہ علی اس وقت نوکری کرنے کے موڈ میں ہے۔ ناکامی ہوئی تو کہیں ارادہ ہی نہ بدل دے۔ دفتر میں چند اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھے گا تو کچھ محفل آجائے گی۔ آوارہ لڑکوں کی صحبت سے بھی بچے گا۔ اکرام نے اس کا اتنا خیال کیا کہ پر چاہ پڑتے ہی علی کے لیے جگہ نکال لی۔ اب درخشاں کی مروت نے گوارا نہیں کیا کہ فون پر شکر یہ بھی ادا نہ کرے۔ اس نے اکرام کو فون کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اکرام نے چند باتوں کے بعد اسے مشورہ دیا کہ وہ شادی کر لے۔ وہ پھر بھڑک گئی۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔

دو سال گزر گئے۔ جیلہ خاتون اس کی شادی کے لیے کیا کوشش کرتیں جبکہ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ کہہ چکی تھی کہ اگر اسے شادی کے لیے مجبور کیا گیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔

گھر قبرستان بنا ہوا تھا۔ علی دفتر چلا جاتا تھا۔ درخشاں کو گھر کے کام کاج سے سروکار نہیں رہا تھا۔ گھر کے ہزار کام ہوتے ہیں جیلہ خاتون کی کمر ڈہری ہوئی جاری تھی۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ علی کی شادی کر دی جائے۔ گھر میں بہو آجائے گی تو کچھ رونق ہو جائے گی۔ گھر کے کام کاج بھی

سنجال لے گی۔
 درخشاں سے مشورہ کیا تو اس نے بھی لالچ سے سہی لیکن اس فیصلے کی تائید کی۔
 جیلہ خاتون کو پھر ایک کام ہاتھ لگ گیا۔ بہو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئیں۔ بہو کے لیے شرط یہ تھی کہ جاننے والوں میں ہو یا جاننے والوں کے توسط سے ہو۔
 درخشاں کو معلوم تھا کہ جتنی چھان بین وہ کرتی ہیں بہو ڈھونڈنے میں برسوں لگا دیں گی لیکن ایسا ہوا نہیں کیونکہ علی کی نہ تو تعلیم زیادہ تھی اور نہ ملازمت ایسی کوئی قابل ذکر تھی کہ کسی بڑے خاندان کے خزانے اٹھائے جاتے۔ انہوں نے شروع ہی سے غریب گھر کی لڑکی لانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ جس خاندان میں وہ نکلیں اس کے لیے یہی بہت تھا کہ علی کا گھر بہت بڑا تھا۔

جیلہ خاتون کو اس مرتبہ اتنی جلدی تھی کہ معنی کا اصول بھی بالائے طاق رکھ کر مہینے بھر میں بہو بیاہ کر لے آئیں۔ بہو آئی تو جیسے گھر میں نیا موسم آ گیا۔ جیلہ خاتون کی ساری توجہ بہو کی جانب ہو گئی۔ علی کو بھی اب بہن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ درخشاں نے کچھ دن تو اس نئے موسم سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی۔ سب لوگ بیٹھے ہوتے تو وہ بھی ان کے درمیان جا کر بیٹھ جاتی۔ کسی بات پر سب ہنستے تو وہ بھی ہنسنے لگتی لیکن وہاں سے ہٹتے ہی اسے محسوس ہوتا جیسے دل میں کوئی چیز جل رہی ہے۔ اس کی تنہائیاں ادا سی سے بھر گئی ہیں۔ کوئی اس کا حق مارنے آ گیا ہے کوئی کام ہوا ماں اسے نظر انداز کر کے بہو کو پکارتی ہیں۔ وہی پیتا جو کل تک ان کی چیزیں چراتا تھا آنکھوں کا تارابن کیا ہے۔ نئی آنے والی کے سامنے اس کی تعریفوں کے پل بانڈھتی رہتی ہیں۔ اگر بھائی کا بھرم رکھتی ہیں تو اس کی بھی تعریف کریں۔ وہ آہستہ آہستہ سب سے دور ہوتی چلی گئی۔ دراصل اس کا مزاج ہی ایسا ہو گیا تھا کہ خود خوش نہیں تھی تو دوسروں کو بھی خوش نہیں رکھ سکتی تھی بلکہ دوسروں کو خوش دیکھ کر اداس ہو جاتی تھی۔ میں بچر ہوں تو دوسرے کے باغ میں پھول کیوں کھلے ہوئے ہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ تلخ ہونے لگی تو اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔

”اماں میں کہیں ملازمت کر لوں؟“
 ”بیٹا میں تو کب سے سوچ رہی تھی کہ تم سے کہوں لیکن پھر سوچتی تم کہو گی اماں کو پیسوں کا لالچ ہے۔ گھر سے نکلو گی تو کچھ دل بیلے گا۔ چار پیسے بھی ہاتھ میں آئیں گے۔ اپنے پیسے اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔“

وہ ایک مرتبہ مردوں کے ساتھ دفتر میں تو نوکری کر کے دیکھ چکی تھی۔ اس مرتبہ وہ بچوں کے کسی اسکول میں نوکری کرنا چاہتی تھی۔ تنخواہ کا لالچ تھا نہیں۔ اس کی منزل تو صرف وقت گزاری تھی۔ ارد گرد بہت سے اسکول تھے۔ ان اسکولوں کو کھال کھینچنے کے لیے ہر وقت نئی لڑکیوں کی تلاش رہتی تھی۔ ہزاروں روپے فیس وصول کر کے سیکڑوں تنخواہیں دینے والی یہ تجارت گاہیں ہر موڑ پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ مقصد اب بھی یہی تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ خوش ہو گئی کہ نئے فرشتوں کے درمیان وقت گزرے گا تو اس کا نشہ بہت دیر تک رہے گا۔

اس کی توقع کے برعکس اسکول پہنچے ہی اس کی نفسیاتی گھر میں مزید سخت ہونے لگیں۔ بچوں کو ہنسنے چھپاتے دیکھ کر اس کے اندر اداسیوں کے موسم اتر آئے۔ میں بڑی ضرور ہو گئی ہوں لیکن کھل کھلا کر ہنسنے کے دن ابھی گئے نہیں ہیں۔ پھر میں ہنستی کیوں نہیں۔ میرے یہ قیمتی سکے کون چرا کر لے گیا ہے۔ میرے ہاتھ اتنے چھوٹے کیوں ہو گئے ہیں۔ ستارے دور کیوں چلے گئے ہیں۔ میں معذوری کے دن کیوں کاٹ رہی ہوں۔ سب کے ساتھ کیوں نہیں چل سکتی۔ چلنے والے کیوں مجھ سے آگے نکل جاتے ہیں۔ کیا میرے حالات نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی مریض کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو درست سمجھ رہا ہوتا ہے، زمانے بھر کو غلط۔ غلطی کا احساس ہو بھی جاتا ہے تو مختلف جواز قطار بنا کر آن کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی بات منوا کر چھوڑتے ہیں۔ درخشاں کو بھی اپنی غلطی کا کبھی احساس ہوتا تو کوئی جواز بنا کر دوسرے کو غلط ٹھہرا دیتی لیکن کچھ دنوں سے ایک مثبت تبدیلی اس کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔ یہ جواز اسے خود ساختہ معلوم ہونے لگے تھے۔ ایک روز ایک بچہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بچے سے ہنس کر باتیں کر رہا تھا، درخشاں اپنے ذہن میں اپنے دکھوں کی کتاب کھولے بیٹھی تھی۔ بچے کی ہنسی اسے اتنی زہریلی کہ فوراً اسے اپنے پاس بلایا اور پھول سے رخساروں پر دو ٹھانچے ایسے جڑے کہ بچہ بلبلا اٹھا۔ قصور اس کا یہ تھا کہ وہ ہنس رہا تھا۔

وہ جب اسکول سے چھٹی کے بعد گھر گئی تو وہ بچہ اس کے خیالوں میں اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”مس میرا قصور کیا تھا؟ مجھے کیوں مارا؟“
 ”تمہارا یہ قصور کیا تم ہے کہ تم ہنس رہے تھے۔“
 ”میری امی تو کہتی ہیں بچے رونے پر پٹتے ہیں ہنسنے

پر نہیں؟“
 ”وہ تمہارا گھر نہیں تھا جو تمہاری امی کا حکم چلے گا۔ اسکول پڑھنے کے لیے آتے ہیں ہنسنے کے لیے نہیں۔“
 ”مگر وہ تو بچہ نام تھا۔“
 ”کچھ بھی تھا۔ میں نے صحیح مارا۔ آئندہ ہنسو گے تو آئندہ بھی پٹو گے۔ جب میں نہیں ہنستی تو کوئی اور بھی کیوں ہنسنے۔ پھر وہ خود ہی سے کہنے لگی۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔ تم نہیں ہنسو گی تو کیا کوئی اور بھی نہیں ہنسنے گا۔ وہ بچہ تھا اور اس وقت بچہ نام تھا۔ اگر وہ کسی بات پر ہنس پڑا تو اس میں برائی کیا ہو گئی۔“

دوسرے دن وہ اسکول گئی تو اس نے اس بچے کو اپنے پاس بلایا۔ اسے پکارا اور اپنے ساتھ لائی ہوئی دو ٹافیاں اسے دیں۔ وہ خوش ہو گیا۔
 ”دو ٹافیاں تمہیں مل گئیں اور تم ہنسے تک نہیں؟“
 ”مس! میں ہنسا تو آپ پھر ماریں گی۔“
 ”نہیں، میں نہیں ماروں گی تم خوب ہنسو۔“

وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس کی اجازت کے باوجود اسے ہنسنے کی ہمت نہ ہوئی اور خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی اس تبدیلی پر خود بھی حیران تھی۔ یہ تبدیلی اس کی عادت بننے لگی۔ بچوں کے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگی لیکن یہ عادت اسکول تک محدود تھی۔ گھر پہنچتے ہی وہ اداسی کی چادر اوڑھ لیتی۔ وہ اپنی اس عادت سے کبھی تنگ آنے لگی تھی لیکن امید ہی کر سکتی تھی کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح زندگی گزار سکے گی۔ وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف پلٹ رہی تھی۔ جب کسی کو اپنی کسی کمی کا احساس ہو جائے تو ایسے اسباب خود بخود فراہم ہو جاتے ہیں جو اس کی کوپرا کر دیں۔ ایسا ہی ایک موقع اس وقت فراہم ہو گیا جب وہ اپنے ایک اسٹوڈنٹ کی دلجوئی کے لیے اس کے گھر گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اسکول سے باہر کسی سے ہنس بول رہی تھی۔

”فرحان آپ کی صحیح تعریف کرتا ہے، آپ تو بہت ہنسنے والی ہیں۔“

اس کے کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ اسی کے بارے میں کہا جا رہا ہے یا کسی اور کے بارے میں۔ وہ وہاں سے واپس آئی تو راستے میں بھی کئی جگہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی نے جگہ بنالی۔ گھر پہنچی تو مسکراتے ہوئے ماں کو سلام کیا۔ جیلہ خاتون سلام کا جواب دینا بھول کر اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اس کی تصویر

پر پڑی جو نقاش نے خاص طور پر اس کے لیے بنائی تھی۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کی اداسی دراز ہو گئی۔ اسے اس جرم کا احساس ہونے لگا جو کچھ دیر پہلے اس سے سرزد ہوا تھا۔ وہ ہنسنے کی گناہ گار ہوئی تھی جبکہ وہ یہ سوچ کر ہنسا بھول گئی تھی کہ یہ ہنسی نقاش کی امانت ہے اسے کسی اور پر ظاہر نہیں کرے گی۔ وہ کچھ دیر اس تصویر کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نیچے گرے۔ وہ آگے بڑھی اور تصویر اتار کر الماری کے نیچے اس طرح کھڑی کر دی کہ ہر وقت اس پر نظر نہ پڑے۔ اس نے اپنی اداسی کا پیر ہن تلاش کر لیا تھا۔ اسے ملے پڑوں میں چھپا رہنے دو۔ اب میں نیا لباس بدلوں گی۔ مرنے والے کے ساتھ مرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ میں اس کی یاد کو اپنی کوکھ میں رہنے دوں گی اور جب کوکھ میں کچھ ہو تو عورت کا زندہ رہنا ضروری ہوتا ہے۔ میں زندگی کی دعا مانگتی ہوں میرا کرا قبر کا گڑھا نہیں کھلونوں کا شیلف ہے۔ کوئی کھلوتا ٹوٹ جائے تو پورا شیلف خالی نہیں کر دیتے۔ جینے کے بہت سے سامان ہیں، ہنسنے کے بہت سے میدان ہیں۔

وہ ہنسا سیکھ گئی تھی لیکن اس بچے کی طرح تھی جس نے ابھی نیا نیا چلنا سیکھا ہو۔ چلتے چلتے گر پڑے ہنسنے ہنسنے رونے لگے۔ ابھی بیٹھی ہنس رہی ہے ابھی ہونٹوں میں ہنسی دبا کر چپ ہو گئی۔

اپنی اس عادت کو پختہ کرنے کے لیے وہ اپنے اسٹوڈنٹ فرحان کے گھر کبھی کبھی جانے لگی۔ جس طرح بچہ کسی اور کے گھر جا کر وہ کچھ نہیں کرتا جو اپنے گھر میں کرتا ہے یہی حال اس کا تھا۔ گھر میں ہنسنے ہوئے ڈرتی تھی یہاں خوب ہنستی تھی۔

فرحان کی والدہ نے اسے فرحان کی سالگرہ کی دعوت دی تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ”یہ دعوت تو فرحان صاحب مجھے پہلے ہی دے چکے ہیں اور میں قبول بھی کر چکی ہوں۔ یہ میرا اور فرحان کا معاملہ ہے آپ سچ میں کیوں دخل دیتی ہیں۔“

”جلے ہمیں تو مطلب تو اب سے ہے۔ آپ ہمارے نہ سبھی فرحان کی مہمان سہی۔ گھر تو ہمارا ہی ہوگا۔“

”میں فرحان کی مہمان ہوں اس لیے مہمان خصوصی ہوئی۔“

”آپ کو پروڈکول بھی ایسا ہی ملے گا۔“

اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ سالگرہ میں ضرور آئے گی۔ برسوں بعد اس نے نفیس سے نکل کر باغ میں چھپ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے اس تقریب کے لیے نیا سوٹ

خریدا۔ بھائی سے گاڑی مانگی اور فرحان کے گھر پہنچ گئی۔ اس وسیع و عریض کوئی کوئی دیکھ کر اسے خیال آیا کہ وہ وقت سے پہلے پہنچ گئی ہے۔ وہ شاید پہلی مہمان تھی جو پہنچی تھی، جلدی آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ گھر والوں کی توجہ کا مرکز بننے کے لیے وہی تھی۔ پورا گھر اس کے گرد جمع تھا فرحان کی خوشی کا تو ٹھکانا نہیں تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مہمان آنا شروع ہو گئے۔ وہ کتنی ہی اہم سہی باقی مہمان بھی بن بلائے تو نہیں تھے۔ گھر والے ان مہمانوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ آیا کہ وہ اکیلی رہ گئی۔ صرف فرحان اس کے پاس تھا۔ وہ بھی اس کے پاس بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔

”مس باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”آپ کمال کرتی ہیں ایک تو وہیں کئے گا۔ سب لوگ وہیں تو بیٹھیں گے۔“

وہ اس کے ساتھ اٹھ کر لان میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد اندھیرا ہوا تو برقی قہقروں سے کوئی روشنی میں نہا گئی۔ روشنی تیز ہو تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ برسوں بعد اپنی تنہائی سے باہر آئی تھی۔ ابھی اتنی بھیڑ کی عادی نہیں تھی۔ زرق برق لباس، میک اپ کی تہیں، ادھر ادھر بکھرے ہوئے قہقہے یہ سب اسے پریشان کر رہے تھے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اسی وقت اعلان ہوا کہ ایک کٹ رہا ہے۔ ایک میز کے گرد عورتوں کا جھوم لگ گیا۔ وہ میز کی طرف جانے کے بجائے کوئی گیت کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں اسی کی طرح تنہا ایک بچہ پڑی نظر آئی۔ یہاں ایک بچہ بھی اداس کھڑا تھا جو عورتوں کے جھوم اور اس کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ وہ اس بچے پر بیٹھ گئی۔ اگر میں فرحان کو بتائے بغیر چلی گئی تو وہ بھری کلاس میں گلہ کرے گا۔ یوں بھی اس مروت سے بعید تھا مجھے تنہائی چاہیے ہے، وہ یہاں میسر ہو گئی ہے کچھ دیر یہاں بیٹھی رہوں تو کیا حرج ہے۔ اس طرف کوئی آئے گا بھی نہیں۔ جب مہمان رخصت ہونے لگیں گے تو وہ بھی فرحان کی والدہ سے اجازت لے کر چلی جائے گی۔

ایک تکلیف دہ یاد نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ایسی ہی ایک پروقار تقریب تھی جب میری مگنسی ہوئی تھی۔ انجام کیا ہوا۔ کیسی منحوس تقریب تھی وہ۔ نقاش نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کی تقریب ایسی شاندار کرے گا کہ مہینوں جرحے ہوں گے۔ ہوا کیا تقریب سے پہلے ہی تقریب اجڑ گئی۔ خدا فرحان کو ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ اس نے پھر

آب طلب

سوچا کہ یہاں سے بھاگ کھڑی ہو۔ اس نے غیر ارادی طور پر کوئی گیت کی طرف دیکھا۔ اسے ایک بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔ گہرے سرخ رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر پر فلیٹ کیپ تھی۔ ڈھیلی ڈھالی پیٹ میں وہ عجیب جو کرسا لگ رہا تھا۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی یہ آدمی گزر جائے پھر میں اٹھوں گی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کوئی اس کے پاس آ کر رک گیا ہے۔

”اے اداس لڑکی! تم یہاں خود بیٹھی ہو یا میرے استقبال کے لیے کسی نے تمہیں یہاں بٹھایا ہے؟“

”میں یہاں خود بیٹھی ہوں۔“

”ہماری بیٹی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”آپ فکر نہ کریں میں ٹھیک ہوں۔“

”پھر تم یہاں تنہائی میں آ کر کیوں بیٹھ گئی ہو۔ میرے تو بیٹے کا فون آنے والا تھا اس لیے ذرا دیر ہو گئی ورنہ ایسی تقریبات میں، میں سب سے پہلے پہنچتا ہوں۔“

”مجھے وحشت ہوتی ہے اس بھیڑ بھاڑ سے۔“

اسے ابتدا میں اس بوڑھے سے ڈر لگ رہا تھا۔ بڑے گھروں کے یہ بوڑھے کچھ کم خطرناک نہیں ہوتے لیکن انہوں نے جس پیار سے اسے بیٹی کہہ کر پکارا تھا اس سے اس کی ہمت ہو گئی تھی۔

”بھیڑ بھاڑ سے گھبراتا تو میں بھی ہوں لیکن صحت کے لیے ضروری بھی ہے کہ انسان خوش رہے۔“ وہ اسی بیچ پر بیٹھ گئے۔ ”بیٹی، میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔“

”میرا نام درخشاں ہے۔ اس گھر میں ایک بچہ رہتا ہے اس کا نام فرحان ہے۔ میں فرحان کی بچہ ہوں۔“

”اوہ ہمارے بیٹی تو بولتی بھی ہے۔ زیادہ بولنے سے بھیڑیوں کی ورزش ہوتی ہے۔ خوب بولا کرو۔ دیواروں سے نہیں آدمیوں سے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے بہت سے دوست ہوں۔ میں تو خوب دوست بناتا ہوں۔ آج ایک دوست کا اور اضافہ ہو گیا جو میری بیٹی بھی ہے اور دوست بھی۔“

انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسے بیٹی کہا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اسی شفقت نے اسے مجبور کیا کہ وہ ان کے بارے میں کچھ اور جانے۔ ”آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں؟“

”بوڑھوں کا نام تو کوئی ہوتا نہیں۔ لوگ ان کا نام اٹھل رکھ دیتے ہیں۔ تم بھی مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہو۔“

”میرا مطلب ہے آپ اکیلے ہی اس تقریب میں

آئے ہیں؟“

”اکیلا کہاں ہوں تم بھی تو میرے ساتھ ہو۔ تمہاری آنٹی تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں اب میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ ایک میرا بیٹا ہے وہ میرے ساتھ رہتا ہے کہیں آتا جاتا نہیں بڑا موڈی ہے۔ یہ میرے دوست کے بیٹے کا گھر ہے اسی رشتے سے آیا ہوں۔ تم مجھے اپنا ایڈریس دو۔ میں تمہارے گھر بھی آؤں گا۔ کہنی رہے گی۔“

اسی وقت فرحان کہیں سے بھاگتا ہوا آیا۔

”مس ڈنر شروع ہو چکا ہے اور آپ یہاں ان کے ساتھ بیٹھی ہیں۔“

درخشاں انہیں اپنا ایڈریس بتانا نہیں چاہتی تھی۔ فرحان نے۔۔۔ مشکل آسان کر دی اور اس کے ساتھ چل دی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے تھے لیکن وہ عورتوں کی طرف بڑھ گئی اور کچھ دیر کے لیے شکر بھیجا کہ جان بچی۔ ڈنر کے دوران بھی وہ ہاتھ میں پلیٹ لے کر کئی مرتبہ اس کے قریب آئے لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے سے آگے بڑھ گئی۔ کبھی سالن لینے کبھی پلیٹ میں کباب ڈالنے کے بہانے۔ ابھی ڈنر ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اٹھل نے اسے تلاش کر لیا تو وہ اسے باتوں میں الجھا لیں گے اور اسے اب دیر ہونے لگی تھی۔ یہ بداخلاقی ضرور تھی لیکن وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر وہاں سے نکل آئی۔

وہ گھر پہنچی تو معمول کے برخلاف بہت خوش تھی لیکن دیر بہت ہو چکی تھی اس لیے کسی کے پاس بیٹھنے کا موقع نہ ملا اور وہ علیک سلیک کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بالکل نارمل تھی لیکن شاد رہنے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب بستر پر لیٹی تو احساس جرم اس کے قریب آ کھڑا ہو گیا۔ اسے وہ بوڑھا یاد آ گیا جس نے بڑی شفقت سے اس کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے یہ بداخلاقی کی کہ ان سے مل کر بھی نہیں آئی۔ ایڈریس دینا تو بڑی بات۔ اٹھل سچ تو کہہ رہے تھے کہ خوش رہتا ہے تو زیادہ سے زیادہ دوست بناؤ۔ یہاں تو جس کو دوست بناؤ وہ رشتہ لے کر آ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اٹھل ٹھیک رہے، وہ صرف دوست بن کر رہے۔ پھر اس نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ ان کے بارے میں فرحان کی امی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ وہ ضرور انہیں جانتی ہوں گی۔ اسے ڈاکٹر نے سکون کی گولیاں دی تھیں وہ کھا کر سو گئی۔ صبح اٹھی تو ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسکول جانے

دو لاکھ کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر
بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111 سٹیشن ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فکس: 35802551

یا تھلی بچے بھی کہتے معصوم ہوتے ہیں۔ کاش! میں بھی ہی
رہتی۔ علی کا بیٹا تھا لیکن ابھی ایک سال کا تھا۔ اس نے
سوچا، وہ ذرا بڑا ہو جائے تو اسے لے کر پارک آجایا کروں
گی۔ گھر کے قریب ہی تو ہے۔ اکیلے پارک آتے تو کوئی اچھا
لگتا ہے۔ آدی خواخواہ ایسا درخت لگنے لگتا ہے جس میں نہ
شاخیں ہوں نہ پتے۔

یہاں بیٹھنے سے واقعی اس کی طبیعت میں بشت
آگئی تھی۔ بچے گرتے پھراٹھ کر بھاگنے لگتے تھے۔ وہ اس
منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ بچوں کا یہ کھیل زندگی سے
کتنا ملتا جلتا ہے۔ زندگی میں بھی ٹھوکریں لگتی ہیں لیکن آدی
اٹھ کر پھر چلنے لگتا ہے۔ ان بچوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ یہ کیا
کہ گرتے تو گرتے گئے۔ میں بھی اب سنبھلنے کی کوشش کروں گی۔
کسی کے چلے جانے یا پھڑ جانے سے زندگی ختم نہیں
ہو جاتی۔ نقاش، مراد، اکرام مجھے معاف کر دینا۔ میں کسی
کنارے پر بھی آباد نہ ہوئی لیکن آباد نہ ہونے اور برباد
ہونے میں بڑا فرق ہے۔ میں برباد ہونا نہیں چاہتی۔ اس
نے محسوس کیا کہ اس کی رگوں میں تازہ لہو گردش کرنے لگا
ہے۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ
ان رگوں میں نہا رہی ہے۔ ہوا میں خوشبو ہے اور خوشبو میں
حوصلے کی جوت جگمگا رہی ہے۔ اس کے پیروں میں ٹھنڈ
سے بندھ گئے۔ وہ اٹھی اور ہری گھاس پر سفید پاؤں رکھ
دے۔ کچھ دیر چھل قدمی کرتی رہی لیکن وہ جو کہتے ہیں مور
ناچتا ہے پیروں کو دیکھ کر رونے لگتا ہے۔ اس نے کئی جوڑوں
کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹپکتے ہوئے دیکھا تو اداس ہو گئی۔
میں اکیلی کیوں ہوں۔ وہ پھر اپنی بیٹی پر آکر بیٹھ گئی۔ چند
گہرے گہرے سانس لیے اور پارک سے باہر آ گئی۔
دوسرے دن اس کے گھر میں شام اتری تو اسے پھر
پارک کا خیال آیا۔ اس نے گاڑی نکالی اور پارک پہنچ گئی۔
ایک اکیلی بیٹی پھر تلاش کر لی لیکن زیادہ دیر وہ اکیلی رہ نہیں
سکی۔ ایک شناسا آواز نے اس کی تہائی کو دور کر دیا۔
”ہیلو لڈی۔“

اس نے گردن کھما کر دیکھا تو اکل کھڑے مسکرا
رہے تھے۔

”جس کو میں دوست بنا لیتا ہوں وہ مجھ سے دور رہ
نہیں سکتا۔“ انہوں نے کہا اور اس کے برابر آکر بیٹھ گئے۔
”اکھل آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ آپ پھر اسکول
آئے ہی نہیں۔ مجھے آپ کا ایڈریس معلوم ہی نہیں تھا ورنہ
میں آ جاتی۔“

”میں تو یہاں سے ٹیوشن پڑھانے جاتی ہوں۔ آپ
جا میں چلی جاؤں گی۔“
”ارے ہماری بیٹی کتنی محنت کرتی ہے۔ بس کچھ دن
کی بات ہے پھر تمہیں اتنی محنت نہیں کرنی پڑے گی۔“
درختوں ان کے اس جملے پر چونکی ضرور تھی لیکن اس
وقت تو اسے بس یہ خوشی تھی کہ اس بن بلائے مہمان سے جان
چھوٹ رہی ہے۔ اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ
بوڑھا اپنے رکشا میں بیٹھ کر چل دیا۔ درختوں نے دوسرا رکشا
کیا اور گھر پہنچ گئی۔

اس دن وہ بہت الجھی ہوئی تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی قصہ
ختم ہوا لیکن ان کے اس طرح اسکول آ جانے سے وہ پریشان
ہوئی تھی۔ انہوں نے اسکول دیکھ لیا ہے۔ وہ تو روز آجایا
کریں گے۔ ان سے کہہ سکتی تھی کہ وہ ان سے ملنا نہیں چاہتی
لیکن وہ اتنی شفقت سے مل رہے تھے کہ ان کا دل توڑنے کی
اس میں ہمت نہیں تھی۔ ان سے کیسے پچھا چھڑائے کچھ سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کس دکھ میں ہیں مجھ سے مل کر
اپنا جی ہلکا کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ انہیں کہاں لے کر بیٹھے۔
گھر لائے تو کس رشتے سے لائے۔ ماں سے کیا کہتی۔
بھادج کو کیا بتاتی۔ ایک بوڑھے آدمی میں اسے کیا دلچسپی
ہوتی۔ وہ دو چار ملاقاتوں ہی میں اس کا کتا گئی تھی۔

دوسرے دن اس نے یہ ترکیب نکالی کہ چھٹی کے بعد
وہ اسکول کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی اور گھر آ گئی۔ اس
کے ضمیر نے اسے ملامت ضرور کی کہ وہ کسی کو دھوکا دے رہی
ہے لیکن وہ اور کیا کرتی۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ اکل سے اس کا سامنا نہیں ہوا
تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اب وہ ان سے ملنے کے لیے
بے چین ہو رہی تھی۔ ایک کشش تھی جو اسے اکل کی جانب
کھینچ رہی تھی۔ اس نے وہ پچھلا دروازہ چھوڑ کر سامنے کے
دروازے سے باہر آئی۔ اس کی توقع کے خلاف وہ وہاں
نہیں تھے۔ بے چارے کب تک آتے آنا چھوڑ دیا ہوگا۔
وہ مایوس ہو کر گھر چلی آئی۔ سوکر اٹھی تو شام ہو چلی تھی اس کا
دل ایسا گھبراہٹ سے کھل کھڑی ہوئی۔ آج اس نے
گاڑی لے لی تھی کہ نہ جانے کتنی دور جانا پڑ جائے۔ فرلانگ
دو فرلانگ کے فاصلے پر اسے ایک پارک نظر آیا۔ اس نے
گاڑی وہیں پارک کر لی۔ کچھ دیر اس پر فضا پارک میں بیٹھ
کر چلی جاؤں گی۔ شاید دل بہل جائے۔

وہ پارک کے اندر گئی اور ایک خالی بیچ دیکھ کر بیٹھ
گئی۔ بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ انہیں پھول کہوں

کے لیے تیار ہونے لگی تو اسے اس بوڑھے کا خیال پھر آ گیا۔
اس کے ہونٹوں پر ایک نفرت بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔
اس بوڑھے آدمی کا خیال مجھے کیوں آ رہا ہے۔ کون لگتا ہے وہ
میرا؟ وہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ خدا خدا کر کے تو جان
چھوٹی تھی اب پھر اس کا پتا پوچھ کر اسے پیچھے لگا لوں۔
اس کی طبیعت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔ گھڑی میں تولہ
گھڑی میں ماشہ۔ ابھی ایک بات سے خوش ہے ابھی اسی
بات سے ناخوش۔ ابھی ایک بات مان لی دوسرے لمحے اسی
بات کو ٹھکرا دیا۔

وہ اسکول گئی تو فرحان کو دیکھ کر اسے پھر اس بوڑھے کا
خیال آیا لیکن اس نے فرحان سے کچھ نہیں پوچھا اور
پڑھانے میں مشغول ہو گئی۔

دو چار دن خیریت سے گزر گئے لیکن ایک روز وہ
اسکول سے نکلی تو اس نے اس بوڑھے کو اسکول سے باہر
کھڑے دیکھا۔ اس نے نظر بچا کر ایک طرف نکل جانا چاہا
لیکن اسے فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ بالکل اس کے
سامنے آ چکے تھے۔

”ہیلو لڈی۔“
”اکھل، آپ اور یہاں۔“

”تم عجیب بیٹی ہو۔ میں تمہارا گھر تک معلوم نہیں۔
وہ تو اچھا ہوا تم نے بتایا تھا کہ تم فرحان کے اسکول میں
پڑھاتی ہو۔ سو میں یہاں آ گیا اور یہ دیکھو تمہارے لیے حلوا
سوہن لے کر آیا ہوں۔ شوق سے کھا لی ہو؟“
”میں جی حلوا کھاتی ہوں۔ اسے تو زبان پر بھی نہیں
رکھتی۔“ اس نے یہ سوچ کر کہہ دیا کہ اچھا ہے واپس لے
جائیں گے۔

”میرا بیٹا بھی سوہن حلوا نہیں کھاتا۔ تمہاری اور اس
کی پسند کتنی ملتی جلتی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کل جی حلوا لے
آئیں گے اپنی بیٹی کے لیے۔“

”نہیں اکل یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں؟“
”تکلیف کیسی۔ تم سے تو ابھی بہت سی باتیں کرنی
ہیں۔ چلو تمہارے گھر چل کر بیٹھتے ہیں۔ گھر دیکھ لوں گا تو کبھی
کبھی آجایا کروں گا۔“

”آج تو گھر پر کوئی نہیں ہے۔ پھر کبھی آجائیے گا۔“
”چلو پھر کبھی آجائیں گے۔“

”اچھا خدا حافظ۔“
”میں رکشا سے آیا ہوں۔ وہ دیکھو رکشا کھڑا ہے۔
تمہیں تمہارے گھر چھوڑنا ہوا چلا جاؤں گا۔“

”میں تو اسکول آیا تھا مگر تم شاید نہیں آئی تھیں۔ مجھے بھی تمہارا ایڈریس معلوم نہیں تھا ورنہ میں گھر آ جاتا۔“

”میں ایک دن نہیں کئی دن نہیں آسکی تھی۔ بس ہلکا سا بخار ہو گیا تھا۔ خیر چھوڑیے آپ بھی پارک میں آتے ہیں۔“

”بات یہ ہے کہ جب میرا شرارتی بیٹا چھوٹا تھا تو میں اسے لے کر یہاں آیا کرتا تھا۔ اب وہ غبیٹ کہتا ہے میں بڑا ہو گیا ہوں۔ میرے ساتھ آنے پر تیار ہی نہیں ہوتا۔ میں اکیلا آ جاتا ہوں اور یہ سوچ کر خوش ہوتا رہتا ہوں کہ وہ بھی ان بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ کھیلتے کھیلتے دور چلا گیا ہے۔ اسی لیے مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔ ابھی کہیں سے نکل کر آ جائے گا۔“

”آپ تو بہت ہی دلچسپ ہیں لیکن آپ کا بیٹا شاید آپ سے محبت نہیں کرتا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ جان دیتا ہے مجھ پر۔“

”پھر آپ کے ساتھ کیوں نہیں آتا؟“

”نہیں آتا۔ مرضی اس کی لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“

”اس سے کہیں شادی کر لے۔ شادی کے بعد وہ بیوی کے ساتھ تو ضرور آئے گا۔ آپ کو بھی کہنی مل جائے گی۔“

”بیٹی، میں تو اس سے کہہ کر تھک گیا ہوں۔ ایک جگہ مگنی بھی کر دی تھی۔ اس نے وہ مگنی بھی تو زدی چپ لگ گئی اس کو۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔ بولے تو ایک لڑکی میں نے دیکھ لی ہے۔ فوراً اس کی شادی کر دوں۔“

”اچھا، آپ نے لڑکی بھی دیکھ لی؟“

”اور نہیں تو کیا۔ اور لڑکی بھی ایسی ہے کہ اگر وہ دیکھ لے تو انکار کر ہی نہ سکے مگر وہ تو میرے ساتھ کہیں جاتا ہی نہیں۔“

”آپ کا بیٹا کرتا کیا ہے؟“

”انجینئر ہے بہت بڑا۔“

”آپ کو کھانے پینے کی تو بہت وقت ہو جاتی ہوگی؟“

”آئی تو اس دنیا میں رہی نہیں۔ بہو آ جائے تو کھانے پینے کا آرام ہو جائے۔“

”میرے بیٹے نے میرے لیے خانساں رکھ دیا ہے۔ ایک سے ایک ڈش بناتا ہے۔ کل آنا کوئی ڈش بنوا کر لاؤں گا۔ دونوں بیٹے کرکھائیں گے۔ ہوسکا تو اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے آؤں گا۔ وہ بھی تو دیکھے میں نے کیسی دوست بنائی ہے۔ تمہارا کہوں گا تو آ جائے گا۔“ یہ آخری الفاظ سرگوشی میں درخشاں کے کان کے قریب منہ لاکر کہے تھے۔

درخشاں کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ کسی کو خوش رکھنے سے انسان کو کتنی خوشی ملتی ہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ جب وہ اس

سے ملتے ہیں ان کی آنکھوں میں ستارے جھمکانے لگتے ہیں۔ اس بوڑھے آدمی سے ملنا اور کچھ دیر کے لیے انہیں خوشی سے ہم کنار کرنا ثواب کمانے کے برابر ہے۔ وہ یہ ثواب کمائی رہی اور ان سے برابر ملتی رہی۔ ہر ملاقات میں وہ اپنے بیٹے کی اتنی تعریفیں کرتے تھے کہ درخشاں یہ سوچنے لگی کہ وہ لڑکی میں ہی تو نہیں جو انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے دیکھ لی ہے۔ وہ تہیہ کر چکی تھی کہ شادی نہیں کرے گی۔ اس نے گھر میں بھی اعلان کر دیا تھا کہ کوئی اسے شادی کے لیے مجبور نہ کرے لیکن اب وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا ذہنی ماحول تبدیل ہو رہا ہے۔ وہ اب یہ سوچ رہی تھی کہ اگر انکل کے بیٹے سے اس کی شادی ہو جائے تو وہ خوش رہے نہ رہے انکل کو کتنی خوشی ہوگی۔ اس نے ان کے بیٹے کو دیکھا نہیں تھا لیکن اس کا مقصد تو یہ تھا کہ انکل کو زیادہ سے زیادہ خوشی دے۔

وہ ان ملاقاتوں کے دوران مسلسل یہ سوچتی رہی تھی کہ انکل کے دل کا حال کیسے معلوم کیا جائے۔ اس نے کئی مرتبہ ہمت کی کہ انکل سے کھل کر بات کرے لیکن اپنے خیال کی خود ہی تردید کرتی رہی۔ یہ بات اگر اماں کی طرف سے پوچھی جائے تو مناسب ہوگا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ماں کو اعتماد میں لیا جائے۔

”اماں، آپ نے ایک روز بھی نہیں پوچھا کہ میں روزانہ پارک کیوں جاتی ہوں۔ کیا میں ایسی فالتو چیز ہوں کہ کسی کو میری پروا ہی نہیں کہ میں کہاں جا رہی ہوں کیوں جا رہی ہوں؟“

”اس میں پوچھنے کی کیا بات تھی بیٹا۔ پارک جانا تو اچھی بات ہے۔ وہاں سے فرنیٹس ہو کر آئی ہو۔ میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ پارک جانے سے تمہاری صحت پر اچھے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ تم اب خوش رہنے لگی ہو۔“

”خوش رہنے کی ایک اور وجہ بھی ہے جس کے بارے میں، میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔“

”ایسا کیا ہے اس پارک میں؟“

”وہاں ایک بڑے میاں آتے ہیں۔ ستر سال سے زیادہ ہی عمر ہوگی۔ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ نہایت خوش مزاج ہیں لیکن لگتا ہے کوئی بڑا دکھ چھپائے پھر رہے ہیں۔ اس دکھ کو کسی میں چھپاتے ہیں۔“

”ہاں بیٹی، دنیا بہت دھمی ہے۔ ہوگا انہیں بھی کوئی دکھ۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ تیری فکر کھائے جاتی ہے۔ تیری اگر شادی ہو جاتی تو میں کتنی خوش رہتی۔“

”اماں، وہ اپنے بیٹے کی بہت تعریف کرتے ہیں۔“

اب طلب

مجھے تو لگتا ہے مجھے سنانے کو تعریف کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے کے لیے لڑکی تلاش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے میری شکل میں لڑکی ڈھونڈ لی ہو۔ آپ ان سے کہہ کر دیکھیں۔ میں ان کے بیٹے سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“

جیلہ خاتون کو جیسے بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ اگر درخشاں یہ کہتی کہ کل سے سورج مغرب سے نکلے گا تو انہیں اتنا تعجب نہ ہوتا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔

”یہ تم کہہ رہی ہو۔ تم شادی کرو گی؟“

”ہاں اماں یوں کب تک آپ لوگوں پر بوجھ بنی رہوں گی؟“

”انہوں نے کبھی ذکر کیا ہے؟“

”کھل کر تو نہیں کہا لیکن اشارہ میری ہی طرف ہے۔ میں انہیں گھر لے کر آتی ہوں۔ آپ خود ان سے کہیے گا۔“

”پاگل ہو گئی ہے۔ میں ان سے کہوں گی کہ میری بیٹی کی اپنے لڑکے سے شادی کر دو۔“

”اگر آپ خود نہیں کہتیں تو میرا نام لے کر کہہ دیجیے گا۔“

جیلہ خاتون کے سامنے پھر ایک مجبوری کھڑی تھی، جو انہیں نہ صرف اپنے بلکہ دنیا کے اصولوں سے بھی بننے پر مجبور کر رہی تھی۔ دنیا کا قاعدہ ہے پیغام لڑکے والوں کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ ان کی بیٹی اُلٹی گنگا بہا رہی تھی۔ مجبوری یہ تھی کہ درخشاں کے ہونٹوں پر کم از کم چار سال بعد شادی کا نام آیا تھا اور وہ یہ موقع کھوتا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے اجازت دے دی کہ وہ ان صاحب کو ٹھہرا سکتی ہے۔

وہ دن نکلنے کے انتظار میں جا گئی رہی۔ صبح اٹھ کر اسکول چلی گئی۔ اب شام کا انتظار تھا۔ شام ہوتے ہی وہ پارک میں چلی گئی۔ بڑے میاں اس سے پہلے ہی پہنچے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں ستارے سے اتر آئے۔

”میرا بیٹا مجھ سے پوچھ رہا تھا میں اتنی پابندی سے پارک کیوں جانے لگا ہوں؟“

”آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کہہ دیا وہاں میری ایک دوست ہے جو بیٹی بھی ہے۔ تیری طرح نٹ کھٹ تیری طرح اداس۔ اس سے ملنے جاتا ہوں۔ چپ ہو گیا کچھ بولا نہیں۔“

”میں بھی آپ کو ایک خوش خبری دینے آئی ہوں۔“

”کہیں رشتہ تو طے نہیں کر لیا؟“

”ارے نہیں۔ میں نے اماں سے ذکر کیا تھا۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ آپ بہت کہتے تھے گھر کا

ایڈریس دو۔ آج میں آپ کو اپنے گھر لے کر چلتی ہوں۔“

”ہم یہاں مل تو لیتے ہیں۔ گھر جانا کیا ضروری ہے؟“

”خود ہی تو کہتے تھے اب چل نہیں رہے۔ اگر آپ نہیں چلتے تو میں آپ سے بھی نہیں بولوں گی۔“

”ارے یہ تو بہت برا ہو جائے گا۔ اب تو چلنا ہی پڑے گا۔“

وہ انہیں لے کر گھر آ گئی۔ جیلہ خاتون نے ڈرائنگ روم میں جمناک کر دیکھا۔ ”یہ تو کس خطی کو لے آئی۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں یہ کھسکا ہوا ہے۔“

”اس عمر میں سب ایسے ہو جاتے ہیں اماں۔ ان کا بیٹا تو بہت قابل ہے اور وہ اس کی شادی بھی کرنا چاہتے ہیں۔“

”پھر میں یہیں سے بات آگے بڑھاؤں گی۔“

وہ کہہ کر تو یہی گئی تھیں لیکن اس بوڑھے کی باتوں میں ایسی مشغول ہو گئیں کہ اصل بات بھول ہی گئیں۔ یا تو انہیں خطی کی کہہ رہی تھیں یا دل جسی سے ان کے ماضی کے قصے سن رہی تھیں۔ بڑے میاں کو بھی اپنے مطلب کی خاتون مل گئی تھیں۔ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

درخشاں نے کئی مرتبہ ماں کو اشارے کیے کہ وہ اصل بات کی طرف آئیں۔ تب جا کر انہوں نے اصل بات چھیڑی۔

”درخشاں آپ کے بیٹے کی بہت تعریف کرتی ہے۔“

”ارے یہ تو ابھی اس سے ملی نہیں ہے۔ ملے گی تو اس کی دیوانی ہو جائے گی۔“

”کسی دن اسے لے کر آئیے۔ ہم بھی تو دیکھیں۔“

”درخشاں آپ کی بھی بہت تعریف کرتی ہے۔ ایک دن تو کہہ رہی تھی کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ میں ہمیشہ انکل کے ساتھ رہوں۔ میں نے تو یہ صورت نکالی ہے کہ آپ بہو بنا کر اسے اپنے گھر لے جائیں۔“

”یہی تو مصیبت ہے بہن۔ وہ شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔“

”میری درخشاں تو بہت مایوس ہوگی۔ یہ تو چاہ رہی تھی کہ آپ کی بہو بن کر آپ کی خدمت کرے گی۔“

”میں بھلا اپنی بیٹی کو مایوس ہونے دوں گا؟ اس مرتبہ دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ اپنے بیٹے سے صاف کہہ دوں گا کہ درخشاں سے شادی کرو ورنہ میں خود کسی کر لوں گا۔ پھر دیکھو وہ کیسے نہیں مانتا۔ بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔ مجھے مرنے تھوڑی دے گا۔“

”تو پھر میں امید رکھوں کہ آپ اپنے بیٹے کو راضی کر لیں گے۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

صورت نہیں دکھانا چاہتے۔
واضح ہو کہ مرحوم اکیلے رہتے تھے۔ بیٹے کی زندگی میں بھی اور اس کی موت کے بعد بھی۔ بیٹے سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے لیکن مرنے کے بعد ساری محبتیں اس کے نام کر دی تھیں۔

جب رات انہوں نے خودکشی کی خانساں سے کہہ دیا تھا کہ وہ دودن کی چھٹی کر لے۔ انہیں کہیں جانا ہے۔ دو دن بعد جب خانساں آیا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ محلے والوں کی مدد سے دروازہ توڑا گیا۔ بیڈروم میں مرحوم ثناء اللہ بیگ کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ فرش پر وہ پستول پڑا تھا جسے انہوں نے اپنی کپٹی پر رکھ کر چلا یا تھا۔

یہ تحریر اس نے خواب میں پڑھی تھی۔ تعبیر اس کی یہ ہوئی کہ وہ آخری الفاظ پر پہنچنے پہنچے بے ہوش ہو گئی۔ اسکول والوں نے اسے اسپتال بھیج دیا۔ وہ ہوش میں آگئی لیکن اس کا شعور کہیں کم ہو گیا تھا۔ پچھنی پچھنی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھتی تھی اور پھر رونے لگتی تھی ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ لڑکی کسی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ یہ جب اس صدمے سے باہر آئے گی، اسی وقت ٹھیک ہوگی۔

☆☆☆

عرصہ ہو گیا تھا۔ اس پر پاگل پن کے دورے پڑ رہے تھے۔ کئی مرتبہ الیکٹرک شاخس لگائے گئے۔ وہ کبھی ٹھیک ہو جاتی کبھی چیخنے چلانے لگتی۔ جیلہ خاتون اس کی حصار داری کر رہی تھیں۔ پھر وہ خود بیمار پڑ گئیں اور چند ہی روز میں منوں مٹی پیچھے چلی گئیں۔

بھائی بھانج کب تک اس کی نگرانی کرتے۔ وہ اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی یا پھر گلیوں میں نکل جاتی جیسے کسی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔
وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ درختوں کے بال سفید ہو گئے۔

ایک بڑھیا اب بھی پارک میں نظر آتی ہے۔ درختوں کے عقب میں جھاڑیوں کے پیچھے کچھ ڈھونڈتی ہوئی۔ عجیب بھکارن ہے ہر آنے جانے والے سے پانی مانگتی ہے۔ اس کے پاس پانی کی بوتلیں رکھی رہتی ہیں۔ کچھ بیتی ہے کچھ پھینکتی ہے۔ ایک پیاس کا صحرا ہے جو اس کے اندر آباد ہے۔ پیاسی آنکھیں سیراب ہوں تو پیاس بجھے۔

کچھ واقف حال بتاتے ہیں اس بڑھیا کا نام درختوں ہے۔



”میں درختوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں زندہ رہا تو اسے اپنی بہو بناؤں گا۔ کل نہیں تو پرسوں میں باقاعدہ رشتہ لے کر آؤں گا۔“
انہوں نے درختوں کے گال پر پیار سے ایک چپت رسید کی اور رخصت ہو گئے۔

انہوں نے اتنے یقین سے بات کی تھی کہ درختوں دوسرے دن پارک نہیں گئی اور شام ہوتے ہی ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی کہ وہ کوئی خوش خبری سنانے آئیں گے۔ بار بار جا کر دروازے پر بھی دیکھ آتی تھی۔ شام سے رات ہو گئی۔ وہ نہیں آئے۔

ابھی ایک ہی دن گزرا تھا۔ تشویش کی بات نہیں تھی۔ بیٹے کو راضی کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ اس کی آنکھیں انتظار میں جلتی رہیں۔ اب وہ واقعی پریشان ہونے لگی تھی۔ انکار کرنے ہی آ جاتے۔ آ تو جاتے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگلے دن وہ پارک جائے گی۔ شاید ملاقات ہو جائے۔ وہ اسکول سے آتے ہی بے چینی سے ٹپکتی رہی اور پھر شام ہونے سے پہلے ہی پارک پہنچ گئی۔ اس کا وہم اس کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ اس نے ایک ایک جھاڑی میں ایک ایک درخت کے پیچھے دیکھ لیا کہ شاید انکل اسے ستانے کے لیے چھپ گئے ہوں لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھے۔ پارک بند ہونے کا وقت آ گیا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر نکل آئی۔ گھبراتی ہوئی گھر آئی کہ شاید وہ گھر آئے ہوئے ہوں۔ وہ یہاں بھی نہیں آئے تھے۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ان کا پتا تلاش کر کے ان کے گھر جائے گی۔ بوڑھے آدمی ہیں کہیں بیمار تو نہیں پڑ گئے۔ وہ اسکول کی لائبریری میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی کہ اندر کے صفحات میں ایک جگہ ان کی تصویر دیکھ کر چوکی۔ پھر اس نے عبارت پر نظر ڈالی۔

”مشہور مصور نقاش آرزو (مرحوم) کے والد نے خودکشی کر لی۔ مرحوم اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔ ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ابھی تک زندہ تصور کرتے تھے اور اس کی شادی کے لیے بے قرار پھر کرتے تھے۔ ان کے خانساں کے ذریعے معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک لڑکی کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ اس سے وعدہ بھی کر آئے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اس سے کر دیں گے۔ بیٹا ہوتا تو شادی کراتے۔ انہوں نے مرنے سے ایک دن قبل خانساں کو بتایا تھا کہ اب وہ اس لڑکی کو اپنی